عشق کا شین
علیم الحق حقی

(حصہ پنجم)

علیم الحق حقی

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37211468 - 37314169

تزئین و اہتمام
نذیر محمد، طاہر نذیر

نام کتاب	:	عشق کا شین (حصہ پنجم)
مصنف	:	علیم الحق حقی
سن اشاعت	:	اگست 2012ء
اہتمام	:	محمد نذیر، طاہر نذیر
کمپوزنگ	:	عاصم شہزاد 0306-4171117
مطبع	:	ریاض شہباز پرنٹرز، لاہور
قیمت	:	-/600 روپے

''بیگم صاحبہ......؟'' نوریز نے بہ مشکل کہا۔

ڈاکٹر نے سر ہلا دیا۔

''ہاں......! مجھے افسوس ہے......!''

''تو وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔'' نوریز نے سوچا۔

''اب میں صاحب کو کیا جواب دوں گا......؟ لیکن نہیں......! ایک اُمید تو ابھی تھی۔'' اس نے دیکھا۔ ڈاکٹر جا رہا تھا۔ اس نے اسے پکارا۔

''ایک منٹ......! ڈاکٹر صاحب......!'' اور وہ ڈاکٹر کی طرف لپکا۔

ڈاکٹر رک گیا اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

''بچہ تو خیریت سے ہے ڈاکٹر صاحب......!''

ڈاکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کون سا بچہ......؟''

''بیگم صاحبہ ماں بننے والی تھیں نا......؟''

اب کے ڈاکٹر نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ اسے پاگل سمجھ رہا ہو۔

''یہ تم سے کس نے کہا......؟ ماں بننے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ بہت پے چیدہ کیس تھا ان کا...... السر پھٹ گیا تھا اور ساتھ ہی آنتوں کا بھی سنگین مسئلہ تھا۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب......!''

''پندرہ بیس منٹ میں لاش تمہیں مل جائے گی۔ پھر تم اسے لے جا سکتے ہو۔'' ڈاکٹر نے خشک لہجے میں اس کی بات کاٹ دی اور آگے بڑھ گیا۔

نوریز کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''بچہ کہاں گیا......؟'' وہ ڈاکٹر کو پھر پکارتا لیکن اس لمحے اسے وحشت زدہ رشیدہ اپنی طرف لپکتی نظر آئی۔ وہ ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا تھی۔ وہی اس مسئلے کو حل کرسکتی تھی۔

رشیدہ اس تک پہنچتے پہنچتے ہانپ گئی تھی۔

''جلدی کرو...... میرے ساتھ چلو......!'' اس نے نوریز کا ہاتھ تھام کر اسے تقریباً گھسیٹا۔

''بی بی صاحبہ کا آپریشن ہونا ہے۔ تمہیں کاغذ پر دستخط کرنے ہیں۔''

''میری بات تو سنو......!''

''جلدی کرو...... کہیں دیر نہ ہو جائے۔'' رشیدہ ہذیان انداز میں اسے کھینچ رہی تھی۔

''بی بی صاحبہ خطرے میں ہیں۔''

''تو کیا یہ بھی ہوگا......؟'' نوریز دہل گیا۔

''اے اللہ......! رحم فرما......!'' اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ اب وہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ

''بیگم صاحبہ کی طرح خدانخواستہ......؟''

وہ بچے کی طرح رشیدہ کے ساتھ چلنے لگا۔

رشیدہ کو اس کی کیفیت کا اندازہ ہوگیا۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں وہ گڑبڑ نہ کر دے۔ اس نے نوریز کو روک دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''یاد رکھنا کہ تم بی بی صاحبہ کے بھائی ہو۔ اس کے بغیر تم دستخط نہیں کر سکتے اور تم دستخط نہیں کرو گے تو وہ ان کا آپریشن نہیں کریں گے۔''

نوریز نے دھیرے سے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

لیکن اس کی آنکھوں کا خالی پن رشیدہ کو اب بھی پریشان کر رہا تھا۔

''میری بات سمجھ آئی ہے تمہیں......؟''

نوریز نے پھر سر ہلایا۔

''مجھے بتاؤ کہ کیا سمجھے ہو......؟''

''میں بی بی کا بھائی ہوں۔''

''ٹھیک ہے......! چلو......!''

رسمی کارروائی پوری ہوتے ہی نوریز نے رشیدہ سے کہا۔

''میرے ساتھ چلو......!''

''بی بی صاحبہ کو اس حال میں چھوڑ کر......''

''اپنی بیٹی کو یہاں چھوڑ دو...... بہت ضروری بات ہے۔''

''ایسے کیسے چھوڑ دوں بی بی صاحبہ کو......؟''

''میری بات سنو......! بیگم صاحبہ کا انتقال ہوگیا......''

رشیدہ سن ہو کر رہ گئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اسے اب تک بیگم صاحبہ کا خیال کیوں نہیں آیا......؟

وہ خاموشی سے نوریز کے ساتھ چل دی۔

وہ ہال میں آئے جہاں اِکا دُکا لوگ ہی موجود تھے۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

''اب کیا ہوگا......؟'' رشیدہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''پتا نہیں......! جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بیگم صاحبہ تو ماں بننے والی تھیں نا......؟''

رشیدہ خاموش رہی۔ صورتِ حال ایسی بدلی تھی کہ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں پاگل ہوں اور اس نے کہا کہ ایسا کچھ نہیں تھا۔''

اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تو ہر پردہ اٹھنا تھا۔

''ڈاکٹر نے ٹھیک کہا......!'' رشیدہ نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر جھوٹ کیوں......"

"میں تمہیں پھر بتاؤں گی......ابھی وقت نہیں ہے۔"

"چھوٹی بی بی تو ٹھیک ہو جائیں گی نا......؟"

"دُعا کرو اللہ سے......!"

"انہیں ہوا کیا ہے......؟"

رشیدہ نے گہری سانس لی۔ بات تو اب کھل ہی گئی تھی۔

"بچہ تو بی بی صاحبہ کے ہاں ہونا ہے......!"

نوریز کے لئے وہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ لیکن اس وقت دوسری الجھنیں بھی تھیں۔

"اب میں چلوں......؟" رشیدہ اٹھنے لگی۔

"ابھی بات کہاں ہوئی ہے......؟ میں بہت پریشان ہوں...... مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے......؟"

"تمہیں تو کچھ بھی نہیں کرنا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو......؟ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ابھی بیگم صاحبہ کی لاش مجھے دے دی جائے گی۔"

"تو کیا ہوا......؟"

نوریز نے اسے مسائل کے بارے میں بتایا۔ صاحب سے رابطہ کی کوئی صورت نہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں تدفین...... وہ کیا جواب دے گا صاحب کو......؟

رشیدہ چکرا گئی۔ واقعی......! یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اسپتال سے جا نہیں سکتیں۔ اکیلا نوریز کیا کرے گا اور واقعی...... اسے تو جواب دینا ہوگا صاحب کو۔

اسے نوریز پر ترس آنے لگا۔

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"صاحب کا فون نمبر تو بی بی صاحبہ سے ہی ملے گا اور وہ ابھی ہوش میں نہیں ہیں۔ تم یہاں بات کرو کہ لاش ہسپتال کے مردہ خانے میں رہے...... صاحب کے آنے تک۔"

بات نوریز کی سمجھ میں آ گئی۔

"اب میں چلتی ہوں...... بی بی صاحبہ کی طرف...... تم ان کے لئے دعا کرنا...... اور ہاں...... میں یہاں آ کر دیکھتی رہوں گی۔ کوئی بات ہو تو مجھے بتا دینا۔"

رشیدہ جانے لگی پھر کچھ سوچ کر پلٹی۔

"پیسوں کی فکر نہ کرنا۔ بیگم صاحبہ کا بیگ میرے پاس ہے۔"

❀❀❀

نہ جانے کیوں نوریز کو ممکن ہونے کے باوجود یہ معاملہ کچھ آسان نہیں لگ رہا تھا۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس سے کرے......؟ یہ احساس اسے تھا کہ ڈاکٹر اس کی سطح کا آدمی نہیں۔ کہیں کوئی مشکل کھڑی نہ ہو جائے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نوعیت کے کسی معاملے سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا اور وہ خود کو اس کے لحاظ سے بہت چھوٹا اور نااہل محسوس کر رہا تھا۔

بہرحال زبان کے معاملے میں اسے فوقیت حاصل تھی۔ وہ مقامی زبان بہت اچھی طرح بول سکتا تھا اور اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔

اس نے ایک وارڈ بوائے سے بات کی۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا، اسے دیکھتا رہا تھا۔ وارڈ بوائے بہت خوش اخلاق تھا۔ کئی بار وہ اسے دیکھ کر مسکرایا بھی تھا۔ لیکن نوریز اپنی پریشانی میں اس کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دے سکا تھا۔

وارڈ بوائے نے اس کی بات سنتے ہی کہا۔

"یہاں مردہ خانے میں صرف پولیس کیس رکھے جاتے ہیں سنگی......! ایسی کوشش کرو گے تو بات پولیس تک ضرور پہنچے گی۔ معاملہ الجھ جائے گا۔ تم پریشانی میں پڑ جاؤ گے۔"

"مگر میں کوئی مجرم تو نہیں ہوں۔ پھر بیگم صاحبہ کا انتقال تو آپریشن کے دوران ہوا ہے۔ وہ بیمار تھیں۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ پر پولیس کا تو اپنا انداز ہے۔ جب انہیں پتا چلے گا کہ مرنے والی کے لواحقین میں سے کوئی یہاں نہیں ہے تو مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ بہت لمبا چکر بھی بن سکتا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں......؟" نوریز نے بے بسی سے کہا۔

"میری مانو تو چپ چاپ دفنا دو اپنی بیگم صاحبہ کو۔"

"صاحب کو کیا جواب دوں گا......؟" نوریز کی آواز بھرا گئی۔

وارڈ بوائے چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"کوئی بڑا فوجی افسر کہے تو بات بن سکتی ہے۔"

نوریز کے ذہن میں کچھ کلبلایا۔ مگر پریشانی کی وجہ سے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ لیکن بالآخر اسے یاد آ گیا۔ ان کے بنگلے کی قطار میں تیسرے بنگلے میں بریگیڈیئر ظہیر رہتے تھے۔ اس کے ڈرائیور سے اس کی بڑی دوستی تھی۔

"ہاں......! یہ کام تو ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"مگر ابھی وہ لاش میرے حوالے کر دیں گے تو مجھے لے جانا ہوگا۔"

"بس...... تو تم ابھی یہاں سے نکل جاؤ...... میں کہہ دوں گا کہ تم اپنے صاحب سے بات کرنے کے لئے گئے ہو۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے لئے لاش مردہ خانے میں رکھ دیں گے۔ تم اتنی دیر میں بات کر لو۔"

"بہت شکریہ یارا......!"

"او......! کوئی بات نہیں سنگی......! میں تمہاری پریشانی سمجھتا ہوں۔ بس تمہارا کام ہو جائے۔"

نوریز تیزی سے اسپتال سے نکل آیا۔ صبح ہو گئی تھی۔ وہ باہر نکلا تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا مسجد میں ارشاد سے ملاقات ہو جائے گی۔

اسے نکلے ہوئے دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ نور بانو کی لاش باہر لائی گئی۔

نماز کے بعد وہ ارشاد سے ملا اور اسے اپنا مسئلہ بتایا۔

"میں تو اتنی لمبی بات نہیں کر سکتا۔" ارشاد نے کہا۔

"صاحب ابھی چھ بجے واک کے لئے نکلیں گے۔ تمہیں ان سے ملوا دوں گا۔ تم خود بات کر لینا۔"

نوریز کے لئے یہ بھی بہت تھا۔ اس کام کے لئے تو وہ کسی سے بھی بات کر سکتا تھا۔ وہ ارشاد کے ساتھ بریگیڈیئر صاحب کے بنگلے کی طرف چلا آیا۔

ٹھیک چھ بجے بریگیڈیئر صاحب باہر آئے تو ارشاد نے نوریز کو ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔

بریگیڈیئر صاحب کے لئے اس کی صورت اجنبی نہیں تھی۔ بارہا انہوں نے اسے ارشاد کے ساتھ دیکھا تھا۔

"ہاں بھئی......! کہو کیا بات ہے......؟" انہوں نے چھڑی لگاتے ہوئے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

نوریز ڈر رہا تھا۔ لیکن ان کی نرمی اور شفقت نے اس کا ڈر دور کر دیا۔

"سر جی......! یہ اس طرف تیسرا بنگلہ میرے صاحب کا ہے۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کبھی دیکھا نہیں تمہارے صاحب کو......؟"

"وہ یہاں کبھی آئے ہی نہیں......!"

"عجیب سی بات ہے...... کرتے کیا ہیں......؟"

"سرکاری افسر ہیں سر جی......!" نوریز کے لہجے میں فخر تھا۔

"پہلے لاہور میں تھے...... اب کراچی ہوتے ہیں۔"

"خیر......! مسئلہ کیا ہے......؟"

نوریز نے مسئلہ بیان کیا۔

"تم نے اپنے صاحب کو فون نہیں کیا......؟" بریگیڈیئر صاحب بولے۔

"ان کا فون نمبر نہیں ہے میرے پاس...... اور بڑی بیگم صاحبہ......" نوریز کی آواز رندھ گئی۔ اس سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔

بریگیڈیئر صاحب بڑے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"تو چھوٹی بیگم صاحبہ کے پاس تو ہوگا ان کا نمبر......؟"

نوریز کو حیرت ہوئی کہ انہیں چھوٹی بی بی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا......؟

"وہ تو خود اسپتال میں ہیں۔ آپریشن ہو رہا ہے ان کا...... وہ ہوش میں آئیں گی تو صاحب کا نمبر مل سکے گا۔"

"چھوٹی بیگم صاحبہ کو کیا ہوا ہے......؟"

''وہ ماں بننے والی ہیں سر جی......!''

''اوہ......!'' بریگیڈ ئیر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

''سر جی...... ! خدا کے لئے میری مدد کریں۔ میں خود تو بڑی بیگم صاحبہ کو دفنا نہیں سکتا۔ صاحب جی کو کیا جواب دوں گا میں......؟'' یہ کہتے کہتے نوریز کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''غلطی تو تمہارے صاحب کی ہی ہے۔ دونوں بیویوں کو یہاں چھوڑ کر خود بے فکری سے کراچی میں بیٹھے ہیں۔''

عبدالحق کی برائی سننا نوریز کو اچھا نہیں لگا۔ لیکن اپنی ضرورت تھی اور پھر بریگیڈ ئیر صاحب کی بات غلط نہیں تھی۔ وہ تو نوکر تھا۔ اس نے اب تک اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ مگر اب سمجھ میں آ رہا تھا۔

پھر بھی اس نے بات بنادی۔

''کراچی میں صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی ورنہ وہ اس وقت یہاں ہوتے سر جی......!''

''اوہ......! یہ تو ناگہانی ہے اللہ کی طرف سے۔'' بریگیڈ ئیر صاحب نے ہمدردانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ یہیں رکو......! میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔

''میں تو بہت ڈر رہا تھا تمہارے صاحب سے۔'' نوریز نے ارشاد سے کہا۔

''دیکھنے میں تو بہت سخت اور غصہ والے لگتے ہیں۔''

''اندر سے بہت نرم اور رحم دل ہیں۔''

''میرا کام بھی ہو جائے گا......؟'' نوریز کو اب بھی یقین نہیں تھا۔

''سمجھو کہ کام ہوگیا......!''

اتنی دیر میں بریگیڈ ئیر صاحب باہر آ گئے۔ انہوں نے ایک کارڈ نوریز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے فون کر دیا ہے سی ایم او کو۔ تم جا کر ان سے ملو۔ اقبال نام ہے ان کا۔ یہ کارڈ انہیں دے دینا۔ کام ہو جائے گا۔''

''بہت شکریہ سر جی......! آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔'' نوریز ان کے آگے جھک گیا۔

''ارے کچھ نہیں......آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔'' بریگیڈ ئیر صاحب نے کہا۔ پھر اس کی پیٹھ تھپکی۔

''مجھے وفادار لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ گیٹ کی طرف چل دیئے۔

❁❁❁

نوریز اسپتال چلا گیا۔ جس وارڈ بوائے سے اس کی بات ہوئی تھی وہ ڈیوٹی ختم کر کے جا چکا تھا۔ اس نے ایک اور وارڈ بوائے کو روک کر اس سے سی ایم او صاحب کے بارے میں پوچھا۔

''وہ ہے صاحب کا دفتر......!'' وارڈ بوائے نے اشارے سے بتایا۔ پھر بولا۔

''مگر وہ تو نو بجے آتے ہیں۔''

نو بجنے میں ابھی دیر تھی۔ نوریز کو ڈر تھا کہ اس وقت تک اگر یہاں کسی نے اسے پہچان لیا اور بیگم صاحبہ کی لاش اس کے حوالے کر دی تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ بریگیڈ ئیر صاحب کی سفارش بھی کام نہیں آئے گی۔

اس نے ارادہ کیا کہ وہاں سے کھسک لے۔ مگر اسی لمحے رشیدہ نے اسے پکارا۔ وہ اس کی طرف آنے لگی۔

اچانک ساتھ کھڑے ہوئے وارڈ بوائے نے حیرت بھری سرگوشی میں اس سے کہا۔

''کمال ہے......صاحب اور اتنی صبح کو......''

نوریز نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سوٹ پہنے ہوئے سی ایم او صاحب اس کے پاس سے گزرے اور اس کمرے کی طرف جانے لگے جو وارڈ بوائے نے بتایا تھا کہ سی ایم او کا کمرہ ہے۔

''خوش قسمتی ہے تمہاری...... ورنہ صاحب اتنے سویرے کبھی آتے نہیں۔''

وارڈ بوائے نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اتنی دیر میں رشیدہ اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن نوریز نے اسے روک دیا۔

''میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ سب سے بڑا مسئلہ حل کر لوں۔ بس اللہ نے مہربانی کر دی ہے۔''

رشیدہ نے تجسس سے اسے دیکھا۔ وہ کسی وضاحت کی اُمید کر رہی تھی اور خود بھی کچھ کہنے کے لئے بے تاب تھی۔

''تم انتظار کرو...... میں ابھی آتا ہوں۔'' نوریز نے کہا اور سی ایم او صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رشیدہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

نوریز نے دروازے پر دستک دی۔ اجازت ملنے پر وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اس نے بریگیڈیئر صاحب کا کارڈ سی ایم او صاحب کی طرف بڑھایا۔

''یہ سر......!''

سی ایم او نے کارڈ لیا اور میز پر رکھ دیا۔

''تمہاری ہی وجہ سے میں اتنے سویرے آیا ہوں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بریگیڈیئر صاحب کا حکم تو میں ٹال نہیں سکتا تھا۔ اچھا...... نام بتاؤ مجھے۔''

''نوریز...... سر......!''

''میں تمہارا نہیں...... مرحومہ کا نام پوچھ رہا ہوں۔''

نوریز کو نور بانو کا نام معلوم تھا۔ لیکن کبھی زبان پر نہیں لایا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے نام بتایا۔

سی ایم او نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔ رابطہ ملنے پر وہ بولے۔

''مردہ خانے میں ایک ڈیڈ باڈی ہے...... نور بانو نام......؟''

پھر وہ دوسری طرف کی بات سنتے رہے، جو خاصی تفصیلی تھی۔

''اسے یہیں رکھنا ہے...... مرحومہ کے شوہر کے آنے تک...... فی الوقت اس کا وارث یہ نوریز ہے۔ میں اسے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔'' انہوں نے ریسیور رکھا

اور نوریز کی طرف مڑے۔

''تم ریکارڈ روم میں جاؤ...... کمرہ نمبر 24...... وہاں ثقلین ہے۔ جا کر اس سے ملو اور بے فکر ہو جاؤ۔ تمہارا کام ہو گیا۔''

''شکریہ سر......!''

نوریز باہر نکلا اور پوچھتا پوچھتا ریکارڈ روم میں گیا۔ رشیدہ اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید رکنے کو کہا۔

ریکارڈ روم میں ثقلین اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

''آپ نوریز صاحب ہیں نا سر......؟''

زندگی میں پہلی بار کسی نے نوریز کو اس طرح مخاطب کیا تھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

''جی سر......!''

ثقلین نے ایک فارم اس کی طرف بڑھایا۔

''میں نے کارروائی مکمل کر دی ہے۔ نمبر 17 ہے۔ جب بھی باڈی لینی ہو، یہ فارم لے کر آجایئے گا۔''

''شکریہ سر......!'' نوریز نے کہا اور فارم لے کر جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اسے مدت کا پابند نہیں کیا گیا۔ ورنہ مسئلہ ہو جاتا۔

''کون جانے صاحب کب آئیں......؟''

باہر نکلتے ہوئے اتنی دیر کے بعد پہلی بار اسے چھوٹی بی بی کا خیال آیا۔

''اللہ کرے وہ خیریت سے ہوں۔'' اس کے دل سے دُعا نکلی۔

❀❀❀
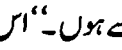
رشیدہ گائنی کے آپریشن روم کے باہر کھڑی تھی۔ وہ بی بی صاحبہ کے لئے سراپا دُعا تھی۔

دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آئی۔ اس کے انداز میں تھکن تھی۔ لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

''مبارک ہو......!'' اس نے کہا۔

''بیٹا ہوا ہے......!''

''اللہ کا شکر ہے......!'' اس نے دل کی گہرائی سے کہا۔

''بچہ ہر طرح سے صحت مند ہے۔ ذرا دیر بعد اس کے ماموں کو بلا لینا۔ بچے کے کان میں اذان دینے کے لئے۔''

''اور بی بی صاحبہ کیسی ہیں......؟'' رشیدہ نے پوچھا۔

''وہ ابھی خطرے سے باہر نہیں ہیں۔''

''لیکن...... آپ نے کہا تھا کہ آپ پہلے زچہ کی فکر کریں گی......؟'' رشیدہ کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

''وہی کیا ہے ہم نے...... اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو بچہ مر جاتا...... اور تمہاری بی بی صاحبہ کے لئے خطرہ اور بڑھ جاتا۔''

''وہ ٹھیک تو ہو جائیں گی نا......؟''

''ابھی وہ خطرے سے باہر تو نہیں ہیں لیکن اللہ سے امید ہے کہ وہ بچ جائیں گی۔ خون بہت ضائع ہوا ہے۔ ہمیں ان کو خون دینا ہوگا۔ تم کاؤنٹر پر جا کر پیسے جمع کرا دو۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر آگے بڑھ گئی۔

ارجمند کی پریشانی میں رشیدہ بچے کی خوشی بھی بھول گئی۔ وہ کاؤنٹر کی طرف گئی۔ اسی وقت اسے اذان کی آواز سنائی دی۔

''خوش نصیب بچہ ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ نوریز اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ اس وقت دوسری فکر میں لگا ہوگا۔

کاؤنٹر پر اس نے بی بی صاحبہ کا نام بتایا۔ کلرک نے کہا کہ تین ہزار روپے جمع کرانے ہیں۔ اس نے بیگم صاحبہ کا بیگ کھول کر نوٹ نکالے اور گنے۔ وہ 2200 روپے تھے۔ ایک لمحاتی فکر مندی کے بعد اسے اپنے پیسے یاد آئے۔ اس نے دوپٹے کا پلو کھول کر نوٹ نکالے اور تین ہزار کی رقم پوری کر کے کلرک کی طرف بڑھا دی۔

کلرک نے رسید اسے دی۔ وہ اس نے بیگم صاحبہ کے بیگ میں ڈال دی۔

اس پر وہ پریشان تھی۔ اس کے پاس صرف دو سو بیس روپے تھے۔ اس نے

نوریز سے کہا تھا کہ پیسوں کی طرف سے فکر نہ کرے۔ اب اگر وہاں ضرورت پڑی تو کیا ہوگا......؟

اس نے جا کر آبیہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''کب تک سوتی رہے گی......؟ صبح ہو گئی ہے...... اُٹھ جا......!''

آبیہ اٹھ گئی اور منہ دھونے کے لئے کمرے کے ساتھ والے غسل خانے میں چلی گئی۔

اسی وقت ارجمند کو کمرے میں لایا گیا اور اسٹریچر سے بیڈ پر منتقل کیا گیا۔ اس کے چہرے کی پیلاہٹ اور سانسوں کی ناہمواری دیکھ کر وہ اور پریشان ہو گئی۔

''اللہ......! بی بی صاحبہ کو زندگی دے۔'' وہ دل میں گڑگڑائی۔

ڈاکٹر کی نگرانی میں ارجمند کو آکسیجن اور خون کی بوتل لگائی گئی۔ ڈاکٹر نے جاتے ہوئے رشیدہ کے پریشان چہرے کو دیکھا تو اس کے پاس رک گئی۔

''گھبراؤ مت......! اللہ سے دعا کرو۔ ٹھیک ہو جائیں گی یہ......!'' پھر وہ باہر چلی گئی۔

ذرا دیر بعد نرس بچے کو لے کر آئی۔

''یہ لو......! تمہاری مالکن کا بیٹا......!''

رشیدہ نے بے ساختہ ہاتھ پھیلائے۔

''ایسے نہیں...... پہلے انعام تو دو ہم سب کو......!'' اس نے دوسری نرس اور صفائی کرنے والی عورت کی طرف اشارہ کیا۔

رشیدہ نے بے تامل دوپٹے کا پلو کھولا اور سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ تو تمہارا انعام......!''

''یہ سب......!'' نرس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں......! رکھ لو......!''

نرس نے تولیے میں لپٹا ہوا دُھلا دُھلایا بچہ اس کی طرف بڑھایا۔ رشیدہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

زچگی کراتے ہوئے اس کی عمر گزری تھی۔ مگر اتنا خوب صورت بچہ اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ گلابی رنگت، ترشا ہوا ناک نقشہ، بڑی بڑی آنکھیں اور کشادہ اور روشن پیشانی۔ وہ تو ہو بہو بی بی صاحبہ جیسا تھا۔

''اچھا ہوا بیگم صاحبہ چلی گئیں۔ جس جھوٹ کے لئے انہوں نے اتنا بڑا جال بچھایا تھا، وہ تو اس بچے کی پہلی جھلک دیکھ کر ہی کھل جاتا...... لیکن نہیں......! وہ اس کے لئے بھی کوئی ترکیب کرلیتیں۔ وہ اس میں بھی اپنی بڑائی اور بھلائی کا کوئی پہلو نکال لیتیں۔''

''مرنے والوں کے بارے میں ایسے نہیں سوچتے۔'' اس کے اندر سے کسی نے اسے ٹوکا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

اس نے بچے کی پیشانی چومی اور بڑی نرمی سے اسے بیڈ کے برابر رکھے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ بچے کے لئے شہد اور گھٹی کی ذمہ داری بھی اسے پوری کرنی ہوگی۔ اس نے سوچا مگر پہلے تو اذان کی فکر ہے۔

وہ پھر لابی میں گئی۔ مگر نوریز اب بھی وہاں نہیں تھا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ کسی سے بھی کہہ دے بچے کے کان میں اذان دینے کے لئے۔ مگر فوراً ہی اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اس بچے کے کان میں کسی ایرے غیرے سے تو اذان نہیں دلوائی جاسکتی۔

وہ وہیں بیٹھ گئی اور ان واقعات کے بارے میں سوچنے لگی۔

''کیسی عجیب بات ہے......؟ کتنے پیسے والے لوگ ہیں یہ۔ بھرا پرا خاندان ہے مگر یہاں پردیس میں ہیں اور اس حال میں کہ کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔ بیگم صاحبہ اللہ کو پیاری ہوگئیں اور کوئی انہیں رونے والا بھی نہیں...... اور یہ کیسی موت ہے کہ جس آرزو کے لئے انہوں نے اتنے بڑے جھوٹ گھڑے......؟ وہ آرزو بھی پوری نہیں ہوئی۔''

وہ تھرا کر رہ گئی۔

''یہ ہے جھوٹ کا انجام......! اور یہ تو دنیا ہے...... اللہ کے ہاں کی اللہ جانے......!''

''مگر اس میں بی بی صاحبہ کا کیا دوش تھا کہ وہ یہاں اس حال میں، بے یار و مددگار پڑی ہیں......؟ ایسے میں تو ان کے شوہر کو ان کی محبت کرنے والی ساس کو اور تمام لوگوں کو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ ان کے ذمہ داری کے کاغذ پر ان کے شوہر کو دستخط کرنے چاہئیں تھے۔ مگر وہ دستخط ان کے نوکر نے ان کا بھائی بن کر کئے۔ کیسا اندھیر ہے......؟ جرم کس کا اور سزا کس کو......؟''

اس کا دل کٹنے لگا۔

''اور یہ ننھا بچہ......! کتنے لوگ اس کے لئے دُعائیں کرتے ہوں گے۔ اس کا انتظار کرتے ہوں گے اور یہ آیا ہے تو اس کے کان میں اذان دینے والا کوئی نہیں۔ اس کے باپ کو کیسا ارمان ہوگا اس کے کان میں اذان دینے کا...... اس کی دادی نے سوچا ہوگا کہ وہ اسے گھٹی دے گی...... اسے شہد چٹائے گی۔ لیکن وہ سب بے خبر ہیں کہ یہ دنیا میں آچکا ہے۔ اس کے سارے کام نوکروں کو کرنے ہیں۔''

''جو اللہ کی مرضی......!'' اس نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا اور بڑی اداسی سے بڑبڑائی۔

پھر اسے خیال آیا۔ وہ تو سراسر نقصان میں تھی۔ اس کا تو یہ سارا وقت ہی بے کار رہا۔ بیگم صاحبہ مرگئیں تو سب کچھ ختم...... جس کا راز تھا، وہ نہیں رہا...... اور راز بھی راز نہیں رہا تو راز داری کا انعام کیسا......؟ اور بی بی صاحبہ نے تو بہت پہلے اسے بتا دیا تھا کہ اس کا جو معاملہ بھی بیگم صاحبہ کے ساتھ ہے، اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتیں اور سچ بولنے سے ڈرتی بھی نہیں۔ پھر اب تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

''ہاں......! بچے کی...... اور پہلے بچے کی خوشی بہت بڑی ہوتی ہے۔ اس کا تو انعام ہوتا ہے۔ لیکن موت کے گھر میں خوشی کتنی ہی بڑی ہو...... انعام کا خیال تو کسی کو نہیں آتا......؟''

''کوئی امکان نہیں......!''

پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو اپنی جمع پونجی بھی لٹا چکی ہے۔ وہ تو دونوں ہاتھ خالی لئے رہی اس گھر سے نکلے گی۔ اس کی خدمت کو تو کوئی سراہے بھی نہیں...... اور اگر وہ

کہے گی بھی کہ اس نے اپنے پیسے بھی خرچ کر دیئے ہیں تو کون یقین کرے گا اس پر.....؟ بے شک پیسے تو شاید وہ اسے دے دیں..... لیکن یہی سمجھیں گے کہ پیسے گھسیٹنے کے لئے اس نے جھوٹ بولا ہے۔

''نہیں.....!'' اس نے فیصلہ کیا۔

''میں یہ بات کسی سے کہوں گی ہی نہیں.....!'' اس پر اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ پیسے کے معاملے میں وہ عزت اور ذلت کی پرواہ بھی نہیں کرتی تھی۔ پیسہ تو اس کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے وہ خود کو اور اپنے بچوں کو بیچنے کے سوا کچھ بھی کر سکتی تھی اور یہ تو اس کا اپنا پیسہ تھا۔ جائز اور حق حلال کا۔ پھر یہ بے پرواہی..... یہ تبدیلی کیسی.....؟

ایک لمحے کو اس کا وجود نقصان کے احساس سے بھر گیا۔

''اتنا وقت بے کار ہوا۔ ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔ اپنی زمین چھڑوانے کا خواب بھی دھرا رہ گیا۔'' لیکن بس وہ ایک لمحے کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کا سارا ملال ڈھل گیا۔ اندر سکون سا بھر گیا۔

''کوئی بات نہیں.....! میں تو بس اللہ سے مانگوں گی۔ وہی تو ہے جو سب کچھ دے سکتا ہے۔''

وہ بے فکر، بے غم ہوگئی۔ مگر اسے حیرت ہوئی۔ اتنے تھوڑے سے عرصے میں وہ اتنا بدل گئی ہے..... کیسے.....؟ جواب سامنے ہی تھا۔ وہ بی بی صاحبہ سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ ان کی باتوں سے اس نے بہت کچھ سیکھا ہے۔

ایک وارڈ بوائے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ نوریز اب بھی نظر نہیں آیا۔ وہ بی بی صاحبہ کے کمرے کی طرف لپکی۔

بی بی صاحبہ کے چہرے کی پیلاہٹ کم ہوئی تھی۔ اسے کچھ اطمینان سا ہوا۔

پھر بی بی صاحبہ کی پلکیں لرزیں۔ آنکھیں تھوڑی سی کھلیں اور ہونٹ لرزے۔ آواز بہت کمزور تھی۔ اس نے کان قریب لے جا کر سنا۔

وہ آپی..... آپی پکار رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں خالی پن تھا۔

پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ بیگم صاحبہ کے لئے نہیں، بی بی صاحبہ

کے لئے۔ اس حال میں بھی انہیں بیگم صاحب کا خیال تھا۔

''بہت ٹھیک ہے بی بی صاحبہ.....! آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے.....!'' اس نے دلاسہ دینے والے انداز میں کہا۔

لیکن بی بی صاحبہ کی آنکھیں مند گئیں۔ انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ وہ ہوش میں ہی نہیں تھیں

وہ بچے کی طرف گئی۔ اس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ اور وہ اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

''کیسا صابر بچہ ہے۔'' اس نے تڑپ کر سوچا۔

''اللہ.....! میں اس کو افطار کیسے کراؤں.....؟''

آپیہ اب جاگی ہوئی تھی۔ وہ اسے وہیں رہنے کا کہہ کر پھر باہر نکل آئی۔

اس بار نوریز اسے نظر آ گیا۔ وہ ایک وارڈ بوائے کے ساتھ کھڑا تھا۔

''نوریز.....! نوریز.....!'' رشیدہ نے اسے پکارا۔

❀❀❀

''ہاں.....! اب کہو.....! کیا بات ہے.....؟'' نوریز نے رشیدہ سے کہا۔

''خوش خبری ہے.....!'' رشیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بی بی صاحبہ کو بیٹا ہوا ہے.....!''

''اللہ کا شکر ہے.....!'' نوریز نے کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔

''چھوٹی بی بی تو خیریت سے ہیں نا.....؟''

''ہاں.....! مگر ابھی ہوش میں نہیں ہیں۔''

''وہ ٹھیک تو ہو جائیں گی نا.....؟''

''اللہ سے دعا کرو.....! ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔''

نوریز پریشان نظر آنے لگا۔

''اچھا.....! اب میرے ساتھ چلو.....!''

''کہاں.....؟''

''کمرے میں بی بی صاحبہ کے.....''

''عورتوں کے وارڈ میں میں.....؟'' نوریز گڑبڑا گیا۔

''نہیں......! ہمارا الگ کمرہ ہے۔ وہاں کسی کو نہیں روکا جاتا۔''

''پر میں کیوں......میرا وہاں کیا کام......؟''

''بچے کے کان میں اذان دینی ہے۔ تا کہ میں اسے افطار کراؤں۔''

''میں اذان دوں گا......؟''

رشیدہ نے تشویش سے اسے دیکھا۔

''تمہیں اذان دینی نہیں آتی......؟''

''اے دماغ ٹھیک ہے تمہارا......؟'' نوریز برہم ہو گیا۔

''اپنے گاؤں کی مسجد میں میں ہی اذان دیتا تھا۔''

''تو پھر پریشان کیوں ہوئے تھے......؟''

''میں......اور صاحب کے بچے کے کان میں اذان......؟''

''یہاں اور کون ہے......؟'' رشیدہ نے کہا اور پھر مسکرائی۔

''اور تم تو اس کے ماما جی ہو۔''

نوریز نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم نے بی بی صاحبہ کا بھائی بن کر ذمہ داری کے کاغذ پر دستخط کئے تھے نا......؟ تو تم اس کے ماما نہیں ہو......؟''

نوریز کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں تک محدود رہی۔ وہ رشیدہ کے ساتھ چل دیا۔

❀❀❀

عبدالحق مطمئن تھا کہ اس نے درست فیصلہ کیا ہے۔ حج پر جانے والوں کے نام بھجوا دیئے گئے تھے۔ لیکن وہ ایبٹ آباد کی طرف سے فکرمند تھا۔ فون پر نور بانو کی آواز اور اس کا لہجہ نارمل نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اذیت میں ہے اور اسے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور اس نے ارجمند سے بھی اس کی بات نہیں کرائی تھی۔

اس نے کہا تھا کہ ارجمند کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ سو رہی ہے۔

عبدالحق کے لئے وہ فون کال خلش بن گئی۔ وہ جتنا غور کرتا، اس کی پریشانی

بڑھ جاتی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس وقت ارجمند سو رہی ہوگی۔ وہ ایسا وقت نہیں تھا لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ نور بانو کی فطرت سمجھتا تھا۔ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ ارجمند سے اس کی بات نہ ہو اور بات ہوتی بھی تو بہت مختصر۔ اس ایک دن کے سوا جب نور بانو چیک اپ کے لئے اسپتال گئی ہوئی تھی۔ اس دن اس کی ارجمند سے تفصیلی بات ہوئی تھی۔

لہٰذا پریشانی اسے ارجمند کی طرف سے نہیں، نور بانو کی طرف سے تھی۔ بلکہ ایک خیال اسے یہ بھی آیا کہ نور بانو کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہی ہوگی۔ آواز، لہجہ اس کی گواہی دے رہا تھا اور ارجمند سے اس نے اس لئے بات نہیں کرائی ہوگی کہ کہیں وہ اس کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں نہ بتا دے۔ اسے ڈر ہوگا کہ یہ سن کر وہ اس کی منت بھول کر ایبٹ آباد دوڑا آئے گا۔

اس خیال نے اسے اور پریشان کر دیا۔

''اس کا تو مطلب ہے کہ طبیعت زیادہ ہی خراب ہوگی۔''

''یہ منت والی حماقت......؟'' وہ جھنجلا گیا۔

''کیا تک تھی بھلا اس کی......؟'' خواہ مخواہ اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ اب وہ یہاں بیٹھ کر پریشان ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

دفتر سے وہ دیر سے آیا۔ کام زیادہ تھا۔ گھر آ کر اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اس نے ایبٹ آباد کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی لیکن فون ریسیو نہیں کیا گیا۔

وہ بار بار کوشش کرتا رہا۔ لیکن فون ریسیو نہیں ہو سکا۔

اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

ایسے میں اس کے لئے سکون کی ایک ہی صورت تھی۔ عشاء کی نماز وہ پڑھ چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا اور قضائے حاجات کے لئے دو نفل پڑھ کر اللہ سے نور بانو اور ارجمند کے لئے عافیت کی دعا کی۔ پھر وہ قرآن پاک پڑھنے بیٹھ گیا۔

بارہ بجے کے قریب وہ سونے کے لئے لیٹا تو پریشانی بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ بلکہ دل میں ایک خوش امیدی جاگ گئی تھی۔

''کون جانے یہ سب خوش خبری کا پیش خیمہ ہو......؟ نور بانو اسپتال میں ہو اور ارجمند اس کے ساتھ...... ایسے میں فون کون ریسیو کرے گا...... کوئی گھر میں ہوگا ہی نہیں......!''

نیند تو اسے فوراً آ گئی۔ لیکن وہ کوئی اچھی، اور پرسکون نیند نہیں تھی۔

اگلے روز ہفتہ تھا۔ دن بھر وہ آفس میں سوچتا اور الجھتا رہا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ گھر جا کر پھر ایبٹ آباد فون کرے گا۔ اور اگر اس بار فون ریسیو نہیں ہوا تو منت کی پابندی بھول بھال کر ایبٹ آباد نکل جائے گا۔

اس نے ایئر لائن کے دفتر فون کیا۔ رات کی فلائٹ میں تو جگہ نہیں ملی البتہ صبح دس بجے کی فلائٹ میں اس نے سیٹ ریزرو کرالی۔ سوچا کہ ضرورت نہ ہوئی تو رات کو ہی سیٹ کینسل کرا دے گا۔

الجھن اور پریشانی کی وجہ سے وہ کام پوری طرح نہیں نمٹا سکا تھا اور کام اُدھورا چھوڑ کر گھر جانے کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس لئے دفتر میں زیادہ دیر تک رکنا پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے عشاء کی نماز پڑھی اور اللہ سے بہت دُعا کی۔ کھانا اس سے ٹھیک طرح سے کھایا نہیں گیا۔ دل پریشان تھا۔ یہ خیال رہ رہ کر ستا رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ خاصی دیر تک تو وہ فون کے قریب جانے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔

لیکن بالآخر اس نے ریسیور اٹھایا اور ایبٹ آباد کا نمبر ملایا۔ پچھلی رات کی طرح رات کی طرح گھنٹی بجتی رہی۔ لیکن فون ریسیو نہیں کیا گیا۔ عین اس لمحے جب وہ مایوس ہو کر فون رکھنے والا تھا کہ کال ریسیو کر لی گئی۔

چند لمحوں کے لئے تو اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے کچھ سنائی ہی نہیں دیا۔ کچھ وہ آواز بھی بہت کمزور اور نقاہت زدہ سی تھی۔

اور وہ ارجمند کی آواز تھی۔

❀❀❀

شام کو ارجمند کو ہوش آ گیا۔ اس نے دیکھا، سامنے رشیدہ بیٹھی تھی۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے......؟'' اس نے بے حد کمزور آواز میں پوچھا۔

رشیدہ اس کے قریب چلی گئی۔

''آپ ابھی بہت کمزور ہیں بی بی صاحبہ......! بولیں نہیں......!''

''میں کہاں ہوں......؟''

''اسپتال میں......!''

''مگر...... میں تو گھر میں...... آپی کی چیخ......'' ارجمند سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی سانس بے ترتیب ہو گئی۔

''میں سب بتا دوں گی آپ کو...... آپ بولیں نہیں......!'' رشیدہ نے کہا۔

ارجمند نے آہستہ سے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

''بیگم صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ آپ نے ان کی چیخ سن کر ان کے کمرے میں آنے کی کوشش کی لیکن راستے میں ہی گر گئیں۔ خون جاری ہو گیا۔ آپ کی حالت بہت خراب تھی۔ ہم آپ کو اسپتال لے آئے۔''

''اور آپی......؟''

رشیدہ نے فیصلہ کیا کہ ابھی اسے سب کچھ بتانا مناسب نہیں۔ اس نے کہا۔

''وہ بھی اسی اسپتال میں ہیں۔ ان کا آپریشن ہوا ہے۔''

''خیریت......؟''

''جی بی بی صاحبہ......! سب ٹھیک ہے......!''

''اور...... بچہ......؟''

''آپ کو مبارک ہو...... بیٹا ہوا ہے......!'' رشیدہ نے کہا۔ لیکن یہ کہتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ بی بی صاحبہ کی تو سوال کرتے کرتے ہی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ اس کا جواب نہیں سن سکی تھیں۔

اس نے اطمینان کی سانس لی۔ یہ ہوش میں آنا اچھی علامت تھی۔ اب وہ خطرے سے باہر تھیں۔

رات کو آپریشن کرنے والی ڈاکٹر آئی تو اس نے اس بات کی تصدیق کر دی۔

''مبارک ہو......!'' اس نے رشیدہ سے کہا۔

''اب یہ خطرے سے نکل آئی ہیں۔ کمزوری بہت ہے، وہ کھانے پینے سے

ڈور ہو جائے گی۔''

اتنی دیر میں ارجمند نے آنکھیں کھول دیں۔

''بیٹا مبارک ہو مسز عبدالحق......!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارجمند کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔

ڈاکٹر نے نرس سے کہا کہ وہ ارجمند کے لئے کچھ لائے۔ نرس کو معلوم تھا کہ کیا لانا ہے......؟ وہ ایک بڑے اور گہرے پیالے میں یخنی لے کر آئی۔ پھر اس نے ارجمند کے بیڈ کا سرہانہ اونچا کیا۔

''میں اٹھ کر بیٹھ......'' ارجمند نے کسمساتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں......! آپ کا بہت بڑا آپریشن ہوا ہے۔ اللہ نے آپ کو دوسری زندگی دی ہے۔ تین دن تک تو آپ خود سے بیٹھنے کی کوشش بھی نہ کیجئے گا۔ سن ہونے کی وجہ سے آپ کو احساس نہیں ہے۔''

ارجمند نے رشیدہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

رشیدہ نے اس کی بات سمجھ لی۔

''ڈاکٹر صاحبہ......! انہیں چھٹی کب ملے گی......؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''کم از کم تین دن انہیں یہاں اور رہنا چاہئے......!''

''لیکن ان کا گھر جانا ضروری ہے۔''

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک لمحے کو تکدر سا جھلکا۔ لیکن پھر وہ مسکرا دی۔

''اگر گھر پر ان کا خیال رکھا جا سکے تو کل میں انہیں ڈس چارج کر دوں گی۔''

''ہم آپ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کریں گے۔'' رشیدہ نے کہا۔

ڈاکٹر نے اسے تفصیلی ہدایات دیں۔ پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔

''آپ بھی ان سب باتوں کا خیال رکھئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

یخنی پی کر ارجمند میں کچھ جان آئی۔ نرس کے جانے کے بعد اس نے رشیدہ سے کہا۔

''بچہ آپی کے پاس ہے نا......؟''

''جی نہیں......! یہیں ہے......!'' رشیدہ نے پنگھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

ارجمند نے پنگھوڑے کی طرف دیکھا۔ پھر بولی۔

''اسے تو آپی کے پاس ہونا چاہئے تھا......؟''

''اسپتال میں یہ کیسے ہو سکتا ہے بی بی صاحبہ......!''

''اچھا...... ! مجھے دکھاؤ تو ذرا......!''

بچہ جاگ رہا تھا۔ رشیدہ نے پنگھوڑے سے نکال کر اسے ارجمند کے پہلو میں لٹا دیا۔

ارجمند نے بڑی محبت سے بچے کو دیکھا اور لرزتے ہاتھ سے اسے چھوا۔

''دنیا میں آمد مبارک بیٹے نورالحق......!'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''اللہ کا شکر......! کہ اس نے تمہیں زندگی دی......!''

بچہ ٹھہری ہوئی آنکھوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا جیسے غور سے اس کی بات سن رہا ہو۔

''تمہیں میری باتیں یاد ہیں نا بیٹے......! کبھی بھولنا نہیں انہیں......اللہ سے، اس کے رسولؐ سے، اور پھر اپنے بابا سے......سب سے بڑھ کر محبت کرنا۔ میری کہی ہوئی ہر بات یاد رکھنا۔ ویسے میں تمہیں یاد بھی دلاتی رہوں گی۔''

قریب ہونے کی وجہ سے رشیدہ نے بھی وہ سرگوشی سن لی۔ اسے لگا کہ بی بی صاحبہ کو کچھ ہو گیا ہے۔

''اس بچے سے پہلے کب باتیں کی ہوں گی انہوں نے......؟ اور وہ ننھا بچہ کیا سمجھے گا ان کی باتیں......؟''

ارجمند کچھ دیر تک بچے سے یونہی باتیں کرتی رہی۔ رشیدہ کچھ دور ہٹ گئی تھی۔ پھر ارجمند جیسے تھک کر سو گئی۔

رشیدہ کی اپنی آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کب سے نہیں سوئی ہے۔ کمرے میں ایک اور بیڈ بھی تھا۔ وہ اسی پر لیٹ گئی۔

''بی بی صاحبہ کا خیال رکھنا...... جاگتی رہنا۔'' اس نے آسیہ سے کہا۔

''اور نیند آنے لگے تو مجھے جگا دینا۔''

پھر وہ بھی بے سدھ ہو کر سو گئی۔

❁❁❁

صبح اٹھتے ہی رشیدہ نے آبیہ کو گھر بھیج دیا۔ تا کہ وہ گھر کی صفائی کر لے۔ کب سے گھر بند پڑا ہے۔ اب پہلی بار اسے یاد آیا کہ گھر تو کھلا پڑا ہوگا۔ آبیہ نے بتایا تھا کہ انہیں تالا ہی نہیں ملا تھا۔

اسے نوریز کا خیال آیا۔

''پتا نہیں...... وہ بھی سویا ہوگا یا نہیں......؟'' اس نے نوریز سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ رات وہ بھی ایک بینچ پر لیٹ کر سو گیا تھا۔

''تم آبیہ کو گھر لے جاؤ......! کچھ دیر بعد ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ بی بی صاحبہ پہنچیں تو گھر صاف ستھرا ہو۔''

''مگر بی بی صاحبہ کو گھر لے جانا......''

''اس وقت وہ تمہاری گاڑی میں نہیں جا سکتیں۔ اسپتال کی گاڑی میں آئیں گی۔''

''اچھا......!'' بات نوریز کی سمجھ میں آ گئی۔ پہلی بار یہ عورت اسے اچھی لگ رہی تھی۔ ہر طرح سے اس نے بی بی صاحبہ کا خیال رکھا تھا...... دل سے، اور اس کا حوصلہ بھی بڑھاتی رہی تھی۔ اس نے سوچا۔

''یہ اتنی بری بھی نہیں ہے جتنا میں سمجھ رہا تھا......؟''

نوریز آبیہ کو لے کر گھر چلا گیا۔

ارجمند سو کر اٹھی تو اسے ناشتہ کرایا گیا۔ پھر ڈاکٹر آئی۔ اس نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ بچے کو دیکھا۔ اس کی طرف سے وہ مطمئن تھی۔

''میں یہی کہوں گی کہ یہ تین دن اور یہاں رہتیں تو بہتر ہوتا۔'' اس نے کہا۔

''بہر حال...... میری باتوں پر عمل کرنا۔''

ڈس چارج کرنے کی تحریری اجازت کے بعد ڈاکٹر رخصت ہو گئی۔ ارجمند کے لئے اسٹریچر لایا گیا۔ رشیدہ کاؤنٹر پر گئی۔ وہاں بل کی رقم ادا کرنے کے بعد اسے 560 روپے واپس کر دیئے گئے۔

ایمبولینس میں رشیدہ بچے کو گود میں لئے ارجمند کے ساتھ ہی بیٹھی۔ اسٹریچر کے ذریعے ہی اسے گھر میں لے جایا گیا اور بیڈ پر منتقل کر دیا گیا۔

ارجمند نے سکون کی سانس لی۔ اسپتال والی بے سکونی دور ہو گئی تھی۔

رشیدہ نے نوریز کو ارجمند کے لئے اور بچے کے لئے ضروری چیزیں لانے بھیج دیا۔ پیسے اس کے پاس کافی تھے۔ اب اس طرف سے وہ بالکل فکر مند نہیں تھی۔

پھر وہ ارجمند کے پاس آئی۔

''اب کیسی ہیں آپ بی بی صاحبہ......!''

''بہتر ہوں......! بس کمزوری بہت ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

''ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ پندرہ دن میں بہتر ہو جاؤں گی میں...... اتنے سارے دن...... ؟ مجھے تو سوچ کر گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

رشیدہ مسکرائی۔

''اس کی فکر نہ کریں۔ کمزوری تو آپ کی اللہ نے چاہا...... تین دن میں دور ہو جائے گی۔''

''کیسے......؟''

''وہ ڈاکٹر کیا جانے کہ کیا کھلانا پلانا ہے......؟ میں جانتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔

''سب ضروری چیزیں منگوا لی ہیں میں نے...... ایسی ایسی چیزیں بناؤں گی آپ کے لئے کہ کمزوری ڈر کر بھاگ جائے گی۔''

ارجمند نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''بہت شکریہ......! تم نے بہت خیال رکھا ہے میرا......!'' پھر اسے کچھ خیال آیا۔

''سودا کیسے منگوایا تم نے......؟ پیسے ہیں تمہارے پاس......؟''

''جی...... بیگم صاحبہ نے دیئے تھے۔''

ارجمند نے سوچا۔ اس کے باوجود رقم تو ہونی چاہئے۔ اس نے رشیدہ سے چیک بک نکلوائی اور ایک ہزار روپے کا چیک لکھ کر رشیدہ کو دیا۔

''نوریز آئے تو اسے بینک بھیج دینا پیسے نکلوانے کے لئے......!''
رشیدہ چلی گئی۔ ارجمند کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔
پھر رشیدہ کی آمد نے ہی اسے چونکایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔
''یہ کھانا ہے آپ کو......!'' رشیدہ کے ہاتھ میں ایک قاب تھی جس میں چمچہ بھی تھا۔ وہ اس نے میز پر رکھی، پھر ارجمند کے گرد تکیے لگائے اور سہارا دے کر اسے بٹھایا۔
''دل نہیں چاہ رہا ہے کچھ کھانے کو۔'' ارجمند نے کہا۔
''یہ ضروری ہے آپ کے لئے......!'' رشیدہ نے کہا اور چمچے سے اسے کھلانے لگی۔
وہ جو کچھ بھی تھا، بہت لذیذ تھا۔ ارجمند نے رغبت سے کھایا اور اچھی طرح کھایا اور اسے اپنے اندر طاقت کا احساس ہونے لگا۔
''یہ ہے کیا......؟'' اس نے پوچھا۔
''بہت خاص چیز ہے......!'' رشیدہ نے جاتے ہوئے کہا۔
ایک گھنٹے بعد رشیدہ نے اسے شربت کا ایک گلاس دیا۔
''یہ اندر سے سارا درد کھینچ لے گا۔''
شربت خاصا بدمزہ تھا۔ لیکن اب ارجمند رشیدہ کے تجربے اور سمجھ بوجھ کی قائل ہوگئی تھی۔ اس نے شربت پی لیا۔
نوریز بینک سے پیسے لے آیا تھا۔ وہ رشیدہ نے ارجمند کے تکیے کے نیچے رکھ دیئے۔
اور واقعی...... دوپہر تک رشیدہ کی تواضع نے ارجمند کو ایسی توانائی دی کہ اسے حیرت ہونے لگی۔ اس سے پہلے اسے اپنا دماغ سن محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب جیسے وہ روشن ہوگیا۔
اسے احساس ہوا کہ اسے رشیدہ سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔
''یہاں میرے پاس بیٹھو......!'' اس نے رشیدہ سے کہا۔
رشیدہ بیڈ کے پاس نیچے ہی بیٹھ گئی۔

''کرسی لے کر میرے سامنے بیٹھو......!''
رشیدہ نے تعمیل کی۔
''آپی کو اب تک میں نے نہیں دیکھا۔ وہ کہاں ہیں......؟'' ارجمند نے اس سے پوچھا۔
''اسپتال میں ہیں جی......!''
ارجمند کو نوربانو کی وہ لرزہ خیز چیخ یاد آئی جو اس رات اس نے سنی تھی۔ جسے سن کر وہ ان کے لئے پریشانی ہو کر اپنے کمرے سے نکلی تھی اور راستے میں ہی گر گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی آنکھ اسپتال میں ہی کھلی تھی۔
''اب کیسی ہیں وہ......؟''
''آپ دُعا کریں ان کے لئے......!''
ارجمند نے آنکھیں بند کر لیں۔ رشیدہ غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر بند آنکھوں کے پیچھے سے آنسو نکلتے چلے آئے۔
رشیدہ کو حیرانی ہوئی۔
چند لمحے بعد ارجمند نے آنکھیں کھولیں۔
''آپی نے تم سے کتنے انعام کا وعدہ کیا تھا......؟'' اس نے پوچھا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔
رشیدہ کو خوف آنے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ ارجمند نے سب کچھ جان لیا ہے۔
''خدا کے لئے بی بی صاحبہ......!'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔
''آپ اپنی طبیعت اور خراب نہ کریں۔''
''مجھے کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ......!'' اس بار ارجمند کے لہجے میں پڑاؤ تھا۔
''میں نے تم سے جو پوچھا ہے...... وہ بتاؤ......!''
''اس کا آپ سے کیا تعلق......؟ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں......؟''
''میں کہہ رہی ہوں...... مجھے بتاؤ......!'' ارجمند نے سخت لہجے میں کہا۔
''کیوں بی بی صاحبہ......! انعام تو میں بیگم صاحبہ سے ہی لوں گی۔ آپ نے ایک بار مجھے ڈانٹا تھا نا...... کہ میرے اور بیگم صاحبہ کے معاملے سے آپ کا کوئی تعلق

نہیں ....آپ کے لئے میں بس نوکرانی ہوں......تو بس آپ مجھے اپنی خدمت کرنے دیں۔''

''اس وقت کی بات اور تھی۔ میں نے ضرورت کے تحت تم سے سختی سے بات کی تھی۔ تم مجھے بتاؤ......! آپی نے تم سے کیا وعدہ کیا تھا......؟''

''خدا کے لئے......! آپ نہ پوچھیں بی بی صاحبہ......! وہ تو میری اور بیگم صاحبہ کی بات تھی۔''

''تو کیا میں ان پر بوجھ رہنے دوں......؟'' ارجمند کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

''میں بہن ہوں ان کی...... بہنوں سے بڑھ کر مجھے چاہا ہے انہوں نے......''

رشیدہ نے غور سے اسے دیکھا۔

''تو کیا آپ سمجھ گئیں......؟''

ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تبھی تو کہہ رہی ہوں کہ اب ان کا معاملہ میرا معاملہ ہے۔''

رشیدہ نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

''میں آپ کو نہیں بتا رہی تھی کہ آپ کو نقصان نہ ہو...... بی بی صاحبہ......! آپ......''

''مگر میں نے جان لیا نا......اور تم فکر نہ کرو...... مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکانا آتا ہے۔ اب تم بتاؤ مجھے......!''

رشیدہ نے ایک گہری سانس لی۔

''وہ بات تو اب ختم ہو گئی بی بی صاحبہ......!''

''کیسے ختم ہو گئی......؟''

''انعام کیا جی......! وہ تو راز چھپانے کی قیمت تھی بی بی صاحبہ......!''

''تو اب کیا ہو گیا......؟'' ارجمند نے سخت لہجے میں کہا۔

''اب راز ہی نہیں ...... تو قیمت کیسی......؟ آپ کا بچہ اب آپ کا بچہ ہے......بیگم صاحبہ رہی نہیں......اور سب کو معلوم ہے کہ یہ آپ کا بچہ ہے۔''

''کون سب......؟''

''پورا اسپتال......اور نوریز بھی......''

ارجمند کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھی۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ بچہ تو میری آپی ہی کا ہے۔ اللہ نے اسے میری کوکھ میں ڈال دیا۔ اس کا کرم......راز تو اب بھی رکھنا ہے۔ قیمت تمہیں پہلے سے زیادہ ہی ملے گی۔''

رشیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں بی بی صاحبہ......!''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اپنی آپی کو ان کی موت کے بعد رسوا کروں گی......؟ انہیں سب کی نظروں میں گراؤں گی......؟ نہیں رشیدہ......! تم اب بھی آپی کی پابند ہو......اور تمہیں انعام بھی ملے گا۔''

رشیدہ تڑپ گئی۔

''نہیں بی بی صاحبہ......! آپ کو اللہ نے آزاد کر دیا۔ اب آپ اپنے ساتھ ظلم نہ کریں......اور یہ تو بچے کے ساتھ بھی ظلم ہوگا۔ ماں کے ہوتے ہوئے بچہ بن ماں کا کہلائے......؟ یہ تو بہت بری بات ہے......!''

''مگر جو آپی کے ساتھ ہوگا...... وہ اس سے بھی بڑا ظلم ہوگا......نہیں......! یہ میں ہونے نہیں دوں گی۔''

''میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' رشیدہ نے بڑی مضبوطی سے کہا۔

''ابھی آپ کو میری ضرورت ہے۔ ورنہ میں اسی وقت یہاں سے چلی جاتی۔ آپ میں طاقت آ جائے ......اور آپ کے گھر والے آ جائیں تو میں فوراً ہی چلی جاؤں گی۔''

ارجمند نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔

''میں تمہیں منہ مانگی قیمت دوں گی اور تم تو اس کے لئے تیار تھیں......؟''

''اب مجھے خود پر شرم آتی ہے۔ مجھے آپ سے کچھ بھی نہیں لینا۔''

ارجمند تو اسے لالچی عورت کی حیثیت سے ہی جانتی تھی۔ اس نے سمجھا کہ وہ

اپنی قیمت بڑھوا رہی ہے۔ مگر اس وقت وہ بلیک میل ہونے کے لئے بھی تیار تھی۔

’’منہ مانگی قیمت کچھ بھی ہو سکتی ہے...... پانچ ہزار...... دس ہزار...... تم مانگ کر تو دیکھو...... !‘‘

رشیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ اس کم عمر لڑکی کو اللہ نے بڑائی دی ہے۔ لیکن وہ اتنی بڑی ہے، یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

’’اتنی بڑی قربانی......؟ عمر بھر کے لئے اتنا بڑا روگ......؟ اور پھر الٹا اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنی...... یہ سب کیا ہے......؟‘‘

وہ مسکرائی۔

’’مجھے پیسے کی ضرورت تھی۔ میں لالچی بھی تھی۔ پیسے کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھی لیکن آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر میں بدل گئی۔ آپ کیا سمجھتی ہیں......؟ میں یہاں سے خالی ہاتھ جاؤں گی...... تنخواہ میں سے جو کچھ میں نے بچایا تھا وہ بھی اسپتال میں خرچ کر دیا اور آپ سے کچھ لوں گی بھی نہیں...... بس یہاں سے اللہ کا بھروسہ ساتھ لے کر جاؤں گی۔ وہ چاہے گا تو کہیں سے بھی میری ضرورت پوری کر دے گا۔‘‘

ارجمند کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

’’اتنا بڑا انقلاب...... !‘‘ اس نے کہا۔

’’تو پھر میری حالت کی تم فکر نہ کرو۔ ابھی یہاں سے چلی جاؤ...... !‘‘

’’آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ سب لوگ آ جائیں...... صاحب آ جائیں تو چلی جاؤں گی۔‘‘

’’وہی بلیک میلنگ......؟‘‘ ارجمند نے سوچا۔

’’اب یہ راز فاش کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔‘‘ وہ خوشامد پر اُتر آئی۔

’’مجھے اس راز کو راز رکھنا ہے۔ دیکھو...... میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔‘‘

رشیدہ نے جلدی سے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ الگ کئے اور انہیں چوم لیا۔

’’آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں راز کھول دوں گی......؟‘‘ اس نے شرمندگی سے

کہا۔

’’میں یہی چاہتی ہوں۔ لیکن آپ کا حکم نہیں ٹالوں گی۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔‘‘

’’تو میں تمہیں......‘‘

رشیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

’’میں آپ سے کچھ لوں گی نہیں...... کچھ بھی نہیں...... یہی میری شرط ہے...... یہی میرا انعام...... ! مجھے بس دعا چاہئے آپ کی۔‘‘

ارجمند سوچ میں پڑ گئی۔ اب اس کے خلوص میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ اس نے تو اُلٹا اپنے پیسے بھی اس پر خرچ کر دیئے تھے۔ یہ وہ کیسے گوارہ کرے......؟ اسے کیسے کچھ دے......؟ بالآخر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔

’’تو پھر تم اس وقت یہاں سے چلی جاؤ...... ! تم غریب بھی ہو اور ضرورت مند بھی...... اور ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میں تمہارا احسان قبول نہیں کر سکتی۔ یا تو تم وعدہ کرو کہ جو کچھ میں دوں گی، خوشی سے لے لو گی یا پھر اسی وقت چلی جاؤ...... ! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔‘‘

رشیدہ رونے لگی۔

’’آپ سمجھتی نہیں بی بی صاحبہ...... ! اس کام کا پیسہ تو حرام ہے مجھ پر...... اور آپ دھکے دے کر نکالیں گی، تب بھی نہیں جاؤں گی میں۔‘‘

’’تو میں تمہارے ہاتھ کا کچھ کھاؤں گی بھی نہیں...... !‘‘

رشیدہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔

’’تو پھر مجھے اپنے ساتھ رکھ لیں...... میں آپ کے اور اس بچے کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔‘‘

ارجمند حیران رہ گئی۔

’’یہ کیسے ممکن ہے......؟ تمہارا گھر...... تمہارے بچے......؟‘‘

’’بڑی بیٹی کی منگنی ہو چکی ہے...... بیٹے بھی بڑے ہیں...... بس آبیہ رہ گئی ہے۔ اسے میں ساتھ لے چلوں گی۔‘‘

ارجمند سوچ میں پڑ گئی۔

''آپ کے بچے کو میں نے پہلا شہد چٹایا ہے، گھٹی دی ہے اسے..... اور میں آپ کے قدموں میں رہنا چاہتی ہوں۔'' رشیدہ گڑگڑائی۔

ارجمند نے یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔

''اللہ.....! یہ بچہ کیسی کسمپرسی کے عالم میں آیا ہے.....؟''

''اور اس کے کان میں اذان.....؟'' وہ سب کچھ بھول گئی۔

''نوریز نے دی ہے۔ اس نے بھائی بن کر آپ کے آپریشن کے اجازت نامے پر دستخط کئے تھے۔''

ارجمند شرمندہ ہوگئی۔ وہ رشیدہ کے احسان سے بچنے کی بات کر رہی تھی اور بے خبر تھی کہ اس پر اور اس کے بچے پر نوکروں کے کتنے احسان ہیں.....؟ اس نے دل میں اللہ سے توبہ کی۔

''اس اجازت نامے کے بغیر تو وہ آپ کا آپریشن ہی نہ کرتے۔''

ارجمند پہلے ہی اس بات کی اہمیت سمجھ چکی تھی۔

''چلو..... ٹھیک ہے.....! مجھ پر احسان ہے تمہارا بھی اور نوریز کا بھی...... میں تمہیں ساتھ لے چلوں گی۔ مگر میری ایک شرط ہے۔ میرے شوہر تمہیں یقیناً انعام دیں گے۔ اس سے انکار نہ کرنا۔ اپنی زمینیں چھڑانا، گھر میں کچھ پیسے چھوڑنا تاکہ تمہارے بیٹے کھیتی باڑی بھی کر سکیں۔ میں تو تمہارے احسان کا صلہ دے ہی نہیں سکتی۔''

رشیدہ خوش ہوگئی۔

''شکریہ بی بی صاحبہ.....!''

''اب تم جاؤ.....! اور نوریز کو بھیج دو.....!''

ذرا دیر بعد نوریز جھجکتا ہوا کمرے میں آیا۔

''آپ اب کیسی ہیں چھوٹی بی بی.....! اور کیا حکم ہے میرے لئے.....؟''

''اللہ کا شکر ہے.....! میں اب بہت بہتر ہوں۔ تم نے مجھ پر اور بچے پر بڑا احسان کیا۔''

''کیسی بات کرتی ہیں چھوٹی بی بی.....! میں نوکر ہوں آپ کا..... خادم ہوں.....!''

''نہیں.....! تم اب میرے بھائی ہو اور بچے کے ماموں.....!''

نوریز نے احتجاج کرنا چاہا۔ وہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔

ارجمند نے اسے روک دیا۔

''جس کاغذ پر تم نے بھائی بن کر دستخط کئے وہ اس کا ثبوت ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ نورالحق کے کان میں تم جیسے نیک آدمی نے اذان دی۔ میں تو تمہیں اب بھائی ہی سمجھوں گی۔''

''میرے لئے تو آپ چھوٹی بی بی ہی ہیں جی.....!'' نوریز نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''اگر تم بھائی نہیں ہو تو پھر تم نے ہم پر احسان کیا ہے.....؟ جس کا بدلہ ہم ساری زندگی نہیں چکا سکتے۔''

''ایسے نہ کہیں چھوٹی بی بی.....!''

''تو پھر بھائی ہی بن جاؤ.....!''

نوریز نے بے بسی سے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایک اور احسان کر دو.....!''

''جب بہن مان لیا تو آپ کا کہنا ہی کافی ہے چھوٹی بی بی.....! بھائی تو چھوٹی بہن کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

''کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہو کہ یہ بچہ میرا ہے..... یہ آپی کا ہے.....!'' ارجمند نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے چھوٹی بی بی.....! سب کو پتا ہے۔''

''رشیدہ کو میں نے سمجھا دیا ہے..... یہ کچھ بولے گی نہیں..... اب بس تم ہی تو ہو.....''

''اسپتال میں سب جانتے ہیں۔''

''وہاں کوئی پوچھنے تو نہیں جائے گا.....؟''

''آپ کی بات کو میں منع نہیں کر سکتا...... پر آپ ایسا کیوں کرتی ہیں......؟''

''دیکھو نا......! سب کو یہی معلوم تھا۔''

''میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ جب ڈاکٹر نے مجھے بیگم صاحبہ کا بتایا تو میں نے اس سے بچے کا پوچھا۔ اس نے تو مجھے یوں دیکھا جیسے میں پاگل ہوں۔ بعد میں مجھے رشیدہ نے بتایا تو سمجھ میں آئی۔''

''اب سوچو......! کیا تم چاہو گے کہ یہ راز کھلے اور تمہارے صاحب اور سب لوگ تمہاری بیگم صاحبہ کو برا سمجھیں......؟ اور میری تو وہ بہن تھیں۔''

نوریز نے اسے بے حد احترام اور عقیدت سے دیکھا۔

''بات تو ٹھیک ہے چھوٹی بی بی......! پر اتنا بڑا جھوٹ......؟''

''بس......! تم میری بات مان لو......!''

''جی......ٹھیک ہے......!''

ارجمند اب اسپتال کے بارے میں سوچنے لگی کہ کیا کیا جائے......؟

''میں جاؤں چھوٹی بی بی......!'' نوریز نے اسے چونکا دیا۔

''نہیں......! تمہیں ایک کام کرنا ہے۔ اسپتال جاؤ اور نورالحق کا برتھ سٹرفکیٹ اور بیگم صاحبہ کا ڈیتھ سٹرفکیٹ لے آؤ......!''

''یہ تو مجھے بولنا بھی نہیں آئے گا جی......!''

''کاغذ قلم لا کر دو......! میں لکھ دوں گی۔''

اس نے ایک کاغذ پر لکھ کر نوریز کی طرف بڑھا دیا۔

نوریز کمرے سے نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس کے پاس جانا ہے۔ مگر پھر اسے ثقلین کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا وہ یہ کام بھی کروا دیں گے۔

❁❁❁

تنہائی میں سوچنے کا موقع ملا تو پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ کتنے پیچیدہ معاملات ہیں۔ ابھی تک عبدالحق کو نہ تو نوربانو کی موت کا علم تھا نہ بیٹے کی پیدائش کا...... بلکہ عبدالحق کیا......؟ کسی کو بھی یہاں کی کوئی خبر نہیں تھی۔

وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ اگر خدانخواستہ اسے بھی کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا......؟ بے چارے ملازم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس جاتے......؟ وہ یہ سب کچھ کیسے نمٹاتے......؟ جب تک دوسری طرف سے رابطہ نہ ہوتا، وہ بے بس ہوتے اور اپنے طور پر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

نوریز کو تو خیر وہ جانتی تھی، لیکن رشیدہ پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کیسے اتنی بدل گئی......؟ اور سچ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے اور نوریز نے جھیلا...... وہ ان کی حیثیت اور ذمہ داری سے بہت بڑھ کر تھا۔

تھوڑی دیر بعد رشیدہ اس کے لئے کھانے کو کچھ لے کر آئی تو اس نے پھر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اسے خیال آیا کہ ایک بات تو اس نے ابھی تک پوچھی ہی نہیں۔

''صاحب کا فون تو نہیں آیا......؟''

''اس رات کے بعد ہم آج صبح ہی تو آئے ہیں۔ اس وقت سے تو فون نہیں آیا۔'' رشیدہ نے جواب دیا۔

''تم لوگوں نے بھی انہیں اطلاع نہیں دی......؟''

''کیسے دیتے بی بی صاحبہ......! ہمارے پاس نمبر نہیں ہے۔''

ارجمند سوچ میں پڑ گئی۔

''یہ تو اچھا ہی ہوا بی بی صاحبہ......!''

ارجمند نے چونک کر اسے دیکھا۔

''اگر ان کا فون آ جاتا یا ہمارے پاس نمبر ہوتا تب تو یہ راز کھل ہی جانا تھا۔ پھر آپ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔''

ارجمند نے سوچا۔

''بات تو ٹھیک ہے۔ یہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔ اس کی رضا شامل ہے میرے فیصلے میں۔'' اور اسے خیال آیا کہ یہ بات تو اسے خود بھی سمجھ لینی چاہئے تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ صرف جسمانی طور پر ہی نہیں، دماغی طور پر بھی کمزور ہو گئی ہے۔

رشیدہ اسے کھلانے کے بعد چلی گئی۔

ارجمند محسوس کر رہی تھی کہ اسے بہت کچھ سوچنا ہے۔ دل تو چاہتا تھا کہ وہ ابھی عبدالحق کو فون کر دے لیکن یہ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ابھی یہ مناسب نہیں ہے۔ ابھی وہ بہت کمزور تھی اور اس نے ایک بہت بڑی بات کو راز رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نوریز دونوں سرٹیفکیٹ لے آیا۔

''کوئی دُشواری تو نہیں ہوئی......؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں چھوٹی بی بی......! ایک جان پہچان بن گئی ہے۔ اس لئے کام آسانی سے ہو گیا۔''

''ٹھیک ہے......! شکریہ......!''

نوریز کے جانے کے بعد اس نے جو پہلا سرٹیفکیٹ کھولا، وہ ننھے نورالحق کا برتھ سرٹیفکیٹ تھا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اس میں صرف باپ کا نام درج ہے، ماں کا نہیں۔

دوسرا سرٹیفکیٹ دیکھتے ہی وہ ضبط نہ کر سکی۔ اور دیر تک روتی رہی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ نور بانو ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکی ہے۔ اس کے لئے تو وہ بہت ذاتی نقصان تھا۔

ذرا دیر بعد طبیعت سنبھلی تو اس نے نور بانو کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا جائزہ لیا۔ طبی اصطلاحات تو وہ نہیں سمجھ سکی لیکن یہ واضح تھا کہ موت کا سبب السر تھا۔

ایک خیال کے زیرِ اثر اس نے سرٹیفکیٹ میں وقت دیکھا۔ پھر اس نے نورالحق کی پیدائش کا وقت دیکھا۔ نورالحق نور بانو کی موت کے 70 منٹ بعد پیدا ہوا تھا۔

اسے ملال ہونے لگا۔ وہ آپی کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ لیکن وہ بھی انہیں نہیں مل سکی۔ وہ پھر رونے لگی۔ کیسی محروم زندگی تھی ان کی اور موت بھی محرومی کی...... بلکہ کسمپرسی کی۔ کسی اپنے کا چہرہ نہیں دیکھ سکیں وہ۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

اس پر اسے خیال آیا کہ اس کا سبب وہ خود ہی تھیں۔ وہی تو اسے لے کر یہاں آئی تھیں ضد کر کے...... اور زندگی کی تمام محرومیوں کے ازالے کے لئے ایک آغا جی کی محبت ہی کافی تھی۔ اسے وہ محبت مل جائے تو وہ آخرت کے سوا کسی چیز کی پرواہ ہی

نہ کرے۔

اس سوچ پر اسے شرمندگی ہوئی۔ اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔

لیکن سوچوں پر کس کا اختیار ہے......؟ اور آدمی جسمانی طور پر بہت کمزور ہو تو وہ تو اختیار سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس نے سوچا۔

''کاش......! نورالحق آپی کی موت سے چند منٹ پہلے ہی پیدا ہو گیا ہوتا......؟'' اس پر اسے خیال آیا کہ اس سے کیا فرق پڑتا......؟ آپی کو تو اس کی اطلاع بھی نہ ملی۔ ان کا تو آپریشن ہو رہا ہوتا۔

مگر پھر اچانک اس بات کی ایک اہمیت اس کی سمجھ میں آ گئی۔

''یہ فرق تو راز کھولنے والا ہے۔ آپی نورالحق کی پیدائش سے 70 منٹ پہلے اس دُنیا سے رُخصت ہو گئیں تھیں۔ یہ بات کسی کو معلوم ہو تو کون اسے آپی کا بچہ مانے گا......؟''

حل بھی اسے فوراً ہی سوجھ گیا۔ آپی کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ اسے چھپانا ہو گا۔

وہ تو ویسے بھی چھپانا ہی تھا۔ اس میں موت کا سبب اَلسر جو لکھا تھا۔

ایک اور بات کے بارے میں سوچ کر اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اب وہ خیریت سے گھر آ چکی ہے تو اسے فوراً عبدالحق کو فون کرنا چاہئے۔ پہلے تو جواز موجود تھا لیکن اب تاخیر کی تو جھوٹ بولنا پڑے گا اور یہ اسے گوارہ نہیں تھا۔ وہ ایک جھوٹ زندگی بھر کے لئے بہت کافی تھا، جو اسے آپی کی خاطر نبھانا تھا۔ بولنے سے تو وہ بچنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

سوال یہ تھا کہ اس کی حالت دیکھ کوئی سمجھ تو نہیں جائے گا۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

رشیدہ کی تجربہ کاری میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ بلکہ اب تو اس کا خلوص بھی سچا تھا۔ تجربے کا تو یہ حال تھا کہ شام تک وہ خود کو بہت توانا محسوس کرنے لگی۔ تکلیف میں بھی بڑی حد تک کمی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رشیدہ کے احسان کا صلہ تو وہ دے ہی نہیں سکتی۔

رات کو رشیدہ اس کے لئے کھانا لائی تو اس نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے رشیدہ......! کہ میں اٹھ کر چل پھر سکتی ہوں۔''

یہ سن کر رشیدہ تو دہل ہی گئی۔

''ایسا سوچیں بھی نہیں بی بی صاحبہ......! ٹانکے کھل گئے تو مصیبت ہو جائے گی۔ ہاں......! کل سے تھوڑا سا ٹہل سکیں گی آپ......!''

تب ارجمند نے اس سے وہ اہم سوال کیا۔

''مجھے دیکھ کر کوئی پہچان سکتا ہے......؟'' شرم کی وجہ سے اس نے ادھوری بات کی۔

''کیا......؟'' پہلے تو رشیدہ کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ مگر پھر ارجمند کے چہرے کی تمتماہٹ نے بات واضح کر دی۔

''یہ کہ بیگم صاحبہ نہیں......آپ ماں بنی ہیں......؟'' اس نے کہا۔

ارجمند نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''دیکھیں...... صاحب کے بارے میں تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ انہیں پتا نہیں چلے گا۔'' رشیدہ نے کہا۔

''پر آپ کی ساس کا نہیں کہہ سکتی۔'' چند لمحے وہ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''میرا خیال ہے کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ آپ کا بھی تو آپریشن ہوا ہے نا......؟'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''لیکن وہ تو......''

''کسی کو کیا پتا......؟ جب سب معاملات الٹ رہے ہیں تو آپ کا آپریشن السر کا ہوا اور بیگم صاحبہ کا بچے کا۔''

''بات تو ٹھیک ہے......!'' اب ارجمند کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''تو اب مجھے آغا جی کو فون کرنا چاہئے......؟''

''میری مانیں تو کل کر لیجئے گا۔''

ارجمند کسی گہری سوچ میں تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس دوران انہوں نے فون کیا ہوگا اور فون ریسیو نہ ہونے

پر بہت پریشان ہوئے ہوں گے۔'' وہ کہتے کہتے رکی اور کسی غیر مرئی نقطے کو نظریں جما کر پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔

پھر اس نے بہت آہستہ سے کہا۔

''ہاں......! اب میں محسوس کر سکتی ہوں، وہ بہت پریشان ہیں۔''

رشیدہ اسے پریشانی اور تشویش سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟''

''تم نہیں جانتیں رشیدہ......! کہ وہ آپی سے کیسی محبت کرتے ہیں......؟ وہ ان سے بے خبر کیسے رہ سکتے ہیں......؟''

''میں نہیں جانتی۔'' رشیدہ نے دل میں سوچا۔

''لیکن یہ جانتی ہوں کہ آپ ان سے کیسی محبت کرتی ہیں......؟''

''اگر میں نے انہیں فون نہیں کیا تو شاید وہ خود ہی یہاں چلے آئیں گے۔'' ارجمند نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ آپی نے منت والا چکر نہ چلایا ہوتا تو شاید اب تک وہ آ چکے ہوتے۔ وہ اس وقت سچ مچ عبدالحق کی کیفیت کو محسوس کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کے دل پر جو گھبراہٹ اور پریشانی کا بوجھ ہے۔ وہ اس کا اپنا نہیں ہے۔ عبدالحق کا ہے۔

''وہ خود چلے آئیں تو اس میں کیا برائی ہے......؟'' رشیدہ نے کہا۔

''یہ تو بہت ہی برا ہوگا۔ نہیں رشیدہ......! تم مجھے فون اٹھا کر دو۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔''

رشیدہ فون کی طرف بڑھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''یہ انہی کا فون ہے۔ لاؤ جلدی سے دو مجھے......!'' ارجمند نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

اور رشیدہ کی سمجھ میں اب تک کہی ہوئی اس کی ہر بات یاد آ گئی۔ وہ محبتیں بھی اس کے سمجھ میں آ گئیں۔

گھنٹی یوں چیخ رہی تھی جیسے کوئی مطالبہ کر رہی ہو۔ رشیدہ نے بڑی احتیاط

سے انسٹرومنٹ اٹھایا اور ارجمند کی طرف لے چلی۔

❀❀❀

''وعلیکم السلام......!'' عبدالحق نے ارجمند کے سوال کا جواب دیا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ فون ریسیو ہو گیا۔ ورنہ وہ جانتا تھا کہ یہ رات گزارنا آسان نہ ہوتا۔

''تم کیسی ہو......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری......؟'' اس نے پوچھا۔

''جی......اب تو بہت بہتر ہے۔''

اس جملے نے اور پھر ارجمند کی آواز کی کمزوری نے ثابت کر دیا کہ اس رات نور بانو نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس خیال نے اسے اور پریشان کر دیا۔

''تو کیا ارجمند اور نور بانو......دونوں کی طبیعت خراب تھی اس رات......؟''

''پرسوں رات میں فون کرتا رہا۔ کسی نے فون ریسیو نہیں کیا......تب سے بہت پریشان ہوں میں۔''

''گھر میں کوئی تھا ہی نہیں......سب اسپتال میں تھے۔''

یہ اندازہ تو عبدالحق کو اس رات بھی ہو گیا تھا۔

''ہوا کیا......؟ سب خیر تو ہے......؟'' اس نے پوچھا۔ اس کا دل خوف سے بوجھل تھا۔

''آغا جی......! سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے نا......؟''

ارجمند کا لہجہ اسے عجیب سا لگا۔ وہ ننھے بچوں کی طرح اس سے تائید طلب کر رہی تھی اور وہ اسے دلاسہ بھی دے رہی تھی۔ جیسے کسی خبر کے لئے تیار کر رہی ہو۔ شاید وہ اسے یاد دلا رہی تھی۔

''بے شک......! سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔''

''میں بستر سے اٹھ نہیں سکتی۔ میں نے رشیدہ سے انسٹرومنٹ لا کر دینے کو کہا تھا۔ وہ اس طرف گئی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ چند لمحوں کا فرق تھا ورنہ یہ فون میں نے کیا ہوتا۔ میں شرمندہ ہوں کہ فون نہیں کر پائی اور آپ کا فون آ گیا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات......؟''

''سمجھ رہا ہوں۔ میں اسے تمہارے ہی فون کال سمجھوں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''مگر مجھے بتاؤ تو......ہوا کیا ہے......؟''

''خوش خبری ہے آغا جی......! آپ باپ بن گئے......بیٹا مبارک ہو آپ کو......!''

عبدالحق کے ہاتھوں سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

''اتنی بڑی خبر......اتنی بڑی نعمت سے نوازا گیا میں......میری نسل میں پہلا پیدائشی مسلم......! ہولڈ کرو ارجمند......! میں ابھی آیا۔'' اس نے ریسیور رکھا اور شکر کا سجدہ ادا کیا۔

پھر اس نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں کہا۔

''میں تمہارا احسان مند ارجمند......! تم نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری سنائی ہے۔''

''سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے آغا جی......!'' ارجمند کے لہجے میں گہری افسردگی در آئی۔

''خبر سنانے والا نہ کسی ستائش کا حق دار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ موجب سزا ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری بھی تو اللہ کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔ آدمی کی مرضی......اس کا ظرف ہو نہ ہو......ذمہ داری تو اسے نبھانی پڑتی ہے۔''

عبدالحق کا دل ڈوبنے لگا۔ ارجمند نے بغیر کچھ کہے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ لیکن ڈوبتا ہوا آدمی تو تنکا بھی تھامنے کی کوشش کرتا ہے۔

''نور بانو تو خیریت سے ہے نا......؟'' وہ جان گیا تھا، پھر بھی اس نے تصدیق چاہی۔

''مجھے افسوس ہے آغا جی......! میرے بس میں ہوتا تو جان دے کر بھی......''

ارجمند کی آواز ٹوٹ گئی۔ اس کی سسکیاں سنائی دینے لگی۔

دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

''خدا کے لئے......! خود کو سنبھالیں بی بی صاحبہ......!''

عبدالحق کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

"یہ سب کیا ہو گیا......؟" بے ساختہ اس نے زیرِ لب کہا۔

"اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ......!"

"بے شک......! سب اللہ ہی کا ہے اور ہم بھی اسی کی طرف جانے والے ہیں۔"

دوسری طرف سسکیاں تھم گئی تھیں اور ارجمند کہہ رہی تھی۔

"میرا بھی آپریشن ہوا تھا۔ مجھے آج ہی ہوش آیا ہے۔ ورنہ میں آپ کو پہلے ہی بتا دیتی۔"

عبدالحق نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اسے کیا تکلیف تھی......؟ جس کی وجہ سے اس کا آپریشن ہوا۔ نور بانو کا غم اتنا بڑا تھا کہ وہ تو بیٹے کی خوشی بھی بھول بیٹھا تھا۔ ارجمند کی کیا فکر کرتا......؟

"جو اللہ کی مرضی......!" اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

"میں کل آ رہا ہوں ارجمند......! تم فکر نہ کرو۔ خود کو سنبھالو......!" اسے خود بھی احساس تھا کہ یہ بات اس نے بڑے رسمی لہجے میں کہی ہے۔ لیکن اس وقت اسے نور بانو کے سوا کسی کا خیال نہیں تھا۔

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ جانے کتنی دیر تک وہ یوں ہی بیٹھا رہا۔ سانس لینا خود کار عمل نہ ہوتا تو شاید وہ مر چکا ہوتا۔ ذہن میں کوئی سوچ، کوئی خیال تک نہیں تھا۔ وہ تو جیسے کسی قبر میں تھا۔

فون کی گھنٹی اسے نہ چونکاتی تو شاید وہ یوں ہی بیٹھا رہتا۔ اس نے چونک کر سوچا۔ یہ ارجمند ہوگی۔ دل میں ایک سختی سی ابھری۔ وہ کیوں اس سے بات کرے......؟ کئی گھنٹیوں کو اس نے نظر انداز کر دیا۔ پھر اندر سے کسی نے کہا۔

"اس میں بے چاری ارجمند کا کیا قصور......؟"

اس نے ریسیور اٹھایا اور بڑی بے رخی سے کہا۔

"کیا بات ہے......؟ کہا نا......کل پہنچ جاؤں گا۔"

جواب میں ساجد کی حیران سی آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم چاچا......!"

اس نے سلام کا جواب دیا۔

اسی لمحے ریسیور سے حمیدہ کی آواز ابھری۔

"تو کیسا ہے پتر......! نہ جانے کیوں دل بہت گھبرا رہا تھا میرا......!"

"بری خبر ہے اماں......!" وہ جیسے پھٹ پڑا۔ پہلی بار اپنے بوجھ میں کسی کو شریک کرنے کا موقع ملا تھا۔

"کیا ہوا پتر......؟" حمیدہ تو جیسے دہل گئی۔

"وہ اماں...... وہ نور بانو...... وہ چلی گئی......!" نہ جانے کیسے وہ یہ الفاظ ادا کر پایا۔ مگر اسے لگا، دل پر سے کوئی بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔

"ارے......! کب......؟ یہ کیا ہوا......؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے مجھے پتا چلا ہے اماں......! زبیر بھائی سے میری بات کرا دو......!"

حمیدہ نے شاید ساجد کو زبیر کو بلانے کے لئے بھیجا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولی۔

"اور بچہ......؟"

تب عبدالحق کو اپنے بیٹے کا خیال آیا۔

"ہاں اماں......! بیٹا ہوا ہے...... تمہارا پوتا......! شاید وہ خیریت سے ہے۔"

"شاید کا مطلب......؟ تجھے معلوم نہیں......؟ تو نے پوچھا بھی نہیں......؟"

حمیدہ کے لہجے میں غصہ تھا۔

"وہ......اماں......! نور بانو کی خبر نے......"

"کیسا ناشکرا ہے تو......؟" حمیدہ نے بہت خفا ہو کر کہا۔

"اتنی بڑی نعمت......! اور تو کہتا ہے شاید......؟"

"میں نے شکر ادا کیا تھا اماں......! پر نور بانو......"

"تو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے کہ اللہ کی طرف سے وقت مقرر ہے ہر کسی کا......غم اپنی جگہ...... پر بندے کو ناشکری تو نہیں کرنی چاہئے۔"

"بے شک......اماں......! لیکن غم بھی تو فطری ہے۔"

"لے...... زبیر سے بات کر...... اور ہاں...... ایبٹ آباد کا نمبر لکھوا دینا ساجد کو...... میں ارجمند سے بات کروں گی۔ پتا نہیں...... کیا گزر رہی ہوگی اس پر۔"

عبدالحق نے زبیر کو صورتِ حال بتائی۔

"صبح دس بجے کی فلائٹ ہے میری......!" اس نے کہا۔

"دو تین بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکوں گا۔"

"آپ فکر نہ کریں کاکا......! ہم تو ابھی کچھ دیر میں ہی روانہ ہو جائیں گے۔"

عبدالحق نے ساجد کو ایبٹ آباد کا فون نمبر لکھوا دیا۔

اب وہ تھا اور تنہائی تھی۔

❀❀❀

گھر میں روانگی کا سامان ہو رہا تھا۔ حمیدہ نے ساجد سے ایبٹ آباد کا نمبر ملوایا۔

"یہ سب کیا ہو گیا ارجی......؟" اس نے ارجمند کی آواز سنتے ہی کہا۔

"بس...... دادی اماں......! اللہ کی مرضی......!"

"تو نے ہمیں فون بھی نہیں کیا......؟"

"کسی کو کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں ملا دادی اماں......! میری اپنی حالت بہت خراب تھی۔ میرا ابھی آپریشن ہوا ہے۔"

یہ سن کر حمیدہ اور وحشت زدہ ہو گئی۔

"تجھے کیا ہوا......؟"

"بس اماں......! پیٹ کا معاملہ تھا...... آج ہی تو مجھے ہوش آیا ہے تو آغا جی کو فون کیا۔ ابھی تو میں چل پھر بھی نہیں سکتی۔"

"فکر مت کر......! ہم آ رہے ہیں۔"

یہ سن کر ارجمند کی ڈھارس بندھی۔

"اور بچہ کیسا ہے......؟"

"بالکل ٹھیک......! اور صحت مند...... الحمدللہ......! کیسا ہے......؟ یہ آپ

آ کر دیکھ لیجئے گا۔"

"بس......! تو پریشان نہ ہو...... ہم آ رہے ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔ کوئی ہے یہاں کہ نہیں......؟"

"اماں......! بہت اچھی خدمت گزار عورت ہے۔ وہ نہ ہوتی تو خدا جانے کیا ہوتا......؟"

"اللہ کا شکر ہے......!"

حمیدہ نے ریسیور رکھا اور رابعہ سے بولی۔

"یہ اتنی تیاریاں کیسی...... بس چل دو اب......!"

"کاکا نے بتایا ہے کہ وہاں سردی ہوگی اماں......!"

"کچھ بھی ہو...... جلدی کرو......!" حمیدہ نے کہا۔

"میری بچی جانے کس حال میں ہوگی......؟"

❀❀❀

وہ بہت مکمل اور مہیب تنہائی تھی۔ تنہائی عبدالحق کو ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی۔ تنہائی میں سوچنے کا موقع ملتا تھا۔ اللہ کے بارے میں، زندگی کے بارے میں، اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کے بارے میں۔ تنہائی میں قرآن پڑھنے اور غور کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ تنہائی میسر ہوتی تو اس میں نماز میں حضوری کا احساس ہوتا۔

لیکن یہ وہ تنہائی نہیں تھی۔ اس میں تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے مر گیا ہے۔ ذہن میں نور بانو کے خیال اور اس کی یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ نور بانو کی بس ایک یاد اس کے ساتھ تھی...... جب وہ دہلی میں کوٹھے پر بیٹھ کر اس کی قرآن کی تلاوت سنتا تھا۔ یا پھر وہ رات جب وہ چھت پر سورۃ الملک کی تلاوت کر رہی تھی۔ جس رات اللہ نے اسے ایمان عطا فرمایا تھا۔

بس وہی دو یادیں تھیں اس کے پاس۔ حالانکہ اس کے بعد ایک طویل ساتھ تھا اس کا۔ لیکن وہ جیسے بھولے ہوئے ایک خواب جیسا تھا۔ جیسے کچھ چھوٹے چھوٹے لمحے گرفت میں آتے آتے ذہن کی انگلیوں سے پھسل جائیں۔

وہ اس پر غور کرتا رہا کہ ایسا کیوں ہے......؟ اس کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ وہ

عجیب غم تھا۔ قطرہ قطرہ جیسے دل میں ٹپک رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ میں ڈوب گیا تو کیا ہوگا......؟ ابھی وہ کم از کم سوچ تو سکتا ہے۔ کیا اس کے بعد وہ سوچ بھی نہیں سکے گا......؟

ان دو یادوں کے حوالے سے سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ وہ اس کے لئے تھے ہی اہم ترین۔ انہوں نے ہی تو اس کی زندگی کا رُخ بدلا تھا۔ آج وہ جو کچھ بھی تھا، انہی لمحوں کی بدولت تھا۔ ورنہ گمراہی میں ہوتا۔

نور بانو کا اس پر بڑا احسان تھا۔

آنسو اس طرح اُمنڈ کر آئے کہ اس کے لئے انہیں روکنا ناممکن ہوگیا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور اس تنہائی میں کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا، اسے دلاسہ دینے والا نہیں تھا۔ اس احساس نے آنسوؤں کو اور مہمیز کر دیا۔

زندگی میں پہلی بار وہ خود ترسی میں مبتلا ہو رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے......؟'' اس نے سوچا۔

''میں اکیلا یہاں غم کر رہا ہوں اس کا...... کوئی پرسہ دینے والا بھی نہیں...... اور وہ خود وہاں ایبٹ آباد میں...... پردیس میں کسمپرسی کے عالم میں مر گئی۔ اسے بھی وہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہاں صرف ارجمند تھی اور وہ خود بھی ہوش میں نہیں تھی۔ وہ خود بیمار تھی۔ اس کا اپنا آپریشن ہونا تھا۔''

اس نے ایبٹ آباد کی اس صورتِ حال کا تصور کیا اور دہل کر رہ گیا۔

دو عورتیں بیمار ہوں، اور اسپتال لے جائی جائیں...... اور وہاں ان کے پاس دو ملازموں کے سوا کوئی نہ ہو...... وہ تو اس سے بھی مہیب تنہائی ہوگی...... جس کا وہ اس وقت یہاں بیٹھا گلہ کر رہا ہے۔

''اور وہ ان ملازموں کی ذمہ داری نہیں تھی۔ انہوں نے تو وفاداری کی حد کر دی۔ وہ تو اس کے اور سب لوگوں کے محسن ہیں۔ انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا۔ ان کا احسان تو وہ کبھی نہیں اتار سکتا۔''

''اور یہ کیسا المیہ ہے کہ وہ دونوں اسپتال میں ہوں گی۔ اسپتال کے لوگ کیا سمجھ رہے ہوں گے......؟ کہ ان کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان کا شوہر...... ان کے رشتہ

دار...... کوئی نہیں......! اور ان لوگوں نے ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی......؟ ان کے بارے میں بھی...... اور ہمارے بارے میں بھی...... ان کی بھی مہربانی...... ان کا بھی احسان...... انہوں نے تو لاوارثوں کی مدد کی۔''

''لیکن یہ سب ہوا کیوں......؟ اگر وہ لاہور میں ہوتیں تو پورا گھر ان کے ساتھ ہوتا۔ وہ اس طرح اکیلی نہ ہوتیں۔ بے چارے ملازموں کے لئے بھی آزمائش نہ بنتیں۔ اور کراچی میں ہوتی تو وہ ان کے ساتھ ہوتا۔ عارف بھائی اور بھابی بھی ہوتے۔''

''یہ سب ہوا کیوں......؟''

جواب سامنے تھا۔ لیکن وہ اس سے نظریں چرانا چاہتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اب یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کا سبب خود نور بانو تھی۔ اس کی وہ جاہلانہ منت جس کی وجہ سے اس نے خود کو اکیلا کر لیا۔ ورنہ وہ وقتاً فوقتاً وہاں جاتا رہتا اور آخر میں چھٹیاں لے کر خود وہاں موجود رہتا۔ لیکن نور بانو نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

اسے نور بانو کو کی ہوئی اپنی آخری فون کال یاد آئی۔ اس نے ٹھیک محسوس کیا تھا۔ نور بانو بات کرتے ہوئے بڑی اذیت میں تھی اور اس نے یہ بھی سچ بتایا تھا کہ ارجمند کی طبیعت بہت خراب ہے۔ لیکن اس نے اپنی طبیعت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بلکہ خود ہی فون کاٹ دیا۔

شاید اس لئے کہ اس کے بعد وہ اپنی اذیت نہ چھپا پاتی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اپنی طبیعت کے بارے میں بتایا تو وہ منت کو نظر انداز کر کے فوراً ایبٹ آباد پہنچے گا اور وہ ایبٹ آباد پہنچ جاتا تو شاید......

اس کے اندر سے کسی نے سختی سے اسے ٹوک دیا۔

''سب اللہ کی طرف سے ہے اور کچھ مقرر ہے۔''

اس کے جسم میں تنبیہی تھرتھری سی دوڑ گئی۔ لیکن غم کی وجہ سے وہ تنبیہ اس تک نہ پہنچ سکی۔

''بے شک......! لیکن اس صورت میں ان کی کسمپرسی کا یہ عالم تو نہ ہوتا۔'' وہ بڑبڑایا۔

"اور میرے ضمیر پر اتنا بوجھ بھی نہ ہوتا۔ اور یہ بوجھ تو وہ ہے جس سے میں کبھی چھٹکارہ نہیں پا سکوں گا۔ میں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر سکا۔"

لیکن سوچوں کا دھارا کہاں رُکتا ہے۔ کوئی ساتھ ہوتا تو شاید دھیان بٹ جاتا۔ اس وقت اس تنہائی میں وہ اپنی بپھری ہوئی سوچوں کے دریا کے سامنے کوئی بند نہیں باندھ سکتا تھا۔

"میں وہاں ہوتا تو آخری بار اسے دیکھ تو لیتا۔"

اس خیال نے کچھ اور دروازے کھول دیئے۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے تو نور بانو کو کئی ماہ سے نہیں دیکھا۔

"آخری بار...... آخری بار کب دیکھا تھا اسے......؟" یہ یاد کرنے کے لئے اسے ذہن پر زور دینا پڑا۔

اس روز جب وہ لاہور سے کراچی کے لئے روانہ ہو رہا تھا اور اس بات کو کم از کم نو ماہ تو ہو گئے۔

"یہ کیسی بدنصیبی ہے......؟ کتنی بڑی بدبختی...... اور وہ بھی اپنی ہی لائی ہوئی...... وہ نور بانو کی منت کیا رنگ لائی......؟"

لاحاصل تو نہیں...... اسے بیٹا تو مل گیا۔

"یہ تو اللہ کی دین ہے...... یا اس منت کا صلہ......! کیا اس منت کے بغیر اسے بیٹا نہ ملتا......؟"

غم سے نڈھال ذہن کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"نور بانو نے بڑا ظلم کیا...... اپنے ساتھ بھی اور میرے ساتھ بھی...... بلکہ بچے کے ساتھ بھی...... کتنا اچھا ہوتا کہ میں اس کے کان میں اذان دیتا...... میں سرگوشی میں اسے بتاتا کہ اس کو اللہ نے کتنا بڑا اعزاز عطا فرمایا ہے۔ وہ اپنی نسل کا پہلا فرد ہے جو ایمان کے ساتھ پیدا ہوا ہے...... خالص مسلم...... اور میں بتاتا کہ اس پر کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ وہ آسانیوں کے ساتھ راہِ حق پر پیدا ہوا ہے۔"

"نہ جانے کس نے اذان دی ہوگی اس کے کان میں......؟"

اسے نور بانو پر غصہ آنے لگا۔

"جو اس دنیا میں بھی نہیں رہا...... اس پر غصہ......؟" اس کے اندر کسی نے ٹوکا۔

وہ بس اتنا سمجھ سکا کہ اس غصے کا رخ تبدیل کرنا ہے۔ غم کے ساتھ، احساسِ زیاں کے ساتھ، اس غصے پر قابو پانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

ایسے میں اسے ارجمند کا خیال آ گیا۔

"وہ روک سکتی تھی نور بانو کو...... وہ اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی تو نور بانو کو کبھی اتنا دور جانے کی ہمت نہ ہوتی...... اور یہ ارجمند کا حق تھا۔"

"ارجمند کو چھوڑو...... تمہارا تو یہ فرض تھا۔" اندر سے کسی نے اسے ڈانٹا۔

"تم نے اسے کیوں اجازت دی......؟ سب سے بڑھ کر تم اسے روک سکتے تھے۔"

"میں......؟ میں اس کی کوئی بات کب ٹالتا تھا......؟ میں کہاں روک سکتا تھا اسے......؟"

"تو پھر دوسروں پر اپنا بوجھ کیوں ڈالتے ہو......؟"

دل اتنا بوجھل تھا کہ مزید بوجھ اٹھانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

"اماں روک سکتی تھیں اسے......!" اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"تم نے تو اسے اماں کی اجازت کے بغیر ہی بھیج دیا...... اماں سے پوچھا تک نہیں......! اماں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ پہلا بچہ ہے...... یہ بے احتیاطی نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

"تو اماں بعد میں اس کے پاس جا سکتی تھیں۔ ان پر تو منت کی پابندی نہیں تھی۔"

"اماں بیمار نہ ہوتیں تو ضرور جاتیں۔ وہ تو بیماری کے باوجود جانے کے لئے تیار تھیں اور تمہیں انہوں نے حکم دیا تھا ایبٹ آباد جانے کا......؟"

"اس روز مجھے حادثہ پیش آ گیا۔"

"تو پھر مان لو کہ یہ سب مشیت ہے۔"

"ارجمند چاہتی تو روک سکتی تھی۔" وہ ارجمند پر ذمہ داری تھوپنے پر تلا ہوا

تھا۔

"تم نور بانو کو نہیں روک سکے تو ارجمند کیسے روک لیتی......؟"

"میں تو محبت سے مجبور تھا۔ میں نے تو اس کے کہنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی دوسری شادی کر لی۔"

"ارجمند بھی نور بانو سے محبت کرتی تھی۔"

"جیسی محبت میں کرتا تھا، ویسی تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔"

"جانتے بھی ہو محبت کو......؟ محبت کرنے والے پر بڑی بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔ محبوب کو ہر نقصان سے بچانا، اس کو خود اس سے بچانا، محبت کوئی آسان کام ہے......؟ محبت صرف سرِ تسلیم خم کرنا نہیں، محبت میں سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ بڑا دعویٰ ہے تمہیں محبت کا......؟ لیکن تم محبت کو سمجھتے ہی نہیں...... غلط فیصلے سے محبوب کو بالجبر روکنا پڑتا ہے۔ غلط بات پر سر جھکانا محبت نہیں۔"

عبدالحق کو بہت بری طرح سے گھر جانے احساس ہوا۔ ہر الزام کا رخ اسی کی طرف تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور وضو کے لئے چلا گیا۔ کم از کم وہ نور بانو کے لئے سورہ بقرہ تو پڑھ لے۔

وہ قرآن لے کر بیٹھا اور سورہ بقرہ کی تلاوت شروع کی۔ دل غم سے بوجھل تھا۔ اس لئے وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ لیکن آیت نمبر 155 پر وہ ٹھٹک گیا۔ پھر آیت نمبر 156 اور 157 بھی اس نے دھیان سے پڑی۔

اگرچہ وہ مفہوم سمجھ رہا تھا پھر بھی اس نے ترجمے پر نظر ڈالی اور تینوں آیتوں کو کئی بار پڑھا۔

"اور ضرور آزمائیں گے ہم تم کو کسی قدر خوف اور بھوک سے اور (مبتلا کر کے) نقصان میں مال و جان کے اور آمدنیوں کے......اور خوش خبری دو صبر کرنے والوں کو۔"

(سورۂ بقرہ، آیت: ۱۵۵)

"وہ (صبر کرنے والے) کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں...... بے شک......! ہم اللہ ہی کے ہیں اور

بے شک......! ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

(سورۂ بقرہ، آیت: ۱۵۶)

"یہی وہ لوگ ہیں کہ ان پر ہیں عنایتیں ان کے رب کی اور رحمتیں بھی اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔"

(سورۂ بقرہ، آیت: ۱۵۷)

وہ آگے پڑھنا بھول گیا۔ وہیں ٹھہر گیا۔ جسم میں تھرتھری سی دوڑ رہی تھی۔ کچھ یاد آ رہا تھا۔ مگر یاد آتے آتے رہ جاتا تھا۔ پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پھر پہلی آیت پر غور کیا۔

"آزمائش کے بعد صبر کرنے والوں کے لئے خوش خبری......!"

"جو ہے سب اللہ کی عطا ہے۔ بندے کی کمائی نہیں...... اس کا حق نہیں...... اللہ کی عنایت ہے۔ سکون اور عافیت، رزق، مال اور دنیاوی پوزیشن، اہل و عیال اور رشتہ دار اور دنیاوی نعمتیں...... اللہ کی چیز، جب چاہے واپس لے لے۔ خود اپنی زندگی بھی تو اسی کی عطا ہے...... جس سے سب کچھ ہے...... کچھ کمی واقع ہو جائے، کچھ چھن جائے اور بندہ شکایت کرنے بیٹھ جائے تو اس کی جہالت...... اور اس جہالت کا نتیجہ گمراہی...... اور گمراہی کے بعد آخرت کی خرابی۔"

اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"اتنا بڑا نقصان......؟"

"اللہ نے سب کچھ دیا۔ اس کا کرم...... لیکن نقصان کے ذریعے آزمائش کی تو کرم در کرم...... بہت بڑی رحمت...... بندہ بھول جاتا ہے کہ وہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے اور وہ جب چاہے اس میں کمی کر دے...... اور جب چاہے واپس لے لے...... تو اس آزمائش سے اللہ بندے کو یاد دلاتا ہے کہ اس کا کچھ بھی اپنا نہیں...... سب اللہ کا ہے...... اور ہر کمی بیشی، ہر نفع و نقصان اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ یاد دلاتا ہے تاکہ بندہ اس سے رجوع کرے۔ آخرت کو یاد کرے۔ یاد کرے کہ وہ خود بھی اللہ کا ہے اور مقررہ وقت پر اسے بھی لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہے۔ جہاں اس کے اعمال کا حساب ہوگا۔"

"آزمائش اس لئے ہے کہ بندہ رحمت سے استفادہ کرنے اور اللہ سے

رجوع کرنے کے بجائے شکایت لے کر بیٹھ جائے...... اللہ نے فرمایا...... خوش خبری دو صبر کرنے والوں کو......!''

''اور صبر بندے میں کہاں......؟ وہ تو غم کرنے والا ہے۔ صبر تو پیغمبروں کا وصف ہے...... تو اللہ نے اپنے مجبور اور بے بس بندوں کو کلمۂ صبر عطا فرمایا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون......!''

کہ وہ کہے......!

''بے شک......! ہم اللہ ہی کے ہیں اور بے شک......! ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

میں نے خبر سنتے ہی ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کہا تھا۔''

عبدالحق نے سوچا۔

''پھر مجھے صبر کیوں نہیں آیا......؟ کوئی خرابی تو ہے مجھ میں......؟''

''صرف زبان سے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دل کی، روح کی گہرائی سے کہا جائے تو یقیناً قرار آئے گا۔ یوں تو ہر شخص کلمہ شہادت پڑھتا ہے۔ زبان سے گواہی دیتا ہے۔ لیکن اس کے عمل سے تو شہادت ثابت نہیں ہوتی۔ زبان سے کہی ہوئی بات فوراً ہی محو ہو جاتی ہے۔ دل میں، روح میں اترے تو بات بنتی ہے۔''

عبدالحق نے دل کی گہرائی سے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا۔ وہ شرمندگی سے بے حال تھا۔ آزمائش آئی تو وہ کس قدر ناکام ثابت ہوا۔ کتنے خسارے کا سامان کر لیا اس نے۔ وہ جانتا تھا کہ موت اللہ کا حکم ہے۔ وقت مقرر ہے۔ لیکن وہ اپنی محبوب بیوی کی موت پر کیسے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا......؟

ارے......! اگر اس نے خود بھی نور بانو کو روک لیا ہوتا تو کیا اس کی موت ٹل سکتی تھی......؟ ہرگز نہیں......!

ذرا دیر میں وہ پسینے پسینے ہو گیا۔

''آدمی تو ایسا ہی ہے...... ہر لمحہ خود کو خسارے میں ڈالنے والا۔''

اور قرآن...... اللہ کا کلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ ابھی اگر اسے قرآن پڑھنے کا خیال نہیں آتا تو کیا ہوتا اس کا......؟

''یہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔'' اس نے سوچا۔

''اللہ تو ہر طرح سے اپنے بندوں کی بہتری کے لئے ان کی رہنمائی فرماتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کے باوجود بچ نہیں پاتے۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت اللہ نے مجھے بچا لیا۔''

اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ سورۂ بقرہ پڑھنے کے بعد اس نے نور بانو کے لئے دعا کی۔ اس کا دل بھر آیا۔ لیکن اس بار اس نے آنسوؤں کو آنکھوں تک نہیں پہنچنے دیا۔ صبر تو بہت دور کی بات......! وہ کم از کم صبر کی کوشش تو کر سکتا ہے۔

اور اجر کتنا بڑا ہوتا ہے صبر کا......؟ عنایتیں ربّ کی...... اور رحمتیں اور پھر ہدایت پانے والوں میں شامل ہونا...... آدمی کوشش تو کرے...... اور کوشش کرنے میں مشکل ہی کیا ہے......؟ اور اللہ چاہے تو کوشش کو کامیاب کر دے اور چاہے تو ناکام کوشش پر بھی اجر عطا فرما دے۔

قرآن کے بعد وہ نوافل پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اب وہ خود کو کچھ سوچنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے بیٹے کی پیدائش پر شکر کے نفل پڑھے۔

وہ ویسے بھی موسم سرما کی لمبی رات تھی۔ اس کے دکھ اور تنہائی نے اس رات کی طوالت کو جیسے اور بڑھا دیا۔ اسے تو بس فجر کا انتظار تھا۔ نوافل پڑھتے ہوئے اسے استغفار کا خیال آیا اور وہ استغفار کرنے لگا۔

فجر کی اذان ہوئی تو اسے سکون کا احساس ہوا۔ رات بالآخر گزر گئی تھی۔

نماز کے بعد وہ اپنا سوٹ کیس بھرنے میں مصروف ہو گیا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اسے کلکٹر صاحب کو بھی مطلع کرنا ہوگا۔ اسٹیشن چھوڑنے کی اجازت لینا ہوگی۔ پھر چھٹی کا مسئلہ بھی ہوگا۔

وہ دفتر فون کرنے والا تھا کہ یاد آیا۔ یہ اتوار کا دن ہے۔ اس نے ڈائری میں سے کلکٹر صاحب کے گھر کا فون نمبر نکالا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہوگا۔

خاصی دیر کے بعد دوسری طرف سے فون اٹھایا گیا۔ فون ریسیو کرنے والی یقیناً کوئی ملازمہ تھی۔

"صاحب سے بات کراؤ میری......!" عبدالحق نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس لہجے کی ضرورت تھی۔

"صاحب تو سو رہے ہیں۔" جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

"تو انہیں جگا دو...... بہت ضروری بات ہے۔"

"میں نہیں جگا سکتی۔ صاحب بہت ناراض ہوں گے۔" ملازمہ کے لہجے میں خوف تھا۔

"اور نہیں جگاؤ گی تو یقین کرو...... شاید نوکری سے ہی نکال دی جاؤ......!"

"لیکن صاحب......!" ملازمہ اس دھمکی کے باوجود ہچکچا رہی تھی۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں نا......! تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔"

"اچھا...... میں کوشش کرتی ہوں۔ آپ کا نام......؟"

"کہنا...... عبدالحق کا فون ہے۔"

اسے کوئی پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ لیکن وہ اس کے لئے ایک گھنٹے کے برابر تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسے اس بات کا یقین بھی نہیں تھا کہ ملازمہ کلکٹر صاحب کو جگانے کی کوشش بھی کرے گی۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ بغیر کوشش کے ان کو اُٹھانے میں ناکامی کا اعتراف کر لے گی۔ بڑے لوگوں کے ملازم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ایسا ہوا تو اسے خود کلکٹر صاحب کے گھر جانا پڑے گا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ وقت اس کے پاس زیادہ نہیں تھا۔ پھر وقت پر ایئر پورٹ پہنچنا۔

اسی لمحے فون پر کلکٹر صاحب کی آواز ابھری۔

"کیا بات ہے عبدالحق......! خیریت تو ہے......؟"

اس کا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ اس نے سکون کی سانس لی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ کس صورتِ حال سے دوچار ہے۔

اس نے کلکٹر صاحب کو نور بانو کے انتقال کے بارے میں بتایا۔

"مجھے دلی افسوس ہے عبدالحق......!" کلکٹر صاحب نے کہا۔

"تم اب روانہ ہو رہے ہو گے......؟"

"جی ہاں جناب......! آپ سے اجازت لینا ضروری تھا۔ اس لئے بے وقت زحمت دی۔"

"زحمت کی کوئی بات نہیں......! لیکن تم لاہور پہنچ کر فون کر دیتے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"میں لاہور نہیں...... ایبٹ آباد جا رہا ہوں جناب......! میری بیوی کا انتقال وہیں ہوا ہے۔"

"فیملی تو تمہاری لاہور میں ہے نا......؟"

"جی ہاں......!"

"تم بے فکری سے جاؤ......! مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم غیر ضروری طور پر چھٹی کرنے والے نہیں ہو۔ یہ فیصلہ میں نے تم پر چھوڑا۔"

"شکریہ جناب......!" عبدالحق نے کہا۔

اب وہ روانگی کے لئے تیار تھا۔

❀❀❀

لاہور سے سب لوگ دس بجے صبح ایبٹ آباد پہنچ گئے تھے۔

رشیدہ ان لوگوں کو دیکھ کر بہت حیران تھی۔ وہ سب نور بانو سے بہت مختلف تھے۔ سیدھے سادے، محبت کرنے والے لوگ۔ اور اس کی ساس تو اسے بہت ہی اچھی لگی۔ اسے تو جیسے اللہ نے محبت سے بنایا تھا۔

وہ سب لوگ پہلے تو ارجمند کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے ساتھ جو مرد تھا، وہ کچھ جھجک رہا تھا۔ لیکن بوڑھی خاتون اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے میں لے آئی۔

"بھتیجی کو نہیں دیکھے گا زبیر......! کیسا چاچا ہے تو......؟" اس نے محبت بھرے لہجے میں ملامت کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تو...... اللہ نے دوسری زندگی دی ہے اسے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ارجمند کے بعد وہ سب بچے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے انداز میں ایسی

محبت تھی کہ رشیدہ نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ بچہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جا رہا تھا۔ اتنی سی دیر میں اسے اتنا پیار کیا گیا کہ اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔

ایک لڑکا تھا، پندرہ سولہ سال کا...... وہ تو بچے کو پنگھوڑے میں لٹانے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ بار بار ارجمند سے کہتا۔

''چاچی......! اللہ نے مجھے بھائی دے دیا......!''

رشیدہ کا خیال تھا کہ اسے ان میں سے کوئی پوچھے بھی نہیں، لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ بچے کو پنگھوڑے میں لٹانے کے بعد بوڑھی عورت اس کے پاس آئی۔

''تو تم ہو جس نے میری بہو کا اتنا خیال رکھا......؟'' وہ بولی تو اس کے لہجے میں احسان مندی تھی۔

''نام کیا ہے تمہارا......؟''

''جی رشیدہ......! اور یہ میری بیٹی آبیہ...... اور بڑی بیگم صاحب......! یہ تو میرا کام تھا...... نوکر ہوں میں آپ لوگوں کی۔''

''نوکری میں کوئی اتنا خیال نہیں رکھتا رشیدہ......! خیال تو محبت سے ہوتا ہے۔'' عورت نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

''اور سنو بیٹی......! میں بیگم صاحب نہیں...... میں تو بس اماں ہوں...... اماں...... سب کی...... تمہارا تو خاص احسان ہے ہم سب پر...... یہاں پردیس میں ہماری بچیوں کو پوچھنے والا کون تھا......؟ تم نے خدمت کی ان کی۔ اب ایک کو اللہ نے واپس بلا لیا۔ اس کی مرضی......!'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز رندھ گئی۔

''میں تو آپ لوگوں کی خادم ہوں اماں......!'' رشیدہ نے کہا۔

''میرے ساتھ چلو......! مجھے بتاؤ تو...... ہوا کیا......؟''

رشیدہ دونوں بوڑھی عورتوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اب اسے بہت محتاط رہنا ہے۔ کم بولنا ہے، اور بہت سوچ سمجھ کر بولنا تھا۔ آبیہ کو اس نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ وہ ویسے بھی بہت کم بولتی تھی۔

حمیدہ صفیہ کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آؤ......! یہاں بیٹھو......!'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رشیدہ سے کہا۔

رشیدہ نے دل میں سوچا۔

''یہ تو بالکل بی بی صاحبہ جیسی ہیں۔''

''شکریہ اماں......!''

''اب بتاؤ......! کیا ہوا تھا......؟''

''سب ٹھیک تھا اماں......! بس اچانک ایک ساتھ سب کچھ گڑبڑ ہو گیا۔''

حمیدہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ رشیدہ کو اس کی نگاہیں اپنے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''جس رات بیگم صاحبہ کی حالت خراب ہوئی، بی بی صاحبہ بھی اسی رات، اسی وقت بیمار ہوئیں۔ بیگم صاحبہ کا تو کیس بہت بگڑ گیا تھا۔ حالت بی بی صاحبہ کی بھی اچھی نہیں تھی۔ بس اللہ پاک نے کرم فرمایا اماں جی......!''

''بے شک......! یہ اس کا کرم ہے۔''

''انتقال کب ہوا نور بانو کا......؟''

رشیدہ نے ایک پل دل میں حساب لگایا۔ پھر بولی۔

''جمعے کی صبح اماں جی......!''

''اور بچہ کب ہوا......؟''

''جمعے کو فجر کے وقت......!'' رشیدہ نے جھجکے بغیر کہا۔

''اللہ کا شکر......! اس کی نعمت......!'' حمیدہ نے چہرہ چھت کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک بولی۔

''یہ بچہ تو ارجمند کا ہے نا......؟''

رشیدہ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح کا سوال کیا جائے گا......؟ بس اللہ کی رحمت تھی کہ اس کی حیرت ظاہر نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ سچ بول دے۔ لیکن بی بی صاحبہ سے کیا گیا وعدہ یاد آ گیا۔

''یہ آپ نے کیسے سوچا اماں جی......! بچہ تو بیگم صاحبہ کا ہے۔''

حمیدہ کے چہرے پر مایوسی کا بے ساختہ تاثر ابھرا۔

''ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔ وہ میں نے دونوں کو دیکھا ہی نہیں تھا کب سے...... نور بانو ضد کر کے یہاں چلی آئی۔ میں لاہور میں نہیں تھی۔ ورنہ ارجی کو تو روک لیتی۔ خیر...... اللہ کی مرضی میں کس کا دخل......؟''

رشیدہ نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔

''ارجی کو کیا ہوا تھا......؟''

''پیٹ کی کوئی تکلیف تھی اماں جی......! ڈاکٹر پتا نہیں کیا نام بتاتے تھے بیماری کا...... مجھے تو سمجھ نہیں آیا۔''

''یہ ڈاکٹر تو ایسے ہی باتیں کرتے ہیں۔ بڑے بڑے نام رکھ دیتے ہیں چھوٹی سی بیماری کا۔''

''چھوٹی بات نہیں تھی اماں جی......! آپ نے دیکھی نہیں بی بی صاحبہ کی حالت......؟''

''دیکھی ہے...... یہ ڈاکٹر بیماری بھی بڑھا دیتے ہیں بندے کی۔''

''پتا نہیں اماں جی......!''

صفیہ اب تک خاموش تھی۔ اس نے پوچھا۔

''نور بانو کی لاش کہاں ہے رشیدہ......؟''

''وہ جی...... اسپتال کے مردہ خانے میں رکھوا دی تھی۔ ورنہ تو دفن کرنا پڑ جاتا۔ آپ لوگوں کی غیر موجودگی میں دفناتے تو یہ ظلم ہوتا۔''

''آدمی اپنے لئے کیا کیا کر لیتا ہے......؟ اللہ جی تو پھر بھی رحم کرتے ہیں۔''

حمیدہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

رشیدہ کو اس سے ڈر لگنے لگا۔ نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ سب کچھ جانتی ہیں۔

''اب دیکھو...... یہاں نوکر ذمہ دار نہ ہوتے تو کوئی صورت بھی نہ دیکھ پاتا اور دفن ہو جاتی۔''

''واقعی......! لیکن آپا......! جس کی جہاں لکھی ہوتی ہے، وہ خود وہیں جا پہنچتا ہے۔'' صفیہ نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو آپا......!'' حمیدہ نے کہا پھر وہ رشیدہ کی طرف مڑی۔

''ارجی کی بہت فکر کرنی ہے رشیدہ......! ہم جتنی جلدی واپس لاہور چلے جائیں، اتنا ہی بہتر ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں ہر طرح سے خیال رکھ رہی ہوں اماں جی......! پر سفر کے قابل ہونے میں تو کچھ دن لگیں گے انہیں۔''

''ہاں......! یہ تو ہے۔'' حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

❀❀❀

باہر زبیر نوریز سے بات کر رہا تھا۔ نوریز اور وہ ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔

''بڑے صاحب کب آئیں گے صاحب جی......؟'' نوریز نے اس سے پوچھا۔

''کاکا جہاز میں بیٹھ چکے ہیں نوریز......! دو بجے تک پہنچ جائیں گے۔'' زبیر نے بتایا۔

''تم یہاں کی سناؤ...... یہ سب کیسے ہوا......؟''

''کچھ نہ پوچھیں صاحب جی......! بس قیامت کی رات تھی وہ...... چھوٹی بی بی اور بیگم صاحبہ دونوں کی ہی حالت خراب تھی۔'' نوریز نے کہا۔

پھر اسے پوری تفصیل سنائی۔

زبیر نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور شفقت بھرے لہجے میں بولا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم پر کیا گزری ہوگی......؟''

''بس صاحب جی......! اللہ نے کرم کیا...... ورنہ بیگم صاحبہ کو دفنانا پڑ جاتا۔ میں کیا منہ دکھاتا بڑے صاحب کو......؟''

زبیر کو پہلی بار لاش کا خیال آیا۔

''لاش کہاں ہے......؟''

"اسپتال کے مردہ خانے میں...... جب کہیں گے، لے آئیں گے۔"

زبیر سوچ میں پڑ گیا۔

"غسل وغیرہ بھی تو دینا ہوگا......؟"

"غسل تو دیا جا چکا صاحب جی......! اب تو بس تدفین ہے۔"

زبیر اپنی کم علمی پر شرمندہ ہو گیا۔

"ابھی تو یہ بھی نہیں پتا کہ تدفین یہاں ہوگی یا لاہور میں......؟" اس نے کہا۔

"یہ فیصلہ تو کاکا ہی کریں گے۔"

"یہاں تدفین کے لئے زمین کا مسئلہ بھی ہوگا صاحب جی......! پہلے سے کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔"

"میں نے کہا نا...... ابھی تو یہ بھی پتا نہیں کہ تدفین کہاں ہوگی......؟"

"سر جی......! زمین کا مسئلہ ہوا تو بریگیڈیئر صاحب سے بات کر لیجئے گا......!"

"کون بریگیڈیئر صاحب......؟"

"جن کی وجہ سے اسپتال والوں نے لاش رکھ لی۔"

"کاکا کو آنے دو......! وہی فیصلہ کریں گے۔"

❁❁❁

عبدالحق پہنچا تو گھر بھرا ہوا تھا۔ پاس پڑوس کی عورتیں بھی آ چکی تھی۔ حمیدہ نے آگے بڑھ کر اسے لپٹا لیا۔ خود پر قابو رکھنے کی کوشش کے باوجود وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ اسی وقت صفیہ نے اس کے بیٹے کو لا کر اس کی گود میں دے دیا۔

اس نے بچے کو بہت غور سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ بچہ تو ہو بہو ارجمند کی تصویر تھا۔ اسے کیا کیا یاد آ گیا۔ نور بانو کو کتنی فکر تھی کہ بچہ اس کی طرح کا نہ ہو۔ کہتی تھی۔

"میں تو واجبی صورت کی ہوں۔ بچہ آپ پر پڑے تو اچھا ہوگا۔"

اور اللہ نے اس کی سن لی تھی۔ وہ اس سے تو مشابہ نہیں تھا لیکن ارجمند جیسا

ہونے کی وجہ سے بہت خوب صورت تھا۔

"یہ کیسی محبت ہے......؟" اس نے سوچا۔

"بچہ نور بانو کا اور صورت ارجمند کی......؟"

اس کی آنکھ سے آنسو بچے کے چہرے پر گرا تو بچے نے جھرجھری سی لی۔ وہ چونکا۔ اس نے بڑی نرمی سے بچے کے چہرے سے انگلی کی مدد سے اس آنسو کو پونچھ دیا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بھی پونچھ ڈالیں۔

بچے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کے دل نے چپکے سے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر وہ عقبی باغیچے کی طرف چل دیا۔ اس وقت اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔ اسے اپنے بیٹے سے بہت اہم باتیں کرنی تھیں۔

سب نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن کسی نے اس کے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی۔

خوبانی کے ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے بچے کے کانوں سے ہونٹ لگائے اور سرگوشی میں بولا۔

"تم اللہ کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہو میرے بیٹے......! مجھے بڑی تمنا تھی تمہاری...... بہت انتظار تھا تمہارا...... تمہارے دادا اور میں، تمہارا باپ...... ہم بہت خوش نصیب ہیں کہ ہم مشرکوں میں پیدا ہوئے لیکن اللہ نے ہمیں ہدایت سے نوازا...... اور اب یہ اس کا فضل عظیم ہے کہ اس نے تم سے نوازا ہمیں...... ہماری روحانی ترقی کی اپنی عطا کو تمہارے ذریعے تکمیل عطا فرمائی۔ تمہارے دادا کے ماں اور باپ دونوں مشرک تھے لیکن اللہ نے انہیں ایمان سے نوازا۔ میری ماں مشرک تھیں لیکن اللہ نے میرے باپ کو ایمان عطا فرمایا تھا۔ تم ہماری خوش نصیبی کی تکمیل ہو کہ تمہارے ماں اور باپ دونوں مسلم ہیں۔ اب انشاء اللہ تم سے ہماری نسل اللہ کی راہ پر چلے گی۔"

نوزائیدہ بچہ حیرت انگیز طور پر ٹکر ٹکر باپ کی صورت دیکھے جا رہا تھا۔

"سب کچھ اللہ کا ہے میرے بچے......! اللہ کی طرف سے ہے۔ پہلی نعمت زندگی سے لے کر موت تک سب اللہ کی طرف سے...... سب اللہ کا...... اور وہ جب جو چیز چاہے واپس لے لے۔ تم ماں سے محروم پیدا ہوئے کہ یہی اس کی مرضی تھی۔ تم

خوش نصیب ہو۔ مگر تم پر ذمہ داری بھی بڑی ہے۔ میں تمہارے لئے دُعا کرتا رہوں گا۔ سب کچھ اللہ کی مدد سے ہی ہوتا ہے۔ بندہ کچھ بھی تو نہیں کرسکتا۔''

وہ بچے کو واپس حمیدہ کے پاس لایا اور اسے سونپ دیا۔

''لو اماں......! یہ تو اصل میں تمہارا ہی ہے۔''

''اب ارجمند سے بھی مل لے پتر......! بہت کمزور ہوگئی ہے وہ...... ابھی تو اُٹھنے کے قابل بھی نہیں۔'' حمیدہ نے اسے یاد دلایا۔

اسے حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ اسے ارجمند کا خیال بھی نہیں آیا۔

ارجمند نے اسے آتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عبدالحق نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ارجمند کا ہاتھ اسے سرد محسوس ہوا۔

''کیسی ہو ارجمند......؟''

''اللہ کا شکر ہے......! ٹھیک ہوں......! لیکن آپ سے شرمندہ ہوں۔''

''ارے نہیں......! اللہ کی مرضی میں کوئی کیا کرسکتا ہے......؟''

ارجمند نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں آغا جی......! کہ آپ کا غم...... آپ کا نقصان بہت بڑا ہے۔ اللہ آپ کو اس کا بہترین بدل عطا فرمائے۔''

عبدالحق نے دل میں سوچا۔

''نور بانو کا بدل کہاں ممکن ہے......؟''

''بس...... دُعا کرتی رہو میرے لئے......!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اس وقت تو آغا جی......! مجھے آپ دُعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔''

ارجمند کے لہجے میں التجا تھی۔

''تم جانتی ہو کہ اس کے لئے تمہیں مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں......!''

ارجمند نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ پھر بولی۔

''بیٹا مبارک ہو آغا جی......!''

''تمہیں بھی......! اب تم ہی تو اس کی ماں ہو......!''

باہر نکلا تو زبیر اس کا منتظر تھا۔ جو کچھ اسے نوریز سے معلوم ہوا تھا، وہ سب اس نے عبدالحق کو بتا دیا۔

''صرف ان دو ملازموں نے اتنا کچھ کیا بھائی......! اس احسان کا تو ہم صلہ دے ہی نہیں سکتے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''وہ تو ہو جائے گا کاکا......! ابھی بڑے فیصلے کرنے ہیں۔ تدفین کا کیا کرو گے......؟''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ تدفین میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ یہ اسے مولوی مہر علی نے بتایا تھا۔ یہاں تو پہلے ہی دو دن کی تاخیر ہو چکی تھی۔ لاہور لے جانے آسان نہیں تھا۔ وہ فوراً ہی ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

''تدفین تو یہیں کرنی ہوگی بھائی......!'' اس نے کہا۔

''میں نوریز کے ساتھ جا کر مرحومہ کا جسد لے آتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کاکا......! یہ نوریز پر چھوڑ دو......!'' زبیر نے کہا۔

''نوریز بتا رہا تھا کہ یہاں دفن کے لئے زمین بھی مسئلہ ہے۔''

عبدالحق جانتا تھا کہ ایبٹ آباد میں زیادہ زمین نجی ملکیت ہے۔''

''ہاں......! یہ تو ہے۔''

''نوریز کہہ رہا تھا کہ بریگیڈیئر صاحب اس معاملے میں بھی مدد کرسکتے ہیں۔ ان کا یہاں بہت اثر ورسوخ ہے۔ انہی کی مدد سے لاش بھی اسپتال میں رکھوائی گئی۔ ورنہ تدفین کرنی پڑ جاتی۔''

''تو کاکا......! ان سے مل کر ان کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔ پھر دیکھیں گے کہ کیا بنتا ہے......؟ اللہ مالک ہے......!''

وہ دونوں بریگیڈیئر ظہیر کی طرف چل دیئے۔ نوریز کو انہوں نے اسپتال روانہ کر دیا تھا۔

بریگیڈیئر ظہیر نے انہیں اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا۔ عبدالحق نے اپنا تعارف کرایا اور بولا۔

''یہ میرے بڑے بھائی ہیں...... زبیر......!''

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر......!" بریگیڈیئر صاحب نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ یہ ملاقات غم کے ماحول میں ہو رہی ہے۔ یہ کہنا تو بہت رسمی بات ہے کہ میں آپ کے غم میں شریک ہوں۔ درحقیقت کوئی کسی کے اس طرح کے غم کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔"

"میں تو جناب آپ کا بے حد شکرگزار ہوں...... آپ نے......"

"قطع کلامی پر معذرت خواہ ہوں......!" بریگیڈیئر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے لگتا ہے کہ ابھی آپ کو مزید مدد کی ضرورت ہے۔ تدفین کے سلسلے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے......؟"

"تدفین تو یہیں ہوگی جناب......!"

"قبر کا انتظام کرلیا ہے آپ نے......؟"

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہاں زیادہ تر لوگوں کے نجی قبرستان ہیں۔" بریگیڈیئر صاحب نے کہا۔

"آپ کو قبر کے لئے زمین مل سکتی ہے لیکن میرے خیال میں قبرستان زیادہ موزوں رہے گا۔ تاکہ آپ کبھی آئیں تو آسانی کے ساتھ وہاں جاسکیں۔"

"جی......! آپ نے بجا فرمایا...... لیکن یہاں......"

"یہاں ایک قبرستان ہے۔ زیادہ تر فوجی دفن ہیں وہاں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو وہاں جگہ دلوا سکتا ہوں۔"

"یہ آپ کا ایک اور احسان ہوگا مجھ پر......!"

"احسان کی کوئی بات نہیں......!" بریگیڈیئر صاحب نے کسی کو پکارا۔ ایک ملازم آیا تو انہوں نے اس سے ڈرائیور کو بلانے کو کہا اور خود فون پر کسی سے گفتگو کرنے لگے۔ ڈرائیور آیا اور خاموش کھڑا رہا۔

بریگیڈیئر صاحب فون رکھ کر واپس آئے اور زبیر سے بولے۔

"آپ کو زحمت کرنا ہوگی۔ میرے ڈرائیور کے ساتھ چلے جائیں۔ سب بندوبست ہو جائے گا۔" پھر انہوں نے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دیں۔

زبیر ڈرائیور کے ساتھ چلا گیا۔

"میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں جناب......! آپ نے ہماری غیر موجودگی میں جو مدد کی......"

"ارے......! ایسی کوئی بات نہیں...... آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایسے ملازم ملے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر اس کی وفاداری نے مجھے متاثر نہ کیا ہوتا تو شاید میں کچھ بھی نہ کرتا۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ کیسی صورتِ حال تھی......؟ ذرا سوچیں...... آپ کی دو بیویاں یہاں ملازموں کے ساتھ اکیلی رہ رہی تھیں۔ کوئی رشتہ دار ساتھ نہیں تھا۔ آپ بھی نہیں تھے اور ان میں سے ایک کو السر تھا اور دوسری ماں بننے والی تھی۔ مجھے تو یہ معاملہ بڑا مشتبہ لگا۔ میں نے اسپتال سے بھی معلوم کیا۔ دونوں کے آپریشن ہوئے تھے اور دونوں آپریشن خطرناک تھے۔ کسی ذمہ دار آدمی کی اجازت کے بغیر نہیں کئے جاسکتے تھے۔ آپ کے اس ملازم نے دونوں اجازت ناموں پر دستخط کئے۔ السر والا معاملہ تو ایسا تھا کہ فوری جان بچانے کا معاملہ تھا۔ ڈاکٹروں نے زیادہ پرواہ نہیں کی۔ لیکن میٹرنٹی کیس میں یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ وہاں ملازم نے آپ کی اہلیہ کے بھائی کی حیثیت سے دستخط کئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنے صاحب کو فون کیوں نہیں کیا......؟ اس بے چارے کے پاس آپ کا نمبر نہیں تھا...... اور آپ کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے کہا چھوٹی بیگم صاحبہ سے فون کروا لو...... اس نے کہا کہ ان کا تو خود آپریشن ہو رہا ہے۔ وہ ماں بننے والی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں نے آپ کو بہت غیر ذمہ دار سمجھا۔ لیکن اس نے وضاحت کی کہ حادثے میں آپ کی ٹانگ کا فریکچر ہو گیا تھا۔ تب میں نے اس کی مدد کی۔ ورنہ یہاں تو پولیس کیس بھی بن سکتا تھا آپ کے ملازموں کے خلاف...... اور سوچیں...... خدانخواستہ دوسری بیگم کو بھی کچھ ہو جاتا تو وہ بے چارہ کیا کرتا......؟ آپ کو کیسے خبر کرتا......؟ سچ یہ ہے میں تو اب بھی آپ کو قصوروار سمجھتا ہوں۔"

عبدالحق کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔ اتنی شرمندگی اسے زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی اور وہ کوئی صفائی بھی پیش نہیں کرسکتا تھا۔

یہ سب کچھ نوربانو کی منت کا نتیجہ تھا۔ یہ وہ کسی کو کیسے سمجھاتا......؟ اور سمجھاتا،

تب بھی قصوروار تو وہی تھا۔ کیوں اس نے نوربان کی بات مانی......؟

''جناب......! کبھی کبھی صورتِ حال ایسی بن جاتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''ادھر میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی، ادھر اماں کو یرقان ہو گیا۔ دوسرے ہمیں آخر تک نہیں بتایا گیا کہ یہاں صورتِ حال اتنی سنگین ہے۔ میں بہرحال آپ سے شرمندہ ہوں اور آپ کا شکرگزار بھی ہوں۔''

''برا نہ ماننا...... میں بڑا صاف گو آدمی ہوں۔ لیکن کسی کے کام آنے کو میں عبادت سمجھتا ہوں اور کوئی خدمت ہو میرے لائق تو میں حاضر ہوں۔''

''بہت شکریہ آپ کا......!'' عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ کے اس احسان کا تو میں کبھی صلہ نہیں دے سکتا۔''

''احسان کی بات کر کے تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو...... بھئی......! انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔''

بریگیڈیئر صاحب اسے رخصت کرنے گیٹ تک آئے۔

''مانسہرہ سے آگے گاندھیاں میں میرے ایک قریبی رشتہ دار کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ابھی وہیں جا رہا ہوں۔ آپ ذرا دیر سے آئے ہوتے تو شاید ہم نکل چکے ہوتے۔ اسی لئے میں آپ کی بیوی کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔ معذرت چاہتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں......! آپ نے جتنا کچھ کیا ہے...... وہ تدفین میں شرکت سے کہیں زیادہ ہے۔'' عبدالحق نے کہا اور ہاتھ ملا کر بنگلے سے نکل آیا۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ بریگیڈیئر صاحب کی کہی ہوئی کوئی بات اسے چبھ رہی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی خلافِ واقعہ بات تھی۔ لیکن حد سے بڑھی ہوئی شرمندگی کی وجہ سے وہ اس کی گرفت میں نہیں آئی تھی۔ اب وہ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ بار بار ذہن کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی پھسل جاتی تھی۔

وہ گھر پہنچا تو نوربانو کی لاش لائی جا چکی تھی۔

❁❁❁

رات کو وہ سب ارجمند کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ لیکن سب خاموش تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کرے......؟

اچانک ننھے بچے کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''بھوکا ہو رہا ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''نہیں......! ابھی کچھ دیر پہلے ہی دودھ پی کر سویا تھا۔'' رابعہ بولی۔

''تو پھر......؟'' حمیدہ پریشان ہو گئی۔

''کوئی تکلیف تو نہیں ہے خدانخواستہ......!''

صفیہ ہنسنے لگیں۔

''خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو آپا......! بچے پالے تمہیں برسوں ہو گئے۔ گیلا ہو گیا ہو گا......؟''

حمیدہ کھسیا گئی۔

''بات تم نے ٹھیک کہی...... میں تو سب کچھ بھول چکی ہوں۔''

رابعہ لپک کر بچے کی طرف گئی۔

''واقعی...... گیا ہو رہا ہے۔'' اس نے جلدی سے ڈائپر تبدیل کر دیا۔

بچہ پھر پرسکون ہو کر سو گیا۔ مگر اس نے ان لوگوں کو بات کرنے کے لئے موضوع فراہم کر دیا تھا۔

''کچھ اس کا نام بھی سوچا تو نے پتر......؟'' حمیدہ نے عبدالحق سے کہا۔

''ابھی تک سوچنے کی مہلت ہی کہاں ملی ہے اماں......! تمہارے ذہن میں کچھ ہو تو بتاؤ......!''

اس پر ارجمند کسمسائی۔

''میں نے بہت پہلے سے نام سوچ رکھا تھا اس کا۔''

''کیا......؟'' عبدالحق نے اس کی طرف دیکھا۔

ارجمند نے تکیے کے نیچے سے برتھ سرٹیفکیٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''برتھ سرٹیفکیٹ کے لئے نام کی ضرورت تھی۔ میں نے یہی لکھوا دیا۔'' اس

کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''اچھا نہ لگے تو تبدیل کر لیجئے گا۔''

''تیرا رکھا ہوا نام ہے...... اچھا کیوں نہیں لگے گا......؟'' حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

''بتا تو سہی......! کیا نام رکھا ہے......؟''

ارجمند سوالیہ نظروں سے عبدالحق کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اپنے منہ سے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

عبدالحق نے برتھ سرٹیفکیٹ پر نگاہ ڈالی اور بے دھیانی کی کیفیت میں دہرایا۔

''نورالحق......!''

حمیدہ چونکی۔

''اچھا نام ہے......!'' اس نے بے دلی سے کہا۔

''پر اس سے اچھا بھی رکھا جا سکتا ہے۔''

مگر دوسری طرف اس نام نے عبدالحق کے شعور کو چھو لیا تھا۔ وہ بھی چونکا تھا۔ وہ بولا۔

''نہیں اماں......! نور بانو کے بیٹے کے لئے اس سے اچھا کیا نام ہو سکتا ہے......؟ میں تمہارا شکر گزار ہوں ارجمند......!''

ارجمند کو احساس ہوا کہ بچے کے لئے یہ نام پسند کرتے وقت یہ زاویہ اس کی نظر میں نہیں تھا۔

''واقعی......! نور بانو...... نورالحق...... بے شک...... اللہ ہی ہر طرح سے رہنمائی فرماتا ہے اپنے بندوں کی۔''

''بس...... یہی نام مناسب ہے۔'' عبدالحق نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ارجمند خوش ہوگئی۔ لیکن حمیدہ نہ جانے کیوں بجھ سی گئی تھی۔

''اب آگے کیا کرنا ہے اماں......؟'' عبدالحق نے حمیدہ سے پوچھا۔

''یہ تو تیرے سوچنے کی بات ہے پتر......!''

''میں تو ابھی کچھ سوچنے کے قابل نہیں ہوں اماں......! میں یہ پوچھنا چاہ رہا

تھا کہ آپ لوگ لاہور کب جائیں گے......؟''

''آپ لوگ کا کیا مطلب......؟ تو نہیں ہوگا ہمارے ساتھ......؟''

''نہیں اماں......! میں تو کل پرسوں کراچی واپس چلا جاؤں گا۔''

''کیوں......؟''

''ابھی دفتر چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ کچھ سوچنے کا موقع ملے گا۔ پھر چھٹی لے کر لاہور آؤں گا۔ اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں کہ آپ لوگ لاہور کب واپس جائیں گے......؟''

''ابھی تو نکی سفر کرنے کے قابل نہیں ہے۔'' حمیدہ نے ارجمند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں پتا کہ کتنے دن لگیں گے۔''

''یہاں سے روانہ ہوتے وقت مجھے فون کر دیجئے گا۔'' عبدالحق نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

گزشتہ رات وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ اس وقت جسم تو نڈھال تھا لیکن آنکھوں میں اب بھی نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی بستر پر لیٹا رہا۔ لیٹنے سے کچھ آرام اور سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں پھر وہی الجھن ابھر آئی۔ بریگیڈیئر ظہیر نے کچھ ایسا کہا تھا، جو خلافِ واقعہ تھا۔

پھر اچانک وہ بات اس کی سمجھ میں آئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

واقعی...... بات تو عجیب تھی...... چونکا دینے والی...... بریگیڈیئر صاحب کی بات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ نور بانو کے انتقال کے بعد نوریز ان سے مدد مانگنے گیا اور اس نے انہیں بتایا کہ صاحب کو فون اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے پاس ان کا فون نمبر نہیں ہے اور بڑی بیگم صاحبہ مر چکی ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا اور دوسری بیگم تو فون کر سکتی ہیں۔ نوریز نے جواب میں کہا کہ وہ خود ہوش میں نہیں۔ ان کا آپریشن ہونے والا ہے۔ بریگیڈیئر صاحب کی بات سے پتا چلتا تھا کہ انہوں نے نوریز سے پوچھا ہوگا کہ انہیں کیا تکلیف ہے تو نوریز نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہیں۔

"یعنی ارجمند......؟" جبکہ بات الٹی تھی۔ نور بانو بچے کو جنم دیتے ہوئے جاں بحق ہو چکی تھی اور ارجمند کا السر کا آپریشن ہو رہا تھا۔

بریگیڈئیر صاحب کو یہ تاثر کیسے ملا......؟ بلکہ ان کے مطابق تو یہ یقینی بات تھی جو انہیں نوریز سے معلوم ہوئی۔ لیکن نوریز انہیں یہ کیسے بتا سکتا تھا......؟ یہ ایک بات سمجھ میں آتی تھی کہ یا تو نروس ہونے کی وجہ سے نوریز سے بیان کرنے میں غلطی ہوئی، یا اس نے گھبراہٹ میں بات کو الجھا دیا یا خود بریگیڈئیر صاحب کو سننے میں غلطی ہوئی اور انہوں نے بات کو الٹ کر سمجھا۔

اس نے سوچا کہ کل وہ بریگیڈئیر صاحب سے مل کر ان کی غلط فہمی کو دور کر دے گا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ وہ تو گاندھیاں جا چکے ہیں۔

اچانک اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی خود پر۔ وہ بلاوجہ اس بات کو اہمیت دے رہا ہے۔ بریگیڈئیر صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے......؟ ان کا اس معاملے سے ایسا کوئی تعلق ہی نہیں۔ ہاں......! نوریز سے وہ اس سلسلے میں ضرور پوچھے گا۔

اس پر اسے خیال آیا کہ اہم ترین بات پر تو وہ غور کر ہی نہیں رہا ہے۔ جو صورتِ حال تھی، اس میں نوریز اور اس عورت رشیدہ پر جو گزری ہوگی، وہ اصل بات ہے۔ ان بے چاروں نے وہ بوجھ اٹھایا، جو ان کا تھا ہی نہیں۔ وہ صرف غیر معمولی انعام کے ہی نہیں، غیر معمولی عزت کے مستحق ہیں۔ اب وہ ملازم تو نہیں رہے۔ وہ تو محسن ہو گئے۔

پھر اسے بریگیڈئیر صاحب کے سامنے اپنی شرمندگی یاد آئی۔ اور اپنی خواب گاہ کی تنہائی میں، خاص خنکی ہونے کے باوجود وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ اپنا چہرہ خود اسے تمتماتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ"

اس نے زیرِ لب کہا۔

"بے شک......! عزت ذلت اللہ کے اختیار میں ہے۔"

"اور الحمدللہ......! اس نے ہمیشہ مجھے عزت سے نوازا اور میری بداعمالیوں

کے باوجود مجھے ذلت سے بچایا۔"

اس نے غور کیا۔ یاد کیا۔ سچ تو یہی تھا کہ اس کی زندگی میں کبھی عام سی معمولی شرمندگی کے لمحے آئے ہوں گے۔ اور وہ قابل ذکر بھی نہیں تھے کہ یاد تک آئے۔ لیکن جو شرمندگی اسے ظہیر صاحب کے سامنے ہوئی، اس کا تصور بھی اس کے لئے باعث شرمندگی تھا۔ اور پوری طرح اس کا مستحق بھی تھا۔

گھر میں اماں تھیں، زبیر بھائی، رابعہ آپا اور ساجد تھے۔ وہ خود بھی تھا۔ اس نے کیسے اپنی دو بیویوں کو محض ایک ملازم کے ساتھ گھر سے اتنی دور بھیج دیا۔ اب یہ سوچ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایسا کیا۔ اور اس احساس کے ساتھ شرمندگی ہو رہی تھی۔

اور وہ بھی اس حال میں کہ اس کی ایک بیوی زندگی میں پہلی بار ماں بننے والی تھی۔ ایسے میں تو بہت خیال رکھنا ہوتا ہے۔ بہت احتیاط کی جاتی ہے۔ اماں نے بھی یہی بات کہی تھی۔

اب وقت گزرنے کے بعد اپنی غلطیاں بہت واضح اور بڑی بڑی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ارجمند کو لے جانے کی اجازت دی نور بانو کو، اور ارجمند سے اس کی مرضی تک نہیں پوچھی۔ وہ ارجمند کو کیا سمجھتا ہے......؟ کوئی کنیز......؟

اور وہ نور بانو کی احمقانہ منت کا پابند ہو گیا۔ اماں اس وقت حق نگر میں تھیں۔ مگر وہ رابعہ آپا کو تو ساجد کے ساتھ وہاں بھیج سکتا تھا۔ اس کا تو اسے خیال بھی نہیں آیا۔ وہ کوئی منع تو نہیں کر دیتیں۔

اور یہ خیال اسے بعد تک نہیں آیا کہ اماں کو نہ سہی، رابعہ آپا کو ہی ایبٹ آباد بھیج دے۔

مگر یہ خیال تو اماں کو بھی نہیں آیا۔ ذہن میں خیال ابھرا۔

لیکن وہ اس کے لئے احتساب کی رات تھی۔ اس نے خود کو جھڑک دیا۔

"دوسروں پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالنے کا یہ کھیل چھوڑو عبدالحق......! اور حقائق کا سامنا کرو......!"

نور بانو کی یہ سراسر بے انصافی تھی۔ زیادتی تھی کہ اس نے ارجمند کو ساتھ

لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ارجمند تو نئی نویلی دُلہن تھی۔ اسے تو اصولاً اس کے ساتھ کراچی جانا چاہئے تھا۔

"یہ بات تو میں نے نور بانو سے کہی بھی تھی۔" اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

لیکن اس وقت تک اس کے اندر کا محتسب پوری طرح جلال میں آ چکا تھا۔

"بکواس......! کہنے سے کیا ہوتا ہے......؟ بات تو فیصلہ کرنے کی ہے۔"

"واقعی......!" اسے تسلیم کرنا پڑا۔

"میں نے ارجمند سے پوچھا تک نہیں۔ میں نے نور بانو سے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ اپنے ساتھ رابعہ آپا کو لے جا سکتی ہے۔"

فیصلہ کرنے کا حق اس کا تھا۔ وہ تو نور بانو کو بھی جانے سے روک سکتا تھا۔

لیکن اس نے نور بانو کی ہر بات مان لی۔ ناروا ہوتے ہوئے بھی۔ کیوں......؟

اس لئے کہ نور بانو کو یقین دلانا تھا کہ وہ صرف اسی سے محبت کرتا ہے۔ وہ اسے رقابت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اگر ایسا تھا تو ارجمند سے شادی ہی نہیں کرنی تھی۔" محتسب نے لتاڑا۔

"اب یہ سوچو کہ نور بانو کی ہر بات مان کر تمہیں کیا ملا......؟ یہ شرمندگی......؟ اور نقصان الگ...... کتنے لوگوں نے تمہارے کئے کی سزا بھگتی......؟ ارجمند نے...... نوریز نے...... اس عورت رشیدہ نے...... اور اس کی بچی نے...... سب سے بڑی بات یہ کہ نور بانو کو ہی کیا فائدہ ہوا اس سے......؟ الٹا نقصان ہی ہوا اسے بھی...... یہ ہے تمہاری محبت......؟"

اس لمحے عبدالحق کی سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔ اسے بہت کچھ یاد آیا۔ نور بانو کی محبت میں کیا کیا کچھ ہوا......؟ کتنے موقعوں پر اس نے کیا کیا کچھ کھویا......؟

اگر اللہ کی رحمت ساتھ نہ ہوتی تو وہ نہ جانے کہاں پہنچا ہوتا......؟ یہ ہوتی ہے محبت......؟

اسی رات اس کی سمجھ میں ایک نکتہ آ گیا۔ محبت کسی بندے کی ہو تو زیاں ہی زیاں...... وہ تو کمزور کر دیتی ہے آدمی کو۔ اس کے برعکس اللہ کی محبت صرف طاقت

دیتی ہے، توانائی، سیدھا راستہ، نیک اعمال، عزت، شرمندگی نہیں۔ سرخ روئی، فلاح ہی فلاح، خیر ہی خیر۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے نماز پڑھ کر اللہ سے توبہ کرنی تھی۔ اور اللہ کی محبت مانگنی تھی۔ ورنہ وہ جانتا تھا کہ یہ احساسِ زیاں اور شرمندگی عمر بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

❀❀❀

فجر کے وقت وہ اٹھا تو زیادہ نیند تو نہیں لے سکا۔ لیکن وہ گہری اور پرسکون نیند تھی۔ اور وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ فجر کی نماز کے لئے نکلا تو تازہ ہوا نے جیسے سینے میں روشنی سی بھر دی۔ اچھی خاصی خنکی تھی۔ لیکن وہ بری نہیں لگ رہی تھی۔

وہ منظر بھی کراچی سے مختلف تھا اور فضا بھی۔ یہاں پہاڑ تھے، موسم بہار تھا۔ خزاں کے نشان مٹ چکے تھے۔ ہر طرف سبزہ تھا۔

وہ ٹہلتا ہوا قبرستان کی طرف چلا گیا۔ اس نے نور بانو کی قبر پر فاتحہ خوانی کی اور کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ احساسِ زیاں پھر ستانے لگا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ نور بانو ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی ہے اور اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔

اسے اپنے سینے میں خلا سا محسوس ہونے لگا۔ کیا یہ خلا کبھی بھر پائے گا......؟

ناشتے کے بعد اس نے رشیدہ کو اپنے پاس بلایا۔ وہ آئی اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" عبدالحق نے اس سے کہا۔

"لیکن تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے......!"

"ایسی بات نہ کریں صاحب......! وہ تو ہمارا فرض تھا۔ اس کی ہم تنخواہ لیتے تھے۔"

"نہیں......! تم نے جو کچھ کیا...... وہ تمہارے فرض سے بہت زیادہ تھا۔" عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں ہمیشہ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ناشکرے پن اور احسان فراموشی سے محفوظ رکھے۔ ہم تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔"

"یہ تو آپ کا بڑا پن ہے صاحب......!ورنہ ہم اس قابل کہاں......؟"
رشیدہ نے عاجزی سے کہا۔

"اچھا......!اب تم جاؤ......!میں تم سے پھر بات کروں گا۔"

عبدالحق کے ذہن میں ایک خیال تھا۔ یہاں نوربانو اور ارجمند کا ایک اکاؤنٹ تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس اکاؤنٹ میں موجود تمام رقم وہ رشیدہ اور نوریز کے درمیان بانٹ دے گا۔

وہ ارجمند کے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت وہ کل سے بہتر لگ رہی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری......؟" اس نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے......!کل کے مقابلے میں اور بہتر ہے۔"

"الحمدللہ......!"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ عبدالحق کو محسوس ہوا کہ اس کے اور ارجمند کے درمیان جیسے کچھ فاصلہ سا پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ دوری سی ہے۔ اس احساس کو دور کرنے کے لئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

حمیدہ بھی وہاں موجود تھی اور اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری چیک بک کہاں ہے......؟" عبدالحق نے ارجمند سے پوچھا۔

ارجمند نے ذہن پر زور دیا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے رشیدہ سے چیک بک منگوائی تھی اور اس کے بعد واپس الماری میں رکھوانے کے بجائے اپنے تکیے کے نیچے ہی رکھ لی تھی۔

اس نے تکیے کے نیچے سے چیک بک نکال کر عبدالحق کی طرف بڑھا دی۔

عبدالحق نے چیک بک کا جائزہ لیا۔ کل پانچ چیک کاٹے گئے تھے۔ ہر کاؤنٹر فائل پر ارجمند کی صاف ستھری تحریر میں تفصیل درج تھی کہ کتنی رقم تھی، کتنے کا چیک کاٹا گیا اور کتنی رقم اکاؤنٹ میں موجود ہے۔

آخری چیک ایک ہزار کا تھا اور رقم دو دن پہلے نکالی گئی تھی۔ یعنی نوربانو کے انتقال کے اگلے روز اور اکاؤنٹ میں موجود رقم سات ہزار دو سو روپے تھی۔

"یہ تمہارا اور نوربانو کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔

"عبدالحق نے کہا۔

"نوربانو کے بعد اب یہ تمہارا ہے۔ اس میں موجود رقم کے بارے میں میرے ذہن میں کچھ ہے۔ میں تم سے اسے خرچ کرنے کی اجازت مانگ رہا ہوں۔ اتنی ہی رقم میں لاہور میں تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں گا۔"

"کیسی غیریت کی بات کر رہے ہیں آغا جی......!" ارجمند تڑپ گئی۔

"سب کچھ اللہ کا......اور اس کے بعد آپ ہی کا ہے۔ آپ کو اجازت کی کیا ضرورت......؟"

وہ ایسا مشترکہ اکاونٹ تھا کہ دونوں میں سے کسی کے بھی دستخط سے رقم نکلوائی جا سکتی تھی۔

"تو تم ایسا کرو کہ سات ہزار کا چیک لکھ کر مجھے دے دو۔" عبدالحق نے کہا۔

ارجمند نے خاموشی سے چیک لکھا اور دستخط کر کے عبدالحق کی طرف بڑھا دیا۔ پھر وہ کاؤنٹر فائل کی خانہ پوری میں مصروف ہو گئی۔

عبدالحق جانے کے لئے اٹھا تو حمیدہ نے اسے ٹوک دیا۔

"کیا بات ہے پتر......!اپنے بیٹے سے نہیں ملے گا......؟"

"خیال ہی نہیں رہا اماں......!" عبدالحق نے معذرت کی۔

حمیدہ نے بچے کو اس طرف بڑھا دیا۔ عبدالحق نے بچے کو گود میں لیا اور اسے دیکھنے لگا۔

"کیسے ہو بیٹے......نورالحق......!"

بچہ اسے نظر جما کر دیکھتا رہا۔

"اللہ کی مہربانی دیکھی......!" حمیدہ نے کہا۔

"ابھی سے اس کی نظر ٹھہری ہوئی ہے......ماشاءاللہ......!ورنہ اتنے چھوٹے بچے نظر جما کر نہیں دیکھتے۔"

"الحمدللہ......!" عبدالحق نے زیر لب کہا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ

"کیسی عجیب بات ہے کہ یہ نوربانو کا بچہ ہے اور صورت ہو بہو ارجمند کی

ہے۔ نور بانو سچ مچ ارجمند کو بہت چاہتی ہوگی۔ شاید اسے ہی ہر وقت نظروں کے سامنے رکھتی ہوگی۔ اسی لئے اسے اپنے ساتھ ایبٹ آباد لائی۔ کچھ اسے بہت خوب صورت بچے کا ارمان بھی تھا۔ خود کو تو وہ بدصورت سمجھتی تھی۔''

ارجمند بھی تو نور بانو کو بہت چاہتی تھی۔ اس کے دل نے کہا۔

''کیسی عجیب بات ہے کہ اس نے بچے کا نام اس کی ماں کے نام پر رکھا۔ نور الحق...... یہ بھی تو محبت کی دلیل ہے۔ کیسا اچھا نام سوچا ہے اس نے......!''

اس نے بچے کو خاموشی سے حمیدہ کی گود میں دیا اور کمرے سے نکل آیا۔ کن انکھیوں سے اس نے دیکھا۔ حمیدہ بچے کے چہرے کو وارفتگی سے چوم رہی تھی۔

''مجھے اپنے بیٹے پر ایسا پیار کیوں نہیں آتا......؟'' اس نے سوچا مگر فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

❀❀❀

بینک سے رقم نکلوا کر اس نے اس کے دو حصے کئے اور ایک کو شرٹ کی اور دوسرے کو پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ باہر آیا۔ نوریز نے اس کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر کے وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔

''چلیں صاحب......؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''نہیں......! ذرا رکو...... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

نوریز کچھ گھبرا گیا۔ اسے لگا کہ شاید صاحب کسی معاملے میں جواب طلبی کر رہے ہیں۔

''جی صاحب جی......!''

''تم نے جو کچھ کیا...... وہ کوئی بھائی ہی کر سکتا تھا۔ کاش میں تمہیں بھائی سمجھ سکتا۔''

نوریز نے پہلی بار اسے اتنا جذباتی دیکھا تھا۔

''میں جو ہوں...... وہی میرے لئے بہت بڑی عزت ہے صاحب جی......!''

''میں سمجھتا...... لیکن اس سے پہلے ہی تم ارجمند کے بھائی بن چکے تھے۔ تم نہ ہوتے تو......''

''زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے صاحب جی......! ایسے ہی ہونا تھا۔'' نوریز نے سادگی سے کہا۔

''لیکن اب تم ہمیشہ ارجمند کے بھائی ہی رہو گے۔ ہم سب یہی سمجھیں گے تمہیں۔''

نوریز سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

عبدالحق نے جیب سے ساڑھے تین ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''یہ کیا سر جی......؟'' نوریز نے حیرت سے کہا۔

''یہ رکھ لو......! اس میں میری خوشی ہے۔''

نوریز کے اندر نہ جانے کہاں سے جرأت آ گئی۔

''ابھی آپ نے مجھے بہت بڑی عزت دی صاحب......! آپ نے کہا کہ آپ ہمیشہ مجھے چھوٹی بی بی کا بھائی سمجھیں گے۔ پر آپ نے سمجھا نہیں...... مجھے گلہ ہے آپ سے صاحب جی......!''

''میں نے غلط نہیں کہا نوریز......!''

''چھوٹی بی بی کا سچ مچ کوئی بھائی ہوتا اور یہی سب کچھ کرتا تو آپ اسے یہ انعام دیتے......؟''

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔

''یہ انعام نہیں......!''

''نوکر سمجھ لیں صاحب جی......! تو میں یہ لے لوں گا۔''

عبدالحق لاجواب ہو گیا۔

''یہ تمہاری بڑی بیگم صاحبہ کے ہیں۔ سوچا تھا تمہیں اور رشیدہ کو دے دوں گا۔''

''صاحب جی......! چھوٹی بی بی کا بھائی تو یہ نہیں لے سکتا۔ آپ یہ بھی رشیدہ

کو دے دیں۔ وہ نہ ہوتی تو پتا نہیں کیا ہوتا......؟'' نوریز جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

''مجھے تو صاحب......! وہ اچھی نہیں لگی تھی۔ پر اس نے جو کچھ کیا، وہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا بہت بڑا حق ہے صاحب جی......!''

''ٹھیک ہے......! اب چلو......!''

''کہاں چلنا ہے صاحب جی......!''

''گھر چلو......!''

نوریز نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

❁❁❁

عبدالحق نے وہ پورے سات ہزار رشیدہ کی طرف بڑھا دیئے۔

لیکن رشیدہ کا ہاتھ نہیں بڑھا۔

''یہ کیا ہے صاحب......؟''

''میری خوشی ہے۔ تمہارا انعام......!''

''جہاں سوگ ہو، غم ہو صاحب......! وہاں انعام کیسا......؟''

عبدالحق کے لئے شاید وہ دن ہی لاجواب ہونے کا تھا۔ اس عورت نے اسے حیران کر دیا۔

''غم اور سوگ سے کیا فرق پڑتا ہے......؟ خوشی بھی تو دی ہے اللہ نے...... اور جو اس نے واپس لیا، وہ بھی اس کا دیا ہوا تھا۔ تو خوشی زیادہ بڑی ہے نا......! یہ رکھ لو...... اس میں میری خوشی ہے۔''

رشیدہ کو لگا کہ جو کچھ اس نے ارجمند سے سیکھا تھا، اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تو سبھی بہت اچھے لوگ تھے۔ موقع غنیمت تھا۔ اس نے اپنی بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا وعدہ تو وہ ارجمند سے لے چکی تھی۔ مگر اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ اصل فیصلہ تو صاحب کریں گے۔

''انعام تو میں منہ مانگا لوں گی صاحب......!''

''انشاء اللہ دوں گا......!'' عبدالحق کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

''لیکن پہلے یہ لینا ہوگا۔'' عبدالحق نے اس رقم کے لئے نیت کر لی تھی۔ اس

لئے جلد از جلد یہ رقم دے دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ منہ مانگے انعام سے بھی ڈر رہا تھا۔

کون جانے...... وہ کیا مانگ لے......؟ آدمی کی بساط ہی کتنی ہوتی ہے......؟

رشیدہ ہچکچائی، چند لمحے سوچتی رہی۔ وہ رقم اسے بہت بڑی لگ رہی تھی۔ اپنے تصور سے بھی بہت زیادہ۔ پھر بالآخر اس نے ہاتھ بڑھایا اور نوٹوں کی وہ گڈی لے لی۔

''یہ بہت زیادہ ہے صاحب......!''

''جتنا بھی ہے، اب یہ تمہارا ہے۔ آدھا تمہارا اور آدھا تمہاری اس بیٹی کی شادی کے لئے۔ جو یہاں تمہارے ساتھ ہے۔''

''شکریہ صاحب......!''

''اور اب منہ مانگا انعام......؟'' عبدالحق نے اسے یاد دلایا۔

''صاحب جی......! مجھے اور میری بیٹی کو بی بی صاحبہ کے قدموں میں جگہ چاہئے۔ میں ساری عمر ان کے اور آپ کے بیٹے کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں اب ان دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

منہ مانگے انعام کے تصور سے خوفزدہ عبدالحق حیران رہ گیا۔ پھر اس کے دل میں اس عورت کے لئے ایسی محبت ابھری، جس پر اسے اپنے باپ کی حمیدہ سے محبت یاد آ گئی۔ وہاں بھی احسان کا رشتہ تھا اور یہاں بھی۔ وہاں بھی ایک بچے کی محبت تھی اور وہ بچہ وہ خود تھا۔ یہاں بھی ایک بچے کی محبت تھی اور وہ بچہ اس کا بیٹا تھا۔ اور یہاں اماں سب کچھ کھو کر اس کے ساتھ ہیں۔ اور اب اس کے بچے میں مگن اور خوش۔

''تو کیا وہ پرانی کہانی دہرائی جا رہی ہے......؟ کتنا عجیب ہے یہ سب......؟''

اس کے استغراق سے رشیدہ کو مایوسی ہوئی۔ وہ سمجھی کہ اس کی التجا رد کی جا رہی ہے۔ اسے صدمہ ہوا۔ کیونکہ یہ اس کی توقع کے برعکس تھا۔ اس نے نوٹ عبدالحق کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ رکھ لیں صاحب......! منہ مانگے انعام کے بغیر یہ میں نہیں لے سکتی۔''

عبدالحق بے ساختہ مسکرا دیا۔
''غلط سمجھیں تم......! میں نے تمہیں انکار کب کیا......؟ ایک پرانی بات یاد آ گئی تھی۔ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ تمہارا اس بچی کے سوا کوئی نہیں ہے......؟''
''ایسے نہ کہیں صاحب......! سب ہیں...... کچھ اپنے گھر کے ہو گئے، کچھ ہونے والے ہیں۔''
عبدالحق کی حیرت اور بڑھ گئی۔
''تو تم چھوڑ دو گی سب کو......؟''
''یہاں سب کچھ ہے صاحب......! ہمارے مرد اس کے لئے بڑے شہروں میں جاتے ہیں۔ میں سوچوں گی کہ اپنے گھر میں میں...... بلکہ میں تو اپنے گھر کا مرد ہی ہوں صاحب......! پھر آپ نے اتنی بڑی مہربانی کی ہے صاحب......!'' اس نے اس کے دیئے ہوئے نوٹ لہرائے۔
''ہمارے پاس زمین تھی، جو گروی پڑی ہے۔ وہ چھڑا لیں گی، کچھ اور زمین بھی مل جائے گی۔ بیٹے اس پر فصل کریں گے۔ سب خوش رہیں گے صاحب......! کبھی یاد کریں گے تو آٹھ دس دن کی چھٹی دے دیجئے گا۔''
''جو تمہاری مرضی......! مجھے تو منہ مانگا انعام دینا تھا تمہیں...... میں انکار تو نہیں کروں گا۔''
''شکریہ صاحب......! آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔ ہماری تو زندگی سنوار دی اللہ نے جی...... آپ لوگوں کے طفیل۔''
عبدالحق ہمیشہ کی طرح کھسیا گیا۔
''ٹھیک ہے...... اب تم جاؤ......!'' اپنی تعریف سن کر ہمیشہ اس کا یہی حال ہوتا تھا۔
رشیدہ چلی گئی۔
کرنے کو وہاں کچھ نہیں تھا۔ حمیدہ اس کے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر وہ اس سے باتیں کرتا رہا۔ لیکن سچ یہ تھا کہ بات کرنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ عجیب سی سوگواری ذہن پر مسلط تھی۔

حمیدہ نے بھی یہ بات محسوس کر لی۔ تاہم جاتے جاتے اس نے پوچھا۔
''تو یہاں کب تک رہے گا پتر......؟''
عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔
''تمہاری اجازت ہو اماں......! تو آج ہی نکل جاؤں......! کل دفتر چلا جاؤں......!''
''اتنی جلدی......؟''
''اس کی وجہ ہے اماں......!'' عبدالحق نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
''یہ صرف ایک دن کی چھٹی ہو گی۔ پھر جب آپ لوگ لاہور جائیں گے تو میں زیادہ دن کے لئے وہاں آ سکوں گا۔ اور یہاں کرنے کو ہے ہی کیا اب......؟''
اس کی بات حمیدہ کے دل کو لگی۔ جی تو اس کا چاہا کہ کہے۔ یہاں اس کا بیٹا ہے، جو مدت کی آرزو کے بعد اللہ نے دیا ہے۔ لیکن وہ سمجھتی تھی کہ ابھی نور بانو کا غم تازہ ہے۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگے گا۔ اسے خود کو سنبھالنے کے لئے، اس بہت بڑے صدمے کے اثر سے نکلنے کے لئے مہلت چاہئے۔ انشاء اللہ لاہور آئے گا تو بہتر ہو گا۔
لیکن یہ سوچ کر اس کا دل تڑپا کہ کراچی میں اکیلا ہو گا۔ سب لوگوں کے درمیان دکھ آسانی سے دور ہو سکتا ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بچے کو دیکھ کر اسے نور بانو یاد آتی رہے گی۔
عبدالحق متوقع نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
بالآخر حمیدہ نے فیصلہ کر لیا۔
''ٹھیک ہے پتر......! یہ زیادہ مناسب ہے۔''
حمیدہ کے جانے کے بعد اس نے راولپنڈی فون کیا۔ خوش قسمتی سے کراچی جانے والی ساڑھے نو بجے کی فلائٹ پر اسے سیٹ مل گئی۔ اس نے سوچا۔ پانچ ساڑھے پانچ بجے یہاں سے راولپنڈی کے لئے نکلے گا۔
ابھی اس کے پاس تقریباً 6 گھنٹے تھے۔ ذہن کی خلش پھر ستانے لگی تو وہ اسے دور کرنے کی غرض سے کمرے سے نکلا اور باہر سرونٹ کوارٹرز کی طرف چل دیا۔
نوریز باہر ہی مل گیا۔ وہ گاڑی کی صفائی میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر بولا۔

''کہیں جانا ہے صاحب......؟''

''اس وقت تو نہیں......شام کو مجھے راولپنڈی چھوڑ کر آنا۔''

''بہت بہتر صاحب......!''

''ذرا میرے ساتھ آؤ......! کچھ بات کرنی ہے تم سے......!''

نوریز چوکنا ہو گیا۔ عبدالحق کے لہجے میں اسے کوئی خاص بات محسوس ہوئی۔ اسے احساس بھی تھا اور یاد بھی تھا کہ اس پر ایک بہت اہم بات چھپانے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ جھوٹ بولنا اس کے لئے آسان نہیں تھا۔

وہ خاموشی سے عبدالحق کے پیچھے چل دیا۔

عبدالحق اسے عقبی لان میں لے گیا۔ وہاں لان چیئرز پڑی تھیں۔

''آؤ بیٹھو......!'' عبدالحق نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں صاحب......! آپ حکم کریں۔''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اب تمہاری حیثیت بدل گئی ہے۔'' عبدالحق نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

نہ جانے کیوں وہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔

''اس لئے تمہیں انعام دینے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ بیٹھ جاؤ......!''

نوریز خاموشی سے بیٹھ گیا۔

عبدالحق کو اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہو گیا۔ وہ کبھی اس طرح بات کرنے والا تھا بھی نہیں۔

''میں شرمندہ ہوں نوریز......! مجھے تم سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں صاحب......!'' نوریز نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں صاحب......! آپ ہر طرح سے مجھ سے بڑے ہیں۔ مجھے آپ کی کوئی بات کبھی بری نہیں لگے گی۔ آپ کا مجھ پر حق ہے صاحب......!''

''چلو......ٹھیک ہے......! مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا۔''

''جی صاحب......! پوچھیں جی......!'' نوریز کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔ کوئی بات ضرور تھی۔

عبدالحق نے بریگیڈیئر ظہیر کی گفتگو دہرا دی۔

''یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' آخر میں اس نے کہا۔

نوریز کی چھٹی حس نے اسے پہلے سے تیار نہ کر دیا ہوتا تو وہ اپنے چہرے کا تاثر نہ چھپا پاتا۔ ایک لمحے میں پول کھل جاتی۔ چوکنا ہونے کے باوجود اپنا چہرہ بے تاثر رکھنا آسان نہیں تھا۔

عبدالحق غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا کہ نوریز ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اور نوریز کو یاد تھا کہ اس نے بریگیڈیئر صاحب سے یہی کچھ کہا تھا اور سچ کہا تھا۔ اس وقت اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ اس سے حقیقت چھپانے کو کہا جائے گا۔ وہ اور کیا کہہ سکتا تھا......؟ اسے حیرت تھی کہ بریگیڈیئر صاحب نے اس کی بات ایسے یاد رکھی۔

سوال یہ تھا کہ اب وہ کیا کہے......؟

یہ کہنا بہت آسان تھا کہ بریگیڈیئر صاحب کو سننے میں غلطی ہوئی۔ لیکن......

وہ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک پل میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ کہنا غلطی ہو گی۔ صاحب آج جا رہے ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب سے ان کی ملاقات نہیں ہو گی۔ لیکن کبھی بھی ہو سکتی ہے۔ اور بریگیڈیئر صاحب اسپتال سے تصدیق بھی کرا سکتے ہیں۔ صاحب خود بھی اسپتال جا کر معلوم کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں بات کھل جائے گی۔

''تو پھر کیا کیا جائے......؟''

''کیا ہوا نوریز......؟ تم نے جواب نہیں دیا......؟'' عبدالحق نے اسے چونکا دیا۔

ایسے میں قدرت نے ہی اس کی مدد کی۔ بعد میں اسے نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ یہ بات تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اتنا عقل مند کب ہے......؟

''یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں صاحب......!'' اس نے کہا۔

''کوشش کا کیا مطلب......؟ بات اتنی سی ہے کہ تم نے ایسا کہا یا نہیں کہا......؟''

''وہ بڑا پریشانی کا ٹائم تھا صاحب......! میرا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کی...... ان کو اسپتال والے نہ رکھتے تو آپ کے بغیر تدفین کرنی پڑتی ان کی...... اب مجھے یاد نہیں آتا صاحب......! کہ میں نے بریگیڈیئر صاحب سے کیا کہا......؟ پر اتنا سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ میں تو گھبرایا ہوا تھا صاحب......! میں ہی الٹا بول گیا ہوں گا۔ پر صاحب......! اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟''

عبدالحق مطمئن ہو گیا۔ الٹا اسے نوریز پر ترس آنے لگا۔

''واقعی...... جو صورت حال تھی، اس میں آدمی کو بات کرتے ہوئے ہوش رہ سکتا ہے بھلا......؟ بات اتنی بڑی...... پھر وہ نوکر آدمی...... بریگیڈیئر صاحب سے مرعوب بھی ہوگا۔ ڈر رہا ہوگا کہ پتا نہیں بات بنتی بھی ہے یا نہیں...... منہ سے الٹی بات نکل گئی ہوگی۔''

اس کی ذہنی خلش دور ہو گئی۔

''نہیں نوریز......! کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا...... تم جاؤ......! پانچ بجے گاڑی تیار رکھنا۔''

''جی صاحب......!'' نوریز جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بس چلتا تو وہ بھاگ جاتا۔

❁❁❁

نوریز کے بجائے زبیر عبدالحق کو راولپنڈی لے کر گیا۔ راستے میں دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو کیا، وہ یک طرفہ بات تھی۔ زبیر عبدالحق کو کاروباری معاملات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ لیکن اسے پتا تھا کہ عبدالحق پوری توجہ سے نہیں سن پا رہا ہے۔

''حق نگر میں جو کچھ آپ نے حکم دیا تھا کاکا......! سب ہو گیا۔ اسکول کالج

بھی...... اور دستکاری کا سینٹر بھی۔''

''مجھے حیرت نہیں ہوئی بھائی......! مجھے یقین تھا اس کا۔''

''اللہ نے اس میں بھی نفع ڈال دیا کاکا......! ہم اب ان مصنوعات کو ملک سے باہر بھی بھیج رہے ہیں۔ اس میں نفع بہت زیادہ ہے۔''

''تو کام کرنے والوں کو اجرت بھی زیادہ دے رہے ہیں کہ نہیں......؟''

زبیر کو خوشی ہوئی کہ اب عبدالحق پوری طرح اس کی متوجہ ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دوسرے لوگ کہتے ہیں کاکا......! کہ ہم نے کاریگروں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اب آپ خود سمجھ لیں۔''

''اللہ کا شکر ہے بھائی......!''

''اور منافع کا ایک حصہ ہم حق نگر میں فلاحی کاموں پر صرف کرتے ہیں۔''

''الحمدللہ بھائی......!''

زبیر کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

عبدالحق تو تھا ہی خاموش۔ باقی سفر خاموشی میں کٹا۔ بالآخر گاڑی ائیر پورٹ کے باہر رکی۔

زبیر نے عبدالحق کا بیگ اٹھایا تو عبدالحق نے اسے ٹوکا۔

''بس بھائی......! آپ یہیں سے لوٹ جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ واپسی کا سفر آپ آدھی رات کو کریں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کاکا......! اتنے دنوں کے بعد تو آپ کا ساتھ ملا ہے۔''

''پہاڑی راستے کا سفر......!''

''آیئے نا......!'' زبیر نے اس کی بات کاٹ دی اور بیگ لے کر آگے چل دیا۔

عبدالحق نے کاؤنٹر سے اپنا ٹکٹ اور بورڈنگ کارڈ لیا اور ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چل دیا۔ زبیر بیگ اٹھائے ہوئے اس کے ساتھ تھا۔

وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

"میں تو کہتا ہوں بھائی......! آپ اب واپس چلے جائیں۔"

"آپ خوامخواہ گھبرا رہے ہیں کاکا......! ابھی ہم لاہور سے آدھی رات کو ہی تو چلے تھے ایبٹ آباد کے لئے۔" زبیر نے کہا۔

"وہ اور برا تھا۔ رات بھر کا نیند اور طویل ڈرائیونگ کے بعد اس علاقے کا سفر۔" عبدالحق نے کہا۔

اب زبیر کو وہ بات کرنے کا بہانہ مل گیا، جو وہ کرنا چاہ رہا تھا۔

"موت تو اللہ کا حکم ہے نا کاکا......! وقت مقرر ہے۔ اس سے پہلے تو نہیں آ سکتی۔"

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وہ اپنے مولوی صاحب کے ساتھ وقت گزارتا ہوں نا......!" زبیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں...... کاکا......! آپ تو جانتے ہیں کہ بات کرنی مجھے نہیں آتی۔ جو آپ کا نقصان ہوا۔ اس کا مجھے بھی بہت دکھ ہے۔ منجھلی بی بی ہماری بھی بہت کچھ تھیں کاکا......!"

عبدالحق کو اس پر پیار آ گیا۔ اس نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے بھائی......! میں آپ کو خود سے الگ کب سمجھتا ہوں......؟ نقصان صرف میرا نہیں...... ہم سب کا ہی تھا۔ پر اللہ کی مرضی میں کس کا دخل......؟"

"سچ کہا کاکا......! اور صبر بھی تو وہی دیتا ہے۔"

"بے شک بھائی......!"

عبدالحق نے محسوس کیا کہ زبیر اور بھی کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کیا...... اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کہے گا نہیں...... اور یہ اچھا ہی تھا۔

وہ تو ویسے ہی ان سے شرمندہ تھا۔ اتنی اپنائیت کا دعویٰ وہ کرتا تھا۔ لیکن نور بانو اور ارجمند کو ایبٹ آباد بھیجتے ہوئے اس نے ان سے رسماً بھی نہیں پوچھا۔ ورنہ وہ دونوں وہاں اتنی اکیلی تو نہ ہوتیں۔ کچھ نہیں تو رابعہ اور ساجد ہی وہاں چلے جاتے۔

"اب پچھتاووں کے سوا رکھا ہی کیا ہے......؟" عبدالحق نے اداسی سے

سوچا۔

فلائٹ کا اناؤنس منٹ ہوا تو وہ اٹھا۔

"میں چلتا ہوں بھائی......!"

"اپنا خیال رکھنا کاکا......! اور اب اکیلے رہنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔"

عبدالحق نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی......!" اس نے آہستہ سے کہا۔ پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

"جو آپ نے نہیں کہا۔ وہ بھی مجھے معلوم ہے اور میں اس پر شرمندہ ہوں آپ سے۔"

زبیر ہڑبڑا گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں کاکا......! شرمندہ تو اب میں ہو رہا ہوں۔"

عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ کی شکایت بجا ہے۔ پر کیا کروں......؟ آدمی تو خطا کا پتلا ہے۔ غلطی تو ہو جاتی ہے نا......!"

"ارے نہیں کاکا......!"

عبدالحق نے اس کا ہاتھ تھاما اور چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔

"آپ میرے گھر کا فرد ہیں بھائی......! میرے بڑے بھائی......!" آپ کی عاجزی سے یہ رشتہ تھوڑا ہی بدلے گا۔ آپ اپنا حق استعمال نہ کریں۔ لیکن مجھے تو شرمندگی ہوگی۔"

زبیر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"بس کریں کاکا......!"

عبدالحق پلٹا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔

❁❁❁

تکلیف بھی کم ہوئی، کمزوری بھی۔ رشیدہ جو کھلا پلا رہی تھی۔ اس میں بڑی

تاثیر تھی۔ پھر ٹانکوں سے بھی نجات مل گئی۔ لیکن ایک اور تکلیف شروع ہوگئی۔ اور وہ بڑی اذیت ناک تھی۔ اور وہ تکلیف تھی چھاتیوں میں۔

ارجمند نے اس کا تذکرہ رشیدہ سے کیا۔

رشیدہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے سر اٹھاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''یہ سب تو ہوگا۔ آپ کو پتا ہی نہیں بی بی صاحبہ......! آپ نے جو نبھانے کا سوچا ہے، وہ کتنا مشکل ہے......؟''

''صاف صاف کہو نا......!''

''اللہ نے آپ کے سینے میں بچے کے لئے جو دودھ اُتارا ہے نا...... یہ اسی کی تڑپ ہے۔ آپ کو دودھ پلائے بغیر چین نہیں آئے گا۔ بڑی تکلیف ہوگی۔''

''وہ تو ہو رہی ہے۔ سب کو ہوتی ہے کیا......؟''

''ہوتی سب کو ہے...... کسی کو کم کسی کو زیادہ۔'' رشیدہ نے کہا۔

''پھر آپ کو بہت زیادہ ہوگی۔''

''کیوں......؟''

''امانت دار زیادہ ہیں نا......! دہری تکلیف ہوگی آپ کو...... اپنی طلب بھی اور حق دار کو حق نہ پہنچانے کا دکھ بھی۔''

''میں کیا کروں......؟'' ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

''پتا نہیں......! کیسے کیسے موڑ آئیں گے اس راہ میں......؟'' رشیدہ نے کہا۔

''ایک ترکیب ہے۔ دونوں بڑے آپ کے باہر ہوں گے تو میں انہیں باتوں میں لگاؤں گی۔ آپ اتنی دیر میں بچے کو دودھ پلا دیجیے گا۔''

''اور کوئی آ گیا تو......؟''

''دروازہ اندر سے بند کر لیجیے گا۔''

ارجمند کو ایک اور خیال آ گیا۔

''لیکن دادی اماں نور الحق کے پاس سے ہٹتی ہی کب ہیں......؟''

''اس کی بھی کوئی ترکیب کر لوں گی میں۔'' رشیدہ نے کچھ سوچتے ہوئے

کہا۔

اور واقعی...... حمیدہ تو حمیدہ، صفیہ کا بھی یہ حال تھا کہ بچے کے پاس سے ہٹنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔

رشیدہ نے ترکیب سوچ ہی لی۔

''بڑی بیگم صاحبہ......! آپ ذرا باہر جائیں تو میں بی بی صاحبہ کے مالش کر دوں۔''

حمیدہ اور صفیہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیکن حمیدہ سیدھی بچے کے پنگھوڑے کی طرف گئی۔

رشیدہ بری طرح بوکھلا گئی۔ حمیدہ نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے جلدی سے پکارا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں بڑی بیگم صاحب......؟''

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نور الحق کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔''

رشیدہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیسے روکے......؟ وہ بچے کو لے جاتیں تو فائدہ ہی کیا تھا ان کے جانے کا......؟ خوش قسمتی سے بچہ سو رہا تھا۔ اسے پھر کچھ سوجھ ہی گئی۔

''گستاخی معاف بڑی بیگم صاحب......! چھوٹے میاں ابھی سو رہے ہیں۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟''

''سوتے سے بچوں کو اس طرح جگایا جائے تو ان کی بڑھوتی رک جاتی ہے۔ چھوٹے رہ جاتے ہیں وہ......!''

حمیدہ نے ایک دم ہاتھ کھینچ لیا۔ جیسے بچہ ابھی چھوٹا ہوتے ہوتے رہ گیا ہو۔

لیکن صفیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

''یہ منطق میں نے آج تک نہیں سنی۔''

''چلو صفیہ......! میں اور تم ان باتوں کو اتنا نہیں سمجھتے...... جتنا یہ رشیدہ جانتی

ہے۔''

ارجمند دم بخود یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہی تھی۔ انہیں دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔

رشیدہ دروازہ بند کر کے پلٹی اور سوتے ہوئے بچے کو پنگھوڑے سے اٹھایا۔ وہ کسمسانے لگا۔ رشیدہ نے اسے ہلایا۔

''اٹھ جاؤ چھوٹے میاں......! آج آپ کی پہلی دعوت ہے۔''

بچے نے آنکھ کھولی۔ مگر وہ اب بھی نیند میں تھا۔ رشیدہ نے اسے ارجمند کی گود میں دے دیا۔

''تمہارے سامنے تو یہ ممکن نہیں۔'' ارجمند نے کہا۔ پھر بولی۔

''تم بھی اللہ کی رحمت ہو۔ تم نہ ہوتیں تو جانے کیا ہوتا......؟ میں تو شاید مر ہی جاتی۔ تمہارا احسان اور بڑھ گیا ہے مجھ پر۔''

''میں منہ پھیر لوں گی بی بی صاحبہ......!'' رشیدہ نے احسان والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''تو میں باتھ روم میں چلی جاتی ہوں۔'' رشیدہ نے کہا اور چلی گئی۔

ماں کا لمس پا کر ننھا نورالحق پوری طرح بیدار ہو گیا اور ارجمند کے لئے تو وہ انوکھا تجربہ تھا۔ وہ بے سدھ سی ہو گئی۔

''اپنے بچے کو دودھ پلانے میں اتنی لذت......! اور نہ پلانے میں اتنی اذیت......؟'' یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

بچہ سیر ہو کر پھر سو گیا۔ خود ارجمند بے خودی سی ہو گئی۔ ایسی بے اختیار اور پرسکون نیند آنے لگی، جیسے کسی کا کئی راتوں نیند سے محروم ہونے پر حال ہوتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے رشیدہ کو پکارا اور پکارتے ہی بے خبر سو گئی۔

رشیدہ آئی تو وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ رشیدہ نے بچے کو پنگھوڑے میں لٹایا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

❁❁❁

کلکٹر صاحب حیران تھے کہ اس نے صرف ایک دن چھٹی کی۔

''سب لوگ ابھی ایبٹ آباد میں ہیں جناب......!'' عبدالحق نے وضاحت کی۔

''وہ لوگ لاہور پہنچیں گے تو مجھے چھٹی چاہئے ہوگی۔''

''تم بڑے ذمہ دار آدمی ہو عبدالحق......!'' کلکٹر صاحب نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''تمہیں چھٹی دینے سے میں کبھی انکار نہیں کروں گا۔ جتنی چاہو، مانگ لینا۔''

''شکریہ سر......!''

''تم اس کے مستحق ہو۔ اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں......!''

عارف نے عبدالحق کی بڑی دل جوئی کی۔ بہت خیال رکھا۔ آفس کے بعد وہ تمام وقت اسی کے ساتھ گزارتا۔ کبھی اسے اپنے گھر بلا لیتا اور کبھی خود اس کے پاس چلا آتا۔ وہ جانتا تھا کہ اکیلے میں عبدالحق اداس ہوگا۔ کھانا عبدالحق روز اس کے ساتھ کھاتا۔

عبدالحق نے ایک دن یعقوب سے مستقبل کے بارے میں بات کی۔

''بہت تبدیلیاں ہونے والی ہیں یعقوب......!''

''سب اچھا ہی ہوگا انشاء اللہ......! سر......!''

''ہوسکتا ہے تمہیں لاہور جانا پڑے۔''

''جو حکم آپ کا سر......!''

''تمہاری بیوی اور بچوں کو تو اعتراض نہیں ہوگا......؟''

''کیسے ہو سکتا ہے سر......! وہ میری خوشی میں خوش...... پھر یہ تو روزگار کا معاملہ ہے۔''

''روزگار کا تو میں تمہارے لئے دوسرا بندوبست بھی کر سکتا ہوں۔''

یعقوب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''آپ نے تو مجھے میرا راستہ دکھایا سر......! مرنے سے پہلے تو آپ کو نہیں

چھوڑوں ں گا میں۔"

"مگر...... اب تم یہاں کراچی میں سیٹ ہو...... لاہور......!"

"لاہور تو مجھے بہت یاد آتا ہے سر......! ہم لوگ وہاں بھی خوش رہیں گے۔"

عبدالحق کا دل مطمئن ہو گیا۔

اب وہ ایبٹ آباد میں اللہ سے کیئے ہوئے عہد کو نبھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اب وہ ہر قدم اللہ کی محبت کی طرف، اللہ کی محبت کے لئے اٹھانا چاہتا تھا۔ دنیا، دنیاوی رشتے، دنیاداری، سب اسے رکاوٹیں لگتی تھیں۔ اب بس وہ تھا اور قرآن۔ وہ قرآن کو سمجھنا چاہتا تھا۔

❁❁❁

ماں کا دودھ منہ کو لگا تو بچے کو بوتل کے دودھ سے رغبت نہیں رہی۔ بوتل کو وہ ہٹا دیتا۔ بار بار دینے پر منہ میں دودھ بھرتا اور اُگل دیتا۔ حمیدہ نے یہ دیکھا تو بولی۔

"عبدالحق کا بیٹا ہے۔ پورے کا پورا اس پر پڑا ہے۔" اس کے لہجے میں فخر تھا۔ اسے یاد تھا کہ ننھے سے عبدالحق نے ماں کا دودھ میسر ہوتے ہوئے کیسے اس کے دودھ کے لئے ضد پکڑی تھی اور اپنی ضد منوا کر رہا تھا۔

لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ اس کی ضد کی نوعیت سمجھ سے باہر تھی۔ وہ بوتل کے بدلے کیا مانگ رہا تھا......؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

صفیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ حمیدہ نے کیا مماثلت دیکھی ہے باپ بیٹے میں...... اس نے پوچھا۔ مگر حمیدہ ٹال گئی۔ خواہ مخواہ یہ پرانی بات وہ کسی کو کیوں بتائے......؟

"مجھے تو لگتا ہے کہ دودھ پر نظر لگی ہے۔" صفیہ نے کہا۔

"کس کی نظر لگے گی......؟" حمیدہ بولی۔

"نظر تو کسی کی بھی لگ سکتی ہے۔ میری بھی...... تمہاری بھی......!"

ہر ہر طرح سے دودھ سے بھرے بوتل کی نظر اتاری گئی۔ کالا دانہ جلایا، سہاگہ انگاروں پر ڈالا، مرچوں کی دھونی دی گئی۔ لیکن بچے نے دودھ کی بوتل کو شدت سے رد کر دیا۔

"یوں تو یہ کمزور ہو جائے گا۔" صفیہ نے تشویش سے کہا۔

لیکن خوش آئند بات یہ تھی کہ بچہ شہد سے منہ نہیں موڑ رہا تھا۔

"شکر ہے۔ عبدالحق تو کچھ بھی نہیں لیتا تھا۔ بہت ضدی تھا وہ۔ من چاہا ملا تو مانا۔" حمیدہ کے لہجے میں فخر تھا۔

"ہوا کیا تھا باجی......! عبدالحق کے ساتھ......؟" صفیہ نے پوچھا۔

حمیدہ گڑبڑا گئی۔

"ارے کچھ نہیں......! ضد کر رہا تھا۔"

"اتنے چھوٹے بچے ضد کب کرتے ہیں......؟ انہیں کچھ پتا ہی نہیں ہوتا۔" صفیہ نے اعتراض کیا۔

"سب سمجھتے ہیں بچے......! ہم بڑے ہی ناسمجھ ہوتے ہیں۔" حمیدہ چڑ کر بولی۔

"اب یہ اتنا سا تمہارے سامنے ہے اور ضد کر رہا ہے۔ اب اسے بوتل سے دودھ پلاؤ تو مانوں......!"

"مگر عبدالحق ضد کس بات کی......"

صفیہ عبدالحق کی ضد کے بارے میں تفتیش کرتی۔ لیکن اسی وقت رشیدہ بول پڑی۔

"پر بہت زیادہ شہد بھی نہیں دیا جا سکتا نا...... بڑی بیگم صاحب......!"

"اللہ بہتر کرے گا۔" حمیدہ نے کہا۔

ارجمند خاموشی سے یہ سب سنتی اور دیکھتی رہی۔ اسے احساس جرم مارے ڈال رہا تھا۔ وہ اپنے بھوکے بچے کو جو اپنا حق مانگ رہا ہے، دودھ نہیں پلا سکتی۔

"یہ کیسی آزمائش ہے......؟"

"تمہارا اپنا کیا دھرا ہے یہ سب......!" اندر سے ایک تلخ آواز نے کہا۔

"اللہ اس کا جواب طلب کرے گا تو کیا کہو گی......؟"

رات میں اور صبح کو اسے موقع مل جاتا تھا بچے کو دودھ پلانے کا۔ لیکن دن میں تو بچے کا روزہ ہو جاتا تھا۔ اور وہ اب سچ مچ کمزور ہونے لگا تھا۔ دن بھر وہ خود بھی

تڑپتی، اذیت میں رہتی، بچے کی بھوک کا غم اور نڈھال کرتا۔

دن میں موقع اس لئے نہیں مل رہا تھا کہ بچہ سو نہیں رہا تھا۔ اب اگر رشیدہ مالش کا بہانہ کر کے تنہائی کا سامان کرنے کی کوشش کرتی تو حمیدہ بچے کو ساتھ لے جاتی اور اسے روکنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

ارجمند کو علم نہیں تھا کہ صفیہ خالہ اس کی بے چینی کا مشاہدہ کر رہی ہیں۔

❀❀❀

اگلے روز صفیہ نے کہا۔

''ایک ترکیب آزماتے ہیں نورالحق کو دودھ پلانے کی۔''

حمیدہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم جا کر دودھ کی بوتل بنا کر لاؤ......!'' صفیہ نے رشیدہ سے کہا اور غور سے ارجمند کو دیکھتی رہی۔

رشیدہ دودھ بنا کر لائی لیکن بچے کا ردعمل وہی تھا۔ وہ بوتل کو پرے ہٹاتا رہا۔ پھر دودھ کی کلیاں کرنے لگا۔

''ایک کام کرو......! اسے ارجمند کی گود میں دو......شاید یہ اس کے ہاتھ سے دودھ پی لے۔''

''ہاں......! یہ ٹھیک ہے۔'' حمیدہ نے خوش ہو کر کہا۔

''ضرور پی لے گا......!''

رشیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ تاہم اس نے بچے کو ارجمند کی گود میں لٹایا اور دودھ کی بوتل ارجمند کے ہاتھ میں دے دی۔

ارجمند نے بوتل بچے کے منہ سے لگائی۔ بچے نے اسے زور سے دھکیلا، پھر اس کے ننھے منے ہاتھ ارجمند کا سینہ ٹٹولنے لگے۔

صفیہ کی نظریں بچے پر نہیں تھیں۔ وہ تو ارجمند کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی، جس کے چہرے پر کرب واضح تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور اسے کچل رہی تھی۔ صفیہ کو وہاں خون کی سرخی نظر آئی۔

اب بات کو بڑھانا زیادتی ہوتی۔ اس نے حمیدہ سے کہا۔

''ارے باجی......! میں تمہیں ایک چیز دکھانا تو بھول ہی گئی۔ آؤ نا...... میرے ساتھ......!''

حمیدہ اٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن صفیہ نے ہاتھ تھاما تو لحاظ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم کوشش کرو......!'' صفیہ نے جاتے جاتے ارجمند سے کہا۔

''ہمیں کچھ دیر لگے گی۔''

رشیدہ نے صفیہ کو بھی دیکھا تھا، اور ارجمند کا حال بھی دیکھ رہی تھی۔

''میں باہر کھڑی دیکھتی رہوں گی۔ آپ بچے کو دودھ پلا دیں۔'' اس نے کہا۔

''دروازہ میں باہر سے بند کر دوں گی۔''

''دادی اماں آ گئیں تو......؟'' ارجمند نے گھبرا کر کہا۔

''راز کھلنے سے ڈرتی ہیں آپ......میرا خیال ہے راز تو کھل چکا۔''

''کیا مطلب......؟''

''آپ کی دادی کی بہن سمجھ گئی ہیں۔''

ارجمند ایسی کیفیت میں تھی کہ پوری بات نہ سمجھ سکی۔ اس نے پیٹھ دروازے کی طرف کر لی اور نورالحق کو سینے سے لگا لیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے رشیدہ کو آواز دی۔ رشیدہ آئی تو اس نے کہا۔

''لو......اسے لٹا دو......سو گیا میرا صابر بچہ......!''

رشیدہ نے بچے کو پنگھوڑے میں لٹا دیا۔

''شکر ہے......دادی اماں نہیں آئیں۔'' ارجمند نے کہا۔ پھر اسے رشیدہ کی بات یاد آئی۔

''کیا کہہ رہی تھیں تم......؟''

''میں یہ کہہ رہی تھی......''

❀❀❀

''لاؤ دکھاؤ......کیا دکھانا ہے......؟'' حمیدہ نے جھنجلا کر کہا۔

''مجھے تو یہ پوچھنا ہے باجی......! کہ تم نے کیا دیکھا......؟''
''میں نے کیا دیکھا......؟'' حمیدہ حیران ہوگئی۔
''کہاں......؟''
''ارجمند کے کمرے میں......اور کہاں......؟''
''وہاں کیا دیکھا......؟'' حمیدہ کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آ رہا تھا۔
''دیکھا نہیں کہ بچہ کس طرح ارجمند کو ٹٹول رہا تھا۔'' صفیہ نے کہا۔
''ارے ہاں......! سچ...... بڑا ترس آیا مجھے بے چارے پر...... ننھا معصوم بچہ......!''
اب صفیہ جھنجلا گئی۔
''باجی......! کچھ سمجھ ہی نہیں رہی ہو تم......! تم اور میں بھی تو گود میں لیتے ہیں اسے......ہمیں تو وہ ایسے نہیں ٹٹولتا۔''
''تو......؟''
صفیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
''اب بھی نہیں سمجھیں......؟ ارے......! وہ ارجمند کا بچہ ہے۔ اس کا دودھ پیتا ہے۔ اس لئے تو اتنا بے تاب ہو رہا تھا اور اس لئے بوتل کا دودھ نہیں پیتا وہ۔ ماں کا دودھ موجود ہے۔''
حمیدہ کا منہ تو کھلے کا کھلا رہ گیا۔
''کیا کہہ رہی ہو آپا......؟''
''ٹھیک کہہ رہی ہوں باجی......! ارجمند ہی اس کی ماں ہے اور اسے دودھ پلاتی بھی ہے۔''
دروازے سے تیزی سے اندر آتی ہوئی رابعہ نے وہ جملہ سن لیا۔ مگر وہ اپنی رو میں اتنی تیزی سے اندر آئی تھی کہ کافی آگے آ چکی تھی اور پلٹ بھی نہیں سکتی تھی۔
صفیہ ایک دم سے چپ ہوگئی۔
رابعہ واپس جانے لگی تو حمیدہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''یہ تو میری بیٹی ہے۔ اس سے کیا پردہ......؟'' اس نے بڑی محبت سے کہا۔

پھر رابعہ سے بولی۔
''آ بیٹھ ادھر......! سنا تو نے...... یہ آپا کیا کہہ رہی ہیں......؟''
رابعہ اب بھی شرمندہ سی تھی۔ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
''یہ کیسے جانا تم نے......؟'' حمیدہ صفیہ کی طرف مڑی۔
''مجھے بھی تو بتاؤ......!''
''مجھے تو اس پر حیرت ہے باجی......! کہ تمہیں یہ سب کیوں سمجھ نہیں آیا......؟''
''نہیں آیا...... پر مجھے سمجھاؤ تو......!''
''دیکھو باجی......! مجھے کئی دن سے شک تھا۔ ارجمند کو وہ تڑپ تھی دودھ پلانے کی، جو اس ماں کو ہوتی ہے جس پر پابندی لگ جائے۔''
اس کیفیت سے تو خود حمیدہ بھی گزری تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ ایسی کوئی بات اسے نظر کیوں نہیں آئی......؟
''تمہیں کیا پتا اس تڑپ کا آپا......؟'' اس نے کہا۔
''زرینہ کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو ڈاکٹر نے بچے کو دودھ پلانے سے روک دیا تھا۔ اس کا حال دیکھا تھا میں نے۔''
حمیدہ کی سمجھ میں بات آ گئی۔ اس کی توجہ کا مرکز تو بچہ تھا۔ وہ کیا مشاہدہ کرتی......؟ اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔
''یہ شک مجھے بھی تھا اماں......! ننکی کو دیکھ کے یہی خیال آتا تھا مجھے...... پر یہ کیسے ممکن......؟ بچہ تو منجھلی بی بی کا ہے۔''
''نہیں......! یہ بچہ ارجمند کا ہے۔ ورنہ وہ اسے دودھ کیسے پلاتی......؟'' صفیہ بولی۔
''ایک میں ہی اندھی تھی...... مجھے ہی کچھ نظر نہیں آیا۔'' حمیدہ نے بھنا کر سوچا۔
''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہو......؟''
''سامنے کی بات ہے باجی......! بچہ بوتل کا دودھ پیتا تھا۔ اچانک اس نے

چھوڑ دیا۔ کیوں......؟ اس لئے کہ ماں کا دودھ مل گیا تھا اسے۔ پھر اگر بوتل کا دودھ وہ پی ہی نہیں رہا ہے تو اسے بہت کمزور ہو جانا چاہئے تھا۔ اللہ کا شکر ہے...... یہ بھی نہیں ہوا۔ اس لئے کہ رات کو اور صبح ارجمند اسے دودھ پلاتی ہوگی۔ دن بھر تو میں اور تم اس کے سر پر سوار رہتے ہیں۔''

''دماغ تمہارا تیز کام کرتا ہے آپا......! پر یہ بس اندازہ ہے تمہارا؟......!''

''تو ابھی چل کر دیکھ لو باجی......! ابھی ہم کمرے سے نکلے تو بچہ اور ارجمند دونوں بے چین تھے نا......اب دونوں سکون سے ہوں گے۔ وجہ یہ کہ ارجمند نے بچے کو دودھ پلا دیا ہوگا۔ میں نے جان بوجھ کر موقع دیا تھا اسے۔''

''چلو...... دیکھ لیتے ہیں۔''

رابعہ وہیں رہ گئی۔ وہ دونوں ارجمند کے کمرے کی طرف چل دیں۔ دروازہ کھلا تھا۔ رشیدہ موجود نہ تھی۔ بچہ پنگھوڑے میں لیٹا سو رہا تھا۔ اور ارجمند اپنے بستر پر دراز بے سدھ سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''اب تو یقین آ گیا باجی......!'' صفیہ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

❁❁❁

حمیدہ خوش بھی تھی، اور اسے خود پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ غصہ اس بات پر تھا کہ اسے تو سب کچھ صاف صاف بتا دیا گیا تھا، پھر بھی وہ نہیں سمجھی اور صفیہ صرف آنکھیں کھلی رکھنے کی وجہ سے سب کچھ سمجھ گئی۔

اسے لاہور والے بابا کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اب نور بانو کا پورا کھیل اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ نور بانو نے سیدھی سادی، خالص محبت کرنے والی ارجمند کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ ارجمند لالچ میں آنے والی تو تھی نہیں، اس نے ارجمند کے سامنے اپنی مظلومیت اور محرومی کا رونا رویا ہوگا اور اس سے وعدہ لے لیا ہوگا کہ وہ اپنا بچہ نور بانو کے نام کر دے گی۔

اس طرح کے معاملات میں راز داری تو ممکن نہیں ہوتی۔ نور بانو نے منت کا چکر چلایا اور ارجمند کو لے کر ایبٹ آباد چلی آئی۔ عبدالحق کو اس نے منت کے نام پر وہاں آنے سے روک دیا ورنہ پول کھل جاتا۔ اور خود اس سے نور بانو نے جان بوجھ کر

تعلق ہی نہیں رکھا۔

''کتنی تیز طرار تھی نور بانو......؟''

لیکن فوراً ہی حمیدہ کی سمجھ میں آ گیا کہ صرف نور بانو کی تیزی طراری سے بات نہیں بن سکتی تھی۔ بابا کی یہ بات بھی درست ثابت ہوئی تھی۔ قدرت نے بھی نور بانو کی بھرپور مدد کی تھی۔ ورنہ بات کھلتی اور نور بانو بہت ذلیل ہوتی۔ مگر سچ ہے کہ عزت ذلت اللہ کے اختیار میں ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب کا انتقال نہ ہوا ہوتا اور وہ صفیہ کی عدت میں اس کے ساتھ رہنے کا ارادہ نہ کرتی تو نور بانو کیا کر لیتی......؟ عبدالحق اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا ہے۔ وہ کہتی تو وہ انہیں ایبٹ آباد جانے ہی نہیں دیتا اور اسے ان کے ساتھ جانے سے تو کوئی روک ہی نہیں سکتا تھا۔ اور وہ ساتھ آتی تو کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا۔

مگر وہ تو حق نگر چلی گئی اتنے دنوں کے لئے۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کا قصور نہیں۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ جب وہ صفیہ کو لے کر لاہور آئی۔ اور ایبٹ آباد آنے کا ارادہ کیا تو ایسی بیمار ہوئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ چلنے پھرنے سے بھی گئی۔ پھر اس نے عبدالحق کو فوراً ایبٹ آباد جا کر ان دونوں کی خیریت لانے کو کہا تو عبدالحق کو حادثہ پیش آ گیا۔ ٹانگ ہی ٹوٹ گئی اس کی۔

''اللہ کی مرضی نہ ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے......؟ یہ تو صاف بات ہے۔ اللہ کو پردہ رکھنا تھا تو اس نے رکھا۔''

''مگر نور بانو کے مرنے کے بعد تو کھیل ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ پھر کیوں نہیں ہوا......؟ ارجمند نے اپنے بچے کو اپنا بچہ کیوں نہیں کہا......؟ کیا پتا نور بانو نے اسے کوئی بڑی قسم دی ہو......؟''

اس نے دل میں سوچا۔

''کچھ بھی ہو......اب اس کھیل کو ختم ہو جانا چاہئے۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''

صفیہ نے اسے چونکا دیا۔

''اب کیا ارادہ ہے باجی......!''

"تم ہی بتاؤ......! کیا کروں......؟"

"پوچھو نا......!"

"کس سے......؟"

"رشیدہ سے......اسے سب معلوم ہوگا۔"

"ٹھیک کہتی ہو آپا......! رابعہ......! ذرا رشیدہ کو تو بلا......!"

رابعہ جلدی سے باہر لپکی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اسے بہت پہلے سے یہ یقین تھا کہ بچہ ارجی کا ہے پر وہ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

❁❁❁

رشیدہ کو بلاوا ملا تو وہ اس کے لئے تیار تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ آزمائش کا وقت آگیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ وقت آئے گا۔ لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی آ جائے گا۔ اس نے ارجمند کو سمجھایا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے، اسے سنبھالنا بہت مشکل ہے۔ مگر یہاں تو یہ ناممکن ہو گیا تھا۔

وہ مجرموں کی طرح دونوں بوڑھی عورتوں کے سامنے پیش ہوئی اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی۔

"کیا حکم ہے بیگم صاحب......؟"

"یہ نورالحق کس کا بیٹا ہے......؟" حمیدہ نے تمہید سے کام لئے بغیر پوچھا۔

"بڑے صاحب کا ہے جی......!" اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ یہ بتاؤ......! اس کی ماں کون ہے......؟"

"یہ بھی آپ کو پتا ہے بڑی بیگم صاحب......! پھر مجھ سے کیوں پوچھتی ہیں......؟"

"کوئی وجہ ہے تو پوچھ رہی ہوں۔"

"آپ بی بی صاحبہ سے پوچھیں نا......!" رشیدہ نے سوچا سمجھا جواب دیا۔

"تم نہیں بتاؤ گی......؟"

"میری مجبوری ہے بڑی بیگم صاحبہ......!"

"نوکری سے نکالے جانے کا ڈر نہیں ہے تجھے......؟" حمیدہ نے لہجہ بدلا۔

"رزق تو اللہ دیتا ہے بیگم صاحب جی......! پر مجھے نوکری سے نکالے جانے کا ڈر ہے ضرور...... بی بی صاحبہ اور چھوٹے میاں صاحب سے دور ہو جانے کی وجہ سے...... آپ مجھ سے نہ پوچھیں۔ بی بی صاحبہ سے پوچھ لیں۔ آپ کو پتا ہے نا......! وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتیں۔"

حمیدہ نے دل میں تسلیم کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ارجمند جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔ پھر وفادار نوکر کو پریشان کرنے کا فائدہ......؟ اسے کھویا کیوں جائے......؟

عبدالحق نے جاتے ہوئے اسے بتا دیا تھا کہ یہ ماں بیٹیاں اساتھ ہی لاہور جائیں گی۔

"ٹھیک ہے......تم جاؤ......!"

"آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہے نا جی......؟" رشیدہ نے لجاجت سے کہا۔

حمیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"آپ مجھے نکالیں گی تو نہیں بڑی بیگم صاحب......؟"

حمیدہ کو اس پر ترس آنے لگا۔

"ایسے خدمت کرنے والے وفادار لوگوں کو کون نکال سکتا ہے......؟ بس تو جا......اپنا کام کر۔" رشیدہ وہاں سے یوں نکلی جیسے جان بخشی ہوگئی ہو۔

"اس نے سب کچھ بتا دیا۔ مگر کچھ نہیں بتایا باجی......!" صفیہ نے اس کے جانے کے بعد حمیدہ سے کہا۔

"ہاں......! پر نکی سے پوچھنا تو ہے۔"

"نہ پوچھو تو اچھا ہے اماں......!" رابعہ جلدی سے بولی۔

"کیوں......؟" حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"نکی بڑی عزت والی ہے۔ اسے بے عزتی کا احساس ہوگا۔"

"پر بات تو کھلنی ہے اب......!" صفیہ بولی۔

"اس میں اس کی بھی بہتری ہے۔ اسے چھپ کے تو دودھ نہیں پلانا پڑے گا بچے کو......اذیت سے بچ جائے گی۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے خالہ......!"

''میں نکی کو جانتی ہوں آپا......!'' حمیدہ نے کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اللہ کو ابھی نور بانو کا پردہ رکھنا ہے۔ بابا کی باتیں اب بھی اس کو راہ دکھا رہی تھیں۔ اسے تو آم کھانے تھے، پیڑ گننا اس کا کام نہیں تھا۔

''یہ تو وہ سہہ لے گی۔ لیکن یہ بات عبدالحق کو معلوم ہو...... یہ وہ نہیں سہہ سکے گی۔''

''پر یہ تو ضروری ہے آپا......!''

''عبدالحق تک یہ بات پہنچ گئی تو نکی مر جائے گی۔ میں جانتی ہوں اسے۔ ہمیں تو برداشت کر لے گی وہ۔''

''عجیب لڑکی ہے۔'' صفیہ نے کہا۔

❁❁❁

ارجمند سے بات کرنے کے لئے حمیدہ اکیلی اس کے پاس گئی۔ کچھ دیر وہ نور الحق کو گود میں لئے ارجمند سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ لیکن ارجمند کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ اسے رشیدہ کی بات یاد تھی کہ راز کھل چکا ہے۔

اچانک حمیدہ نے اس سے پوچھ لیا۔

''یہ نور الحق کس کا بیٹا ہے نکی......! تیرا یا نور بانو کا......؟''

ارجمند کو براہ راست سوال کی امید نہیں تھی۔ اب تک اس نے براہ راست جھوٹ بولا بھی نہیں تھا اور جھوٹ بولنے والی وہ تھی بھی نہیں۔ راز کھل ہی گیا تو جھوٹ بول کر گناہ گار ہونے کا کیا فائدہ......؟ عزت ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آدمی شرمندگی کا کام کرے گا تو شرمندگی اٹھائے گا بھی۔ اللہ اپنی رحمت سے بچا لے تو یہ اس کا کرم۔

اس نے بلا جھجک کہا۔

''دادی اماں......! اللہ نے اسے میری کوکھ میں اتارا۔ لیکن ہے یہ آپی کا بچہ...... اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ ان کی مغفرت فرمائے۔''

''میری تو سمجھ میں نہیں آئی یہ بات......! اللہ نے تجھے اس کی ماں بنایا تو یہ نور بانو کا بچہ کیسے ہو گیا......؟''

ارجمند نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''حالانکہ دنیا میں ایک آپ ہی ایسی ہیں جو یہ بات سمجھ سکتی ہیں دادی اماں......!''

''وہ کیسے......؟''

''دیکھیں نا...... آغا جی آپ کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئے۔ لیکن بیٹے تو آپ ہی کے ہیں......!''

حمیدہ کے لئے تو وہ دھماکا تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ سن ہو کر رہ گئی۔ پھر اس نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

''تجھے یہ کیسے پتا چلا نکی......؟''

''آپی نے بتایا تھا مجھے...... آغا جی کے والد کی ڈائریاں بھی مجھے دی تھیں پڑھنے کے لئے۔''

''پر نکی......! یہ اور بات ہے۔ عبدالحق کو تو سب معلوم تھا نا...... اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے اس کو۔''

''کیا فرق پڑتا ہے دادی اماں......! بچہ تو یہ آغا جی کا ہی ہے نا......؟ انہیں اس سے کیا کہ اس کی ماں کون ہے......؟''

''یہ تیرا حق ہے نکی......!''

''اور میں خود اپنا حق چھوڑ رہی ہوں۔''

''عبدالحق کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تیرا بیٹا ہے تو اس میں کیا حرج ہے......؟ بیٹا......! تو یہ اسی کا رہے گا...... تو نے خود کہا ابھی...... تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟''

''اس سے بہت فرق پڑے گا دادی اماں......!''

''ذرا مجھے بھی سمجھا دے میری بڑی سی نکی......!''

''ضرور دادی اماں......!'' ارجمند نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''دیکھیں...... آغا جی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ایسی محبت کم ہی کی ہو گی کسی نے کسی سے۔ صرف آپی کے کہنے پر انہوں نے مجھ سے شادی کی۔ ورنہ کبھی

نہ کرتے۔ اور آج بتا دوں دادی اماں......! کہ میں آغا جی سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اور ان کا ملنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ بس اللہ میاں مجھے بتاتے تھے کہ وقت آنے پر وہ خود مجھے مل جائیں گے۔ مجھے فکر نہیں کرنی۔''

حمیدہ حیران تھی۔ بابا نے اسے کہا تھا کہ اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو وہ چاہتی ہے وہی ہوگا اور اسے پوتا بھی ملے گا۔ کھیلنے والوں کو کھیلنے دے۔ اللہ کی چال سب سے مضبوط ہے۔ انہوں نے کہا تھا۔ تو کچھ بھی نہ کر...... اور واقعی...... نور بانو نے خود ہی ارجمند سے عبدالحق کی شادی کرا کے اس کی آرزو پوری کی۔ اور اب پوتا بھی مل گیا...... اور یہ ارجمند نے کیا کہا...... یہ عبدالحق کے سوا کسی کو......

''......تو دادی اماں......! آپی نے مجھ پر احسان کیا نا......؟''

''یہ احسان نہیں...... خود غرضی تھی اس کی۔''

حمیدہ نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''وہ جانتی تھی کہ اولاد اسے نہیں ملنی۔ تیرے سوا کون اس کی یہ بات مان سکتا تھا......؟ اس نے تجھے استعمال کیا نکی......! اتنے بڑے جھوٹ کے جنجال میں پھنسایا تجھے...... اور دیکھو...... جھوٹ کھل کر رہا نا......؟''

''نہیں دادی......! آپی مجھ سے بہن جیسی محبت ہی کرتی تھیں تو میں ان کے لئے قربانی نہیں دے سکتی کیا......؟ اور اب تو وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔''

''تیری قربانی کا کیا حاصل ہوا نکی......! جھوٹ تو کھل ہی گیا......؟ اس بے چاری کو مرنے کے بعد بھی عزت نہیں ملی۔ کوئی منہ سے نہ کہے، پر دل میں اس کے بارے میں کیا سوچیں گے سب......؟ میں، صفیہ آپا، رابعہ، یہ تیری نوکرانی رشیدہ...... کیا کسی کے دل میں عزت ہوگی اس کی......؟ اتنا بڑا مکر اور فریب کا جال بچھایا اس نے...... صرف اپنی عزت، اپنی شان بڑھانے کے لئے......؟ مگر ہاتھ کیا آیا......؟''

حمیدہ کے لہجے میں تندی تھی۔

''میں نے ہمیشہ اسے بیٹی سمجھا، اسے بھلا برا سمجھایا، پر وہ دشمن سمجھتی رہی مجھے۔ خود پر اعتماد ہی نہیں تھا اسے۔ خود کو برا سمجھتی تھی، حقیر...... تو ایسے لوگ اچھے کیسے

ہو سکتے ہیں......؟ اور میری بات سن نکی......! تو احسان کی بات کرتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میں اب اور انتظار نہیں کروں گی۔ اور میں حکم دوں گی تو عبدالحق انکار نہیں کرے گا دوسری شادی کو۔ اس نے گھبرا کر خود ہی فیصلہ کر لیا اور چنا تجھے کہ تو اس کی مرضی پر چلے گی۔ پر اسے نہیں معلوم تھا کہ میرے دل میں تیرا ہی خیال ہے۔ یاد ہے جب اس لڑکے کا رشتہ آیا تھا تیرے لئے تو میں کتنی پریشان ہوگئی تھی......؟''

ارجمند تو ہکا بکا رہ گئی۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دادی اماں کے دل میں بھی اس کی اور آغا جی کی یکجائی کا خیال ہوگا۔ اور دل میں وہ جانتی تھی کہ دادی اماں کی ہر بات ٹھیک ہے۔ لیکن وہ زبان سے تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔

''واقعی......! آپی نے جھوٹ، مکر اور فریب کا جال بچھایا تھا مگر ہاتھ ان کے کچھ نہیں آیا۔ پردیس میں کسمپرسی کی موت، لوگوں کی نظروں میں برائی، اور بچے کی وہ صورت بھی نہیں دیکھ سکیں۔''

''تو لوگوں کی نظروں میں نور بانو کی عزت بحال کر سکتی ہے......؟'' حمیدہ کے لہجے میں چیلنج تھا۔

ارجمند نے چند لمحے سوچنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں دادی اماں......! لیکن آپی کے جرم میں میں بھی تو شریک تھی۔ سب لوگ مجھے بھی جھوٹا، فریبی اور مکار سمجھیں گے۔ پر اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟ دل کا حال تو بس اللہ جانتا ہے۔''

''تجھے کسی نے برا نہیں سمجھا...... کوئی برا نہیں سمجھے گا...... الٹا سب تجھے معصوم اور مروّت والا سمجھیں گے۔ پر اب تو نور بانو کو نہیں بچا سکتی۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں......؟''

''یہ کہ تیرا بچہ اب تیرا ہی کہلائے...... تیرا ہی رہے۔''

''اور یہ میں نہیں چاہتی...... کم از کم آغا جی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا......؟''

''میں نے کہا نا...... اماں......! کہ بہت فرق پڑے گا۔''

''پر سمجھایا تو نہیں...... مجھے قائل تو نہیں کیا۔''

"بات ادھر ادھر ہوگئی تھی دادی اماں......! اب سمجھاتی ہوں۔ دیکھیں دادی......! آغا جی آپی سے بہت محبت کرتے ہیں اور وہ محبت ختم ہونے والی نہیں۔"

"ہاں......! یہ تو مجھے معلوم ہے۔ پر اب تیری باری ہے۔ تجھ سے بھی محبت کرے گا وہ۔"

"کون جانے دادی اماں......! جو اللہ کو منظور......!" ارجمند نے گہری سانس لے کر کہا۔

"لیکن سوچیں کہ ان کو حقیقت کا پتا چل جائے تو ان پر کیا گزرے گی......؟ کیا سوچیں گے وہ......؟ وہ کیسا محسوس کریں گے......؟"

"سیدھی سی بات ہے...... بہت سچا، کھرا اور حق والا ہے میرا پتر......! نور بانو کی حقیقت جان لے گا تو وہ محبت اس کی ختم ہو جائے گی۔ چاہے دھیرے دھیرے ہو...... پر یہ میں جانتی ہوں کہ وہ ختم ہو جانی ہے۔"

"اور یہ میں نہیں چاہتی۔"

"لے......اس میں تو تیرا بھلا ہے......!"

"اپنے بھلے کی میں فکر نہیں کرتی دادی......! وہ میں اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں۔ اس میں کئی باتیں ہیں۔ ایک تو میں اسے اچھا نہیں سمجھ سکتی کہ کسی ایسے شخص کی طرف سے جو اللہ کے ہاں چلا گیا اور اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتا۔ کسی ایسے شخص کا دل برا کراؤں جو اس مرنے والے سے بہت محبت کرتا ہو۔"

"چاہے اس کے لئے بہت بڑا جھوٹ بولنا پڑے......؟"

"آپ میری پوری بات سن لیں...... پھر اعتراض کر لیجئے گا دادی اماں......! دوسری بات یہ ہے کہ آغا جی آپی سے جتنی محبت کرتے ہیں، اگر آپی سے ان کا دل برا ہوا تو خدانخواستہ انہیں بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ان کا دل محبت سے ہی برا ہو جائے۔ وہ محبت کے نام سے بھی چڑنے لگیں۔ پھر وہ کبھی کسی سے بھی محبت نہیں کر سکیں گے۔ نہ آپ سے...... نہ مجھ سے...... نہ اپنے بچے سے...... اور محبت ہی آغا جی کی سب سے بڑی طاقت ہے دادی اماں......!"

ارجمند کی بات حمیدہ کے دل کو لگی تھی۔ پھر بھی اس نے کہا۔

"یہ ضروری تو نہیں......!"

"میرے خیال میں تو ایسا ہی ہو گا۔"

"تو اسے نہ بتائیں کہ نور الحق تیرا بیٹا ہے...... یہ نور الحق کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی......؟"

"اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا دادی......! اسے تو سب کچھ ملتا رہے گا۔"

"پر میں تو عبدالحق کو حقیقت بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔"

"تو دادی اماں......! مجھے کچھ ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں بچوں گی نہیں۔"

حمیدہ دہل گئی۔

"کیسی باتیں کرتی ہے تو......؟"

"سچ کہہ رہی ہوں اماں......! اس کے بعد آغا جی کا سامنا کیسے کر سکوں گی میں......؟"

"تو ہم سب جھوٹ بولتے رہیں عبدالحق سے......؟ یہ اس پر ظلم نہیں ہو گا......؟"

"ان کی تو بھلائی ہے اس میں دادی اماں......! اور جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں...... آغا جی جو سمجھ رہے ہیں، بس وہ انہیں سمجھنے دیں۔"

حمیدہ نے سوچا۔

"بات تو ٹھیک ہے......!"

ارجمند نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"اچھی دادی......! میری بات مان لیں۔"

حمیدہ کا دل جیسے پگھل گیا۔ اصل میں تو یہ ارجمند ہی کے ساتھ زیادتی تھی۔ اس میں کسی اور کا کیا جاتا تھا......؟ اور وہ خود ہی اسے قبول کر رہی تھی۔ اور اس کی یہ بات دل کو لگتی تھی کہ نور بانو کا فریب کھلنے کے بعد عبدالحق کو محبت سے ہی نفرت ہو جائے گی۔

"یہ لڑکی کتنی سمجھدار ہے اتنی کم عمری میں...... اور اللہ نے دل کتنا بڑا دیا ہے

اسے۔ خود کو نہیں دیکھتی، بس دوسروں کی فکر کرتی ہے۔''

''چل ٹھیک ہے...... ! مان لیا میں نے۔''

''شکریہ دادی اماں......!'' ارجمند نے اس کے ہاتھ چوم لئے۔

''یہ بتا...... کس کس کو معلوم ہے یہ بات......؟''

''رشیدہ اور نوریز کو......!''

''ٹھیک ہے......! صفیہ آپا اور رابعہ کو میں سمجھا لوں گی۔'' حمیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ارجمند نے سکون کی سانس لی۔ اب اپنے بچے کو چھپ کر دودھ پلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

❁❁❁

وہ سب ایبٹ آباد سے لاہور پہنچے۔ عبدالحق کو فون کر دیا تھا۔ دو دن بعد وہ بھی لاہور پہنچ گیا۔

عبدالحق کو اتنے دن میں سوچنے سمجھنے کے لئے بہت وقت مل گیا تھا اور اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ اپنی تمام کوتاہیاں، تمام غلطیاں اسے نظر آ گئی تھیں۔ اللہ سے تو اس نے بخشش طلب کر لی تھی۔ لیکن جانتا تھا کہ بندوں کی معافی کے بغیر اللہ سے بھی معافی نہیں ملتی۔

اس بار اس نے پندرہ دن کی چھٹی لی تھی۔ کلکٹر صاحب نے کہہ دیا تھا کہ ضرورت پڑے تو وہ اس میں توسیع بھی کرا سکتا ہے۔ لمبی چھٹی لینے کا یہ مقصد تھا کہ وہ زندگی میں آنے والی سب سے بڑی تبدیلی کو کم از کم ذہنی طور پر قبول کر لے اور زندگی کی تنظیم نو کے بارے میں فیصلہ کرے۔ اس نے سوچا تھا کہ اس بار دو تین دن حق نگر میں بھی گزارے گا۔

مگر لاہور آیا تو جیسے وہاں نور بانو اسے پھر سے مل گئی۔ ہر جگہ وہ اس کے ساتھ تھی۔ بس اسے نظر نہیں آتی تھی۔ گھر میں چپے چپے پر اس کی یادیں بکھری تھیں۔ جس کمرے میں بھی وہ بیٹھتا، دروازے کی طرف اس یقین سے دیکھتا کہ ابھی نور بانو مسکراتی ہوئی دروازے سے اندر چلی آئے گی۔

لیکن نہیں...... ! نور بانو مسکراتی ہی کب تھی......؟

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے ایک موقع بھی یاد نہیں آیا کہ اس نے نور بانو کو بے ساختہ، اندر سے، دل سے مسکراتے دیکھا ہو۔ حیرت ہے، اس نے پہلے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ وہ خوش نہیں تھی۔ خوشی اور مسکراہٹ کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خوشی پھول ہے تو مسکراہٹ اس کی خوشبو۔ خوشی کا اظہار مسکراہٹ ہوتی ہے۔

''تو کیا نور بانو خوش نہیں تھی......؟ کیا وہ ناخوش تھی......؟'' یہ بہت بڑا سوال تھا۔ اس سوال سے کئی اور سوال جنم لیتے تھے۔

''کیا یہ اس کی ناکامی ہے......؟ کیا وہ نور بانو کو خوشی نہیں دے سکا......؟''

وہ بے چین ہو گیا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔

اسے ایک اور خیال آیا۔ کراچی میں تو اس نے نور بانو کے ساتھ بہت طویل عرصہ گزارا تھا اور وہ بھی اکیلے...... کوئی اور تھا ہی نہیں وہاں...... تو وہ صرف اور صرف اس کا تھا۔ مگر اسے کراچی میں نور بانو اس طرح یاد نہیں آئی۔ وہاں تو اس کے ذہن نے قبول کر لیا تھا کہ نور بانو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ ایسا کیوں......؟

اور کراچی میں بھی کبھی اس نے نور بانو کو مسکراتے نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ وہاں بہت خوش تھی۔ نور بانو کو اس پر پورا قبضہ کرنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ تو اس میں ننھے ساجد کا ساجھا بھی برداشت نہیں کر سکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی کو دیکھے، نہ کسی سے بات کرے۔ محبت تو بہت دور کی بات...... وہ تو چاہتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچے بھی نہیں۔ اور یہ بڑی غیر فطری بات تھی۔ اس نے بارہا نور بانو کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی۔ ضرورت پڑنے پر اس نے اسے سختی سے بھی سمجھایا اور دوٹوک کہہ بھی دیا کہ یہ ممکن نہیں۔

''تو کیا نور بانو اس لئے ناخوش رہی......؟ اس لئے وہ کبھی خوش نہیں رہی......؟ اس لئے وہ کبھی مسکرائی بھی نہیں......؟''

شروع ہی سے وہ سوچنے، غور کرنے اور تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرنے والا رہا

تھا۔ الجھن کو سلجھائے بغیر وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ اب بھی وہ سب کچھ بھول کر اس کھوج میں لگ گیا۔

یہ بات طے تھی کہ نور بانو کا یہ مطالبہ غلط تھا۔ آدمی پر اس کے معاشرے کا حق ہوتا ہے۔ آدمی کسی ایک شخص تک محدود نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو سب سے اچھا یہ ہوتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف اللہ کا ہو جائے۔ لیکن اللہ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ یہ رہبانیت ہے اور اللہ کو بالکل پسند نہیں۔ اللہ نے تو انسان کو فرائض ادا کرنے کا پابند کیا ہے۔ جس کا بھی حق ہو، اسے ادا کیا جائے۔

تو وہ نور بانو کی یہ بات نہیں مان سکتا تھا۔ اگر نور بانو کی خوشی اس میں تھی تو یہ خوشی وہ اس کو دے ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ناخوش رہی تو یہ اس کا اپنا قصور تھا۔ اس پر تو اس کا کوئی بوجھ نہیں۔

پھر بھی اس کے دل کا بوجھ کم نہیں ہوا۔

ذہن میں ایک اور سوال نے سر اٹھایا۔

''کراچی میں تو نور بانو کو خوش رہنا چاہئے تھا۔ وہاں تو وہ صرف اور صرف اسی کا تھا۔ وہاں تو صرف وہی اس کی توجہ کا مرکز تھی۔ عارف بھائی کے بچوں کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ پھر کراچی میں کیوں ناخوش رہی وہ......؟''

جواب میں فوراً ہی ابھرا۔

کراچی میں وہ تنہا تھی اور اکیلے رہنے کی وہ عادی نہیں تھی۔ پھر کام زیادہ ہونے کی وجہ سے دفتر سے واپسی میں اسے دیر بھی ہو جاتی تھی۔ وہ تھکا ہارا نڈھال گھر واپس آتا تھا۔ یعنی رقیب سے نور بانو کی جان کراچی میں بھی نہیں چھوٹی۔ وہاں اس کا کام، اس کی ملازمت اس کی رقیب بن گئی۔ وہاں وہ اس لئے ناخوش رہی۔ تبھی تو لاہور جا کر کراچی واپس نہیں آئی وہ۔ اسے اکیلا چھوڑ دیا۔

''تو ایسے آدمی کو خوش رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ایسا آدمی کبھی خوش رہ ہی نہیں سکتا۔ پھر میرے دل پر اس کی ناخوشی کا بوجھ کیوں ہے......؟''

اس کی ملازمت بھی نور بانو کو بری لگتی تھی۔ کہتی تھی۔

''ضرورت ہی کیا ہے آپ کو اس کی......؟''

لیکن وہ ملازمت نہ کرتا تو بھی گھر میں اس سے جڑ کر تو نہیں بیٹھتا۔ مردوں کے لئے دن بھر باہر کی دنیا ہوتی ہے۔ کتنے کام ہوتے ہیں۔ ملازمت نہ کرتا تو وہ کاروبار کرتا۔ زمینوں کے معاملات سنبھالتا۔ حق نگر کے لوگوں کی فلاح کے لئے کچھ کرتا۔ نہیں بھئی......! وہ نور بانو کو خوش رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

''یہ ہوتی ہے انسان کی محبت...... جتنی بھی کرو...... کم ہی رہے...... محبوب خوش ہی نہ ہو کسی طرح...... طوطا مینا کی طرح پنجرے میں قید ہو...... اور شاید محبوب پھر بھی خوش نہ ہو...... پھر وہ یکسانیت سے اکتا جائے۔''

''خسارہ ہی خسارہ...... سراسر خسارہ......!''

''محبت تو بس اللہ سے ہی کرنی چاہئے...... مگر کیسے......؟''

اس ''کیسے'' کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اسے ایک اور خیال آیا۔

''نور بانو کی بیماری یہاں کراچی میں ہی تو شروع ہوئی۔ ضرور یہی بات ہے۔ بیمار نہ ہوتی تو وہ یہاں خوش رہتی۔ اکیلے پن پر وہ ناخوش نہیں تھی۔ تنہائی تو خود اس نے چاہی تھی۔ ثبوت یہ تھا کہ لاہور وہ فون پر بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کرتی تو بے دلی سے کرتی۔''

''وہ کبھی میری محبت سے خوش اور مطمئن نہیں رہی۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''اور میں اس کے جانے کے بعد بھی اس کی محبت میں مبتلا ہوں۔ کیا حاصل ہے اس محبت کا......؟ ناخوشی ہی ناخوشی...... جو محبت خوشی نہ دے سکے، وہ کیا محبت ہوگی......؟''

یہ سوال اب بھی اپنی جگہ تھا کہ کراچی میں اسے نور بانو ایسے یاد کیوں نہیں آئی......؟ جیسے یہاں یاد آ رہی ہے۔

بہت غور کرنے پر اسے اس کا جواب بھی مل گیا۔ وہ مکمل اور شافی جواب نہیں تھا۔ لیکن بہرحال معقول جواب تھا۔ کراچی میں وہ خود بھی ناخوش رہا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہاں خود کو پنجرے میں قید پرندے جیسا محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنے تمام محبوب

لوگوں سے دور ہوگیا تھا یہاں آکر۔ لاہور میں سبھی لوگ فون پر بات کرنے سے گھبرانے والے تھے، چنانچہ بات مختصر ہی ہوتی تھی۔ اور تقریباً سات سال اس نے ان میں سے کسی کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ وہ عید تو عید...... پر کبھی اپنے گھر نہیں جا سکا۔ کراچی اس کا گھر نہیں تھا۔ گھر ہوتے ہوئے بھی گھر نہیں تھا۔ گھر تو گھر کے لوگوں سے ہوتا ہے۔

اور وہ عید بقرعید پر گھر جا سکتا تھا۔ لیکن پہلے ہی سال سے یہ ہوا کہ جب بھی موقع آتا۔ نور بانو کی طبیعت خراب ہو جاتی۔ کبھی تو اسے لگتا کہ نور بانو صرف لاہور جانے سے بچنے کے لئے اور اسے روکنے کے لئے اپنی طبیعت خراب کر لیتی ہے۔ وہ بدگمان کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ پھر بھی کئی بار اس نے یہ بات سوچی۔

خیر...... اب تو ثابت ہوگیا کہ وہ نور بانو کا مکر نہیں تھا۔ اس بیماری نے ہی اس کی جان لے لی۔

تو کراچی اس کے لئے شہر ہجر تھا۔ وہ وہاں خوش نہیں رہا۔ وہ وہاں نور بانو کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں رہا۔ اس لئے وہ کراچی بھی اسے یاد نہیں آئی۔

❀❀❀

رات کھانے کے بعد وہ حمیدہ کے کمرے میں چلا گیا۔

''کیسی ہیں اماں......؟''

''میں ٹھیک ہوں پتر......! پر دیکھتی ہوں کہ تو ٹھیک نہیں ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''میں بھی ٹھیک ہی ہوں اماں......! اور ٹھیک ہو جاؤں گا کچھ دن میں......!''

حمیدہ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

''اب تجھے تو میں سمجھا بھی نہیں سکتی۔ کیا سمجھاؤں گی میں......؟''

''نہیں اماں......! سمجھانے والی بات ہو تو ضرور سمجھاؤ......!''

''جو سب کچھ آپ ہی سمجھتا ہو، اسے سمجھانا کیا......؟''

عبدالحق خود بھی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔

''کبھی آدمی کی سمجھ میں خوب اچھی طرح سمجھی ہوئی بات بھی نہیں آتی۔ ایسے میں اس کے بڑے ہی اسے سمجھاتے ہیں، جو عقل میں اس سے زیادہ ہوتے ہیں۔''

''میں عقل میں تجھ سے زیادہ نہیں...... پر زندگی کا تجربہ زیادہ ہے مجھے۔''

''بے شک اماں......! تو سمجھاؤ نا مجھے......!''

''جو کچھ تو نے قرآن پڑھ کر سمجھا...... مجھے ضرورت کے وقت اللہ نے خود ہی سمجھا دیتا تھا۔ ورنہ میں مرگئی ہوتی۔ تو نے پڑھ کر سمجھا بھی، دوسروں کو سمجھایا بھی۔ پر اپنی ضرورت کے وقت اسے بھول گیا......؟''

''میں سمجھا نہیں اماں......!''

موت اللہ کا حکم ہے۔ اپنے مقرر وقت پر آتی ہے۔ بندہ غم ضرور کرتا ہے۔ پر اللہ اسے صبر دیتا ہے۔ تاکہ اس کے ذمے جو کام اس نے لگا رکھے ہیں، وہ رُک نہ جائیں۔''

''غم اپنی جگہ اماں......! مگر میں نے کسی فرض سے تو منہ نہیں موڑا۔''

''خود کو خوش رکھنا بھی عبادت ہے پتر......!''

''میں اس سے بہت محبت کرتا تھا اماں......!'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''پتا ہے مجھے...... پر تجھے پتا نہیں...... اللہ نے میرے سر کے سائیں کو اور میرے اکلوتے بیٹے کو ایک ہی دن اپنے پاس بلا لیا۔''

یہ سن کر عبدالحق پر تھرتھری چڑھ گئی۔

''ایک میرا جیون ساتھی تھا، جیسے نور بانو تیری تھی، تو دوسرا دنیا کے حساب سے دیکھو تو میرا آخری سہارا تھا۔ پر میں نے جیون کی ڈور نہیں چھوڑی۔ اللہ سے دعا کرتی رہی کہ تیری امانت تجھ تک پہنچانے کی مہلت مجھے دے۔ یہ صبر مجھے میرے ربّ نے ہی دیا تھا اور اس کا کرم کہ آج بھی میں زندہ ہوں۔ میرے سر کے سائیں کی نسل تو ادھر ہی ختم ہوگئی تھی نا...... پر تیری اور تیری اولاد کی کیسی لگن تھی مجھے...... غم تو اب بھی کبھی کبھی ہوتا ہے مجھے...... پر میں سوچتی ہوں کہ اس سے بہت زیادہ تو خوشیاں دے دیں دینے والے نے...... تو جب غم ہوتا ہے، شکر ادا کرتی ہوں اس کا خوشیوں پر۔''

عبدالحق کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ سچ کہا تھا حمیدہ نے۔ قرآن پڑھ کر

جو وہ سمجھا اور وقت آنے پر بھول گیا، وہ اللہ نے حمیدہ کے بغیر قرآن کے وقت پر خود ہی سمجھا دیا تھا۔ وہ جسے شکر ادا کرنا چاہئے تھا کہ اللہ نے اسے نور بانو سے جوڑا، ملایا اور اتنا طویل ساتھ عطا فرمایا، اس کی جدائی کے غم میں مبتلا تھا جو کہ مشیت تھا۔ اس نے قرآن سے اپنے رب کی رضا میں راضی رہنا نہیں سیکھا۔

''میں بھی وصال دین سے اور اس کے ابا جی سے بہت محبت کرتی تھی پتر عبدالحق......!''

حمیدہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ پھر کانپ کر رہ گیا۔

واقعی..... اماں کا نقصان تو اس کے نقصان سے سینکڑوں گنا زیادہ تھا۔ اس کا تو سب کچھ ایک ہی دن میں کھو گیا تھا۔ شوہر، اکلوتا بیٹا، گھر، گھر کیا، پورا گاؤں..... اور اس پر ستم یہ کہ بینائی بھی چلی گئی اور اماں کیسے اللہ کے بھروسے پر اس کی امانتیں سنبھالے اس کا انتظار کرتی رہیں۔ بے شک صبر تو اللہ ہی دیتا ہے مگر اللہ سے رجوع کرنا تو بندے کا کام ہے۔

''اماں.....! غم تو مٹ جاتا ہے مگر پچھتاوا بہت بری چیز ہے۔''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''پچھتاوا کیسا پتر.....؟''

''میں نور بانو کو کبھی خوش نہیں رکھ سکا اماں.....! میں نے کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔'' عبدالحق نے بڑے دکھ سے کہا۔

''میں سمجھ گئی پتر.....! پچھتاوے تو تجھے اور بھی بہت ہوں گے۔ یہ بھی کہ وہ بے چاری وہاں ایبٹ آباد میں اکیلی تھی اپنے آخری وقت میں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اس کا۔''

عبدالحق اس کا بدلا ہوا لہجہ سمجھ نہیں سکا۔

''ان باتوں کو چھوڑ پتر عبدالحق..... ! جو اللہ کے پاس چلے گئے، ان کے بارے میں بات نہیں کی جاتی۔ اور پچھتاوا تو ہے ہی بری چیز۔ تقدیر پر کسی کا زور اختیار نہیں۔ جو رب نے لکھ دیا، وہ نہیں ٹلتا۔''

''لیکن اماں.....! اگر میں.....''

''دیکھ پتر.....! میں کم عقل، بے علم ہوں۔ پر اتنا جانتی ہوں کہ اللہ کے معاملے میں اگر مگر ایمان سے ہٹا دیتی ہے بندے کو۔''

''مگر اماں.....! میں کیسے بھولوں کہ میں نور بانو کو خوش نہیں رکھ سکا.....؟''

''اب تو مجبور کر رہا ہے پتر.....! تو میں زبان کھولوں گی۔ رب معاف کرے مجھے..... تو ایک بات بتا..... جسے اللہ خوش نہ کر سکے، اسے کوئی بندہ خوش کر سکتا ہے بھلا.....؟ بندے کی اوقات ہی کیا ہے.....؟''

عبدالحق بری طرح گڑبڑا گیا۔

''میں سمجھا نہیں اماں.....!''

''نور بانو خوش ہونے والی تھی ہی نہیں۔ اللہ اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرے۔ پر سچی بات یہ ہے کہ وہ خوش ہونے والی تھی ہی نہیں۔ تو آسمان سے چاند تارے توڑ کر لا دیتا، تب بھی وہ خوش نہ ہوتی۔''

''یہ تم زیادتی کر رہی ہو اماں.....!''

''نا پتر.....! رب مجھے محفوظ رکھے..... بے انصافی سے..... میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تو غور تو کر..... رب نے کتنی عنایتیں کیں اس پر۔ اس کی بڑی بہن اور چھوٹی بہن، دونوں بہت خوب صورت تھیں۔ تو اسی لئے اس کی ماں اس سے زیادہ محبت کرتی تھی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اماں.....؟'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''تو یہ کیسے سمجھے گا پتر.....! اس بات کو سمجھنے کے لئے تو ماں کا دل چاہئے۔ ماں کو اپنا سب سے کمزور، سب سے محروم بچہ سب سے پیارا ہوتا ہے۔ تو دنیا میں اس کا مشاہدہ تو کر سکتا ہے، اسے محسوس نہیں کر سکتا۔ خیر..... مجھے تو اس نے آپ ہی بتائی تھی یہ بات۔ اور بہنیں بھی اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ پر وہ بات بات پر چڑتی۔ ہر ایک سے اسے شکایت ہوتی۔ لڑنے کے بہانے تلاش کرتی۔ اللہ سے گلہ کرتی کہ اسے بہنوں سے کم تر کیوں بنایا.....؟ خوش کسی بات پر ہوتی ہی نہیں تھی وہ۔ اور پتر.....! اللہ بھی اپنے کمزور بندوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ ماں کو شاید یہ خوبی اس نے اپنی دے دی ہے۔ تو دیکھ، اللہ نے کیسے کرم فرمایا اس پر..... اس کے گھر پر حملہ ہوا۔ سب لوگ

شہید ہو گئے۔ اللہ نے اسے بچا لیا۔ پھر دنیا میں اس کا کوئی نہیں رہا تھا تو اللہ نے ہم سے اسے ملا دیا۔ گھر اور کنبہ دے دیا اسے۔ تیرے دل میں اس کی محبت ڈالی، ایسی کہ وہ تیرے نزدیک دنیا کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ ورنہ تیرا اور اس کا جوڑ تھا بھلا......؟ میرے دل میں اس کے لئے بیٹی جیسی محبت ڈال دی۔ یہ نہ ہوتا تو میں تیری اور اس کی بے جوڑ شادی کبھی نہ ہونے دیتی۔ تو میرا حکم ٹالتا بھلا......؟ پھر شادی کے بعد اللہ نے اسے ملکہ بنا دیا۔ کون سی نعمت ہے، جو اس کے پاس نہیں تھی......؟ پر اس نے کبھی شکر ادا نہیں کیا۔ ہمیشہ گلہ ہی کرتی رہی۔ اللہ سے بھی اور بندوں سے بھی۔ صرف اس لئے کہ اللہ نے اسے بہت حسین نہیں بنایا تھا۔ معمولی شکل وصورت دی تھی۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ سب سے بڑی چیز نصیب ہوتا ہے، اور اللہ نے اسے وہ نصیب دیا جو بہت حسین لڑکیوں کو بھی کم ہی ملتا ہے۔''

''لیکن اماں......! پھر بھی ایک بڑی محرومی اسے ملی۔ برسوں وہ اولاد کو ترستی رہی۔'' عبدالحق سے رہا نہیں گیا۔

''جو اللہ جانتا ہے، وہ کوئی نہیں جانتا۔ اور جو میں جانتی ہوں عبدالحق پتر......! وہ تو نہیں جانتا۔ تجھے کیا پتا......؟'' حمیدہ ایک دم کہتے کہتے رُک گئی۔

اسے احساس ہو گیا کہ اس سے آگے بولنے کا اسے حق نہیں۔ حق تو اسے کچھ بھی کہنے کا نہیں تھا۔ لیکن عبدالحق کے پچھتاوے دور کرنے کے لئے اس نے زبان کھولی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پچھتاوے ایسے ہوتے ہیں، جیسے آدمی اپنے اندر بچھو پال لے۔

اب بچھو کا کام تو ڈنک مارنا ہے۔ باہر ہو بندہ اسے مار بھی دے، جان چھڑا لے۔ پر اندر کے بچھو کا کیا کرے......؟ وہ تو جب تک رہے گا، عمر بھر ڈنک مارتا رہے گا۔ وہ ان بچھوؤں کو مارنے کی کوشش کر رہی تھی، جو عبدالحق کے اندر پل رہے تھے۔ لیکن مرے ہوئے آدمی کا پردہ تو نہیں ہٹا سکتی وہ۔ ورنہ ربّ اس کا پردہ نہیں رکھے گا۔ بلکہ ارجمند نے تو اسے وہ پردہ بھی رکھنے کا پابند کر دیا تھا، جو رکھنے والا نہیں تھا۔

اس نے بروقت خود کو سنبھال لیا۔

''دیکھ پتر......! ایسا نہیں کہتے......تو جانتا ہے کہ اللہ نے نور بانو کو اولاد سے

بھی محروم نہیں رکھا۔ یہ تیرا نورالحق ہے نا......اس کی نشانی......!'' اس نے اوپری دل سے کہا۔

''لیکن نور بانو تو اسے دیکھ بھی نہیں سکی۔ یہ محرومی نہیں ہے اماں......؟''

''توبہ کر پتر......! توبہ......توبہ......! تجھ جیسا بندہ بھی اللہ سے گلہ کرنے لگا......؟ شکر ادا کرنے کی جگہ شکایت......؟ دیکھ لے......یہ محبت کا اثر ہے......؟'' حمیدہ نے نہایت غصے سے کہا۔

''کل کو میں مر جاؤں تو اللہ جی سے لڑنا کہ اتنی جلدی کیوں بلا لیا میری اماں کو......؟ یہ بھول جانا کہ جب زندگی کی کوئی صورت نہیں تھی تو اس نے تیری اماں کو زندہ رکھا......؟ جبکہ وہاں نہ آدم......نہ آدم زاد......کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اس کا...... اندھی اور لاچار تھی تیری اماں......! ربّ نے اسے زندہ رکھا......تجھے اس تک پہنچایا......اس کی آنکھیں واپس دیں اور بیس برس ہونے کو آئے، وہ آج بھی زندہ ہے۔ واہ پتر......! واہ......! شاباش ہے بھئی......!''

عبدالحق پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اندر اس کے وجود میں جیسے زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ اس کی زبان ہی نہیں، دل بھی اور جسم کا رواں رواں بھی استغفار کر رہا تھا۔ دیر تک وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم نے ٹھیک کہا اماں......! میں بہت شرمندہ ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے......! میں بہت توبہ کروں گا۔''

''یہ تو اس بات پر کہہ رہا ہے تو......؟'' حمیدہ نے کڑے لہجے میں کہا۔

''مجھے تو تیرے پچھتاوؤں کی فکر ہے۔ میں تو انہیں مٹانا چاہتی ہوں۔ یہ بتا......تو سمجھتا ہے کہ نور بانو کو اولاد کی بڑی آرزو تھی نا......؟''

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور بچے کی آرزو میں در در وہ نہیں پھری......میں پھری۔ کوئی دربار ایسا نہیں جہاں میں نے حاضری نہ دی ہو تیری اولاد کے لے۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ جو میں نے لا کر دیا، اسے بھی کھانے یا پینے کے بجائے پھینکتی رہی۔ یہ آرزو تھی

اسے اولاد کی......؟''

''اب اماں......! یہ تو تمہاری ضعیف الاعتقادی تھی۔ دیکھو نا...... مجھے بھی اولاد کی آرزو تھی۔ مگر میں بس اللہ سے مانگتا رہا۔ میں بھی کسی مزار، کسی دربار پر نہیں گیا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میری آرزو جھوٹی تھی......؟''

''تیری اس بات کا جواب میں بعد میں دوں گی پتر......!'' حمیدہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو یہ بتا کہ بندے کی سب سے بڑی محرومی دور ہو...... سب سے بڑی آرزو پوری ہو تو وہ کیسا نرم، مہربان ہو جاتا ہے پوری دنیا کے لئے......؟ کیسا شکر ادا کرتا ہے رب کا......؟ پر نور بانو کی آرزو پوری ہوئی تو وہ سخت ہو گئی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اماں......؟ یہ تو زیادتی ہے۔''

''تو خود سوچ پتر......! میں گھر کی بڑی ہوں۔ اس نے مجھے خوش خبری سنائی اور اس کے بعد ایبٹ آباد چل دی۔ مجھ سے اجازت بھی نہیں لی۔ خیر...... اس سے زیادہ تو یہ شکایت مجھے تجھ سے ہے۔ پر میں بھی تو اسے بیٹی ہی سمجھتی تھی نا......؟ میں جانتی ہوں، میری جگہ اس کی ماں ہوتی تو بھی وہ یہی کرتی۔ اسی لئے مجھے اس سے گلہ نہیں۔ تو نے مجھ سے پوچھا ہوتا تو میں کبھی نہ جانے دیتی اسے۔ تو تو سمجھتا نہیں ان باتوں کو۔ کچا پکا معاملہ ہوتا ہے نا......عورت کا تو اتنا لمبا سفر خطرناک ہوتا ہے۔ اونچے نیچے راستے، ایک جھٹکا بھی لگ جائے تو قصہ ختم۔ یقین کر کہ یہ اللہ کی ایک اور کریمی تھی۔ ورنہ اس نے تو خرابی میں کمی نہیں چھوڑی تھی۔ بچہ ضائع بھی ہو سکتا تھا۔'' حمیدہ نے گہری سانس لی۔ پھر بولی۔

''اب تو مجھے بتا کہ اس کی سب سے بڑی آرزو پوری ہوئی تو وہ تجھے، گھر کو، ہم سب کو چھوڑ کر ایبٹ آباد چل دی۔ کیا یہ خوشی اس اکیلی کی تھی......؟ ہم میں سے کسی کی نہیں......؟ ارے......! وہ تو سب کی خوشی تھی۔ وہ میرے پاس ہوتی تو کتنا خیال رکھتی میں اس کا......اور یہاں اس کے کتنے خدمت کرنے والے تھے۔ حق مارا نا اس نے سب کا......؟''

عبدالحق حیران تھا۔ یہ بات اماں نے پہلے بھی کہی تھی کہ سفر میں بچے کو خطرہ

تھا۔ پھر نور بانو نے یہ خطرہ کیوں مول لیا......؟ شاید ناتجربہ کاری کی وجہ سے...... اسے معلوم ہی نہیں ہوگی یہ بات......!

''اب بتا...... اس کے ایبٹ آباد جانے کی کیا تک تھی......؟'' حمیدہ نے اسے جھنجوڑا۔

''میں نے بتایا نا...... اماں......! کہ اس نے منت مانی تھی۔''

''میرا مزاروں، درباروں کے چکر لگانا غلط تھا......تو نور بانو کی یہ منت تو غلط نہیں تھی نا......؟''

''میرے نزدیک تو غلط تھی اور یہ میں نے اس سے کہا بھی تھا۔'' عبدالحق نے صفائی پیش کی۔

''اب اس نے مان لی تو میں کیا کرتا......؟''

''منت یہی تھی نا کہ تو اسے نہیں دیکھے گا اور وہ تجھے نہیں دیکھے گی......؟ تو یہ کام تو یہاں بھی ہو سکتا تھا۔ ایک کمرے میں نو مہینے کا اعتکاف کرنے بیٹھ جاتی۔''

''وہ کسی خوب صورت مقام پر رہنا چاہتی تھی، تاکہ بچہ خوب صورت ہو۔''

''تو بہت خوب صورت ہے پتر......! تو کیا ٹھاکرانی تجھے جنم دینے کے لئے گاؤں چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھیں......؟ اور خوب صورت مقام تو مری بھی ہے۔''

پہلی بات کا عبدالحق کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''مری میں اسپتال ڈاکٹر کا مسئلہ تھا اماں......!''

''ایبٹ آباد میں ڈاکٹر اسپتال سب تھا...... کیا انہوں نے بچا لیا اس کو......؟ مری میں خدمت کرنے والے شمریز کے سب گھر والے تھے۔ مری میں بھی بچے پیدا ہوتے ہیں پتر......!'' حمیدہ نے کہا۔

''پھر ایک اور بات بتا...... وہ نکی کو کیوں اپنے ساتھ لے کر گئی......؟ اس پر کیا حق تھا اس کا......؟ نکی تو نئی نویلی دلہن تھی۔ اس کا تو الٹا حق چھین لیا اس نے اور تجھ سے نہ ملنے کی منت مانی تھی تو یہ اور ضروری تھا کہ نکی تیرے ساتھ رہے...... دو بیویوں کے ہوتے ہوئے آدمی اکیلا رہے......؟ یہ کوئی اللہ کو خوش کرنے کی بات ہے......؟''

"وہ......اماں...... !اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لئے......"

مگر حمیدہ اب جلال میں تھی۔ اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس کے لئے وہ نسیمہ کو ساتھ لے جاتی، رابعہ بھی تھی، میں بھی تھی۔ سب تجربہ کار تھیں۔ نکی بے چاری کو کیا پتا ان معاملات کا......؟ وہ معصوم، کم عمر لڑکی، اس نے تو ٹھیک سے تجھے دیکھا بھی نہیں...... تیرے ساتھ وقت بھی نہیں گزارا ڈھنگ سے...... یہ تو سراسر ظلم تھا اس پر۔"

پے در پے حملوں سے عبدالحق گھبرا گیا۔ اور ہر بات معقول تھی۔ جواب کسی کا نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ چڑ چڑا ہو گیا۔ جھنجلا کر بولا۔

"اپنی نکی سے بھی پوچھنا اماں...... !وہ کیوں تیار ہوئی جانے کو......؟"

"وہ کوئی انکار کرنے والی تھی......؟ نہ تجھے اور نہ نور بانو کو...... اس کی بات چھوڑ...... تو تو اللہ والا ہے...... تو نے یہ ظلم کیوں ہونے دیا نئی نویلی دُلہن پر......؟ جو اللہ کی طرف سے تیری ذمہ داری تھی۔"

"میں نے کہا تھا نور بانو سے...... وہ بولی...... ارجمند خود تیار ہے میرے ساتھ جانے کو۔" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

"دیکھ پتر...... !جو ہوا سو ہوا...... وہ تو نہیں بدلے گا۔ میں تو صرف تیرے پچھتاوے دور کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ نور بانو کو پردیس میں موت آئی، ایسی کہ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اس کا۔ اب مجھ سے پوچھ تو میں کہوں گی کہ اس کی موت وہیں اور اسی طرح لکھی تھی۔ کوئی اسے ٹال نہیں سکتا تھا۔ پر دنیا دار بن کر سوچوں تو کہوں گی کہ اس نے جو بویا وہ کاٹا۔ یہ سب سامان اس نے خود کیا تھا اپنے لئے۔ ارجمند، نوریز اور رشیدہ کو بلاوجہ سزا ملی اس کی۔ تو تو بہت سوچنے والا ہے پتر...... !سوچ کہ نور بانو نے یہ سب کیوں کیا......؟ ہم سب بڑوں کو چھوڑ کر اس حال میں نکی کو لے کر اتنی دور کیوں گئی......؟ سوچے گا تو جواب بھی مل جائے گا۔ کوئی پچھتاوا بھی نہیں رہے گا۔ یہ تو سب بلبلے ہیں پانی کے پتر...... !"

"جزاک اللہ اماں...... !میں سوچوں گا۔"

"پچھتاوا تو ناشکرا پن ہوتا ہے پتر...... !"

"میں اللہ سے توبہ کروں گا اماں...... !اور انشاءاللہ ہر پچھتاوا مٹا دوں گا۔"

"اب وہ بات بھی سمجھا دوں جو میں نے کہی تھی...... کہ بعد میں سمجھاؤں گی۔" حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تو درباروں، مزاروں میں جانے کو...... بابوں سے دُعا کرنے کو شرک سمجھتا ہے نا...... پتر...... !جھوٹے مال کھانے والے بابوں کی میں بات نہیں کرتی۔ جو اصل بابے ہوتے ہیں نا...... وہ اللہ کے ولی ہوتے ہیں۔ میں جاہل نری...... پر اتنا جانتی ہوں کہ انہوں نے سب کچھ چھوڑ کر اللہ سے لو لگائی ہوتی ہے۔ اس سے محبت کرتے ہیں وہ۔ اس کی ہر بات مانتے ہیں۔ ان کا کھانا پینا، سونا جاگنا، رشتے ناطے، محبتیں، سب صرف اللہ کے لئے ہوتی ہیں۔ تو پھر اللہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ انہیں دوست بنا لیتا ہے۔ تو سوچ، کوئی چھوٹا مرتبہ ہوتا ہے اللہ کے دوست کا......؟ پھر اللہ اپنے دوستوں کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔ تو لوگ جو وہاں جاتے ہیں تو ان سے سفارش کے لئے جاتے ہیں۔"

"اللہ کے ہاں بھی سفارش چلتی ہے......؟" عبدالحق نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں......؟ سفارش تو ہر جگہ چلتی ہے پتر...... !"

"وہ تو سب کی سنتا ہے اماں...... !"

"بے شک...... !مگر کچھ دُعائیں قبول بھی تو نہیں ہوتیں پتر...... !"

"اور سفارش پر قبول ہو جاتی ہیں......؟"

"ہاں پتر...... !دیکھ تیری دعا میں اور اللہ کے ولی کی دعا میں تو فرق ہو گا نا......؟ دوست تو زیادہ عزیز ہو گا نا پتر...... !"

"پر اماں...... !لوگ مزاروں، قبر کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ کھلا شرک ہے یہ تو...... !"

"ولی کا اس میں کیا دوش پتر...... !اور لوگ ناسمجھ ہیں۔ کوئی پیار سے سمجھاتا بھی تو نہیں ان کو۔ مشرک کہنے سے تو اور ضد آجاتی ہے انہیں۔ تجھ میں تو بڑی عاجزی ہے پتر...... !یہ بات تکبر والی کی تو نے۔ برے کو برا کہنے سے وہ اچھا نہیں ہوتا۔ برا

کہے بغیر اچھائی بتائی اور سمجھائی جاتی ہے۔ سوچ تو ذرا کہ نبی پاکؐ نے کسی کو برا کہا کبھی......؟ اوراس سے بھی زیادہ بگڑے ہوئے لوگوں کو اچھا بنا دیا۔''

عبدالحق بہت شرمندہ ہوا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو اماں......! شاید میں بہت خراب ہوگیا ہوں۔ بہت توبہ کروں گا اللہ سے۔''

''ناپتر......! تو تو بہت اچھا ہے۔ پر وقت کبھی آدمی کو ہلکا کر دیتا ہے۔ جا......اب تو سو جا......! تھک گیا ہوگا۔''

''میں تو ضروری بات کرنے آیا تھا اماں......!''

''وہ کل کر لینا...... جلدی کیا ہے......؟''

عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

❁❁❁

عبدالحق کا دل بھی بوجھل ہو رہا تھا اور دماغ بھی۔ سر میں درد تھا۔ حمیدہ کی سچی باتوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت بدل گیا ہے۔ اندر سے بہت خراب ہوگیا ہے...... بہت برا۔

حمیدہ نے کہا تھا کہ یہ نوربانو کی صحبت کا اثر ہے۔ وہ شکر کی جگہ شکایت کا مرتکب ہوا۔

مگر یہ غلط تھا۔ آدمی خود ہی خراب ہوتا ہے، خود کو خراب کرتا ہے۔ کس دوسرے کا کیا دوش......؟ اسے تو محبت نے خراب کیا تھا۔

ارجمند نے غور سے اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے......؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے......؟'' اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں ارجمند......!''

''آیئے...... لیٹ جایئے......!''

عبدالحق نڈھال ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی لیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ آنکھوں میں نیند بھی نہیں تھی۔

''اچھا......! آپ بیٹھیں...... میں ابھی آئی۔'' ارجمند نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

عبدالحق نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ کے اس سرے پر دیوار کے ساتھ لیٹا تھا اور سو رہا تھا۔ عبدالحق ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ وہ دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ شرمندہ بھی تھا کہ واقعی بہت ناشکری کی اس نے۔

ذرا دیر بعد ارجمند کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ٹب تھا۔ وہ اس نے لاکر عبدالحق کے پیروں کے پاس رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا اور خودکلامی کے انداز میں بولی۔

''ٹھیک ہے...... !''

عبدالحق حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اپنے دونوں پیر اس میں ڈالیں......!''

''کیوں......؟'' عبدالحق نے گڑبڑا کر کہا۔

''آپ ڈالیں تو......!''

عبدالحق نے دونوں پاؤں پانی میں ڈالے۔ وہ نیم گرم پانی تھا۔ لیکن اس کی حرارت بہت خوشگوار تھی۔

ارجمند اپنے ہاتھوں سے اس کے دونوں پیروں کو ملنے لگی۔

عبدالحق نے پاؤں کھینچنے کی کوشش کی لیکن ارجمند کی گرفت مضبوط تھی۔

''کیوں......؟ کیا ہوا......؟'' ارجمند بولی۔

''تم پیروں کو ہاتھ لگاؤ...... اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ میرا فرض بھی ہے اور حق بھی۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ آپ کو بھی انشاء اللہ اچھا لگے گا۔''

ذرا دیر میں عبدالحق کو احساس ہوا کہ اس کے جسم کا تناؤ اور پیروں کی دُکھن دونوں دور ہو رہی ہیں۔

''یہ ہے کیا......؟'' اس نے پوچھا۔

''گرم پانی میں نمک ملایا ہے۔ آپ کے پاؤں دکھ رہے تھے نا...... اب

آرام آجائے گا۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میرے پاؤں دُکھ رہے ہیں......؟"

"پتا نہیں آغا جی......! بس دل نے بتایا اور میں نے مان لیا۔" ارجمند نے سادگی سے کہا۔

"اب بس کرو......! دُکھن ختم ہوگئی ہے۔" عبدالحق کے لہجے میں تشکر تھا۔

"ذرا رکیں......!" ارجمند نے کہا اور باتھ روم میں جا کر تولیہ لائی۔ ٹب ایک طرف ہٹا کر اس نے بہت اچھی طرح اس کے پاؤں خشک کیئے۔ پھر وہ تولیہ لے کر باتھ روم میں گئی۔

"اب آپ لیٹ جائیں آغا جی......!" واپس آ کر اس نے کہا۔

عبدالحق بڑی حد تک پُرسکون ہوگیا تھا۔ وہ بستر پر دراز ہوگیا۔

"نیند آ رہی ہے آپ کو......؟"

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔

"حالانکہ اس وقت نیند کی ضرورت ہے آپ کو......!" وہ تفکر آمیز لہجے میں بولی۔

وہ الماری کی طرف گئی، وہاں سے ایک تولیہ نکال کر لائی۔

"ذرا سر اٹھائیں اپنا......!"

عبدالحق نے سر اٹھایا تو اس نے تولیے کو تکیے پر پھیلا دیا۔

"اب لیٹ جائیں آرام سے......!"

"تولیے سے کیا فرق پڑے گا......؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"دیکھتے رہئے......!" ارجمند نے کہا۔

اس بار وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی تھی۔

"یہ کیا......؟"

"تیل لگاؤں گی آپ کے سر میں...... مگر پہلے لائٹ آف کر دوں......!"

"اس کی ضرورت نہیں......!"

"ضرورت ہے۔ آپ کو معلوم نہیں۔ اور آغا جی......! یہ میرا فرض بھی ہے۔"

ارجمند نے تیل سر میں ڈالا اور نرمی سے اسے تھپتھپا کر جذب کرنے لگی۔

"توبہ آغا جی......! کتنا پیاسا ہے آپ کا سر......! سارا تیل جذب کر لیا۔ تیل کبھی لگاتے نہیں آپ......؟"

عبدالحق کو جیسے نشہ سا ہونے لگا تھا۔ ارجمند کی انگلیوں میں کوئی مقناطیسیت تھی، جو ہر پریشانی اور فکر کو کھینچ رہی تھی۔ اس نے نیندسی آواز میں کہا۔

"کبھی خیال ہی نہیں آیا۔"

"یہ تو میری کوتاہی ہے۔" ارجمند کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

"مرد اپنا خیال خود تھوڑا ہی رکھتے ہیں۔"

اس پر عبدالحق کے غنودگی کی طرف جاتے ہوئے ذہن میں نور بانو کا خیال آیا۔ اتنے برسوں کے ساتھ میں نور بانو کو کبھی یہ خیال نہیں آیا۔ اب اسے یاد آیا کہ اکثر پاؤں دُکھتے تھے اور سر بھی بوجھل ہوتا تھا۔ اسے تو پتا ہی نہیں تھا اور نور بانو کو کبھی خیال نہیں آیا۔

"اور یہ ارجمند...... ملی ہی کتنے دن ہے مجھے......؟ اور اسے اپنی کوتاہی کہہ رہی ہے......؟"

"اور ایسے آرام آجاتا ہے...... یہ تو معلوم ہی نہیں تھا مجھے...... ساری تھکن، ساری دُکھن دور ہوگئی۔"

ارجمند اب دھیرے دھیرے مالش کر رہی تھی۔ اور عبدالحق جیسے خود کو فضا میں تیرتا محسوس کر رہا تھا۔ اب کچھ سوچنا بھی محال تھا۔ نہ جانے کب وہ سو گیا۔

ارجمند نے باتھ روم میں جا کر ہاتھ دھوئے، وضو کیا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے اس کے پہلو میں دراز ہوگئی۔

وہ معمول کے مطابق سونے سے پہلے کے وِرد کر رہی تھی۔

❁❁❁

وہ بہت گہری اور پُرسکون نیند تھی۔ ارجمند نہ جگاتی تو اس کی آنکھ کبھی نہ کھلتی۔ ارجمند کو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے سے جاگی ہوئی ہے۔ اور نماز کے درمیان سے اٹھی ہے۔

''فجر کی اذان ہوگئی کیا.....؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''جی نہیں.....! ہونے والی ہے۔ میں نے ذرا پہلے جگا دیا آپ کو..... تاکہ آرام سے تیار ہو جائیں۔''

عبدالحق سمجھ گیا کہ ارجمند تہجد کے لئے اٹھی ہوگی۔

وہ نماز پڑھ کے آیا تو ارجمند کچن میں تھی۔ ننھا نورالحق جاگ رہا تھا اور ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ وہ بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ یہ نوربانو کا بیٹا اور صورت ہو بہو ارجمند جیسی..... اور نام ارجمند نے نورالحق رکھا اس کا۔

اسے یاد آیا۔ نوربانو کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ بچہ اس پر نہ پڑے۔ وہ بہت خوب صورت ہو اور ارجمند جو کہ ویسے ہی خوب صورت ہے، لیکن نوربانو کو شاید بہت زیادہ حسین لگتی ہوگی۔ اسی لئے وہ اسے ایبٹ ساتھ لے کر گئی اور اسے نظروں کے سامنے رکھا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بچہ ارجمند پر پڑا۔

نوربانو کو بس یہی فکر تھی۔ عبدالحق نے تاسف سے سوچا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ صورت شکل سے کچھ نہیں پڑتا۔ اماں نے ٹھیک ہی کہا۔ نصیب بڑی چیز ہوتا ہے۔

اور ارجمند کی بات بھی اسے یاد تھی۔ اس کے پاس اپنے بچے کے لئے اور طرح کے خواب تھے۔ وہ اپنے بچے کو اللہ اور رسولؐ کی، اور اس کے بعد اس کی محبت سکھانا چاہتی تھی۔

اور اللہ نے بچہ نوربانو کو دیا۔ ارجمند کو نہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو اسے ارجمند ہی پالے گی۔

''چلئے..... ناشتہ کر لیجئے.....!'' ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

ناشتہ اس نے سب کے ساتھ کیا۔ بہت اچھا لگا۔ جیسے پرانے دن لوٹ آئے ہوں۔ لیکن نہیں..... بہت بڑی کمی تھی اب..... بہت بڑا فرق تھا جب میں اور اب ہیں۔ اب نوربانو نہیں تھی۔ اب سب کچھ پہلے جیسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے سینے کا خلا کبھی نہیں بھرے گا۔

اس رات ارجمند پھر پچھلی رات والا معمول دہرانے لگی تو عبدالحق نے کہا۔

''آج تو مجھے تھکن نہیں ہے۔''

''تو کیا ہوا.....؟ اچھا تو لگے گا نا..... آپ کو.....؟ اور تازہ دم ہو جائیں گے۔ اچھا لگا تھا نا..... آپ کو.....؟''

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھا تو لگے گا..... لیکن ضرورت نہیں ہے تو کیوں زحمت کرو.....؟''

ارجمند نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ اسے میرے لئے زحمت سمجھتے ہیں.....؟ اس میں مجھے خوشی ملتی ہے۔ آپ کی خدمت کرنا، آپ کی ضرورت پوری کرنا، آپ کو خوش رکھنا..... یہ میرا فرض تو ہے ہی..... لیکن میرے لئے کتنی بڑی خوشی ہے..... یہ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کو ضرورت نہ بھی ہو، اچھا نہ بھی لگے تو میری خوشی کے خیال سے برداشت کر لیا کیجئے۔ ایثار آپ ویسے بھی بہت کرتے ہیں۔''

عبدالحق کو شرمندگی ہونے لگی۔ ایسی خدمت اور برداشت کرنا کہہ رہی ہے اسے۔ اس لڑکی میں کتنی عاجزی اور انکساری ہے۔ اور یہ اس کی خوشی ہے۔ کسی سے جیتنے کی فکر نہیں اسے۔ اپنا حق جتانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی۔

اس لمحے ایک بھولی بسری یاد ابھر آئی۔ ماتا جی اسے سلانے کے بعد پتا جی کے کمرے میں جاتی تھیں۔ اسے پتا ہی نہیں تھا۔ ایک رات اس کی آنکھ کھل گئی تو پتا چلا کہ ماتا جی نے بتایا کہ وہ پتا جی کی سیوا کرنے جاتی ہیں ہر رات۔ اور سیوا کرنے کی وضاحت انہوں نے کی تھی، پاؤں دبانا، سر دبانا۔

اور ارجمند وہی کچھ کر رہی تھی۔

''ایک بات بتاؤ ارجمند.....! یہ سب تمہیں کس نے سکھایا.....؟''

''کیا کچھ آغا جی.....؟'' ارجمند نے نیم گرم پانی میں اس کے تلوؤں کو سہلاتے ہوئے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

''یہ سب کچھ..... یہ خدمت جسے تم فرض کہتی ہو.....؟''

''پتا نہیں آغا جی.....! شاید خود ہی آ جاتا ہے یہ سب کچھ.....!'' وہ اب بھی اس کے پیروں میں گم تھی۔

''خود ہی کیسے آ سکتا ہے بھلا......؟'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''بہت کچھ ایسا بھی ہوتا ہے دنیا میں...... آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں آغا جی......!'' ارجمند نے دھیانی سے کہا۔

عبدالحق کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ارجمند کے ہاتھوں سے کوئی توانائی، کوئی طاقتور کرنٹ اس کے پیروں میں منتقل ہو کر اس کے جسم میں پھیل رہا ہو اور جسم میں تازگی پھیلا رہا ہو۔ جسم میں کیف سا دوڑ رہا تھا۔ گزشتہ رات اسے یہ احساس نہیں ہو سکا تھا۔ شاید تھکن کی وجہ سے۔ وہ صرف پرسکون ہوا تھا۔ اس کیف سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تو اس کا دماغ بھی جیسے بادلوں میں تیر رہا تھا۔

''میں تو ایسا کچھ نہیں جانتا دنیا میں جو خود بخود ہو جاتا ہو۔'' اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے بول رہا ہے۔

''لیکن مجھے یہ سب کسی نے سکھایا نہیں......!''

''تو پھر تمہیں کیسے آیا یہ سب......؟''

''بچہ سانس لینا کیسے سیکھتا ہے آغا جی......! وہ تو نیا نیا پیدا ہوا ہوتا ہے۔ ناسمجھ ہوتا ہے۔ اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا سانس لینے کا۔ تو اسے سانس لینا کون سکھاتا ہے......؟''

''یہ تو میں بتا سکتا ہوں۔'' عبدالحق نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''اس کے ایک دھپ رسید کیا جاتا ہے۔ تکلیف سے وہ روتا ہے۔ روتا ہے تو سانس آتی ہے۔ سانس آتی ہے تو اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ......''

''وہ تو ناسمجھ ہوتا ہے آغا جی......!'' ارجمند نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''ٹھیک......! میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ روتے ہوئے وہ بے ارادہ سانس لیتا ہے اور پھر مشین چل پڑتی ہے۔ پھر وہ ساری زندگی سانس لیتا رہتا ہے۔''

''چلیں...... مان لیا...... لیکن تکلیف پر رونا اسے کون سکھاتا ہے......؟'' ارجمند اب بھی اسی کیفیت میں تھی۔

''یہ تو جبلت ہے......!''

''اور جبلت کیا ہے......؟''

''تم ہی بتاؤ......!''

ارجمند نے پہلی بار سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ہاتھ اس کے اب بھی مصروف تھے۔

''وہ اقبال صاحب نے بتایا تو ہے نا...... آغا جی......! سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی۔''

عبدالحق کو پہلی بار احساس ہوا کہ ارجمند کے ہاتھوں سے اس کے جسم میں منتقل ہونے والی توانائی ارجمند کے ارتکاز کی وجہ سے تھی اور وہ مکمل ارتکاز تھا۔ دل، دماغ، جسم اور روح...... سب اس کے پیروں پر مرتکز تھے۔ اور اب وہ ارتکاز ٹوٹ گیا تھا تو کرنٹ تو اب بھی تھا۔ مگر بہت موہوم۔

ارجمند سر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی۔'' عبدالحق نے پہلا مصرعہ پڑھا۔

''چھوٹا منہ بڑی بات آغا جی......! مگر میرے خیال میں اقبال صاحب نے یہ مصرع صرف اس لئے کہا کہ روایتی طور پر شعر دو مصرعوں کا ہوتا ہے۔ ورنہ تو وہ مصرع اپنی جگہ مکمل ہے۔''

''ایسی بات تو نہیں...... دوسرا مصرعہ سوال ہے اور پہلا اس کا جواب......!''

''ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پہلے مصرعے میں سوال ہوتا اور دوسرے میں جواب......!''

''شاعری میں تو یہ چلتا ہے ارجی......!'' عبدالحق نے بے ساختہ پیار سے اسے پکارا۔ پہلی بار اسے لگا کہ اس کی روح ان باتوں کو ترستی رہی ہے۔

ارے......! ارجمند ہی سے تو وہ یہ باتیں، یہ تبادلۂ خیال کر سکتا ہے۔

''مجھے نہیں معلوم......! میرے نزدیک تو پہلے یعنی جوابی مصرعے میں اقبال صاحب نے جو دو آپشن دیئے، وہ غلط۔ دوسرے مصرعے میں جو سوال انہوں نے اٹھایا، اس کا ایک ہی جواب ہے، حتمی جواب...... آپشن تو وہاں ہے ہی نہیں۔''

''اور وہ حتمی جواب کیا ہے......؟'' عبدالحق کے لہجے مین دلچسپی تھی۔

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن......!'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''بے شک...... کوئی آپشن نہیں...... یہ حتمی جواب ہے۔ میں تم سے متفق ہوں ارجی......! یہ مصرعہ ہر طرح سے مکمل ہے۔ اسے کسی جواب کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ جواب ہر شخص کی سمجھ میں تو نہیں آئے گا۔''

''مجھے اختلاف ہے اس سے۔'' ارجمند نے کہا۔ وہ اس کے پاؤں بدستور سہلائے جا رہی تھی۔

''یہ مصرعہ ہر شخص کے اندر درست جواب ابھارنے والا ہے۔ لیکن اسے دوسرا مصرعہ دے کر اقبال صاحب نے ابہام پیدا کر دیا ہے۔ لوگوں کو بھٹکانے کا سامان کر دیا۔''

''وہ کیسے......؟''

''دیکھیں...... انہوں نے دو آپشن دیئے۔ گویا جواب انہی میں ہے۔ شعر پڑھنے والے کو پابند کر دیا انہوں نے۔ اور ان میں سے ایک آپشن بہت کمزور ہے۔ مکتب کی کرامت۔ مکتب میں علم دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوئی کرامت نہیں ہوتی وہاں۔ اب پڑھنے والے کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ فیضانِ نظر کو دوسرا جواب مان لے۔''

''تو اس میں کیا حرج ہے......؟ اللہ کی نظر کرم کی بات ہے۔'' عبدالحق نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''یہیں تو ابہام ہے آغا جی......! فیضانِ نظر کی اصطلاح ولیوں، پیروں اور فقیروں کے لئے استعمال کی جاتی ہے یہاں۔''

عبدالحق کو اس کی بات کا قائل ہونا پڑا۔

''اور اس شعر میں پہلے جواب ہے، سوال بعد میں ہے۔ اور جواب کے دو آپشن ہیں۔ ان میں سے ایک کمزور ہے تو پڑھنے والا پہلے ہی سے ذہن بنا لیتا ہے کہ فیضانِ نظر کا معاملہ ہے...... اور وہ اسے بندوں کی طرف لے جاتا ہے۔''

عبدالحق کو ایک اور نکتہ سوجھا۔

''لیکن یہاں فیضانِ نظر کا اشارہ حضرت ابراہیمؑ کی تربیت کی طرف بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے آغا جی......؟ وسیلے کی طرف توجہ کرنا تو راہ سے بھٹکنا ہے۔ توجہ تو وسیلہ بنانے والے کی طرف ہونی چاہئے۔ منبع اور سرچشمہ تو وہی ہے نا...... اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن......!''

''لیکن اہمیت تو وسیلے کی بھی ہے نا......؟''

''ہے......! لیکن یہ خیال بھی رہے کہ وسیلہ محض آزمائش ہے۔ وسیلے میں جتنا الجھیں گے، راستہ اتنا طویل اور منزل اتنی دور ہو گی۔ پھر وسیلے کی اہمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور جس نے وسیلہ بنایا، اس سے تو ہم پہلے ہی دور ہو چکے...... اور آغا جی......! اللہ تو بغیر وسیلے کے بھی بہت کچھ دیتا ہے۔''

''اس دنیا کو تو اللہ نے اسباب کا کارخانہ بنایا ہے۔''

''لیکن بہت کچھ وہ بے گمان اور براہِ راست بھی دیتا ہے۔''

''وضاحت تو کرو......!''

''ابھی آپ جبلت کی بات کر رہے تھے۔ ہر جاندار کو ملی اور کسی کے توسط کے بغیر ملی۔''

''وہ تو جسم کے، زندگی کے اس نظام کا حصہ ہے، جو اللہ نے ہر ایک کے لئے قائم فرمایا ہے۔ جسم کی طرح۔''

''نہیں آغا جی......! میرے خیال میں ایسا نہیں......!'' ارجمند نے بے حد عاجزی سے کہا۔

''جسم تو ماں کے وسیلے سے بنتا ہے۔ لیکن جبلت تو اللہ براہِ راست القا فرماتے ہیں۔ یہ تو قانونِ بقا ہے۔ زندگی کے تحفظ اور اس کی بقا کے لئے مختلف ردِعمل مختلف موقعوں پر...... ناسمجھ بچہ، جو کچھ جانتا سمجھتا نہیں ہے، ان اصولوں کے تحت ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔ آپ ہاتھ ہلائیں اس کے سامنے تو پلکیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں اس کی۔ اور یہ جبلت تو مرتے دم تک اس کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ اسے کسی کے توسط سے نہیں ملتی۔ کوئی سکھاتا نہیں اسے۔''

"یہ تو نسل در نسل ودیعت ہوتی ہے۔"

"ودیعت ہونے کا لفظ استعمال کر کے آپ نے تسلیم کر لیا کہ یہ براہِ راست اللہ کا دیا ہوا ہے۔ چلیں...... اسے چھوڑیں...... دیکھیں...... وحی صرف پیغمبروں کے لئے ہے۔ علم کا ذریعہ۔ لیکن اللہ نے عام انسانوں کو بھی محروم نہیں رکھا۔ ان پر خیال القا فرماتا ہے وہ۔ موجدوں کی مثال لیں۔ ان پر خیال اللہ کی طرف سے اترا۔ انہیں غور و فکر پر اللہ نے اُکسایا۔ اس کے نتیجے میں ایجادات ہوئیں۔ القا کی نعمت نہ ہوتی تو انسانی ارتقاء کیسے ہوتا......؟ اور آپ تنہائی میں قرآن پڑھتے ہوں اور کوئی آیت پڑھتے ہوئے کوئی نکتہ آپ کی سمجھ میں آتا ہے اور واضح ہوتا ہے تو بتائیں...... کس نے سمجھایا وہ نکتہ......؟ نہیں آغا جی......! اللہ نے انسان کو زمین پر بھیج کر اسے اکیلا نہیں چھوڑا۔ اس کے روحانی، مادی اور ذہنی ارتقاء کا سامان فراہم کرتا رہا۔ سورۂ رحمٰن کی ابتدائی آیات دیکھ لیں۔ رحمٰن نے قرآن پڑھایا۔ اس سے پہلے بولنا سکھایا۔ نہ سکھایا ہوتا تو آج تک وہ اشاروں میں بات کرتا ہوتا، جو بہت اہم ہوتے ہیں۔ انسان کو اس کا وعدہ یاد دلانے کے لئے پیغمبر بھیجنے تھے، صحیفے اتارنے تھے۔ خود سوچیں آغا جی......! یہ زبانیں کہاں سے آئیں......؟ عربی، اردو، انگریزی، فرانسیسی...... سب اللہ کا دیا ہے آغا جی......! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

عبدالحق کو اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ اس طرح تو اس نے نیوٹن کے بارے میں سوچا تھا۔ اور اس نے پتھروں کے زمانے کا تصور بھی کیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اللہ نے سب القا کیا تھا اس پر۔ افسوس کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ بہت پیچھے چلا گیا وہ۔

وہ اداس ہو گیا۔ کبھی فرصت سے بیٹھ کر سوچنا اور وہ سب یاد کرنا ہو گا۔ سلسلہ وہیں سے جوڑنا ہو گا۔ اس نے سوچا۔

ارجمند نے اس کی اداسی محسوس کر لی۔

"میں جانتی ہوں کہ یہ سب آپ جانتے ہیں، بلکہ اس سے بہت زیادہ آپ ہی سے تو سیکھا ہے میں نے۔"

"میں نے تمہیں کب بتایا یہ سب......؟"

"آپ کے دل سے میرے دل کا، روح سے میری روح کا رابطہ ہے۔ یہ

اللہ کا کرم ہے۔ ورنہ میں تو محبت کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔ آپ سے جڑی تو یہ بہت بڑا فیض ملا مجھے۔ قرآن پاک پڑھتی ہوں تو آپ میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ باتیں بھی ہوتی ہیں آپ سے۔"

عبدالحق کو یاد آیا۔ کراچی میں ایک بار اس کے ساتھ ایسا ہوا تھا اور عین اسی وقت یہاں لاہور میں ارجمند کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اس کی گواہ ان دونوں کی ڈائریاں تھی۔ مگر دوبارہ ایسا نہیں ہوا۔

ارجمند پھر بھی اسے محسوس کرتی رہی اور کرتی ہے۔ تو کیا اب یہ یک طرفہ ہو گیا۔ یہ رابطہ تو بہت قیمتی ہے۔

ارجمند تسلا اٹھا کر لے گئی۔ پھر آ کر اس کے سر میں تیل لگانے لگی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سو گیا۔

❀❀❀

اگلے روز صبح کے وقت عبدالحق لان میں جا بیٹھا۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ رات جو احساسِ زیاں ہوا تھا، اس نے اسے تڑپا دیا تھا۔ اتنا کچھ ہو گیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا...... کیوں......؟

اس نے ترتیب کے ساتھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ شادی سے پہلے کا آخری عرصہ اسے یاد تھا۔ جب وہ محبت میں سرشار تھا۔ جب جسم کے بھید نہیں کھلے تھے۔ وہ بڑی محبت سے نماز پڑھتا تھا اور بہت استغراق کے ساتھ قرآن۔ لیکن مولوی مہر علی نے کچھ علامات دیکھ کر بہت شفقت اور نرمی سے اسے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ غرور کی طرف جا سکتا ہے، بلکہ اس راستے پر چل پڑا ہے۔

بدقسمتی کا آغاز نور بانو کے ساتھ اختلاط سے ہوا تھا۔ اس نے شادی میں اس لئے جلدی کی تھی کہ اس کی نماز حضوری سے اور قرآن کی تلاوت غور و فکر سے محروم ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ نکاح کی برکت سے ہر خرابی دور ہو جائے گی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں، بلکہ برعکس ہوا۔

اس کا ذہن جیسے روشن ہو گیا۔ ہر یاد بالکل صاف اور واضح...... تمام جزئیات سمیت۔

اعتکاف کے بعد اسے داڑھی رکھنی تھی۔ مولوی صاحب نے تجویز کے پردے میں حکم دیا تھا۔ پھر اماں نے اس کی تائید کی تھی۔ لیکن نور بانو نے اسے شیو کرنے پر مجبور کر دیا۔

''مجبور کر دیا......؟'' کیا وہ بے بس تھا، کمزور تھا......؟

''نہیں......!'' وہ نور بانو کی دلجوئی کر رہا تھا۔ انسان تو ایسے ہی کمزور ہے۔ محبت اسے اور کمزور کر دیتی ہے۔

''جو اللہ سے دور کر دے...... وہ محبت نہیں ہو سکتی۔'' مولوی مہر علی نے فرمایا تھا۔

''ایسی کیا دلجوئی کہ آدمی نبی کریمؐ کی سنت پر عمل کرتے کرتے ہٹ جائے......؟''

''پھر سہاگ رات......!''

وہ شکر کے دو نفل ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نور بانو نے اسے روک دیا۔ یہ کہہ کر کہ وہ تو اسے بھی ادا کرنے ہیں۔ ذرا رک جائے۔ ایک بات کرنی ہے۔ اور اس بات کے نتیجے میں وجود میں دھماکہ ہوا اور سب کچھ ختم۔ نور بانو نے سورۂ ملک سنانے کی فرمائش بھی ٹال دی تھی۔

اس روز وہ فجر سے بھی گیا۔ دن چڑھے اٹھا۔ پھر عرصے تک یہ معمول بن گیا۔ نور بانو میں کوئی جادو تھا، جو اسے گھیر لیتا تھا، اور نیند بہت گہری آتی تھی۔ آنکھ کھلتی ہی نہیں تھی کسی طرح سے۔

اللہ نے پھر بھی رحمت فرمائی۔ سرکاری ملازمت اس کی رحمت ہی تھی، جس کی وجہ سے اسے دیر تک سونے سے نجات ملی اور فجر کی نماز واپس آگئی۔

اور جس سورۂ ملک کی تلاوت کو وہ خود پر نور بانو کا احسان سمجھتا تھا، جس کے بارے میں وہ سمجھتا تھا کہ وہی اسے ایمان کی طرف لائی، وہی سورۂ ملک دہلی میں رمضان کی اس مبارک رات کے بعد آخر تک اسے سننا نصیب نہیں ہوا، سوائے اس ایک موقع کے، جب اس نے نہایت سختی سے نور بانو سے اس کی فرمائش کی اور اصرار کیا۔ اور جب اس نے سنائی تو وہ پرانی والی بات ہی نہیں تھی۔

اور نور بانو سے اس کا تعلق قرآن کے حوالے سے تھا۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ جب وہ اس سے نکاح کے رشتے میں جڑی تو اس نے قرآن پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ بلکہ نماز بھی ترک کر دی۔ صرف یہی نہیں، اس نے اس کو بھی اس طرف سے غافل کرنا چاہا۔ کتنے عرصے تک اس نے خود کو فجر سے محروم رکھا۔

یہ سوچ کر اسے اب بھی شرم آتی تھی۔

لیکن قصوروار نور بانو نہیں تھی، وہ تھا۔ شادی کے بعد نور بانو اس کی ذمہ داری تھی۔ اس کا حق تھا کہ وہ اس معاملے میں نور بانو پر سختی کرتا۔ اسے نماز پڑھواتا۔ یقین سے تو وہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس بارے میں وہ مولوی صاحب سے پوچھے گا کہ کہیں اس سلسلے میں شوہر کو جواب دہی تو نہیں کرنی پڑتی بیوی کو۔

اس سے قطع نظر یہ تو حقیقت تھی کہ نور بانو نے نماز بالکل چھوڑ دی تھی۔ قرآن پڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا اور وہ دوپہر کے وقت سو کر اٹھتی تھی۔ اسے اس کے ناشتے، کھانے سے، اس کی ضرورتوں سے نہ کوئی غرض تھی نہ فکر۔ وہ تو صرف اس کے جسم کے تقاضے پورے کرنے کی فکر کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کسی معاملے سے غرض نہیں تھی۔

عبدالحق کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔

فرض کرلو کہ وہ اس کی ذمہ داری نہیں بھی تھی تو محبت کے حوالے سے تو تھی۔ وہ ہر طرح سے اپنا نقصان کر رہی تھی۔ بلکہ خود کو برباد کر رہی تھی۔ دنیا کا نقصان بھی اور آخرت کا نقصان بھی۔ وہ کیسا محبت کرنے والا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ خود کو تباہ کرتی رہی۔ اور وہ خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا۔ یہ کیسی محبت تھی......؟ شرمندہ کرنے والی محبت...... خود کو بھی اور اپنے محبوب کو بھی۔

اس نے کبھی ایک بار بھی نور بانو سے جلدی اٹھنے کو نہیں کہا۔ اسے ناشتہ نہیں ملتا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائے۔ لیکن دوسرے کو اس کے اپنے نقصان سے تو بچانے کی کوشش کرے...... نہیں......! اس کے لئے تو اسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

پھر آخری معاملے میں وہ سراسر قصوروار تھا۔ اور تمام لوگوں کا قصوروار تھا۔

حتیٰ کہ نور بانو کا بھی۔ محبت کیا یہ ہوتی ہے کہ محبوب نے جو محبت اللہ سے غافل کر دے، وہ اچھی نہیں ہو سکتی۔ اس کے کانوں میں مولوی صاحب کی آواز گونجی۔

نور بانو نے ایبٹ آباد جانے کا کہا۔ اس نے اماں سے اجازت لئے بغیر مان لیا۔ اس نے ارجمند کو ساتھ لے جانے کو کہا۔ اس نے مان لیا۔ یہ نہیں سوچا کہ یہ نئی نویلی دُلہن کے ساتھ زیادتی ہوگی اور اس کی جواب دہی اس پر ہوگی۔ اور ایسی نازک صورتِ حال میں اس نے ایک حاملہ عورت کو ایک کم عمر نئی نویلی دُلہن اور ایک نوکر کے ساتھ اتنی دور بھیج دیا۔ یہاں سے نسیمہ بھی جا سکتی تھی اور رابعہ بھی اور ساجد بھی۔ مگر اسے کچھ نہیں سوجھا۔

پھر اس نے نور بانو کی احمقانہ منت بھی مان لی۔ چلو...... اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اپنے اپنے عقیدے کی بات ہوتی ہے۔ لیکن اسے ارجمند کو تو محروم نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ اس سے ملنے تو باقاعدگی سے جا سکتا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا۔ جاتا رہتا تو وہاں کے حالات سے بھی واقف رہتا۔

اب سوچتے ہوئے عقل میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس نے یہ سب کیسے قبول کر لیا......؟ کیا وہ فاتر العقل تھا......؟ مخبوط الحواس تھا......؟ سمجھ بوجھ سے محروم تھا وہ......؟ یہ سب کیسے ہونے دیا اس نے......؟

اور جواب ایک ہی تھا۔

اس کی ذمہ دار انسان کی انسان سے محبت ہے۔ محبت جتنی شدید ہوگی، محبت کرنے والے کو اتنا ہی کمزور کر دے گی۔ جو کچھ اب وقت گزرنے کے بعد اسے احمقانہ لگ رہا تھا، وہ اس وقت نہیں لگا تھا۔ اس وقت وہ درست اور جائز تھا۔

''اللہ نور بانو کے ساتھ اچھا معاملہ فرمائے اور مجھے میری حماقتوں پر بخش دے۔ میں نے محبت کے نام پر نور بانو کے ساتھ بڑی زیادتی کی...... اسے خراب کیا...... اب تو اس کی تلافی بھی نہیں کی جا سکتی۔''

ایک بات اس کی سمجھ میں آئی۔ نکاح بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے ہوتے نفس کا معاملہ نفس کا معاملہ نہیں رہتا۔ بلکہ ایک طرح سے فرض بن جاتا ہے۔ ایک دوسرے پر ایک دوسرے کا حق ہونے کی وجہ سے۔ اور فرض کی ادائیگی کو عبادت کا درجہ

حاصل ہے۔ لیکن یہاں بھی ایک شرط ہے۔ آپ کتنے ہی بے لگام ہو جائیں، لیکن اپنے فرائض کا، نماز روزے کا پابندی کے ساتھ خیال رکھیں۔ اس سے ہٹے تو پھر نفس ہی نفس۔

اس نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔

پھر اسے ارجمند کا خیال آ گیا۔

بہت کم عمر ارجمند، جسے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا، جو ایک غلیظ پنجرے میں پلی بڑھی تھی۔ اسے اس وقت اس سے محبت ہوئی جب وہ محبت کا مفہوم سمجھنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ اور اسے اللہ میاں مل گئے۔

ارجمند جب اس کے گھر میں آئی تو قرآن سے جڑی ہوئی تھی۔ باقاعدگی سے نماز پڑھتی تھی۔ بلکہ تہجد گزار تھی۔ قرأت اس کی بہت خوب صورت تھی۔ اس نے اس سے سورۂ ملک سنی۔ اس وقت تو وہ یہ نہیں سمجھ سکا، لیکن اب سمجھ سکتا تھا کہ وہ آواز اور قرأت، دونوں میں نور بانو سے بدرجہ بہتر تھی اور اللہ اسے فہم قرآن سے بھی نواز رہا تھا۔

ارجمند نے نسیمہ کو ایک طرف ہٹا کر ناشتے کی ذمہ داری خود لے لی۔ سب لوگوں کے لئے ناشتہ وہ خود بناتی۔ پھر اسکول جاتی۔ اور تو اور...... آگے جا کر اس نے اس کے لئے دوپہر کا کھانا دفتر بھیجنے کا معمول بھی اپنا لیا اور اس کا کریڈٹ بھی نہیں لیا۔ اسے تو اتفاقاً ہی معلوم ہوا ورنہ وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ نور بانو کھانا پکا کر بھیجتی ہے۔ اتنا ایثار، اتنی خدمت گزاری تھی اس کی طبیعت میں...... دوسری طرف نور بانو دھڑلے سے جھوٹ بولتی رہی کہ کھانا وہ پکاتی ہے اور وہ بھیجتی ہے۔

اور اس کی آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی تھی۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ تنگ دلی، تنگ نظری، حاسدانہ اور قابضانہ فطرت کے ساتھ نور بانو میں جھوٹ اور مکاری بھی ہے۔ اور جھوٹ تو ایسی برائی ہے کہ تمام خوبیوں کو کھا جاتی ہے۔ اس کا فرض تھا کہ وہ نور بانو کو برائیوں کا احساس دلاتا اور اس کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ لیکن اس نے محبت اور درگزر کے نام پر نور بانو کی تمام برائیوں کو الٹا پختہ کر دیا۔

اماں نے جو کچھ بھی کہا، سچ کہا۔ اماں نے شادی سے پہلے ہی اسے خبردار کر

دیا تھا۔ بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ یہ شادی غلط ہو رہی ہے۔ اسے اس سے بچنا چاہئے۔ وہ اماں کی بات ٹالنے والا نہیں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ دہری مجبوری تھی۔ ایک تو وہ برسوں سے نور بانو سے محبت کرتا تھا اور قبولِ اسلام کے حوالے سے اس کا احسان مند بھی تھا۔ پھر بھی اماں کے حکم کی تعمیل میں وہ دل پر پتھر رکھ لیتا۔ مگر برسات کی اس شام جو کچھ ہوا، اس کے بعد وہ نور بانو سے منہ نہیں پھیر سکتا تھا۔ اس شام وہ اس کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ جو داغ لگا تھا، وہ نکاح سے ہی ڈھل سکتا تھا۔

اماں نے ایبٹ آباد جانے کے حوالے سے جو کچھ کہا، وہ بھی سچ تھا۔ اور عارف بھائی نے تو سب کچھ سننے کے بعد نور بانو کی شخصیت کا ایسا بھرپور تجزیہ کیا تھا کہ اب وہ اس پر صرف حیرت ہی کر سکتا تھا۔ مسترد تو اس وقت وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اب وہ جانتا تھا کہ وہ تجزیہ بالکل درست تھا۔ عارف بھائی نے پہلی بار اس سے اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی، اس کی وجہ ارجمند تھی۔ اس کے ساتھ مرحومہ نادرہ کی وجہ سے ان کی جذباتی وابستگی تھی۔ ایک طرح سے وہ اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ انہوں نے کھل کر کہا تھا کہ نور بانو ارجمند کو استعمال کر رہی ہے۔

اب وہ سمجھ سکتا تھا۔ نور بانو کو اس کے علاوہ سبھی لوگ جانتے اور سمجھتے تھے۔ ایک وہی تھا، جو کچھ نہیں جانتا تھا۔ عارف بھائی نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اس کی شخصیت کو سمجھ گئے اور یہ طے تھا کہ نور بانو نے سبھی کو آزار دیئے، زخمی کیا۔ زبیر بھائی، رابعہ آپا، ساجد...... حد یہ کہ اس نے اماں کو بھی نہیں بخشا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اماں کے معاملے میں وہ کتنا سخت ہے۔ پھر بھی اس نے اماں کے ساتھ جنگ کی۔ صرف اس یقین پر کہ وہ اس کا اسیر ہے، اس کی محبت میں پوری طرح احمق بن چکا ہے۔

اسے خود پر بڑی شدت سے غصہ آیا۔ نور بانو سے سب سے قریب وہی تھا، اور سب سے بے خبر بھی وہی تھا۔ سب نور بانو کو جانتے تھے، ایک وہی نہیں جانتا تا، اور اس کا سبب محبت تھی۔

تو محبت کوئی اچھی چیز تو نہیں۔ اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ اس میں آدمی اُلو بن جاتا ہے۔ محبوب کی خاطر ناجائز کو بھی جائز بنا دیتا ہے۔ اللہ سے بھی دور ہو جا

ہے۔

''محبت صرف اللہ کے لئے...... صرف اللہ سے......'' اس کے اندر سے کسی نے کہا۔

اسے ارجمند کا خیال آ گیا۔ ارجمند بھی تو اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن وہ کسی سے حسد نہیں کرتی۔ وہ اسے دوسروں سے دور کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ وہ کتنی خدمت گزار ہے۔ اس نے پہلی بار احساس دلایا کہ بیوی کو کیسا ہونا چاہئے......؟

نور بانو نے تو کبھی اس کا خیال نہیں رکھا۔ کبھی اس کی خدمت نہیں کی۔ وہ تو صرف بستر کی رفیق بن کر رہی۔ اس نے تو بس اسے اپنی ملکیت سمجھا، جیسے وہ اس کا مفتوحہ کوئی شہر ہو۔ اور ارجمند نے تو ہمیشہ اس کی نماز کا خیال رکھا۔ اس کے جھڑکنے کے باوجود اسے گہری نیند سے جگایا فجر کے لئے۔

''دونوں میں اتنا فرق کیوں......؟''

جواب اسے فوراً ہی مل گیا۔

ارجمند ایسی اس لئے ہے کہ وہ جانتی ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ نور بانو اب بھی اس کے دل میں بسی ہے۔ تو بات یہ ہے کہ یکطرفہ محبت میں بھلائی ہے اور دوطرفہ محبت خرابی لاتی ہے۔

تھوڑا سا غور کرنے پر ثبوت بھی سامنے آ گئے۔

جب تک اسے یہ علم نہیں تھا کہ نور بانو بھی اس سے محبت کرتی ہے، وہ بہت اچھا تھا۔ نماز میں حضوری کا احساس ہوتا تھا۔ قرآن پڑھتے ہوئے ایک خوب صورت کیفیت اس پر طاری رہتی تھی۔ وہ سب کی فکر کرتا تھا۔ لیکن جب یہ علم ہوا کہ نور بانو بھی اس سے محبت کرتی ہے تو نفس ایک دم شیر ہو گیا۔ خواہشیں سر اٹھانے لگیں، بے لگام ہو گئیں۔ پھر انہوں نے پھیلنا شروع کر دیا۔ دماغ ان سے بھر گیا۔ دل آلودہ ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ تباہ ہو گیا۔

اور نور بانو کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ بھی کتنی اچھی تھی۔ لیکن اس کی محبت کا احساس ہوتے ہی وہ پر پرزے نکالنے لگی۔ بے اعتقادی کے ساتھ سہمی سہمی ادھر ادھر پھرنے اور کونوں میں دیکھنے والی لڑکی، جو اپنے بارے میں بھی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی،

دوسروں کے بارے میں فیصلے کرنے لگی۔ بلکہ ان پر عمل درآمد کرانے لگی۔

ابھی اگر ارجمند کو احساس ہو جائے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی بدل جائے گی۔ اس وقت تو وہ میرے لئے بہت نافع ہے۔ شاید اختیار اور اقتدار آدمی کو خراب کر دیتا ہے...... عورت کو کچھ زیادہ ہی۔

ذہن میں ایک سوال نے سر اٹھایا۔ کیا وہ ارجمند سے محبت کرتا ہے......؟ تصور میں فوراً نوربانو کی شبیہہ ابھری۔ محبت محبوب کے مرنے کے بعد بھی زندہ تھی۔ جبکہ کوشش کے باوجود ارجمند کا وہ تصور بھی نہیں کر سکا۔

ارجمند کو وہ پسند کرتا تھا۔ اس میں خوبیاں ہی اتنی تھیں۔ لیکن محبت نہیں۔ اور اب وہ کسی سے محبت کرنا بھی نہیں چاہتا۔ بہرحال یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ ارجمند اس کی بیوی تھی۔ وہ اس کا، اس کی ہر آسائش کا، اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ وہ اس کی آخرت کی فکر بھی کرتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر قرآنِ حکیم کی آیات پر غور و فکر اور تبادلۂ خیال کر سکتا تھا۔

بلاشبہ ارجمند اس کے لئے نعمت تھی...... بہت بڑی نعمت۔

❁❁❁

حمیدہ کے ساتھ عبدالحق کی بات ہوئی۔ بات مستقبل کی تھی۔ اب کیا ہونا ہے......؟ کیسے رہنا ہے......؟ کیا کرنا ہے......؟

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے......؟'' حمیدہ نے کہا۔

''فیصلہ تو تجھے کرنا ہے پتر......!''

''تو جیسا چل رہا تھا، ویسا ہی چلنے دیں......!''

''تو غلط سمجھا پتر......! فیصلہ تجھے اس بات کا کرنا ہے کہ نوکری کرنی ہے یا چھوڑنی ہے......؟ آگے کی بات میری...... بہت رہ لی تیرے بغیر...... اب جہاں تو رہے گا، میں بھی وہیں رہوں گی۔''

''نوکری تو اماں......! چلے گی۔''

''بس...... تو ہم تیرے ساتھ ہی چلیں گے۔''

''ہم سے کیا مراد ہے اماں......! ہم سب......؟''

''پاگل ہے تو تو...... بچوں جیسی بات کرتا ہے۔ میں اپنی اور نکی کی بات کر رہی ہوں۔ ساجد کی پڑھائی ہے۔ پھر تجھے تو معلوم ہی نہیں کہ زبیر کتنی محنت کرتا ہے۔ خدا جانے، کتنے کام پھیلائے ہوئے ہیں اس نے۔ اب تو ساجد بھی اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ یہ لوگ تو یہیں رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے اماں......! جو تمہاری مرضی......!'' عبدالحق کے دل پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ اب وہ اکیلا رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''تو میں تیاری شروع کرادوں......؟''

''کیسی تیاری اماں......؟''

''ارے...... بےوقوف......! کتنا سامان لے جانا ہوگا......؟''

''سامان کا کیا ہے اماں......؟ وہاں بھی بہت...... سبھی کچھ ملتا ہے وہاں......!''

''پھر بھی...... کپڑے وغیرہ تو لینے ہوں گے۔''

''تم جانو اماں......!''

ارجمند کو پتا چلا تو وہ کتابوں کے لئے پریشان ہوگئی۔

''اب پوری لائبریری تو نہیں جا سکتی وہاں......؟'' عبدالحق نے کہا۔

''اور کتابیں تو وہاں بھی ہیں۔''

''لیکن منتخب کتابیں تو جائیں گی۔'' ارجمند نے شیلف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

اور وہ منتخب کتابیں بھی کم نہیں تھیں۔

''ٹھیک ہے......! سامان زبیر بھائی یہاں سے بھیج دیں گے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب گاؤں چلنے کی فکر کرلیں پہلے......!''

❁❁❁

حق نگر میں تو عبدالحق کے پاس فرصت کے نام پر ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ دعا کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ عبدالحق کا غم پورے حق نگر کا غم تھا۔

حق نگر اب چھوٹا سہی، مگر ایک شہر بن چکا تھا۔ تقریباً ہر سہولت وہاں میسر تھی، سوائے ریل کے۔ جنہیں ریل سے سفر کرنا ہوتا، وہ صادق آباد یا رحیم یار خان کا رخ کرتے۔ آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ عبدالحق کو شناسا لوگ کم نظر آئے اور اجنبی زیادہ۔ جنہیں وہ پہچانتا بھی نہیں تھا۔ لیکن لطف کی بات یہ کہ اسے سب پہچانتے تھے۔

وہ باہر نکلتا تو راستے میں سب اسے سلام کرتے۔ مسجد میں اس سے مصافحہ کئے بغیر کوئی مسجد سے نہ نکلتا۔

دو دن تو ایسے گزرے کہ بیٹھک کبھی خالی ہی نہیں ہوتی تھی۔ سوائے نماز کے اوقات کے۔ ہر وقت لوگ بھرے رہتے تھے۔

عبدالحق کو احساس ہوا کہ زبیر بھی وہاں بہت مقبول ہے۔ لوگ اس سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔

عبدالحق نے گھوم پھر کر جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ زبیر نے وہاں کام بھی بہت کیا تھا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا، وہ تو کیا ہی تھا، اس کے سوا بھی بہت کچھ تھا۔ دستکاری کا مرکز بہت اچھا چل رہا تھا۔ کالج بھی موجود تھا اور اسکول تو کئی تھے۔ اس کے علاوہ ایک شوگر مل تھی۔ بازار کئی تھے، اور بڑے بڑے تھے۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں میسر تھی۔

عبدالحق کو اندازہ ہوا کہ اللہ کے فضل سے لوگ خوش حال ہوئے ہیں اور پھل پھول رہے ہیں۔

ایک مارکیٹ میں کپڑے کی ایک دُکان پر اسے شیخ صاحب بیٹھے نظر آئے۔

وہ ان کی طرف چلا گیا۔

شیخ صاحب تخت سے اٹھ کر باہر چلے آئے۔ پرسے کے لئے تو وہ پہلے ہی دن آچکے تھے۔

عبدالحق نے ان سے ہاتھ ملایا۔

''کیسے ہیں شیخ صاحب......!''

''آپ کی دُعاؤں کے سائے میں ہیں سرکار......! آیئے...... بیٹھئے نا......!'' انہوں نے جھاڑن سے تخت پر بچھے ہوئے صاف کپڑے کو یوں جھاڑا، جیسے اس پر گرد ہی گرد ہو۔

عبدالحق بیٹھ گیا۔

شیخ صاحب نے تھانوں پر سے گرد جھاڑنے والے لڑکے کو پکارا۔

''ارے عمر......! دیکھ تو کون آیا ہے......؟''

عمر نے پلٹ کر دیکھا اور لپک کر نیچے آیا۔

''سلام...... بڑے سرکار......!''

عبدالحق نے سلام کا جواب دیا۔

''کیسے ہو عمر......؟''

''جی...... ٹھیک ہوں......!''

''جا کے جلدی سے ایک پاکولا لے کر آ سرکار کے لئے......!''

''یہ زحمت نہ کریں شیخ صاحب......!'' عبدالحق اس تپاک سے گھبرا کر گھگیانے لگا۔

''زحمت کیسی سرکار......! یہ تو عزت افزائی ہے ہمارے لئے......!''

لڑکا اتنی دیر میں پاکولا لینے دوڑ گیا تھا۔

''تو آپ یہاں کام کر رہے ہیں آج کل......؟''

''جی ہاں......!''

''دُکان کس کی ہے......؟''

شیخ صاحب نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔

''آپ ہی کی ہے سرکار......!''

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ جس انداز میں شیخ صاحب نے یہ بات کہی تھی، اس سے لگتا تھا کہ دُکان ان کی اپنی ہے اور آخری بار جب وہ ان سے ملا تھا تو وہ بہت پریشانی میں تھے۔ مل میں کام کرتے تھے۔ پھر سانس کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ کام کرنا ان کے لئے دُشوار ہوگیا۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ ان کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔ زبیر بھائی سے بات کرے گا۔ لیکن بات ذہن سے نکل گئی۔

''بہت مبارک ہو آپ کو......!''

''آپ ہی کا احسان ہے سرکار......!''

''میں سمجھا نہیں شیخ صاحب...... !'' عبدالحق کے لہجے میں الجھن تھی۔

''یہ تو مارکیٹ ہی آپ کی ہے سرکار......!''

''اچھا......؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''چھوٹے سرکار نے بنوائی ہے۔ نام اس کا آپ کے نام پر ہے...... حق مارکیٹ......!''

مزید حیرت کی گنجائش نہیں تھی۔ عبدالحق سمجھ گیا کہ چھوٹے سرکار زبیر بھائی ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے۔ جو چھوٹا ہے وہ بڑے سرکار کہلاتا ہے اور جو بڑا ہے وہ چھوٹے سرکار......!

''تو اس میں احسان کی کیا بات......؟'' اس نے کہا۔

عمر اتنی دیر میں پاکولا کی بوتل لے آیا تھا۔ وہ اس نے عبدالحق کو تھما دی اور خود دُکان کے اندر چلا گیا۔

''بڑے لوگوں کی یہی تو بڑی بات ہوتی ہے سرکار......! احسان کر کے بھول جاتے ہیں۔ لیکن سرکار......! میں تو اللہ سے یہی دُعا کرتا ہوں کہ ہمیں احسان فراموشی اور ناشکرے پن سے بچائے رکھے۔''

عبدالحق نے پاکولا کا گھونٹ لیا۔ اسے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ بات کھل ہی نہیں رہی تھی۔

''آپ پوری بات بتائیں تو مجھے یاد آئے......!''

''اللہ آپ کو اس سے بھی اچھا بنائے سرکار......! اور اتنا دے کہ آپ احسان کر کے بھولتے رہیں۔'' شیخ صاحب نے عاجزی سے کہا۔

''یاد ہے آپ کو...... پچھلی بار میں آپ سے ملا تو میں بے روزگار تھا۔ بہت پریشان تھا سرکار......! پھر آپ تو چلے گئے۔ دو تین دن بعد چھوٹے سرکار آئے۔ میں راستے میں ملا تو مجھ سے پوچھا کہ کام پر کیوں نہیں گئے......؟ میں نے وجہ بتائی تو میرا ہاتھ پکڑ کر یہاں لے آئے۔ یہ مارکیٹ اسی وقت مکمل ہوئی تھی۔ شاید وہ اسی کے لئے لاہور سے یہاں آئے تھے۔ یہ دُکان انہوں نے کھول کر مجھے دکھائی اور چابی مجھے دے دی۔ بولے...... یہ اب تمہاری ہے۔ میں نے کہا۔ خالی دُکا کا میں کیا کروں گا

سرکار......؟ کہنے لگے، خالی نہیں رہے گی۔ اچھا...... کپڑے کا کاروبار کرو گے......؟ میں نے کہا۔ کیسے کر سکتا ہوں......؟ میرے پلّے تو کچھ ہے نہیں...... بولے...... ہم اپنے کام کرنے والوں کو، اگر وہ بیمار ہو جائیں، کام کے قابل نہ رہیں تو ایسے تو نہیں چھوڑتے۔ اتنے برس تم نے کام کیا ہے ہمارے لئے۔ کل مل چلے جانا۔ وہاں سے تمہیں تمہارا حق مل جائے گا۔ پھر میں کل آ کر تم سے بات کروں گا۔''

شیخ صاحب کہتے رہتے اور عبدالحق سنتا رہا۔

اگلے روز مل سے شیخ صاحب کو بارہ سو روپے مل گئے۔ وعدے کے مطابق زبیر وہاں پہنچا۔ صورتِ حال سننے کے بعد اس نے کہا۔

''اس میں کیا بنے گا......؟ خیر...... دیکھتے ہیں۔ کل میرے ساتھ چلنا......!''

اگلے روز زبیر انہیں اپنے ساتھ لاہور لے گیا۔ وہاں سے اس نے خود انہیں پانچ ہزار روپے کا کپڑا خرید کر دیا۔

''اب آپ جائیں اور کاروبار شروع کریں۔ انشاء اللہ برکت ہو گی......!''

شیخ صاحب نے بارہ سو میں سے ہزار روپے اس کی طرف بڑھائے۔

''یہ تو رکھ لیں چھوٹے سرکار......!''

''یہ تم اپنے پاس رکھو...... کاروبار میں آدمی کو خالی ہاتھ نہیں رہنا چاہئے۔''

''لیکن چھوٹے سرکار......!''

''فکر نہ کرو...... یہ قرض ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے سہولت کے ساتھ اتارنا...... ایسے کہ گھر بھی چلتا رہے۔ کاروبار میں بھی خلل نہ پڑے۔ اس کے خلاف نہ کرنا۔ ورنہ کاکا مجھ پر بہت خفا ہوں گے۔''

''اور دکان کا کرایہ......؟''

''جب مارکیٹ کامیاب ہو گی۔ کاروبار اچھا ہو گا تو وہ بھی طے کر لیں گے۔ اب تم جاؤ......!''

عبدالحق حیران تھا۔ اس سے کچھ کہا بھی نہیں گیا۔

''میرے بچے آپ کے لئے دُعا کرتے ہیں سرکار......! اور میرا کیا......؟ اس مارکیٹ کی ہر دکان کسی ضرورت مند کے پاس ہے۔ سب آپ کے لئے دُعا کرتے

ہیں۔''

عبدالحق کا شرمندگی سے برا حال تھا۔

''اور اب آپ کا کیا حال ہے......؟''

''اللہ کا شکر ہے......آپ کی عنایت ہے سرکار......! کام خوب چلا ہمارا۔''

''اور قرض کا کیا بنا......؟''

''چھوٹے سرکار نے کہا کہ اپنے پاس جمع کرتے رہو۔ رقم پوری ہی واپس کرنی ہوگی۔ شرط یہ ہے کہ دُکان پہلے ہی کی طرح بھری ہوئی ہو مال سے۔ تو سرکار......! میں اب تک دو ہزار کے قریب جمع کر چکا ہوں۔ قرض ادا کرنے کے لئے۔ پر سرکار......! آپ کیوں پوچھتے ہیں......؟ آپ کو تو سب معلوم ہے......؟''

''کیا مطلب......؟'' عبدالحق پھر حیران ہوا۔

''آپ ہی کے حکم پر تو یہ سب ہوا ہے۔'' شیخ صاحب بولے۔

''چھوٹے سرکار نے خود بتایا ہے مجھے......!''

عبدالحق کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔

''زبیر بھائی کا بس چلے تو اپنی ہر نیکی میرے نام لکھ دیں۔'' اس نے کہا۔

''سچ تو یہ شیخ صاحب......! کہ میں تو آپ سے شرمندہ ہوں۔ سوچا تھا کہ آپ کے لئے کچھ کرنا ہے۔ مگر مصروفیات میں ذہن سے نکل گیا۔ اس کی تو اللہ کے حضور جواب دہی کرنی ہوگی۔''

شیخ صاحب نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ایسا نہ کہیں سرکار......! آپ اور چھوٹے سرکار الگ تو نہیں...... پھر زمین آپ کی، پیسہ بھی آپ کا، مل بھی آپ کی، تو آپ ہی نے سب کچھ کیا نا......؟ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو چھوٹے سرکار کیا کر لیتے......؟''

اب اس کے آگے بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ انہیں کیا بتاتا کہ زمین بھی زبیر بھائی کی، مل بھی ان کی اور پیسہ بھی ان کا۔ تو اجرا سے کیسے مل سکتا ہے......؟

ہاں......! اسے یاد رہتا اور وہ زبیر بھائی سے کچھ کرنے کو کہتا تھا تو اور بات ہوتی۔

وہ بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ خود کو ہلکا کرنے کے لئے اس نے سب لوگوں کے لئے کچھ کپڑا خرید لیا۔ وہ بھی مشکل بن گئی۔ شیخ صاحب پیسے لینے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے انہیں قائل کیا۔

❁❁❁

ذرا فرصت ہوئی تو اس نے وہ کام کیا جس کے لئے وہ بے تاب ہو رہا تھا۔

فجر کی نماز کے بعد وہ مولوی مہر علی صاحب کے پاس رک گیا۔

''میں شرمندہ ہوں حضرت......! کہ آپ کے پاس اتنی تاخیر سے بیٹھ رہا ہوں۔''

''ارے نہیں...... پتر عبدالحق......!'' مولوی صاحب نے بڑی شفقت سے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ کتنے مصروف رہے ہو۔ یہاں کے لوگوں کا بھی تو حق ہے تم پر۔ اور پھر بات بھی غم کی تھی۔ اللہ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے......!''

عبدالحق سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''اور میرے پاس تو فرصت میں ہی آنا تھا نا...... تم نے......؟'' مولوی صاحب نے مزید کہا۔

عبدالحق نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ تین دن سے وہ نماز کے بعد انہیں دیکھتا رہا تھا۔ لیکن اسے ایک بار بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ بہت تیزی سے بوڑھے ہوئے ہیں۔ صرف بوڑھے نہیں، کمزور بھی۔ ان کی آنکھوں کے نیچے حلقے تھے۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے مولوی صاحب......!'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

مولوی صاحب مسکرائے۔

''الحمدللہ پتر......! اللہ کا فضل ہے کہ ہر بیماری سے محفوظ ہوں۔''

''کچھ کمزور لگ رہے ہیں آپ......!''

''جسم کی بات کر رہے ہو نا پتر......! یہ تو عمر کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتا ہی

ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے۔‘‘

عبدالحق کو احساس ہوا کہ دانش کا ایک بند دروازہ اس پر کھل رہا ہے۔ یقیناً مولوی صاحب کو اللہ اور آگے لے گیا تھا۔

’’یہ کمزوری اللہ کی رحمت ہے...... ؟ وہ کیسے مولوی صاحب......؟‘‘

’’دیکھ نا پتر......! نفس جسم کی طاقت ہی کو تو سب سے زیادہ استعمال کرتا ہے۔ عمر بڑھتی ہے اور جسم کمزور ہوتا ہے، طاقت اور توانائی مدہم پڑتی ہے تو نفس کا غلبہ بھی کمزور پڑتا ہے۔ اللہ بندے کو یاد دلاتا ہے کہ ملاقات کا وقت قریب آ رہا ہے، تیاری کر لے اس کے لئے۔ ویسے تو اس کی یہ تلقین عمر بھر ساتھ رہتی ہے بندے کے...... لیکن جسم جیسے جیسے ڈھلتا ہے، گناہ کی طاقت کم ہوتی جاتی ہے۔ تو ایسے میں اس تلقین کی شنوائی کا امکان بڑھتا ہے، نفس کے تقاضے کم ہوتے ہیں، اس کا شعور گھٹتا ہے تو آدمی کو قریب آتی موت کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دینے لگتی ہے۔ پھر اللہ کی تلقین بھی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ بندہ اللہ سے رجوع کرتا ہے اور فلاح پا جاتا ہے۔‘‘

عبدالحق بہت غور سے سن رہا تھا۔ بات کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے اعتراض ضروری تھے۔ ان کے جواب میں دانش اور آگہی کے اور موتی ہاتھ آئے۔ اسی کے لئے تو وہ یہاں آیا تھا۔

’’لیکن مولوی صاحب......! نفس تو مرتے دم تک ساتھ رہتا ہے۔ وہ کہاں جان چھوڑتا ہے آدمی کی......؟‘‘

’’درست ہے پتر......! اس کی وجہ سے تو جنت اور جہنم ہیں۔ لیکن سوچو......! آدمی کی جوانی میں، ادھیڑ عمری تک میں اس کا نفس تو جابر بادشاہ ہوتا ہے نا...... اس کا ہر حکم قابل عمل ہوتا ہے۔ پر بڑھاپے میں وہ بات نہیں رہتی۔‘‘

’’تب تو وہ اور ظالم ہو جاتا ہے مولوی صاحب......!‘‘ عبدالحق نے کہا۔

’’وہ کیسے عبدالحق پتر......؟‘‘

’’وہ غالب نے کہا ہے نا مولوی صاحب......! کہ گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے۔‘‘

’’وہ بڑا شاعر تھا پتر......! ٹھیک ہی کہا اس نے بھی۔ پر اس بات پر ذرا آگے

جا کر سوچو۔ بڑھاپے میں نفس اس بادشاہ کی طرح ہوتا ہے جس کی بہت بڑی سلطنت کے بیش تر صوبے باغی ہو کر اس کے ہاتھ سے نکل چکے ہوں۔ بس وہ بہادر شاہ ظفر کی طرح ہوتا ہے، جس کا اقتدار بس دہلی کے لال قلعے تک محدود ہو گیا تھا۔‘‘

’’تب وہ آدمی کو حسرتِ گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔‘‘

مولوی صاحب نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔

’’حسرتِ گناہ درجے میں عملی گناہ کے برابر تو نہیں ہو سکتی نا پتر......!‘‘

’’لیکن گناہ تو ہے نا مولوی صاحب......!‘‘

’’اب میں گمان کی بات کروں گا۔ کیونکہ مجھے اس کا تجربہ نہیں۔‘‘ مولوی صاحب کے لہجے میں عاجزی در آئی۔

’’حسرت میں لذت تو نہیں ہے نا پتر......! الٹا اذیت ہے اس میں۔ تو میرا خیال ہے کہ آدمی اس سے تھک جاتا ہوگا۔ اور آخری پناہ گاہ تو اللہ کے دربار میں ہی ہے نا......؟‘‘

’’یہ بتائیں کہ نفس کا لال قلعہ کیا ہے......؟‘‘

’’تصور...... تخیل......‘‘ مولوی صاحب نے بے جھجک کہا۔

’’اور اس کا تعلق جسم سے ہے یا روح سے......؟‘‘

’’دونوں سے......!‘‘

’’وہ کیسے......؟ میں تو سمجھتا تھا کہ اس کا تعلق صرف روح سے ہے۔‘‘

’’دماغ سے بھی ہے نا پتر......! اور دماغ جسم کا گورنر ہے۔‘‘

’’تو نفس جب تصور کو خراب کرے گا تو روح بھی کمزور ہوگی......؟‘‘

’’ہاں پتر......! پر ایک فرق ہے۔ جسم مادہ ہے اور روح اللہ کی سانس ہے۔ جس میں جتنی روح پھونکی اللہ نے، اتنا ہی اس نے جینا ہے۔ چاہے جسم کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ ہاتھ پاؤں جواب دے جائیں، روح ہے تو آدمی کو زندہ رہنا ہے۔ اور آدمی گناہ کرتا ہے، کئے جاتا ہے تو روح آلودہ ہوتی ہے۔ کمزور ہوتی ہے۔‘‘

’’تو پھر جسم کی کمزوری سے آدمی کی فلاح کا راستہ کیسے نکل سکتا ہے......؟‘‘
عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''طاقت گناہ کم ہوتی ہے نا پتر......! اور یہ اللہ کی رحمت ہے۔''

''لیکن جسم کمزور ہوگا تو بھلائی کی طاقت بھی تو نہیں رہے گی۔ عبادت بھی تو آسان نہیں ہوگی۔''

''یہ تو ہم ظاہری اسباب کے حوالے سے کہہ سکتے ہیں عبدالحق پتر......! پر اللہ کی رحمت اور قدرت کو سامنے رکھ کر بات کرو۔ دیکھو نا...... گناہ کے ارادہ پر وہ سزا نہیں دیتا، جب تک بندہ گناہ نہ کرے۔ اور نیکی کے اردے پر بھی وہ جزا دیتا ہے، چاہے بندہ اپنے ارادے پر عمل نہ کر پائے۔ اور طاقت کی بات کرتے ہو پتر......! تو میں نے ایسے بے بس لوگوں کو دیکھا ہے، جن میں چلنے کا دم بھی نہیں ہوتا۔ پر اذان کی آواز سنتے ہی نماز کے لئے چلے آتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں، جن سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جاتا، لیکن انہوں نے نماز بیٹھ کر کبھی نہیں پڑھی۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے۔ نیکی کی نیت سچی ہو تو وہ ناتواں کو بھی طاقت دے دیتا ہے اور نہ بھی دے تو اجر تو دے ہی دیتا ہے۔ پھر سوچو کہ آدمی بستر پر پڑے رہنے پر مجبور ہو تو اللہ نے اسے اشاروں میں نماز پڑھنے کی سہولت دی۔ لیٹے لیٹے کچھ نہ کر پائے تو بندہ ذکر تو کر سکتا ہے۔ اللہ نے نیکی کے لئے بڑی آسانیاں عطا فرمائی ہیں پتر......! وہ تو اپنی جنتوں کو اپنے بندوں سے بھر دینا چاہتا ہے۔''

''بڑی عمر تو زحمت ہے مولوی صاحب......!''

''نہیں پتر......! غور کرو تو سب اللہ کی رحمت ہے۔ بڑی عمر بھی رحمت ہے کہ مہلت ہے آخرت کے لئے کچھ کرنے کی۔''

''سب سے زیادہ مہلت تو ابلیس کو دی اللہ نے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''ایسے نہ کہہ پتر عبدالحق......!'' مولوی صاحب نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''سوچو نا...... کہ اس کا تو فیصلہ کر دیا۔ انجام طے کر دیا اس کا۔ مہلت دی تو اور خرابی کرنے کی۔ پر بندے کی مہلت تو اس کا انعام اور کرم ہے۔ چلو...... اب کچھ کما لو آخرت کے لئے......!''

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔ واقعی اس نے بہت کمزور بات کی تھی۔ ایک مولوی

صاحب ہی تو تھے جن کے سامنے وہ خود کو نا سمجھ بچہ محسوس کرنے لگتا تھا۔

''لیکن مولوی صاحب......! لمبی عمر میں بہت دکھ ہیں۔ کراچی میں میں نے دو ایسے بندے دیکھے، جن کی عمریں سو کے قریب تھیں۔ دونوں کے حالات بھی الگ تھے اور دکھ بھی۔ ایک کے پوتے پر پوتے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ کوئی ان کے پاس نہیں بیٹھتا، کوئی بات نہیں کرتا، کوئی ان کی نہیں سنتا۔ میں نے پوتوں سے بات کی تو وہ بولے کہ دادا سنک گئے ہیں۔ ہر بات پر اعتراض کرتے ہیں، ایک ایک قصہ ہزار بار سنا چکے، پھر بھی وہی سناتے رہتے ہیں۔ بچوں کی ہر بات پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ بال کیوں بڑھا رکھے ہیں لڑکیوں کی طرح، یہ بھی کوئی لباس ہے بھلا، انگریز والا، تو اب کیا کریں کہ بچے ان کے پاس پھٹکتے بھی نہیں۔ مجھے فرصت نہیں، یہاں سے تنگ آ کر بڑے بھائی کے ہاں چلے جاتی ہیں تو بچے سکون کا سانس لیتے ہیں۔ وہاں بھی یہی کچھ ہوتا ہے تو پھر واپس چلے آتے ہیں۔ میں ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہوں۔ اور کیا کروں......؟''

''دوسرے صاحب ایسے ہیں کہ دنیا میں ان کا کوئی نہیں۔ یار دوست بھی سب مرکھپ چکے۔ مکان اپنا ہے۔ اس کا ایک حصہ کرائے پر دے رکھا ہے۔ اس سے گزراوقات ہو جاتی ہے۔ باہر کے حصے میں چھوٹی سی دُکان کر لی ہے، صرف اس لئے کہ کوئی کچھ لینے آئے تو اس سے دو باتیں ہی ہو جائیں۔ کہتے ہیں، ایسی تنہائی کا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ موت کی آرزو کرتے ہیں ہر وقت۔ اب آپ بتائیں......!''

مولوی صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

''دونوں چلتے پھرتے ہیں آزادی سے......؟ صحت مند ہیں......؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی مولوی صاحب......! الحمدللہ......!''

''تو پتر......! آدمی کی سوچ کی بڑی اہمیت ہے۔ جیسی اس کی سمت ہوگی، ویسا ہی عمل کا راستہ بنے گا۔ مومن ہمیشہ وقت سے، صورتِ حال سے اور جس دور میں جی رہا ہے، اس سے مطابقت پیدا کرتا ہے۔ خود کو اس کے مطابق ڈھالتا ہے اور سوچو تو زندگی شروع ہی سے آدمی کو یہی سبق سکھاتی ہے۔ اسلام تو دین فطرت ہے نا

پتر......!''

''حالات سخت مخالف ہوں تو ایمان سے ہٹ جائے گا......؟''

''میں نے مومن کی بات کی ہے عبدالحق پتر......! مومن وہ ہے جو ایمان لایا اور اس پر قائم رہا۔ اب یاد کرو، اسلام کے ابتدائی دور میں مومن نماز چھپ کر ادا کرتے تھے نا......اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد ایسا وقت نہیں آیا۔''

''مولوی صاحب......! قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔ ہم بڑی عمر پر بات کر رہے تھے۔''

''ہاں پتر......! مجھے یاد ہے۔ بڑی عمر کی قباحتیں بھی ہیں۔ اس لئے تو حضورؐ کارآمد عمر کی دُعا فرماتے تھے۔ آدمی محتاج نہ ہو جائے دوسروں کا۔ دماغ اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ لیکن پتر......! لمبی عمر بہرحال بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے اصلاحِ احوال کی مہلت ہے۔ اب جن دو حضرات کا تم نے حوالہ دیا، انہوں نے اس سے استفادہ نہیں کیا۔''

''کیسے مولوی صاحب......؟''

''انہوں نے اس امر کو سمجھا ہی نہیں کہ یہ مہلت ہے۔ نعمت ہے اللہ کی۔ سمجھتے کہ دنیا کی طرف سے رخ پھیرنا ہے۔ نماز کی طرف لپکتے، قرآن پڑھتے کہ اب فرصت ہی فرصت ہے۔ اولاد کی اولاد پر تنقید کرنے کے بجائے ان سے محبت کرتے۔ جو قرآن سے سیکھتے، دلچسپ قصے کہانیوں کی صورت میں ان تک پہنچاتے۔ اس سے انہیں ان کی محبت بھی ملتی، اور باطنی خوشی اور طمانیت بھی حاصل ہوتی۔ مگر انہوں نے سمجھا ہی نہیں۔ بدلتے وقت سے مطابقت پیدا ہی نہیں کی۔ آدمی جب باپ ہوتا ہے تو وہ اپنے گھر میں حاکم وقت ہوتا ہے۔ لیکن دادا بننے کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہت اولاد کو منتقل ہوگئی۔ ایسا آدمی شاہ جہاں کی طرح ہوتا ہے، جسے اورنگ زیب نے معزول کر دیا تھا۔ تو وقت گزاری کے لئے شاہ جہاں نے کیا مانگا تھا......؟ بچے، جنہیں وہ پڑھا سکے، اور اورنگ زیب نے سمجھ لیا شوقِ حکمرانی دل سے نہیں گیا۔ استاد بھی تو بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ مطلق العنان نہیں ہوتا۔ وہ حکمت اور فراست کے زور پر حکومت کرتا ہے، محبت کے زور پر دل جیتتا ہے۔''

''اور پتر......! کوئی دور ایسا نہیں، جس میں فیشن نہ رہا ہو۔ اور وہ بدلتا رہتا ہے۔ آدمی ایسا نہ ہو کہ اپنے دور کو ہی اچھا سمجھ کر اس میں جیتا رہے۔ جس دور میں رہ رہا ہو، اسے قبول ہی نہ کرے۔ اسے برا کہے، اسے ردّ کرے، ایسے میں تو وہ موت کی دُعا کرے گا ہی۔ سوچو...... پہلے بیل گاڑی، بگھی میں سفر کرتے تھے۔ وقت زیادہ لگتا تھا۔ تھکن بھی ہوتی تھی۔ اب لاری ہے، موٹر ہے۔ آسانی ہے نا......تو ہم لاری میں بیٹھتے ہیں نا......تو اس دور کی ہر چیز کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ نہیں کہ جو اچھا لگا، وہ قبول، برا لگا تو ردّ کر دیا۔''

''اب جس کو رشتے ناطے ملے ہیں، اسے ان کو اپنا بنا کر رکھنا ہے۔ بڑھاپے میں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ سختی اور حاکمیت سے انہیں کھونا عقل مندی نہیں اور جس کا کوئی نہیں، اسے تو صاف سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا صرف اللہ ہے۔ اللہ نے اسے دوست بننے کا موقع دیا ہے۔ یہ تو بدنصیبی ہے کہ دنیا سے سب کچھ لینے کے بعد بھی آدمی دنیا سے چمٹا رہنا چاہے، اس کی طرف رخ نہ کرے، جس نے مہلت دے کر کرم فرمایا۔ دیکھو نا......جس کے رشتے ناطے ہیں، اسے تو اپنے پوتوں پر پوتوں کو محبت اور شفقت کے ساتھ اللہ کی روشنی دینی چاہئے۔ یہی اس کا فرض ہے۔ اگر وہ خود ہی روشنی کی طرف نہیں بڑھتے تو یہ تو وہ بہت بڑا نقصان کر رہے ہوتے ہیں۔''

عبدالحق خاموشی سے سن رہا تھا۔ مولوی صاحب چپ ہوئے تو وہ بولا۔

''لیکن کچھ لوگ سنک بھی جاتے ہیں۔ دماغ بھی ماؤف ہو جاتا ہے ان کا۔''

''یہ بھی اللہ کی رحمت ہے پتر......! اللہ ان کا حساب لکھوانا موقوف کر دیتے ہیں۔''

''اور معذوری محتاجی، بیماری، تکلیفیں......؟''

''وہ بھی رحمت ہے۔ اس کے اجر میں اللہ نے ان کے پچھلے گناہوں میں سے کچھ گناہ مٹاتے رہتے ہیں۔''

''اور جو استفادہ کریں، وہ فلاح پا جاتے ہیں......؟''

''ہاں پتر......! اللہ کی رحمت دیکھو، گناہ کی طاقت نہیں رہتی، لیکن نیکی

اور بھلائی کی، عبادت کی طاقت ختم نہیں ہوتی۔''

''جی......! میں سمجھ گیا مولوی صاحب......!''

''بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی......؟ تم سامنے ہو تو میں بہت زیادہ بولتا ہوں پتر عبدالحق......!''

''اسی لئے تو میں آپ کے پاس آنے کو ترستا رہتا ہوں۔''

''اور اپنی سناؤ......!''

''میں تو دنیا کی محبت سے ڈرنے لگا ہوں مولوی صاحب......!'' عبدالحق نے کہا۔

''یہ آدمی کو اللہ سے دور کر دیتی ہے۔''

''غلط سمجھ رہے ہو پتر......! محبت تو بری ہو ہی نہیں سکتی۔''

''مال کی محبت کو ہی لیجئے......!''

''وہ محبت نہیں، ہوس ہے۔ آدمی اللہ کے دیئے ہوئے مال سے بے شک محبت کرے۔ نعمت ہے اللہ کی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے نیک اعمال آسان ہو جاتے ہیں۔ آدمی اسے اللہ کی طرف سے امانت سمجھتا ہے، ذمہ داری سے خرچ کرتا ہے۔ اللہ کو خوش کرنے کے لئے خرچ کرتا ہے۔ تفکرات سے آزاد ہوتا ہے۔ دل لگا کر عبادت کر سکتا ہے۔ نماز بھی پڑھتا ہے، مسجد بھی بنواتا ہے، مسجد میں آنے والوں کے لئے سہولت فراہم کرتا ہے، روزہ رکھتا ہے، دوسروں کو افطار بھی کراتا ہے، حج کرتا ہے اور کسی مفلس کو حج بھی کرا دیتا ہے، زکوٰۃ ادا کر کے اللہ کے دیئے ہوئے مال کو پاک بھی کرتا رہتا ہے۔ سائلوں اور محروموں کی، غرباء اور مساکین کی مدد کر کے بھی نیکیاں کماتا ہے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ کسی کا قرض ادا کر کے اس کی گردن چھڑاتا ہے۔ نیکیاں ہی نیکیاں، اور جتنی بے غرض، اتنا ہی اللہ کے ہاں ان کا اجر زیادہ۔ اور وہ محبت ہوس میں بدل جائے تو دولت جمع کرنے کے شوق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گنتا اور افسوس کرتا ہے کہ اب بھی کم ہے، اور کمانی چاہئے۔ تب اس کی توجہ کا مرکز اور محور صرف دولت ہو جاتی ہے۔ نیکی اعمال سے دور ہو جاتا ہے۔''

''محبت اور ہوس میں فرق کیا ہے مولوی صاحب......؟''

''محبت اللہ کے لئے ہوتی ہے۔ جس چیز سے آپ محبت کریں، یہ احساس رہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کی عطا اور اس کا فضل ہے کہ اس نے اسے آپ کے تصرف میں دیا۔ اور یہ اس کی امانت ہے۔ وہ جب چاہے واپس لے لے۔ اور واپس لے لی جائے تو آپ شکر ادا کریں، گلہ نہ کریں کہ بغیر کسی حق کے اس نے اپنی کریمی سے عطا فرمائی تھی۔ اور اتنے عرصے آپ کے پاس رہی۔ یہ محبت ہے۔ اور آپ نے اسے اپنی محنت اور کاوش کا نتیجہ اور اپنی مِلک سمجھا تو گویا ہوس کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ پھر رکنا مشکل ہے۔ کیونکہ ہوس کی بڑھنے کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اور اس کی حد کوئی نہیں ہوتی۔ وہ سب کچھ کھا جاتی ہے۔ آدمی کو بھی کھا جاتی ہے اور خود ختم نہیں ہوتی۔''

''مگر کتنے لوگ اس سے آخرت کا فائدہ اٹھاتے ہیں......؟''

''یہ تو وہی عمر والا معاملہ ہوا نا پتر......! دینے والا تو موقع دے رہا ہے نا...... یہ اس کا کرم ہے۔ اب جسے ملے اور وہ فائدہ نہ اٹھائے تو یہ اس کی بدبختی...... اس میں نعمت کا کیا قصور......؟ وہ تو نعمت ہی کہلائے گی نا...... اور لوگ فائدہ بھی تو اٹھاتے ہیں۔''

''اور انسانوں کی محبت......؟''

مولوی صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔

''دیکھ پتر......! مجھے نہیں معلوم کہ صحیح ہے یا غلط......؟ لیکن یہ میرا یقین ہے کہ دلوں میں محبت اللہ ہی ڈالتا ہے۔ اس کی مثال ماں ہے۔''

''تو محبت ہوس میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے......؟''

''آدمی خود ہی سب کچھ کرتا ہے۔ ایسے ہی ہے جیسے وہ اللہ کی نعمت کو اپنے لئے فتنہ بنا لیتا ہے۔''

''وضاحت کریں نا مولوی صاحب......!''

''محبت اللہ کا وصف ہے پتر......! اس کا اسم و دود ہے نا......! وہ اپنے بندوں سے ماں سے 70 گنا سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ تو محبت میں ہمیں اس کی پیروی کرنی چاہئے۔ اور اسے شامل رکھنا چاہئے۔ وہ اپنے بندوں کی بھلائی کے لئے

بھی بہت کچھ کرتا ہے اور انہیں برائی سے روکنے کے لئے بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ کریم ایسا ہے کہ بغیر مانگے ہر ضرورت پوری فرماتا ہے۔ اور جبار ایسا ہے کہ بندہ نہ مانے تو جس چیز کے زور پر بندہ گناہ پر آمادہ ہے، اس کو سلب کر لے۔ کوئی دولت کے زور پر گناہ کئے جائے اور وہ اسے قلاش کر دے تو یہ اس کی محبت ہی ہے نا...... تو آپ جس سے محبت کرتے ہیں، اس کی بھلائی کے لئے، اسے نقصان سے بچانے کے لئے آپ کو کبھی سختی بھی کرنی ہوتی ہے۔ نہیں کریں تو محبت میں خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔''

''یہ بات تو مجھ پر بھی صادق آتی ہے۔'' عبدالحق نے سوچا۔ وہ دل میں تھرا گیا۔ نور بانو کے ساتھ کتنی زیادتی کی اس نے...... اور وہ بھی محبت کے نام پر......؟ اس نے کبھی نماز کی تلقین تک نہیں کی اسے...... کسی بات پر نہیں ٹوکا۔

''اب ماں کو ہی دیکھو پتر......! ایک ماں اپنے چھوٹے سے بچے کو چوری کرنے پر سزا دیتی ہے۔ اس کا ہاتھ جلا دیتی ہے۔ اس کے دکھ، اس کی تڑپ کا اندازہ تو کرو پتر......! کیا گزرتی ہوگی اس پر......؟ مگر بچے کی بہتری کے لئے بچے کو جتنی تکلیف دیتی ہے، اس سے زیادہ خود اٹھاتی ہے۔ اور دوسری ماں نظر انداز کرتی ہے۔ بچہ بڑا ہو کر چور بن جاتا ہے۔ ہاتھ جلنے سے زیادہ سخت سزائیں زندگی بھر اسے ملتی ہیں، رسوائی الگ۔ ذمہ دار کون ہے......؟ ماں......! تو پتر......! محبت بہت ذمہ دار لوگوں کا کام ہے۔''

''اور میں بہت غیر ذمہ دار ہوں۔'' عبدالحق نے سوچا۔

''آپ محبت اور ہوس میں فرق کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' اس نے احترام آمیز لہجے میں مولوی صاحب کو یاد دلایا۔

''بتایا تو پتر......! بنیادی بات اس حقیقت کو ہر لمحہ یاد رکھنا ہے کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی ہے، اللہ کی عطا اور اس کی امانت ہے۔ جب آپ اس بات کو دل اور دماغ کی گہرائی میں بٹھا لیں گے تو پھر یہ بھی سوچیں گے کہ امانت کا کیسے خیال رکھنا چاہئے......؟ روح سے شروع کریں، جس کے دم سے زندگی ہے۔ اللہ نے پاکیزہ روح عطا فرمائی آپ کو۔ تو حق یہ ہے کہ اسے آلودہ نہ کریں۔ اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ فطرت ہے کہ گناہ کی رغبت رکھتا ہے۔ اس سے بچنے کی کوشش لازمی۔ اس کے

باوجود گناہ تو کریں گے۔ روح تو آلودہ ہوگی۔ تو اسے خوفِ خدا اور توبہ کے پاک پانی سے دھو ڈالا۔ مکمل جسم ہے، تمام اعضاء ہیں۔ ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا بھی لازم...... مادّی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی۔ مادّی طور پر ایسے کہ صحت کا خیال رکھیں۔ اور روحانی طور پر ایسے کہ کسی عضو سے کوئی ایسا کام نہ لیں، جس سے اللہ نے منع فرمایا ہو۔ ایسے ہی دولت ہے، محبت ہے، رشتے ناطے اور تعلقات ہیں۔ جب بھی آدمی دولت کو اللہ کی عطا اور امانت نہیں سمجھے گا اور اپنی ملکیت سمجھے گا۔ وہی سے خسارہ شروع۔ غرور میں مبتلا ہوگا۔ دوسروں کو حقیر سمجھے گا۔ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرے گا۔ اس کی محبت میں مبتلا ہوگا تو جمع کرنے کا شوق ہوگا۔ دل تنگ ہوتا جائے گا۔ اپنی ملکیت سمجھتے ہی ہوس شروع۔ جو بڑھتی ہی جائے گی، کبھی ختم نہیں ہوگی۔ الاّ یہ کہ اللہ رحم فرمائے......!''

''ایسے ہی محبت کا معاملہ ہے۔ اللہ کی عطا، اس کی امانت، اس کا کرم۔ جب تک آپ اسے اللہ کی طرف سے سمجھیں گے، عافیت رہے گی۔ شیطان اس میں دخیل ہونے کی کوشش کرتا رہے گا۔ لیکن اللہ اسے ناکام بنا دے گا۔ اور جب آپ اس سے ہٹے تو شیطان اندر گھسنا شروع کر دے گا۔ مرد اور عورت کی محبت میں خاص طور پر ایسا ہوتا ہے۔ شیطان کو وہ مقام زیادہ پسند ہیں، جہاں خرابی کی گنجائش زیادہ ہو۔ اور کیونکہ یہ محبت شرک کے بعد کے بدترین گناہ کی طرف لے جاتی ہے، اس لئے اسے زیادہ ہی پسند ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان فطری کشش ہوتی ہے، شیطان وہاں نفسانی تقاضوں کی چنگاری کو ہوا دیتا ہے۔ ادھر آدمی نے اس تصور کو چھوڑا کہ محبت اللہ کی عطا ہے اور ادھر اس کی تباہی کا آغاز ہوا۔ اللہ رحیم و کریم ہے۔ اس نے بچاؤ کے لئے نکاح کی ڈھال عطا فرما دی۔''

''تو پھر میاں بیوی تو محفوظ ہوئے نا مولوی صاحب......!''

''محفوظ تو کوئی بھی نہیں ہے پتر عبدالحق......! پناہ تو صرف اللہ کی رحمت کے دامن میں ہے۔''

''لیکن مولوی صاحب......! شیطان میاں بیوی کی خلوت میں داخل نہیں ہو سکتا۔''

''ٹھیک کہا پتر...... !لیکن خلوت ہوتی کتنی دیر کی ہے......؟ اس کے بعد تو وہ دونوں شیطان کی دسترس میں ہوتے ہیں۔''

''وہاں کیسے کام کرتا ہے شیطان......؟''

''شیطان کا طریق کار ایک ہی ہے پتر...... ! انسان کے اندر چھپے منفی جذبوں کو ابھارتا۔ خود غرور اور جاہ طلبی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ سو وہ انسان میں بھی یہی کچھ ابھارتا ہے۔ مرد اور عورت، دونوں میں سے کوئی بھی محبت کو دوسرے پر اپنا احسان سمجھنے لگے تو یہ تکبر کا آغاز ہے۔ اور یاد رہے پتر عبدالحق...... ! کہ میاں بیوی چاہے شادی سے پہلے ایک دوسرے سے ملے بھی نہ ہوں، تو بھی اللہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت پیدا فرماتا ہے۔ تو جب کوئی محبت کو دوسرے پر اپنا احسان سمجھنے لگے تو اگلے مرحلے میں اسے اپنی ملکیت بھی سمجھتا ہے۔ یہاں سے ہوس کا آغاز ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان...... مرد ہو یا عورت، کسی ایک شخص کی ملکیت کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس پر مختلف درجوں میں بے شمار لوگوں کا حق ہوتا ہے۔ ماں، باپ، بیوی، بچے، بہن بھائی، پھر صلہ رحمی والے رشتے، پھر عزیز و اقارب، پڑوس، دوست احباب، عام طور پر قابض ہونے سے بہر حال محروم رہتی ہے۔ پر لگی رہتی ہے اس چکر میں، ہوس ہے نا پتر...... ! یہ تو...... سو وہ مرد کو بھی ہوس میں مبتلا کر دیتی ہے۔ حالانکہ بے اعتدالی میں ہر زاویے سے نقصان ہی نقصان ہے۔ پھر شیطان غیر فطری طریقوں کا راستہ بھی دکھاتا ہے۔ ایسے میں بس خوفِ خدا اور اللہ کی رحمت ہی بچا سکتی ہے بندے کو۔ تو اب خود دیکھ لو پتر...... ! کہ محبت ہوس کیسے بن جاتی ہے......؟''

عبدالحق نے نظریں جھکا لیں۔ وہ نظریں چرا رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ مولوی صاحب سب جانتے ہیں، اور اسی کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔

چند لمحے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔

''لیکن مولوی صاحب...... ! ماں کی محبت میں تو ہوس کی گنجائش نہیں......؟''

''کیوں نہیں پتر...... ! بالکل ہے۔ ماں اپنے بیٹے کی محبت کو ہوس تک لے جائے تو وہ بھی اس پر قابض ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ بہو کو بیٹی کے بجائے مداخلت کار اور غاصب سمجھتی ہے۔ ساس بہو کے جھگڑے کیوں ہوتے ہیں گھر گھر......؟ ماں

بیٹے کو دوسروں سے میل جول پر کیوں ٹوکتی ہے......؟ اس سے ملو...... ! اس سے نہ ملو...... ! یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ دراصل عورت کی فطرت میں اقتدار کی آرزو ہوتی ہے۔ اقتدار وہ براہِ راست حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ صاحب اقتدار مرد پر قابض ہو جائے۔ اس سے تو بادشاہ بھی محفوظ نہیں رہے پتر...... ! جہانگیر بادشاہ تھا، لیکن حکم نور جہاں کا چلتا تھا۔ ایک رومن بادشاہ تھا، نام مجھے یاد نہیں اس کا، پر وہ ماں کے فرمان کے مطابق احکامات جاری کرتا تھا۔ عورتوں نے ہمیشہ اقتدار کی جگہوں کے نقشے ترتیب دیئے۔ اپنے فرمانبردار بیٹوں کو مسند اقتدار تک لے جانے کی سر توڑ کوششیں، بلکہ سازشیں تک کیں۔''

عبدالحق جانتا تھا کہ مولوی صاحب نے لحاظ اور حیا کی وجہ سے رومن بادشاہ کی پوری بات نہیں بتائی۔

''جزاک اللہ مولوی صاحب...... ! آپ سے مجھے ہمیشہ بہت قیمتی سرمایہ ملتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن اس میں عورت کی تحقیر نہیں محسوس ہوتی آپ کو......؟''

''نہیں پتر...... ! یہ صنفی کمزوریاں ہیں اللہ کی دی ہوئی۔ آدمی کو ان سے لڑنا ہوتا ہے۔ اب سبھی عورتیں تو ایسی نہیں ہوتیں۔ اور سبھی مرد بھی ایسے نہیں ہوتے۔ عورت کو تو بڑا درجہ دیا ہے اللہ نے، بڑی ذمہ داری سونپی ہے اسے۔ اس کا کام مرد کو سنوارنا ہے۔ وہ پیغمبروں اور ولیوں کی ماں بھی ہے۔ وہ بیوی بھی ہے، جو خود کو پس پشت ڈال کر شوہر کی روحانی ترقی کے لئے سب کچھ کرتی ہے۔ اس کی آخرت کی فکر کرتی ہے۔ کسی آزمائش میں وہ ہل جائے تو اپنی محبت سے اسے استقامت کی طرف لے جاتی ہے اور اپنی کمزوریوں سے ہار جائے تو اس کی آخرت کے لئے خطرہ بھی بن جاتی ہے۔ کوئی صنف بھی بری نہیں ہوتی۔ افراد اچھے برے ہوتے ہیں پتر...... ! فطری طور پر اللہ نے مرد کو عورت کا محافظ بنایا ہے۔ عورت کو اللہ نے محبت دی ہے اور مرد کو فراست اور حکمت۔ عورت سب کچھ محبت کے زور پر کرتی ہے۔ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ وہ محبوب کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتی ہے۔ مگر محبت میں بگاڑ ہو تو بے شمار منفی جذبے ابھرتے ہیں۔ حسد اور رقابت، تسلط کی خواہش...... پھر اس کی شاخوں میں جھوٹ، مکر اور

فریب، بغض اور کینہ اور نہ جانے کیا کیا......؟ انجام کار محبت ہوس بن جاتی ہے۔تو پتر......! مرد ہو یا عورت، آدمی کو اللہ نے طاقتیں بھی دیں اور کمزوریاں بھی۔ ایمان لانے کے بعد کامیابی کے لئے نیک اعمال ضروری قرار دیئے۔تو نیک اعمال کے لئے جدوجہد بھی کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کمزوریوں پر غالب آئے اور طاقت میں اضافہ کرے۔اسی جدوجہد سے آدمی اچھا ہوتا ہے اور نہ کرنے سے برا۔''

''یہ بتائیں مولوی صاحب......! کہ گھر میں ماں اور بیوی کے درمیان چپقلش ہو تو مرد کیا کرے......؟ باہر کے معاملات سے نمٹنے کے بعد اسے گھر میں بھی سکون نہ ملے تو یہ ظلم ہے۔ پھر اللہ نے ماں کا درجہ تو بہت بڑا رکھا ہے۔ بیوی سے اس کا کیا مقابلہ......؟''

''یہ ظلم نہیں پتر......! آزمائش ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''دیکھو نا...... بیوی کا ایثار بھی بہت بڑا ہے۔ وہ اپنا گھر، اپنے محبت کرنے والے تمام رشتے چھوڑ کر شوہر کے پاس آتی ہے۔ اللہ نے ماں کا درجہ مقرر کیا تو بیوی کے حقوق بھی مقرر کیے۔تو مرد کا کام توازن قائم رکھنا ہے۔ اگر ساس اور بہو میں نہیں بنتی تو اسے چاہئے کہ بیوی کو الگ گھر لے دے۔''

''تب وہ وقت پر، توجہ کی کمی پر گلہ کریں گی۔''

''چھوڑ تو وہ کسی کو نہیں سکتا نا......؟ تو دونوں سمجھ لیں گی کہ لڑنے میں نقصان ہوا۔ پہلے وقت گھر کے اندر تقسیم ہوتا تھا، اب باہر ہونے لگا۔''

''اور کسی میں اس کی مالی استطاعت نہ وہ تو......؟''

''میں نے کہا نا...... کہ مرد کو اللہ نے فراست اور حکمت دی ہے۔ اور وہ عورت کا محافظ بھی ہے۔ دونوں عورتوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اب میں تمہیں اس کی مثال بتاتا ہوں۔ ایک غریب آدمی کے ساتھ یہی مسئلہ ہوا۔ ماں اور بیوی، دونوں کو اس نے بہت سمجھایا۔ لیکن عورت کی ضد بہت بری ہوتی ہے۔ نہیں مانیں، تب ایک دن وہ اپنا گھر چھوڑ کر ایک دوست کے گھر چلا گیا۔''

''یہ تو دہرا غضب ہوا مولوی صاحب......!'' عبدالحق نے کہا۔

''اللہ دونوں کی طرف سے جواب طلبی کرے گا۔''

''نہیں پتر...... ! شفا زہر سے ہوتی ہو تو زہر دینا بھی اجر کا کام ہے۔''

''میں سمجھا نہیں مولوی صاحب......!''

''یہ اس کی حکمت تھی، تین دن میں اس کا نتیجہ نکل آیا اور گھر میں امن ہو گیا۔''

''کیسے......؟''

''دونوں عورتوں نے دیکھا کہ دونوں ہی محروم ہو گئیں تو انہوں نے باہم صلح کر لی۔ دونوں مل کر گئیں اور اسے منا کر واپس لائیں۔ پھر تو یہ ہوا کہ جب وہ کام سے واپس آتا، ماں کو سلام کرنے جاتا تو ماں کہتی...... جا بیٹا......! تھوڑی دیر بہو کے پاس بیٹھ جا...... آج کچھ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اس کی۔ وہ بیوی کے پاس جاتا تو وہ کہتی، پہلے اماں کو سلام کر کے آؤ...... طبیعت پوچھو ان کی۔ پورے دن کھانستی رہی ہیں۔''

''واقعی......! یہ تو کمال ہو گیا۔'' عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

''میں سمجھ گیا مولوی صاحب......!''

''تم اپنی سناؤ پتر......! تمہارا کیا حال ہے......؟''

''دنیا میں الجھ کر دین سے دور ہو گیا مولوی صاحب......!'' عبدالحق نے سرد آہ بھر کے کہا۔

''غلط سمجھ رہے ہو پتر عبدالحق......!'' مولوی صاحب بولے۔ ''دنیا سے ہی دین ہے۔ ورنہ دنیا میں کیوں بھیجا جاتا آدمی کو۔''

''یہ آزمانا تھا کہ بندہ اللہ کو یاد رکھتا ہے یا دنیا کی محبت میں خود کو گم کر لیتا ہے۔''

''بے شک......! اللہ نے آدمی کے لئے دنیا میں کشش رکھ کر آزمائش بنا دیا۔ لیکن پتر......! دوسرا زاویہ بھی تو ہے۔ اللہ کے ہاں عبادت محدود نہیں۔ صرف نماز، روزہ ہی عبادت نہیں۔ اللہ نے بندے کو جو فرائض سونپے ہیں۔ ان کی احسن طریقے سے، محبت کے ساتھ ادائیگی بھی عبادت ہے۔ گھر کی ذمہ داری پوری کرنی ہے تو اکلِ حلال بھی عبادت ہے۔ بیمار کی عیادت بھی عبادت ہے۔ کسی پریشان حال شخص کی دل

جو بھی عبادت ہے۔ سوچو تو اللہ نے بندوں کو اتنے مواقع عطا فرمائے ہیں کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ عبادت ہو سکتا ہے۔ ہر عمل عبادت ہے۔ بس ایک شرط ہے کہ آدمی ہر وقت اللہ سے رابطہ رکھے، اس سے رجوع کرتا رہے۔ کیسی رحمت ہے اللہ کی۔''

''مگر فرض عبادت کی تو بات ہی اور ہے مولوی صاحب.....!''

''عبادت کو محدود کیوں کرتے ہو پتر.....! عبادت فرض ہے، لیکن ہر فرض عبادت ہے۔''

''مگر دنیا تو آدمی کو کھینچ لیتی ہے نا مولوی صاحب.....!''

''بتا دیا گیا کہ یہ آزمائش ہے، اس خواہش سے لڑنا فرض ہے اور انعام جنت ہے۔''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''میں بچپن سے ہی اللہ سے محبت کرنا چاہتا تھا مولوی صاحب.....!''

''اللہ سے محبت بہت بڑی بات ہے پتر.....! ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔''

''یہی میں بھی سوچتا تھا مولوی صاحب.....!'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن کسی نے بتایا کہ اس کے بندوں سے محبت کرنا اس سے محبت کرنا ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے پتر.....!''

''لیکن مجھے اب غلط لگتا ہے مولوی صاحب.....!''

''کیوں پتر عبدالحق.....؟''

''بندوں کی محبت اللہ سے غافل کر دیتی ہے مولوی صاحب.....!''

''یہ تو محبت کرنے والے کی خرابی ہے پتر عبدالحق.....! اس میں محبت کا کیا قصور.....؟'' مولوی مہر علی نے کہا۔

''دنیا کی، اس کے ساز و سامان کی، دولت، مال مویشی کی، زمین کی..... یہ ساری محبتیں تو اور خراب ہیں۔''

''اس لئے تو میں سب کو چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔''

''لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے پتر.....!''

''تو میں کیا کروں.....؟ اس راستے میں بڑی مشکل آزمائشیں ہیں۔''

''دنیا میں قیام تو ہے ہی آزمائش پتر.....! اللہ نے اعتدال کا راستہ دکھایا ہے، وہ پکڑو..... آزمائش سے تو مفر ہے ہی نہیں۔''

''مولوی صاحب.....! اللہ سے براہِ راست محبت بھی تو کی جا سکتی ہے۔''

''جسے آپ دیکھ نہیں سکتے، جس کی آواز سن نہیں سکتے، جس سے براہِ راست بات نہیں کر سکتے، کچھ پوچھ اور بتا نہیں سکتے، اس سے براہِ راست محبت کیسے کر سکتے ہیں.....؟''

''سچ بتاؤں مولوی صاحب.....! مجھے اپنے دل میں اللہ کی محبت محسوس ہوتی ہے۔''

''یہ تم پر اللہ کا فضل ہے پتر عبدالحق.....! پر دنیا تو نہیں چھوڑی جا سکتی۔ بندوں کی محبتیں بھی نہیں چھوڑی جا سکتیں۔ وہ تو فرق ہے۔ دوسرا کوئی راستہ ہے نہیں عبدالحق پتر.....!''

''راستہ تو ہے نا مولوی صاحب.....! ولیوں کا راستہ..... اللہ کو خوش کرنے اور اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لئے ریاضتوں اور مجاہدوں کا راستہ۔''

مولوی صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

''بہت بڑی بات کہہ رہے ہو پتر.....! پر یہ بھول گئے کہ اللہ نے دنیا ترک کرنے کو کبھی نہیں کہا۔ دنیا میں رہ کر، دنیا کی ساری ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے سب کچھ کرنا ہے۔''

''کیوں مولوی صاحب.....؟''

''دنیا چھوڑ کے کچھ کرنا تو بہت آسان ہے، آزمائش تو دنیا ہے نا.....؟''

''لیکن قرآن میں اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خوبی بیان فرمائی کہ وہ ساری دنیا سے کٹ کر ان کے ہو رہے۔ تو ساری دنیا سے کٹ کر اللہ کا ہو رہنا تو خوبی ہوئی۔''

''پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ بعد میں اس بات کی سمجھ آئی پتر.....! یاد کرو عبدالحق پتر.....! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا ترک تو نہیں کی تھی۔ کی ہوتی تو

آپ کے پیروکار کہاں سے آتے......؟ دنیاوی نعمتوں سے بے پرواہی اور بات ہے پتر......! لیکن کوئی پیغمبر اللہ کے بندوں سے منہ کیسے موڑ سکتا ہے......؟ اسے تو بندوں کی اصلاح کے لئے ہی بھیجا گیا ہوتا ہے۔ اور محبت کے بغیر اصلاح نہیں ہوتی۔ تو ہر پیغمبر نے اللہ کے بندوں سے محبت کی ہے۔ اور ہمارے پیارے نبیؐ نے تو سب سے بڑھ کر اللہ کے بندوں سے محبت کی۔ آپؐ کے بس میں ہوتا تو روئے زمین پر موجود ہر بندے کی گمراہی دور کر کے اسے اللہ کے راستے پر لے آتے۔ کیسے غم کرتے تھے آپؐ لوگوں کی گمراہی پر......؟ گھلے جاتے تھے ان کے لئے۔ اللہ پاک کیسے کیسے سمجھاتے......؟ تسلیاں دلاتے دیتے آپؐ کو۔ سورۂ کہف کی وہ آیت یاد کرو پتر......! فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ......''

''جی...... بے شک......! مجھے یاد ہے مولوی صاحب......! یہ بتائیں کہ پھر ساری دنیا سے کٹ کر اللہ کا ہو رہنا کیا ہوتا ہے......؟''

''یہ بھی درجے ہیں پتر اللہ کی محبت کے...... ابھی تم نے ولیوں کا حوالہ دیا۔ مجھے بتاؤ......! تمہارے ذہن میں کیا ہے اس سلسلے میں......؟''

''ولیوں نے دن رات ریاضتیں اور مجاہدے کئے...... اپنی جان گھلائی اللہ کی محبت میں۔''

''کس کے لئے پتر......؟''

عبدالحق نے بے جھجک کہا۔

''اللہ کے لئے......!''

''پر اللہ کو تو ان کی ضرورت نہیں۔ تمام فرشتے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ کائنات کی بے جان چیزیں...... شجر حجر تک اس کی حمد وثناء کرتے ہیں۔''

''وہ سب تو پابند ہیں مولوی صاحب......! اولادِ آدم کو تو اختیار دیا گیا ہے۔ اور وہ سرکشی بھی کرتی ہے۔ اس لئے اس کی عبادت، ریاضت اور مجاہدے کی اپنی اہمیت ہے۔''

''نا پتر نا......!'' مولوی صاحب نے اپنے دونوں کان پکڑ کر اپنے رخساروں پر طمانچے مارے۔

''ایسا نہیں کہتے پتر......! بندے کے سجدے، اس کی عبادتوں کی اہمیت اس کے اپنے لئے ہے، اللہ کے لئے نہیں۔ اللہ کی ایک بہت بڑی صفت اس کے اسم صمد میں ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ اسے کسی کی، کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں۔ وہ تو اپنی مخلوق کو ہر چیز فراہم کرنے والا ہے۔ ہر چیز سے بے نیاز ہے وہ۔ بندے کا سجدہ، اس کی عبادت، اس کی ریاضت، اس کی اپنی بھلائی کے لئے ہے۔ یہ اس کی اپنی جنگ ہے، شیطان کے خلاف۔ شیطان اسے جہنم رسید کرانا چاہتا ہے۔ سجدہ شیطان کے خلاف انسان کا پہلا دفاعی ہتھیار ہے۔ پہلی کامیابی ہے۔ جو آگے فتح کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ یاد کرو پتر......! جب شیطان کی سرکشی پر اللہ نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تو بھی اس کے سامنے توبہ کا راستہ کھلا تھا۔ لیکن اس کی سرکشی نے وہ اسے دیکھنے ہی نہیں دیا۔ حالانکہ وہ معلم الملکوت تھا، سب جانتا تھا۔ الٹا اس نے چیلنج کر دیا، مہلت مانگ لی۔ صرف انسانوں کو گمراہ کر کے ان سے جہنم بھروانے کے لئے۔ اللہ نے وہ مہلت اسے دے دی تو یہ جنگ ہے انسان اور شیطان کی۔ بندہ جب، جہاں، جس لمحے شیطان کو شکست دیتا ہے تو اللہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ بس اتنی اہمیت ہے ہمارے سجدوں اور ہماری عبادت کی۔ اللہ بہت اجر دینے والا ہے۔ لیکن خود ہر چیز سے بے نیاز ہے۔''

عبدالحق کی تسلی نہیں ہوئی۔

''تو پھر ولیوں کے مجاہدوں، مراقبوں کا مطلب......؟''

مولوی مہر علی نے ایک گہری سانس لی۔

''پہلے یہ سمجھ کہ ولی کیا ہے......؟'' انہوں نے کہا۔

''ولی کا مطلب ہے دوست...... اور اللہ کا بندہ ہونا بھی چھوٹا اعزاز نہیں۔ ولی کا درجہ بہت بڑا ہے۔ کوئی یوں ہی تو اللہ کا دوست نہیں بن سکتا۔ جبکہ اللہ کا کوئی ہم سر نہیں۔ وہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ تو اس کا دوست بننا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ اب یہاں اخلاص کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ اخلاص سے ہی اعمال کے درجات کا تعین ہوتا ہے۔ نکتہ آغاز ہے اللہ کا حکم ماننا اور اس کے مطابق تمام حقوق ادا کرنا۔ آپ نے کسی کا حق ادا کیا، یہ پہلا درجہ، احسن طریقے سے ادا کیا، درجہ بلند ہوا، خوش نودی اور خندہ

پیشانی کے ساتھ ادا کیا، درجہ اور بلند ہوا۔ اپنا نقصان ہوتے ہوئے خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ادا کیا، درجہ اور بھی بلند ہوا۔ اور جب خود کو، اپنے مفادات کو بھول کر محبت کے ساتھ کوئی حق ادا کیا تو بلندی حاصل ہوئی۔ یہ اللہ کے ہاں اللہ سے محبت کرنا ہوا اور یہ محبت سب سے بلند مقام ہے۔ تو جیسے جیسے درجات بلند ہوتے ہیں، مرتبہ بڑھتا ہے۔''

''تو کوئی بھی ولی بن سکتا ہے......؟'' عبدالحق کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''تمہارے ذہن میں اولیائے کرام کا تصور ہے پتر......!'' مولوی صاحب بولے۔

''ولی اللہ کا دوست ہوتا ہے...... وہ جسے اللہ دوست بنا لے۔ وہ میں بھی ہو سکتا ہوں اور تم بھی۔ میں نے کہا نا...... کہ مرتبہ درجات سے ہے۔ اور ہر ایک کا مرتبہ الگ ہوتا ہے۔ اولیائے کرام میں بھی تو درجے اور مرتبے ہیں۔ حضرت عبدالقادر گیلانیؒ جیسا مرتبہ اولیائے کرام میں کسی کا نہیں۔ مرتبے تو پیغمبروں اور انبیاء کے الگ الگ ہیں۔ مگر وہ اللہ کا معاملہ ہے۔ ہمیں تو سب کو ماننا ہے۔''

''مگر عبادتیں، ریاضتیں اور مجاہدے تو اولیائے کرام کثرت سے کرتے ہیں نا......! بات پھر وہی آئی کہ بندہ دنیا سے کٹ کر اللہ کا ہو رہے......؟''

''تم دنیا سے کٹنے کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ رہے ہو پتر......! اس کا مطلب اللہ کے بندوں سے ترکِ تعلق ہرگز نہیں۔ مجاہدہ ہے کیا......؟ نفس کے خلاف جنگ...... اور نفس کیا ہے......؟ انسان کے وجود کا کمزور ترین مقام...... شیطان کے لئے سب سے آسان ہدف، تو شیطان کو شکست دینے کے لئے پہلے اپنے نفس کو شکست دینی ہے۔ نفس کو اتنا دبایا اور کچلا جاتا ہے کہ اس میں اُف کرنے کی طاقت بھی نہ رہے۔ اللہ کے دوست نفس کشی کے باوجود ہر پل نفس اور شیطان کی طرف سے چوکنا رہتے ہیں، اور ان کے اخلاص کی وجہ سے ان کا دوست، ان کا قادرِ مطلق ربّ انہیں اپنی امان عطا فرماتا ہے اور ان کے درجات اور مرتبے بلند فرماتا ہے۔ اب رہیں عبادات...... تو پتر......! کچھ عبادتیں فرض ہیں۔ وہ ادا کرنی ہے۔ لوگ ادا کرتے ہیں۔ نفس انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہے، طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتا ہے۔ بندہ پھر بھی اللہ کا

حق ادا کرے تو ان کے ذہن میں دنیا بھر کے مسائل اجاگر کرتا ہے، تاکہ عبادت اچھی نہ رہے۔ آدمی نماز پڑھتا ہے، لیکن اس کے دماغ پر دنیاوی مسائل، شیطانی وسوسے اور تصور اور نفسانی خواہشات حاوی ہوتی ہیں۔ اللہ کی کریمی کہ پھر بھی وہ انہیں قبول فرما لے۔ تو یہ تو حق ادا کرنا ہوا۔ اب ہم تم نماز محبت اور رغبت سے پڑھیں تو وہ بہتر نماز ہوگی نا...... یہ درجات کا فرق ہے۔ عام لوگوں میں کتنے ہی ولی ہوتے ہیں، ہم انہیں پہچان نہیں سکتے۔ وہ دنیا کے تمام حقوق و فرائض ادا کر رہے ہوتے ہیں...... ہم عام لوگوں کی طرح بظاہر ہماری ہی طرح نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، لیکن اپنے خلوص اور محبت کی وجہ سے ان کی عبادت اللہ کو خوش کرتی ہے اور وہ اللہ کے دوستوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس کا پتا نہیں چلتا۔ کبھی تو وہ خود بھی اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔''

''اب ہم بات کرتے ہیں دنیا سے کٹ کر اللہ کے ہو رہنے کی۔ جو کہ بہت بڑا مقام ہے۔ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کا مقام۔ تو دنیا سے کٹ کر اللہ کا ہو رہنے کا مطلب ہے اللہ کی طرف یکسوئی اور ارتکاز کے ساتھ مسلسل متوجہ رہنا۔ ہم میں سے ہر ایک کو حضرت ابراہیمؑ کی اس سنت کی پیروی کی طرف قدم بڑھانا چاہئے۔ یعنی آپ کچھ بھی کر رہے ہوں۔ دنیاداری، دنیا کا بھی کوئی کام تو آپ کے دل میں اللہ کا خیال ہو، دماغ میں اللہ کی سوچ اور اسے اپنی کارکردگی سے خوش کرنے کی خواہش ہو۔ دنیاداری آپ صرف اس لئے کر رہے ہوں کہ وہ اللہ کا حکم ہے تو یہ وہ یکسوئی اور ارتکاز ہے، جس میں آپ دنیا میں، دنیا سے منسلک ہوتے ہوئے بھی دنیا سے کٹ کر اللہ کے ہو رہتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے، جب دل کی دھڑکن بھی اللہ پکارتی ہے اور ہر سانس بھی۔ آپ کے وجود میں اللہ کا ذکر جاری ہو جاتا ہے۔ تب آپ کی ہر بات، ہر کام، جسم کی ہر جنبش عبادت ہو جاتی ہے۔''

''لیکن مولوی صاحب......! یہ عام بندوں کے بس کی بات کہاں......؟''

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ دیکھو پتر......! پہلی بات تو ایمان لانا ہے۔ اس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں۔ یہ تو الف ہے۔ پھر اسے اپنے وجود میں نافذ کرنا ہے۔ پھر نیک اعمال کے بغیر ایمان بے فیض۔ یعنی زندگی شروع نیک اعمال سے ہوگی۔ اب

اخلاص اور اس کے درجات۔ یہ سفر ہے، بہت طویل سفر ہے۔ اس کا نکتہ آغاز ایمان ہے۔ تو ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ سنت ابراہیمؑ پر عمل کرنے کی آرزو کریں اور اس راستے پر قدم بڑھائیں۔ آگے ہمارے خلوص اور اللہ کی عنایت پر انحصار ہے۔ اور پتر......! اللہ خوش ہو جائے تو کسی کو کوئی بھی مقام عطا کر دے۔ کوئی ادا اسے پسند آ جائے تو کیا کہنا......؟ ہم لوگ تو پہلا ہی مرحلہ پار نہیں کر پاتے۔ بس ہر وقت، ہر پل اللہ کو یاد رکھنے کی ناکام کوشش میں عمر تمام ہو جاتی ہے۔'' مولوی صاحب کے لہجے میں تاسف در آیا۔

''میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے مولوی صاحب......! کہ دنیا کی محبتیں آدمی کو اللہ کی محبت تک نہیں پہنچنے دیتیں۔''

''یہی تو غلط ہے پتر......! اللہ تک، اس کی محبت تک پہنچنے کا بنیادی راستہ ایک ہی ہے......اس کے بندوں سے محبت......!''

''کہتے ہیں کہ جتنے انسان ہیں، اللہ تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں۔''

''بے شک......! لیکن ہر راستہ اسی راہ سے نکلتا ہے پتر......! بس ایک شرط ہے۔ ہر محبت اللہ کے لئے کی جائے۔ دل میں ہر پل اللہ کا خیال ہو، کچھ بھی کریں، سوچ یہ ہو کہ اللہ کو خوش رکھنا ہے۔''

''اور عبادت سے اللہ خوش نہیں ہوتا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''کیوں نہیں ہوتا......؟ مگر میں نے کہا نا...... کہ عبادت کو محدود نہ کرو۔ اللہ کے احکام کے مطابق ہر ایک کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ اللہ نے جو فرائض عائد کئے، اس کی ادائیگی بھی عبادت ہے۔''

''اور نفلی عبادات......؟''

''کسی کا حق روک کر عبادت کرو تو اچھی نہیں...... کسی فرض سے منہ موڑ کر عبادت کرو تو اچھی نہیں......!''

''لیکن مولوی صاحب......! آدمی تو حقوق اور فرائض میں بری طرح بندھا ہوا ہے۔''

''بے شک پتر......! لیکن اللہ نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ حق تو تم پر تمہارا بھی

ہے۔ اس سے استفادہ کرو۔''

''میں سمجھا نہیں......!''

''یاد نہیں......! اس پر ہم نے پہلے بھی بات کی تھی۔ سورۂ نبا میں ہے نا...... کہ دن کو بنایا معاش کے لئے اور رات کو بنایا پردہ پوش......''

یہ عبدالحق کیسے بھول سکتا تھا......؟ اسے یاد آ گیا۔

''رات آرام کے لئے ہے۔ اللہ نے سسٹم بنایا۔ دن بھر کی تھکن رات کی نیند سے، آرام سے دور کرو اور اگلے دن کے لئے تازہ دم ہو جاؤ......!''

''جی...... یہ تو ٹھیک ہے...... مگر میں کچھ اور کہہ رہا تھا۔''

''میں بھی اسی کا جواب دے رہا ہوں۔ تمہیں پوری بات یاد نہیں......؟ سورۂ الذاریات میں فرمایا......اچھا اور معیاری کام کرنے والوں کے بارے میں کہ راتوں کو وہ کم ہی سوتے ہیں اور آخری پہر میں استغفار کرتے ہیں۔ تو پتر......! اللہ کی محبت کی طرف پہلا براہِ راست قدم ہے اس وقت میں عبادت کرنا جو خالص تمہارا اپنا ہے۔''

''اور آدمی کا معاش بہت تھکا دینے والا ہو اور شب بیداری کے نتیجے میں اسے دن میں نیند آئے اور اپنا کام ٹھیک طور سے نہ کر سکے تو......؟''

''تو وہ بددیانتی ہوگی جو نفلی عبادت کو کھا جائے گی۔''

''تو بات وہیں کی وہیں رہی......!'' عبدالحق نے کہا۔

''نہیں پتر عبدالحق......! ایسا نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہر چیز کا اپنا مقام ہے۔ سنت فرض کے درجے کو نہیں پہنچتی اور نفل کو کبھی سنت اور فرض پر فوقیت حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ اللہ بہت مہربان اور آسانیاں عطا فرمانے والا ہے۔ ہر عمل کی قبولیت کے درجے میں......آدمی کے اخلاص سے ان کا تعین ہوتا ہے۔ فرض محبت سے ادا کیا جائے تو وہی کافی ہے۔ میں نے کہا نا...... کہ اخلاص کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اللہ ہی تو ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔ جتنا خلوص ہوگا، اتنا ہی وہ اجر بڑھا دے گا۔ محبت کا اظہار تو فرض سے بھی ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ کی کریمی دیکھو، اس نے فرض نماز میں بھی سنتیں اور نوافل عطا فرما دیئے کہ کوئی بھی محروم نہ رہے۔ اللہ نے کسی کے لئے بھی کی

نہیں ہونے دی۔ اب یہ دیکھو کہ رات کی عبادت آدمی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے...... ؟ محسن کے درجے پر پہنچ جاتا ہے بندہ...... کیونکہ اللہ نے بندے کو نفل کا پابند نہیں کیا۔ اس لئے نفلی عبادت اس سے محبت کا خصوصی اظہار ہے۔''

''اب اس بات کو دوسرے زاویے سے دیکھو۔ اللہ کریم ہے۔ بغیر مانگے سب کچھ دیتا ہے۔ اپنی مخلوق کی تمام ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔ اب اس کا بندہ خلوص اور محبت کے ساتھ اپنی تھکن اور نیند کو بھول کر اس کی عبادت کرتا ہے تو کیا وہ رحیم و کریم جو سب سے بڑھ کر قدرداں ہے، اپنے اس بندے کو اس کے حال پر چھوڑ دے گا...... ؟ اس کی مدد نہیں کرے گا...... ؟ نہیں...... ! یہ تو ممکن ہی نہیں...... آخرت کا اجر تو اس کا اپنی جگہ، وہ دنیا میں بھی اسے آسانیاں عطا فرمائے گا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ روحانی سکون اور طمانیت تو اس عابد کو ملے گا ہی، جو کہ بہت بڑی چیز ہے۔ اللہ اسے اپنی رحمت اور قدرت سے ایک یا دو گھنٹے کی نیند میں بھی وہ تازگی عطا فرما دے گا، جو دوسروں کو آٹھ گھنٹے کی نیند میں بھی نہیں مل سکتی۔ اور وہ اگلے دن کی محنت اور مشقت کے لئے تمام تر توانائیوں کے ساتھ بے دار ہوگا۔ یہ دنیا کا انعام ہے، آخرت کا الگ۔ اور اسے خیر و برکت بھی ملے گی۔''

''جی مولوی صاحب...... ! میں سمجھ گیا۔'' عبدالحق نے کہا۔ حالانکہ وہ مطمئن نہیں تھا۔ بہت تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہ اور بات کرتا، لیکن جانتا تھا کہ مولوی صاحب کے معمولات میں حرج ہوگا۔ اس لئے سلام کر کے وہاں سے نکل آیا۔

❁❁❁

ارجمند کو حق نگر بہت اچھا لگتا تھا۔

ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ چھوٹا شہر تھا، جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ گھل مل کر رہتے اور ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے۔ وہ لاہور سے بالکل مختلف تھا۔

لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اس کا نام عبدالحق سے موسوم تھا۔

دو دن میں ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہاں عبدالحق سے کیسے محبت کی جاتی ہے...... ؟ لوگ اسے دیوانہ وار چاہتے ہیں۔ دور رہنے سے بھی لوگوں کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نئی نسل کے لوگ بھی اس سے محبت کرتے

تھے۔ اس کی حیثیت وہاں ایک لیجنڈ جیسی تھی۔

لیکن عبدالحق کے حوالے سے جب اسے پرستش کی حد کو پہنچی ہوئی وہ محبتیں ملتیں تو وہ شرم سار ہو جاتی۔

ہر روز گھر میں عورتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ دادی اماں تو جگت اماں تھیں۔ ان کا احترام ایسے کیا جاتا جیسے وہ وہاں کی ملکہ ہوں اور کوئی بھی خالی ہاتھ نہ آتا۔ ننھے نورالحق کے لئے اتنے تحفے آئے کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ آخر وہ عبدالحق کا بیٹا تھا، حق نگر کا ولی عہد...... !

لاہور کے برعکس یہاں اس کے لئے نورالحق کو دودھ پلانا مسئلہ بن گیا۔ بچہ تو گود سے گود منتقل ہوتا چلا جاتا۔ رشیدہ یہاں بہت کام آئی۔ اسے بچے کے دودھ پینے کے اوقات کا علم تھا۔ اور یہ نورالحق کی خوبی تھی کہ دودھ وہ مقررہ وقت پر ہی پیتا تھا۔ تو جب وہ وقت آتا، رشیدہ جس کی گود میں بھی بچہ ہوتا، اس سے کہتی۔

''اب چھوٹے صاحب کے نہانے کا وقت ہوگیا ہے۔''

عورت بچے کو ایسی نزاکت سے اس کی طرف بڑھاتی، جیسے وہ کانچ کا بنا ہوا ہو۔

پھر رشیدہ ارجمند کو پکارتی۔

''بی بی صاحبہ...... ! چھوٹے صاحب کے نہانے کا وقت ہوگیا ہے۔''

یہ پکار سن کر ارجمند اس کی طرف لپکتی۔

ایک بار ایک عورت نے رشیدہ سے کہا۔

''تم ہی نہلا دو نا...... چھوٹی بی بی بات کر رہی ہیں۔''

رشیدہ کو بات بنانے میں کمال حاصل تھا۔

''بڑے نخریلے ہیں چھوٹے صاحب...... ! بی بی صاحب کے سوا کوئی نہیں نہلا سکتا انہیں۔''

''ہاں...... ! نکی نہ نہلائے تو ہنگامہ مچا دیتا ہے میرا شہزادہ۔'' حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

''نہاتے وقت کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا۔''

ارجمند تو بچے کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ تمام عورتیں اپنی حد میں رہتی تھیں۔ صحن ان کی حد میں تھا۔ زیادہ ہوتا تو جب حمیدہ اپنے کمرے میں ہوتی تو وہاں چلی جاتیں، وہ بھی حمیدہ سے اجازت لے کر۔

اس کے جانے کے بعد تبصرے ہونے لگے۔ ایک عورت نے کہا۔

''چھوٹی بی بی کتنی محبت کرتی ہیں بچے سے......؟''

''اور وہ بھی ان سے ہی زیادہ مانوس ہے۔ دودھ بھی انہی کے ہاتھ سے پیتا ہے۔'' دوسری بولی۔

''ایسی سوتیلی ماں کہیں نہیں دیکھی۔ اس کے لئے سگی ماں سے بھی بڑھ کر ہیں چھوٹی بی بی......!''

یہ سن کر حمیدہ تو تڑپ گئی۔

''سوتیلی ماں کیسی...... نکی اس کی سچ مچ کی ماں ہے۔''

''ہم نے تو سنا تھا، یہ بڑی بی بی کا بچہ ہے...... ؟'' ایک اور عورت نے معصومیت سے کہا۔

اب حمیدہ کو سنبھلنا پڑا۔

''پہلے دن سے جس نے گود میں لیا، ہر طرح سے خیال رکھا۔ اس کے لئے بچہ سوتیلا کیسے ہوسکتا ہے......؟ اور پھر نور بانو اور نکی ایک دوسرے کو سگی بہنوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ اب خالہ بھلا سوتیلی ماں ہوسکتی ہے......؟''

''واقعی...... ایسی محبت کہیں نہیں دیکھی۔'' پہلی عورت بولی۔

''اور دیکھو تو...... شہزادے کی صورت بھی چھوٹی بی بی سے ملتی ہے۔''

''ملتی کیا ہے...... بنا بنایا چھوٹی بی بی ہے۔'' دوسری نے کہا۔

''اللہ کی قدرت ہے...... اللہ نے اسے نکی کا ہی بیٹا بنایا ہے۔'' حمیدہ نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

ایسی صورتِ حال میں حمیدہ کو ارجمند پر بڑی شدت سے غصہ آتا تھا۔

اگلے روز ایک اور عورت نے ارجمند کی موجودگی میں ہی یہ بات کہی تو حمیدہ نے جواب دینے کے بجائے ارجمند کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

مگر ارجمند پرسکون رہی۔

''یہ سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے......؟'' اس نے نرمی سے کہا۔

''ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔''

''وہ چھوٹی بی بی...... ماں تو وہ ہوتی ہے نا...... جو نو مہینے پیٹ میں رکھتی ہے بچے کو۔'' عورت نے کھسیا کر کہا۔

''میں تو ایسا نہیں سمجھتی...... میرے شوہر کا بچہ ہے تو میں اس کی ماں ہی ہوئی نا...... اور آپی آج زندہ ہوتیں تو ہم دونوں اس کی مائیں ہوتیں۔ یہ تو خوش بختی ہوتی نا اس کی۔''

''سچ ہے بھئی...... ! ماں ہو تو چھوٹی بی بی جیسی...... !''

مگر ارجمند کو ایک بات کا بہت ملال ہوتا تھا۔ شاید ہی حق نگر کا کوئی گھر ایسا ہو جہاں سے کوئی عورت نور بانو کے پرسے کے لئے نہ آئی ہو لیکن ان میں سے ہر ایک کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نور بانو کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ لیکن عبدالحق سے ان کی محبت، عقیدت اور احترام اس ناپسندیدگی سے بہت زیادہ بڑھ کر تھا۔ اس لئے وہ اس کی عزت کرتی تھیں۔ وہ پہلی بار آئیں، انہوں نے نور بانو کی تعزیت کی، اس کے لئے دُعا کی اور پھر اسے یوں بھول گئیں، جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ ہاں نور الحق اور ارجمند کے لئے ان کی محبت والہانہ تھی۔

آپی میں منافقت نہیں تھی، اس لئے وہ زندگی میں زیادہ دوست نہ بنا سکیں۔ ارجمند نے افسردگی سے سوچا۔

''اماں......! یہ بہو بہت اچھی ہے آپ کی۔'' اس نے ایک عورت کو دادی اماں سے کہتے سنا۔

''میری نور بانو بھی بہت اچھی تھی۔'' حمیدہ نے تنک کر کہا۔

عورت گڑبڑا گئی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں......!''

ارجمند نے سوچا، دادی اماں آپی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اشارتاً بھی ان کی برائی برداشت نہیں کرسکیں۔

"پر میری نکی کی تو بات ہی اور ہے۔" حمیدہ نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"وہ لاکھوں میں نہیں، کروڑوں میں ایک ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہی تھی اماں......! میں نے تو ایسی لڑکی زندگی میں نہیں دیکھی۔ خوب صورت ایسی کہ چاند بھی شرما جائے۔ اور عادت اس سے بھی بڑھ کر۔ ہر ایک کی عزت کرنا، ہر کسی سے ہنس کر بات کرنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا۔"

"ہاں اماں......! سب سمجھتے تھے یہ بات......!" عورت نے اپنی بات جاری رکھی۔

"پر چھوٹی بی بی تو فرشتہ ہیں جی......! اتنی کچی عمر میں اتنا سمجھدار کسی کو نہیں دیکھا اماں......! اور پھر اماں......! کون کسی دوسرے کے بچے کو پالتا ہے......؟ اور وہ بھی اتنی محبت سے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ ارجمند مسکرائی۔ جانتی تھی کہ دادی اماں دانت پیس رہی ہوں گی۔ اور دل ہی دل میں اس پر غصہ کر رہی ہوں گی کہ اپنی حماقت سے اپنے ہی بچے کی سوتیلی ماں بنی ہوئی ہے۔

ادھر حمیدہ نے موضوع ہی بدل دیا۔

"اللہ کی دی ہوئی کتنی ہی خوبیاں سہی ہم میں۔" ارجمند نے جھک کر اپنے بچے کے کان میں کہا۔

"لیکن نور الحق......! یہ حقیقت ہمیں کبھی نہیں بھولنی کہ یہ جو عزت، پذیرائی اور محبت ہمیں مل رہی ہے، یہ اللہ کی عطا ہے اور تمہارے بابا کی وجہ سے ہمیں مل رہی ہے۔ وہ چراغ ہیں اور یہ عزت، پذیرائی اور محبت اس چراغ کی روشنی ہے۔"

وہاں زرینہ ایسی تھی، جو اسے پہلے سے جانتی تھی۔ وہ اکثر اپنے بچوں کے ساتھ لاہور آتی تھی۔ زرینہ کو ایک نظر میں ہی اس سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ اس سے بہت قریب ہوگئی تھی۔ نور بانو کے جانے کے بعد وہ قربت اور بڑھ گئی تھی۔

ارجمند کو اس کے بچوں سے بہت پیار تھا۔ لاہور آئے تو وہ ہی انہیں سنبھالتی۔

"آپا......! آپ بچوں کو بھول جائیں۔" وہ زرینہ سے کہتی۔

"نہیں میں سنبھال لوں گی۔ آپ سب لوگوں سے ملیں جلیں۔"

اور واقعی اس نے بچوں کو سنبھال لیا۔ زرینہ کو حیرت ہوئی، کیونکہ بچے اس کے بغیر رہنے والے نہیں تھے۔ وہ تو ہر وقت اس سے چپکے رہتے تھے۔

ایک دن زرینہ نے جھجکتے ہوئے اس سے کہا۔

"ایک بات کہنا چاہتی ہوں تم سے......؟"

"تو کہیں نا......! مجھ سے جھجکتی ہیں آپ...... مجھے شرمندگی ہوتی ہے آپا......!"

"تمہیں بری لگے گی تو مجھے شرمندگی ہوگی نا......!"

"مجھے کیوں بری لگے گی آپ کی بات......؟"

"بات ہی ایسی ہے ارجی......!"

"ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی آپا......! میں آپ کی بات کا برا ماننے والی نہیں...... آپ کہیں نا......!"

زرینہ پھر بھی جھجک رہی تھی۔ اس کے اصرار پر بولی۔

"بھائی کے لئے بھابی کا جو تصور تھا نا...... میرا...... تم اس پر پوری اترتی ہو۔"

چند لمحے تو ارجمند کی سمجھ میں اس کی بات ہی نہیں آئی۔ اور جب وہ سمجھی تو اس کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا۔

"ایسی بات نہیں کرتے آپا......!" اس نے ہڑبڑا کر کہا۔

"برا لگا نا تمہیں...... میں اسی لئے تو نہیں کہہ پا رہی تھی۔"

"نہیں آپا......! برا تو نہیں لگا مجھے......!"

"پھر بھی مجھے نہیں کہنی چاہئے تھی یہ بات......! عمر کا اتنا بڑا فرق ہے تم میں اور بھائی میں۔"

"عمر سے کچھ نہیں ہوتا آپا......!" اس نے جلدی سے کہا۔

"اللہ میاں جوڑے بناتے ہوئے عمر نہیں دیکھتے۔" کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ ان دو جملوں میں اس نے بہت کچھ ظاہر کر دیا ہے۔

"اگر ایسا ہوتا تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا......؟"

اب ارجمند بہت چوکنا ہوگئی تھی۔ اس نے بے پرواہی سے کہا۔

''پتا نہیں آپا......! ایسا ہوا نہیں تو مجھے کیسے معلوم......؟ میں نے تو ایسا کبھی نہیں سوچا۔''

''تم کیسے سوچ سکتی تھیں......؟ سوچا تو میں نے تھا۔ اور تم سے کہہ بھی دیا۔ شرمندہ ہوں۔''

ارجمند نے اس کے دونوں ہاتھ محبت سے تھام لئے۔

''میں نے کہا نا......آپا......! کہ آپ شرمندہ نہ ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے جو کہا کہ ایسی بات نہیں کرتے، تو اس لئے کہا کہ میری آپی جن سے میں بہت محبت کرتی ہوں، آپ کی بھابی ہیں۔ آپ کا اس طرح سوچنا ان کے ساتھ زیادتی ہے اور آپی بہت اچھی ہیں۔''

''میں بھابی کو برا کب کہہ رہی ہوں......؟'' زرینہ بولی۔

''لیکن سچی بات یہ ہے کہ دونوں کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔''

''آغا جی آپی سے بہت محبت کرتے ہیں آپا......! ایسے رشتے بے جوڑ نہیں کہلاتے۔''

''میں صورت شکل کی بات نہیں کر رہی ہوں راجی......! بھابی کا دل بہت چھوٹا ہے۔ وہ شکی بھی بہت ہیں۔ وہ تو بھائی کے سلسلے میں مجھ پر بھی شک کرتی رہیں اور انہوں نے ننھے بچے ساجد کو بھی نہیں چھوڑا۔ وہ کسی کو بھائی کے قریب دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ اور بھائی بے چارے، ہر ایک کا خیال رکھنے، ہر ایک سے محبت کرنے والے......تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ ان کا دل کتنا بڑا ہے۔ بھابی کا بس چلے تو انہیں سب سے کاٹ دیں۔ اب کراچی جا کر بہت خوش ہوں گی۔ دیکھ لو......عید بقر عید پر بھی نہیں آئے کبھی۔''

''یہ اس لئے کہ آپی بہت محبت کرتی ہیں آغا جی سے۔'' ارجمند نے نوربانو کی صفائی پیش کی۔

''اور نہ آنے کی وجہ آپی کی بیماری ہے۔''

''ہاں......! میں سمجھ سکتی ہوں۔ جب آنے کا ارادہ کرتے ہوں گے، بھابی

بیمار ہو جاتی ہوں گی۔''

''آپ زیادتی کر رہی ہیں آپا......! بدگمانی کر رہی ہیں۔''

''جو میں نے دیکھا ہے، تم نے نہیں دیکھا۔ تم ویسے بھی بہت معصوم ہو۔ میں تو بس بھائی کی فکر کرتی ہوں۔ انہوں نے غلط فیصلہ کیا تھا، اور اسے عمر بھر نبھائیں گے۔ وہ بہت عظیم انسان ہیں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ پتا ہے...... وہ مجھے کہاں سے لائے تھے......؟''

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

''مہاجروں کے کیمپ سے۔ جہاں میرا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ لائے......مجھے بہن بنایا اور مجھے اس سے بہت زیادہ دیا...... جو ایک باپ اور بھائی مل کر کسی لڑکی کو دے سکتے ہیں۔''

''میں آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھے وہ کہاں سے لائے ہیں......؟'' ارجمند نے دل میں سوچا۔

''خیر......چھوڑو ان باتوں کو......میں تمہارے لئے بہت دعا کروں گی۔''

یہ پوچھنے کی ارجمند میں ہمت نہیں ہوئی کہ زرینہ اس کے لئے کیا دُعا کرے گی......؟ البتہ اس نے اتنا جان لیا کہ آپا اس سے بہت محبت کرتی ہیں۔

اس کا جواب اسے اس دن مل گیا، جب عبدالحق سے اس کی شادی ہوئی۔ شادی میں زرینہ تین دن وہاں رہی۔ دوسرے دن تنہائی میں زرینہ نے اس سے کہا۔

''دیکھا......تم میری بھابی بن گئیں نا ارجی......! میری خواہش بھی پوری ہوئی۔ اور میری دُعائیں بھی قبول ہوئیں۔ پتا ہے، تمہارے لئے کتنی دُعائیں کرتی رہی ہوں میں......؟''

ارجمند نے سر اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا۔

''میرے لئے......؟''

''ہاں......! تمہارے لئے......!'' زرینہ نے کہا۔

''یاد ہے...... جب میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے تم جیسی بھابی چاہئے......!''

"تو آپ نے آغا جی کے لئے دعا کی ہوگی ....؟" ارجمند نے دبی آواز میں کہا۔

"نہیں......! تمہارے لئے......! اس دن میں نے دیکھ لیا تھا کہ تم بھائی سے بہت محبت کرتی ہو۔ محبت کبھی چھپتی نہیں میری پگلی بھابی.....!"

اور اپنی محبت کو سات پردوں میں چھپا کر رکھنے والی ارجمند خوف زدہ ہوگئی کہ اور جانے کس کس کو اس کا راز معلوم ہوگیا ہوگا.....؟

پھر ساجد بھی تھا، جو اسے چھوٹی چاچی کہہ کر پکارنا چاہتا تھا۔ اس کے کہنے پر وہ صرف تنہائی میں اسے اس طرح پکارتا تھا۔

اور چاچا اور چاچی، سبھی اس شادی سے خوش تھے۔ اور تو اور دادی اماں بھی...... جیسے سب کی یہی خواہش تھی۔ مگر کہتے نہیں تھے۔

شادی کے بعد زرینہ سے پہلی ملاقات اب حق نگر میں آکر ہوئی۔ زرینہ ان کے گھر رہنے کے لئے آگئی تھی۔ دن بھر وہاں رہتی اور شام کو اپنے گھر چلی جاتی۔

زرینہ نے پہلی بار نورالحق کو گود میں لیا، سینے سے لگایا، پیار کیا، پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بے ساختہ بولی۔

"یہ بچہ بڑی بھابی مرحومہ کا تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپا......؟" ارجمند نے بوکھلا کر کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ یہ ہو بہو تمہاری طرح ہے بلکہ یہ تمہارا ہی بچہ ہے۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے آپا......!"

"یہ تم نے ایک بار پہلے بھی مجھ سے کہا تھا۔ مگر میں جانتی ہوں کہ سچ یہی ہے۔"

"آپ بہت بڑی اور گمان کی باتیں اتنے یقین سے کیسے کر لیتی ہیں......؟ آپ کو ڈر نہیں لگتا۔" ارجمند کے لہجے میں برہمی تھی۔

"گمان ہوگا یہ اوروں کے لئے...... میں تو یقین سے ہی کہہ رہی ہوں۔ اس لئے ڈر نہیں لگتا۔" زرینہ نے بے پرواہی سے کہا۔

"کیسے......؟" ارجمند نے اسے چیلنج کیا۔

"ایسے کہ میں نے بھابی مرحومہ کو بہت قریب سے دیکھا۔ انہیں بہت اچھی طرح جانتی تھی میں۔ پہلے تو میری سمجھ میں یہی نہیں آیا تھا کہ بھائی پر پوری طرح قابض ہونے کے خبط کے باوجود انہوں نے خود بھائی سے تمہاری شادی کیسے کرا دی......؟ سچ میں تو ہار گئی سوچ سوچ کر۔ پھر پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہیں اور ایبٹ آباد چلی گئیں ہیں تمہیں ساتھ لے کر...... تمہیں ساتھ لے جانا تو سمجھ میں آتا تھا۔ بھائی کے پاس کیسے چھوڑ دیتیں تمہیں......؟ لیکن یہ نہیں سمجھ پائی کہ اس حال میں سب کو چھوڑ کر...... سب سے کٹ کر اتنی دور جانے کی کیا تک تھی......؟ بہت سوچا، لیکن سمجھ نہیں آئی۔ پر اس ننھے بچے نے......" زرینہ نے بڑی محبت سے نورالحق کی پیشانی کو چوما اور اپنی بات پوری کی۔

"......سارے بھید کھول دیئے۔"

"آپا......! آپ قیاس کے زور پر......"

زرینہ نے محبت بھرے لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں ارجی......! میری پیاری بھابی......! یہ قیاس نہیں ہے۔"

"آپ نے آپی کی بیماری کو بھی مکر سمجھا تھا۔" ارجمند نے خفگی سے کہا۔

"ہاں......! اور وہ بھی قیاس نہیں تھا۔"

"لیکن اس بیماری نے آپی کی جان لے لی۔ ثابت ہوگیا کہ وہ مکر نہیں تھا۔"

"نہیں ثابت ہوا۔ بلکہ یہ ثابت ہوگیا کہ یہ بچہ ان کا نہیں ہے۔"

"کیسے......؟"

"تم بھول رہی ہو کہ میرے سسر، اللہ انہیں کروٹ جنت نصیب کرے، ڈاکٹر تھے...... اور بہت اچھے ڈاکٹر تھے۔ اور درحقیقت وہ میرے لئے باپ سے بڑھ کر تھے۔ مجھ سے بہت قریب تھے وہ......"

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے آپا......!" ارجمند نے جھنجلا کر کہا۔

"پوری بات تو سن لو میری...... وہ بھائی سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب بھائی اور بھابی کراچی چلے گئے تو پہلی عید پر وہ ان کے منتظر تھے۔ مگر وہ تو لاہور بھی نہیں آئے۔ تین سال گزر گئے تو انہوں نے اماں سے بات کی۔ اماں نے انہیں بھابی کی

بیماری کے متعلق بتایا۔ تب انہوں نے مجھ سے..... صرف مجھ سے اس سلسلے میں بات
کی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہاری بھابی اپنی قابضانہ فطرت سے مجبور ہو کر عبدالحق
میاں کو سب لوگوں سے کاٹنے کے لئے یہ ڈھونگ کر رہی ہے۔ اور یہ اسے بہت مہنگا
پڑے گا۔ اس کی وجہ بھی بتائی تھی انہوں نے۔ انہوں نے کہا کہ عبدالحق بہت ذمہ دار
اور خیال رکھنے والا ہے۔ وہ اسے دوائیں ضرور کھلائے گا اور دواؤں کا غیر ضروری
استعمال بہت بھیانک ثابت ہوگا۔ اس کے نتیجے میں السر سے بہت بڑی اور خوفناک
بیماریاں پیٹ میں پیدا ہوں گی۔ انہوں نے ایک بات اور بھی کہی تھی، جو میں بھول گئی
اور وہ مجھے ابھی یاد آئی ہے۔''

ارجمند کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''آپ نے ان سے آپی کو سمجھانے کو کیوں نہیں کہا...؟''

''کہا تھا میں نے... وہ بولے ... نور بانو کبھی نہیں مانے گی یہ بات ... وہ
مجھے جھٹلائے گی۔''

''تو وہ آغا جی سے تو یہ بات کر سکتے تھے ... ؟''

''یہ بھی کہا تھا میں نے... مگر ان کے خیال میں اس میں بڑی خرابی ہو سکتی
تھی۔ بھابی اور بھائی کے بیچ میں تفرقہ پڑ سکتا تھا۔ یہ بات انہیں گوارہ نہیں تھی۔ اور یہ
بھی ممکن تھا کہ بھائی ان سے ہی دور ہو جاتے۔''

ارجمند کو آپی کا درد سے تڑپنا یاد آیا تو اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''کتنی اذیت سہی تھی آپی نے ....؟ تو کیا وہ خود مول لی ہوئی اذیت
تھی.....؟''

''مگر آپا......! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''آغا جی اتنی دور چلے گئے تھے تو آپی کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ بقول آپ
کے میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ تو عید بقرعید پر تین چار دن کے لئے ملنے آنے میں
آپی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یہ بات تو میرے حلق سے نہیں اترتی۔''

''بھابی ایک دن کے لئے بھی لاہور آنا نہیں چاہتی تھیں۔''

''لیکن کیوں......؟''

''انہیں ڈر تھا کہ اولاد سے محرومی کو جواز بنا کر اماں بھائی کی دوسری شادی کرا
دیں گی۔''

''لیکن وہ لاہور آئیں، بلکہ انہوں نے خود آغا جی کی دوسری شادی کرا
دی۔'' ارجمند نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''مجبوری میں آئیں وہ ... بیماری بہت بڑھ گئی تھی اور وہ وہاں بہت اکیلی
تھیں۔ اور آنے سے پہلے انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ بھائی کے
لئے انہیں تم سے اچھی بیوی اور اپنے لئے سوکن اور کون مل سکتی تھی ...؟ محبت کرنے
والی، تابع دار، راز رکھنے والی، تم جیسی دوسری کوئی تو ہے ہی نہیں روئے زمین پر۔ اماں
بھائی کی دوسری شادی کراتیں تو انہیں سچ مچ کی سوکن ملتی۔ نہیں ارجی.... ! بھابی بہت
چالاک تھیں۔''

''آپ کو نہیں پتا آپا ... ! کہ ایبٹ آباد میں مرنے سے پہلے کتنی اذیت
اٹھائی آپی نے......؟'' ارجمند نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''وہ انہوں نے اپنے لئے خود چنی تھی۔''

''مگر یہ کیسے یقین ہو گیا آپ کو کہ نورالحق ان کا بچہ نہیں ہے۔''

زرینہ کی گود میں موجود نورالحق اب اپنی مخصوص آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کا
دودھ کا وقت ہو گیا تھا۔ لیکن ارجمند ایسی الجھن میں تھی کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں
دے سکی۔

''میں نے کہا نا کہ ابا جان کی کہی ہوئی ایک بات میں بالکل بھول گئی تھی
ورنہ اس بچے کو دیکھے بغیر بھی حقیقت جان لیتی۔''

ارجمند نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بس سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

نورالحق کی مخصوص آوازیں اور بلند ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا کہ اب کسی بھی لمحے وہ
رونا شروع کر دے گا۔

''ابا جان نے کہا تھا، ان دواؤں کا غیر ضروری استعمال زندگی کے لئے تو
خطرناک ہوگا ہی، لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ تمہاری بھابی کے ماں بننے کا کوئی
امکان ہے بھی تو وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ یہ بات مجھے ابھی یاد آئی ہے.... اور ارجی

بھابی......! ابا جان بہت اچھے ڈاکٹر تھے۔"

ارجمند سناٹے میں آ گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔

"لیکن یہ بات غلط ثابت ہو گئی۔" اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"یہ تو تم کہہ رہی ہو ارجی......! ورنہ بچے کے نقوش تو خود منہ سے بول رہے ہیں۔"

"اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ آپی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔"

"مجھے نہیں پتا کہ تم حقیقت کیوں چھپا رہی ہو......؟ لیکن......" اچانک زرینہ کو بچے کی ان آوازوں کا احساس ہوا۔

"یہ کیسی آوازیں نکال رہے ہو میاں نورالحق......؟"

اب ارجمند کو بھی احساس ہوا۔

"وہ آپا...... یہ ان کے نہانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"نہانے کا وقت......؟" زرینہ نے حیرت سے دہرایا۔

اسی لمحے گھبرائی ہوئی رشیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"بی بی صاحبہ......! نورالحق کا وقت ہو گیا ہے نہانے کا۔" اس نے کہا۔ اس وقت اس کی نظر زرینہ پر پڑی۔

"اور باجی صاحبہ......! آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔"

"آج تو میاں نورالحق کو میں نہلاؤں گی۔" زرینہ نے کہا۔

ارجمند نے بے بسی سے رشیدہ کو دیکھا۔

"باجی صاحبہ......! اماں بلا رہی ہیں آپ کو......!" رشیدہ نے دہرایا۔

"ان سے کہنا...... میں اپنے بھتیجے کو نہلا کر ابھی آئی......!"

وہ پہلا موقع تھا کہ رشیدہ بھی بے بس ہو گئی۔

"چھوٹے سرکار بی بی صاحبہ کے علاوہ کسے سے نہیں نہاتے۔ کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے۔"

"تو کوئی بات نہیں......! بھابی ہی نہلا دیں گی انہیں۔ میں ہاتھ بٹا دوں گی

ان کا۔" زرینہ نے کہا۔

"بس...... اب تم جاؤ......!"

رشیدہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد زرینہ نے کہا۔

"یہ آواز میرے لئے جانی پہچانی ہے ارجی......! تین بچے ہیں میرے۔ بھتیجے صاحب کو نہانا نہیں ہے۔ انہیں بھوک لگی ہے اور یہ دودھ مانگ رہے ہیں۔"

ارجی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"آپا......! آپ فیڈر بنا لائیں اس کے لئے......!"

"بھئی......! اس وقت تو یہ پھپھو کی گود میں ہیں۔ دودھ تم ہی بنا لاؤ بھابی......!"

اب ارجمند کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ بچہ اب رو رہا تھا۔

زرینہ نے بچے کو ارجمند کی طرف بڑھایا۔

"اس پر ظلم تو میں گوارہ نہیں کر سکتی بھابی......! تم اسے دودھ پلاؤ...... میں جا رہی ہوں اماں کے پاس......!" بچے کو ارجمند کی گود میں دے کر وہ جانے کے لئے مڑی۔

"آپا......!" ارجمند نے اسے پکارا۔

"میں یہ بھی نہیں پوچھوں گی ارجی......! کہ تم یہ سب کیوں کر رہی ہو......؟ اور میں کسی کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔" زرینہ نے پلٹتے ہوئے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا آپا......! سب لوگوں کو معلوم ہے یہ بات۔" ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

اب حیران ہونے کی باری زرینہ کی تھی۔

"سب کو معلوم ہے......!"

"جی......! صفیہ چچی کو بھی معلوم ہے۔"

"اور انہوں نے مجھے نہیں بتایا......؟" زرینہ بولی۔

''بھائی کو بھی معلوم ہے......؟''

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایسا لگتا ہے کہ ان کے سوا سب کو معلوم ہے......؟''

''یہ اور بڑا ظلم ہے...... خیر...... اب تم اسے دودھ پلاؤ......! ہم بعد میں بات کریں گے اس پر۔'' زرینہ نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

بعد میں زرینہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کی دلیل سن کر وہ بولی۔

''مگر تم اس میں ناکام ہو گئیں ارجی......! سبھی کو تو معلوم ہو گئی یہ بات سوائے بھائی کے۔''

''میرے لئے تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔'' ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

''اتنی بڑی بھی نہیں کہ اس کے لئے تم اتنی بڑی قیمت ادا کر رہی ہو......؟''

''آپی آغا جی کی نظروں میں سرخ رو رہیں، اس کے لئے میں کوئی بھی قیمت ادا کر سکتی ہوں۔''

''کیوں......؟''

''دیکھیں نا...... آپی سے آغا جی جیسی محبت تو کسی نے بھی نہیں کی۔''

''چلو......! تم یہ قیمت ادا کر دو۔ لیکن نورالحق کے ساتھ تو یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔''

''وہ کیسے آپا......؟''

''ماں کے ہوتے ہوئے عمر بھر وہ یہی سمجھے گا کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے آپا......؟''

''بہت فرق پڑتا ہے میری بھابی......! بہت بڑی محرومی کا احساس اس کے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔''

''میں اسے کسی محرومی کا احساس ہونے ہی نہیں دوں گی۔ میں اس سے اتنی محبت کروں گی۔''

''کوئی محبت ماں کی محبت کا بدل نہیں ہو سکتی۔''

''مگر میں تو اس کی حقیقی ماں ہوں۔''

''ہرگز نہیں......!''

''تو پھر محرومی تو اپنی جگہ رہے گی نا......!''

ارجمند لاجواب ہو گئی۔

''اور جتنی قیمت تم ادا کرو گی اس جھوٹ کی، اس سے بہت زیادہ یہ بے چارہ ادا کرے گا۔'' زرینہ نے نورالحق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور وہ بھی اپنی مرضی کے بغیر۔ یہ تو اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوئی نا......؟''

''میں اس کی ماں ہوں۔ یہ میرا بچہ ہے۔ میرا حق ہے اس پر۔ یہ زیادتی نہیں۔''

''جسے اللہ نے محروم نہیں کیا، اسے محروم کرنے کا تمہارا حق ہے......؟ صرف اس لئے کہ تم اس کی ماں ہو......؟'' زرینہ نے چیلنج کیا۔

ایک لمحے کو ارجمند اندر سے ہل کر رہ گئی۔ مگر وہ بولی تو اس کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

''آپا......! میں نے اسے پیدا ہونے سے پہلے ہی آپی کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ کیا مائیں اللہ کو نہیں دے دیتیں اپنا بچہ......؟''

''میں تمہاری طرح پڑھی لکھی تو نہیں ہوں ارجی......! لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ جب یہ پیدا ہوا تو وہ جھولی ہی نہیں رہی تھی، جس میں تم نے اسے ڈالا تھا۔ وہ تو اس کی پیدائش سے پہلے ہی اللہ کے حکم پر سمٹ چکی تھی۔''

''اب کچھ ہو نہیں سکتا آپا......! اب مجھے کمزور نہ کرو۔'' ارجمند کے لہجے میں التجا تھی۔

''میں تو صرف تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں ارجی......! میں تم سے بھی محبت کرتی ہوں اور اس ننھے بچے سے بھی۔ ماں کی حیثیت سے تمہارا حق اپنی جگہ...... لیکن اس کی محرومی کا سوچ کر میرا دل کٹتا ہے۔''

''تم ہم دونوں کے لئے دعا کرنا آپا......!''

''وہ تو میں کرتی ہوں اور کروں گی۔''

بات ختم ہوگئی۔ لیکن ارجمند کے لئے وہ ہمیشہ کی خلش بن گئی۔ یہی سب کچھ اسے رشیدہ نے اور پھر حمیدہ نے بھی سمجھایا تھا۔ لیکن زرینہ کی طرح دلیلیں کسی نے نہیں دی تھیں۔ یہ احساس کہ وہ بچے کے ساتھ زیادتی کر رہی ہے۔ اس کے لئے بہت روح فرسا تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ اب اس احساس سے وہ کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکے گی۔

''میں کیا کروں بیٹے نورالحق......! بس......تم مجھے معاف کر دینا...... میں اللہ سے بھی بخشش طلب کرتی رہوں گی۔'' اس نے بچے سے سرگوشی میں کہا اور اس کی پیشانی چومنے کے بعد محبت سے اسے لپٹا لیا۔

اب قریبی لوگوں میں کوئی ایسا نہیں رہا تھا، جس کے لئے وہ راز ہو۔ ایک اعتبار سے ارجمند کے دل پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ بس ایک بوجھ رہ گیا تھا۔ اور وہ زندگی بھر کا تھا۔

حق نگر میں باقی دن اس نے سکون سے گزارے۔

❁❁❁

لاہور اور کراچی، دونوں جگہ کے منظر تبدیل ہوگئے تھے۔

لاہور میں صرف ساجد رابعہ اور زبیر رہ گئے تھے۔ گھر کے تمام ملازم بھی موجود تھے۔ بس نوریز کی جگہ یعقوب اور اس کی فیملی آگئی تھی۔ نوریز رشیدہ اور آبیہ کے ساتھ کراچی چلا گیا تھا۔ اور اس تبدیلی کی وجہ ننھا نورالحق تھا۔

کراچی آنے والے تمام لوگ پہلی بار کراچی آئے تھے، اور بہت خوش تھے۔ سمندر ان سب نے پہلی بار دیکھا تھا اور مسحور ہو کر رہ گئے تھے۔ اتنا پانی......! اتنا پانی کہ حد نظر تک کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا گھر سمندر سے بہت قریب تھا۔

رشیدہ اور نوریز کے لئے تو کراچی ایک خواب تھا۔ جسے دیکھنے کی انہیں کب سے آرزو تھی۔ ان کے علاقے کے بے شمار لوگ روزگار کے لئے کراچی کا رخ کرتے تھے۔ عید بقر عید پر وہ گھر واپس جاتے تو کراچی کے افسانے سناتے۔ سننے والوں کو وہ افسانے ہی لگتے تھے۔ کراچی میں روزگار بہت ہے۔ کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا وہاں۔

عبدالحق انہیں سمندر دکھانے لے گیا تھا۔

حمیدہ نے سمندر کی طرف دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ پھر اس نے اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے کہا۔

''پتر عبدالحق......! یہ تو بہت بڑا ہے۔ آگے پانی کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔''

''یہ سمندر ہے اماں......! سمندر......!'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس کے اس طرف کیا ہے......؟'' حمیدہ نے معصومیت سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم اماں......! کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ کیسے پتا چلے گا......؟''

''ہاں......! یہ تو ہے......!''

''لیکن اس طرف منوڑا ہے۔ میں وہاں لے چلوں گا تمہیں......!'' عبدالحق نے کہا۔

''کیسے......؟''

''یہ اسٹیمر کھڑا ہے نا اماں...... اس میں بیٹھ کر جائیں گے۔''

''نا پتر......! میں نہیں جانے والی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''میرے ساتھ ہو پھر بھی ڈر لگے گا......؟''

''ڈر تو پھر بھی لگے گا پتر......! اور فائدہ کیا ہے...... دیکھ تو رہی ہوں سمندر......!''

''وہاں ساحل ہوگا اماں......! تم ریت پر کھڑی ہوگی اور پانی تمہارے پاس آئے گا۔''

حمیدہ کا دل للچانے لگا۔ صحرا والوں کا دل تو سراب کو دیکھ کر بھی مچل جاتا ہے۔ پانی تو ان کی بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر وہ سمندر کو دیکھ سکتی تھی، لیکن پانی کے لمس سے تو محروم تھی۔

''یہ کشتی الٹے گی تو نہیں......؟'' اس نے پوچھا۔

''انشاء اللہ......! ایسا نہیں ہوگا اماں......!'' عبدالحق نے بڑے خلوص سے کہا۔

''اور اماں......! یہ کشتی نہیں...... اسٹیمر ہے۔ آواز سن رہی ہو نا...... اس میں

انجن لگا ہے۔ یہ اپنی کار جیسا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ کار سڑک پر چلتی ہے اور یہ پانی پر چلتا ہے۔''

حمیدہ نے دور جاتے ہوئے اسٹیمر کو دیکھا۔ اس کی آواز سنی، رفتار دیکھی تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔

''اور کشتی یہ ہے اماں...... !'' عبدالحق نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ چپوؤں سے چلتی ہے۔ اس میں بیٹھو تو شاید چیخ مار کر بے ہوش ہو جاؤ...... !''

''کیوں پتر...... ؟''

''یہ لہروں پر بری طرح ڈولتی ہے نا...... !''

وہ اتوار کا دن تھا۔ تفریح کے لئے منوڑا جانے والوں کا ہجوم تھا۔ اسٹیمروں کی باری لگی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھر جاتے تھے۔ عبدالحق نے ایک اسٹیمر والے سے صرف اپنے لئے بات کر لی۔

حمیدہ کو تو اسٹیمر پر سوار ہوتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔ عبدالحق نے سہارا دے کر اسے پھر ارجمند کو اسٹیمر پر پہنچنے میں مدد دی۔ نورالحق اس وقت بھی ارجمند کی گود میں تھا۔

عبدالحق کو پہلی بار شعوری طور پر احساس ہوا کہ ارجمند نورالحق کو کبھی خود سے الگ نہیں کرتی ہے۔

''اسے رشیدہ کو دے دو نا...... !'' اس نے کہا۔

''جی نہیں...... ! یہ میرے پاس ہی ٹھیک ہے۔'' ارجمند نے جواب دیا۔

''اچھا...... مجھے دے دو...... !''

ارجمند نے نورالحق کو اس کی گود میں دے دیا۔ لیکن اسٹیمر پر چڑھتے ہی اس کی طرف پلٹی۔

''لائیں...... اب مجھے دے دیں...... !''

''میں لے آؤں گا...... تم فکر نہ کرو...... !'' عبدالحق نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

ارجمند کے چہرے پر تشویش ہویدا تھی۔ اور وہ تشویش صرف اس وقت دور ہوئی جب وہ نورالحق کو لے کر اسٹیمر پر پہنچ گیا۔

اسٹیمر کی سائیڈ میں لکڑی کی بینچ جیسی نشستیں تھیں۔ رشیدہ، نوریز اور آبیہ سامنے بیٹھ گئے۔ جبکہ حمیدہ، ارجمند اور عبدالحق مقابل والی نشستوں پر تھے۔

اسٹیمر پر عملے کے تین آدمی تھے۔ ان میں ایک اسٹیمر چلانے والا تھا۔

''چلیں صاب...... ؟'' اسٹیمر والے نے عبدالحق سے پوچھا۔

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسٹیمر جھٹکے سے اسٹارٹ ہوا اور آگے بڑھا۔ حمیدہ گھبرا کر عبدالحق سے لپٹ گئی۔

''ہائے ربا...... !''

ارجمند کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ سفر کی دعا پڑھ رہی تھی۔ نورالحق کو اس نے دوبارہ گود میں لے لیا تھا۔

''گھبراؤ نہیں اماں...... ! ابھی کچھ دیر میں تمہیں مزہ آنے لگے گا۔'' عبدالحق نے حمیدہ کو تھپ تھپایا۔ پھر ارجمند کی طرف متوجہ ہوا۔

''تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا ارجی...... ؟''

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

لمحوں میں ہی اسٹیمر کی چال ہموار ہوگئی۔ اس کے چلنے سے لہریں اچھل رہی تھیں اور اس کی پہلو کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ چھینٹیں اچھل کر ان لوگوں تک آ رہی تھیں۔ حمیدہ کو وہ لمس بہت خوش گوار لگا۔

عبدالحق نے پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔

''کتنا اچھا لگتا ہے۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''اور پانی کا دباؤ تو دیکھیں...... اماں...... ! تم بھی پانی میں ہاتھ ڈالو نا...... !''

''نا پتر...... ! مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔''

''میں تمہیں پکڑے ہوئے ہوں۔ ہاتھ پانی میں ڈالو نا...... اماں...... !''

عبدالحق نے بچوں کی طرح ضد کی۔

حمیدہ نے صرف اسے خوش کرنے کے لئے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پھر اسے لطف آنے لگا۔ اس نے جھک کر پانی میں موجود اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ پانی بے حد شفاف تھا۔ البتہ اس کی رنگت سبزی مائل تھی۔

لیکن ذرا دیر میں اسے چکر آنے لگے۔ گھبرا کر اس نے نظریں ہٹالیں۔

''کیا ہوا اماں......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''پانی پر نظریں جمانے سے چکر آتے ہیں۔''

''تو پانی کی طرف مت دیکھو......!'' عبدالحق نے کہا اور ارجمند کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سحر زدہ سی پانی کو دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں چکر نہیں آرہے ہیں......؟'' عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

''نہیں آغا جی......! الحمدللہ......! بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ......!''

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں شکر گزاری کی کیا بات ہے......؟

''پانی میں ہاتھ ڈالو نا......!''

ارجمند نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

''ڈر لگتا ہے......؟''

ارجمند نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

بات عبدالحق کی سمجھ میں آگئی۔ ارجمند بڑی نزاکت سے نورالحق کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

''لاؤ......! نورالحق کو مجھے دے دو......!''

ارجمند ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر اس نے بچے کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اب تم اچھی طرح انجوائے کرو......!''

ارجمند نے نہایت شکر گزاری سے اس کی طرف دیکھا۔

''شکریہ آغا جی......! لیکن میں ویسے بھی انجوائے کر رہی تھی۔''

''میں چاہتی تھی آغا جی......! کہ میں اور یہ پہلی بار سمندر ایک ساتھ دیکھیں۔'' ارجمند نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

عبدالحق اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

''یہ بچے سے اتنا پیار کرتی ہے......!'' اس نے حیرت سے سوچا۔

ارجمند نے اب پانی میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا اور انہماک سے اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

ادھر اسٹیمر اب کھلے سمندر میں آگیا تھا۔ پانی میں کھڑے بڑے بڑے جہاز اب کھلونوں جیسے لگ رہے تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ حمیدہ کو ڈر لگنے لگا۔ اب تو کنارہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پتر......!'' اس نے عبدالحق کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں اماں......!''

''اب تو ہم بیچ سمندر میں ہیں۔ کشتی ڈوب گئی تو......؟''

''اللہ کے حکم کے بغیر تو کچھ نہیں ہوتا اماں......! ڈر لگے تو اللہ سے دعا کرنی چاہئے اور امان مانگنی چاہئے......!''

اور حمیدہ کے دل کو قرار آگیا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ اللہ کرتی رہی۔

بالآخر سفر ختم ہوا اور وہ منوڑا پہنچ گئے۔ عبدالحق نے اسٹیمر والے کو کرایہ ادا کیا اور اسے چار گھنٹے کے بعد آنے کو کہا۔

سفر میں حمیدہ کو سمندر سے جتنا ڈر لگ رہا تھا، ساحل پر اتنا ہی نڈر ہو گئی۔ پانی کی موج نے اس کے پیروں کو چوما تو خوشی کی ایک لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر عبدالحق نے ہاتھ تھام کر اسے روک دیا۔

حمیدہ نے پلٹ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہاں موجیں بہت تند ہوتی ہیں اماں......! یہ ساحل بہت خطرناک ہے۔'' عبدالحق نے اسے سمجھایا۔

''کیوں......؟''

''آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا اور کوئی موج آپ کے سر پر سے گزر جائے گی۔ اور واپس جاتی ہوئی لہر بہت خطرناک ہوتی ہے۔ قدم اکھاڑ دیتی ہے آدمی کے۔ اور سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر سمندر میں کھینچ کر لے جاتی ہے۔ آپ بس یہیں کھڑی رہیں میرا ہاتھ تھام کر۔''

یہ باتیں سن کر نوریز اور رشیدہ بھی محتاط ہو گئے۔ آبیہ تو ویسے ہی ڈر رہی تھی۔

مگر حمیدہ کا دل نہیں مان رہا تھا۔

''تھوڑا اور آگے جانے میں کیا حرج ہے پتر......؟''

عبدالحق نے ساحل پر لگے ہوئے ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''دیکھو اماں......! یہ بورڈ حکومت نے لگایا ہے۔ اس پر لکھا ہے کہ یہاں نہانا خطرناک ہے۔''

حمیدہ نے ارجمند کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ارجمند نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آغا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں......!''

حمیدہ کو کچھ مایوسی ہوئی۔ لیکن اگلے دس منٹ میں اسے اندازہ ہو گیا کہ عبدالحق نے ٹھیک کہا تھا۔ سمندر سے پانی موج در موج آتا تھا۔ ایک کے پیچھے دوسری اور دوسری کے پیچھے تیسری موج۔ وہ نہ رکنے والا سلسلہ تھا۔ اور ہر موج پہلے والی موج سے اونچی تھی۔ پانی سینے تک آ گیا تو وہ گھبرا گئی۔ پھر اسے واپس آنے والی موج کا تجربہ بھی ہو گیا۔ اسے ایسا لگا کہ پیروں تلے سے زمین سرک گئی ہے۔ وہ چکرا کر گرنے والی تھی کہ عبدالحق نے اسے سنبھال لیا۔

''موج واپس آئے تو تھوڑا سا اچھل جاتے ہیں اماں......! ایسے......!''

عبدالحق نے مظاہرہ کر کے دکھایا۔

سب لوگ اس کی تقلید کرنے لگے۔

ذرا دیر میں حمیدہ کا دل بھر گیا۔

''اب تو بھوک لگ رہی ہے پتر......!''

''تو کھانا کھا لیتے ہیں اماں......!''

عبدالحق نے فرمائش کر کے ارجمند سے قیمہ بھرے پراٹھے بنوائے تھے۔

رشیدہ اور آبیہ نے چادر بچھائی۔ کھانا لگایا گیا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔

''ایک کمی رہ گئی پتر......!'' کھانے کے بعد حمیدہ نے کہا۔

''چائے کو دل چاہ رہا ہے۔ تو چائے بنوا کر نہیں لایا......؟''

''تھرمس میں چائے کا مزہ نہیں رہتا اماں......! آپ کو ابھی تازہ چائے پلواؤں گا۔''

''یہاں کہاں......؟''

''یہ آبادی ہے نا اماں......! یہاں ہوٹل بھی ہیں۔''

وہ بستی کی طرف چل دیئے۔

''وہ کیا ہے پتر......؟'' حمیدہ نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے اچانک پوچھا۔

''کسی بزرگ کا مزار ہے اماں......!''

حمیدہ رک گئی۔

''تو پہلے یہاں آنا تھا نا پتر......! سلام کرنے کے لئے......!''

''خیال نہیں رہا اماں......!'' عبدالحق نے معذرت کی۔

''خیال رکھنا چاہئے پتر عبدالحق......!'' حمیدہ کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

''پرانا دستور ہے۔ کسی جگہ جاتے ہیں تو سب سے پہلے وہاں کے بادشاہ کے پاس تعظیم کے لئے جاتے ہیں۔''

''بادشاہ......!'' عبدالحق نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں پتر......! اللہ کے ولی بادشاہ ہی تو ہوتے ہیں۔'' حمیدہ نے کہا۔

''تو سمجھتا ہے کہ بادشاہ تخت و تاج سے ہوتا ہے......؟ وہ بادشاہ تو پتر......! مر جاتے ہیں۔ تو ان کی قبروں کا نشان بھی نہیں ہوتا۔ کوئی انہیں یاد بھی نہیں کرتا۔ اللہ کے ولی وہ ہوتے ہیں، جن پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے۔ دنیا کے خزانے ان کے قدموں میں ہوتے ہیں اور وہ اللہ کی محبت میں گم ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔''

عبدالحق کو چند روز پہلے ہی مولوی مہر علی سے ہونے والی گفتگو یاد آئی۔ پھر

اس سے چند روز پہلے جو حمیدہ سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی، وہ بھی یاد آئی۔ اس نے شرمندگی سے کہا۔

''غلطی ہوگئی اماں......!''

''بندہ جب کسی نئی جگہ جائے تو پہلے وہاں کے بادشاہ کو تلاش کرے۔ اس کے دربار میں جا کر تعظیم دے، سلام کرے......!''

''آئندہ خیال رکھوں گا اماں......!''

وہ مزار میں گئے۔ فاتحہ پڑھی۔ باہر آ کے انہوں نے چائے پی۔ پھر ساحل کی طرف لوٹے۔ پیٹ بھرے ہوئے تھے۔ لہٰذا پانی کی طرف کوئی نہیں گیا۔ وہ ساحل پر ہی چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔

سمندر کچھ زیادہ الف ہوگیا تھا۔ موجوں کا شور پہلے کے مقابلے میں زیادہ بلند تھا۔ وہ خاصی دور بیٹھے تھے۔ مگر پانی کی چھینٹیں ان تک آ رہی تھیں۔

''سنا ہے دریا میں باڑھ آئی ہے پتر......! میں نے راوی کو دیکھا ہے۔ ویسے تو پانی اتنا نہیں ہوتا۔ پر کہتے ہیں کہ باڑھ آئے تو پانی قریب کی بستیوں میں گھس جاتا ہے......؟'' حمیدہ نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''ہاں اماں......!''

''پر دریا تو بہت چھوٹا ہوتا ہے پتر......! سمندر میں تو جدھر دیکھو، پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ کتنا گہرا ہوگا پتر......؟''

''اتنا گہرا اماں......! کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''اور پتر......! سمندر میں باڑھ آ جائے تو کیا ہوگا......؟''

''اسے باڑھ نہیں، طوفان کہتے ہیں اماں......! اور سمندر چڑھ دوڑے تو شہر کے شہر تباہ ہو جائیں۔''

حمیدہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''یہ شہر کراچی بھی......؟''

''اللہ پناہ میں رکھے اماں......! یہاں طوفان آیا...... خدانخواستہ تو بہت آگے تک جائے گا۔''

''میں نے پڑھا ہے اماں......! کراچی سطح سمندر سے 22 فٹ نیچے ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

حمیدہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کا کیا مطلب ہے نکی......؟''

''یہ کہ کراچی شہر سمندر سے 22 فٹ نیچے ہے۔ سمندر صرف آگے بڑھ آئے تو یہاں کچھ نہیں بچے گا۔''

''22 فٹ کتنا ہوا ہے نکی......؟''

ارجمند نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔

''میرے اوپر میرے جتنی تین ارجمند اور کھڑی ہو جائیں تو یہ 22 فٹ ہوگا۔''

حمیدہ بری طرح خوف زدہ ہوگئی۔

عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

''پورا شہر تو 22 فٹ نیچے نہیں ہے۔ جو سب سے نشیبی علاقے ہیں، صرف وہ 22 فٹ نیچے ہیں۔ ورنہ باقی شہر تو صرف چار پانچ فٹ نیچے ہے۔'' ساتھ ہی اس نے تنبیہی نظروں سے ارجمند کو دیکھا۔

''آغا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں......!'' ارجمند نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''دریا تو آگے بڑھتے ہیں نکی......! یہ سمندر بھی آگے بڑھتا ہوگا......؟''

''نہیں اماں......!''

''کیوں......؟''

''اللہ کی رحمت ہے دادی اماں......! دراصل یہ سب اللہ کے لشکر ہیں۔''

''اللہ کے لشکر......؟''

''جی دادی......! ہم لوگ سمجھتے ہی نہیں یہ بات...... اللہ نے قرآن میں سمجھایا ہے۔''

''مجھے بھی سمجھا نکی......!''

ارجمند کچھ کہنے ہی والی تھی کہ عبدالحق نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب ہمیں چلنا چاہئے۔اسٹیمر آنے ہی والا ہوگا۔''

اور وہ وہاں پر پہنچے ہی تھے کہ اسٹیمر آ گیا۔

❁❁❁

عبدالحق کا معمول بن گیا تھا کہ عشاء کے بعد وہ حمیدہ کے کمرے میں آتا۔ چند لمحے وہاں بیٹھنے کے بعد وہ حمیدہ کے پاؤں دباتا۔اس دوران جو مکالمے ہوتے، وہ بھی روز کا معمول بن گئے تھے۔

حمیدہ اپنے پاؤں کھینچ لیتی۔

''کیا ہوا اماں......؟'' عبدالحق پوچھتا۔

''تو رہنے دے پتر......! پاؤں میں نکی سے دبواؤں گی۔'' حمیدہ جواب دیتی۔

''کیوں اماں......؟ میں اچھے نہیں دباتا......؟ دل سے نہیں دباتا......؟''

''یہ بات نہیں پتر......! پر نکی کی بات ہی اور ہے۔سارے جسم کا درد کھینچ لیتی ہے اپنے ہاتھوں سے۔''

یہ بات تو عبدالحق خود بھی جانتا تھا۔اب تو اسے اس راحت کی عادت سی ہوگئی تھی۔کچھ جادو تھا ارجمند کے ہاتھوں میں۔

''پھر بھی اماں......! تھوڑی دیر دبانے دو......! میری آخرت کی خاطر......!''

اور حمیدہ پاؤں اس کی طرف بڑھا دیتی۔

اس رات بھی یہی ہوا۔

ارجمند نے نورالحق کو سلانے کے بعد نماز پڑھی۔پھر وہ حمیدہ کے کمرے میں چلی آئی۔جہاں عبدالحق حمیدہ کے پاؤں دبا رہا تھا۔اسے دیکھ کر عبدالحق نے اپنی کرسی تھوڑی سی سرکائی۔وہ حمیدہ کے بستر پر پائینتی کی سمت بیٹھ گئی اور پاؤں دبانے لگی۔

چند لمحے خاموش رہی پھر حمیدہ نے کہا۔

'تو مجھے اللہ کے لشکروں کے بارے میں بتا رہی تھی نکی......!''

''جی دادی اماں......!'' ارجمند نے کہا۔اس کے ہاتھ اپنے کام میں اسی طرح مصروف تھے۔

''آسمان اور زمین کے تمام لشکر صرف اور صرف اللہ کے ہیں۔''

''پر نکی......! میری پتری......! لشکر تو فوج کو کہتے ہیں نا......؟''

''جی دادی اماں......!''

''تو زمین اور آسمان میں اللہ کی فوجیں ہیں......؟''

''جی دادی اماں......!''

''پر پتری......! اللہ کو فوج کی کیا ضرورت......؟''

''ضرورت کا لفظ تو اللہ کے لئے ہے ہی نہیں دادی اماں......!'' ارجمند نے جلدی سے کہا۔

''اس نے ہمیں صاف بتا دیا ہے کہ وہ ہر چیز سے بے پردہ اور بے نیاز ہے۔وہ غنی ہے، وہ صمد ہے۔لیکن اماں......! ذرا سوچیں تو...... دنیا میں بادشاہ ہوتے ہیں نا......تو ان کے پاس فوج بھی ہوتی ہے۔کوئی ملک ان کے ملک پر حملہ کرے تو وہ فوج جنگ لڑے، اس سرزمین کا دفاع کرے اور ان کے پاس پولیس بھی ہوتی ہے تاکہ ملک میں امن وامان قائم رہے۔لوگ قانون کی خلاف ورزی کریں، دوسروں کا حق ماریں تو انہیں گرفتار کریں۔اور قاضی بھی ہوتے ہیں کہ مقدمات سنیں، اور قانون کے مطابق فیصلہ سنائیں۔اور نہ جانے کتنے کس کس طرح کے اہل کار ہوتے ہیں۔جن کے ذمے بے شمار فرائض ہوتے ہیں۔مقصد یہ ہوتا ہے کہ مملکت میں زندگی معمول کے مطابق بغیر کسی رخنے کے چلتے رہیں۔نظام ایسے ہی تو نہیں چلتا۔وہ ذمہ دار لوگوں کی نگرانی میں ہی چلتا ہے۔نہیں تو جنگل کا قانون چلنے لگے۔ ہر طاقت ور کمزور کو دبا لے۔تو فوج کے بغیر تو بادشاہت نہیں۔اب سوچو اماں کہ اللہ تو بادشاہوں کا بادشاہ، مالک الملک ہے۔پوری کائنات اس کی مملکت ہے۔اس زمین جیسی نہ جانے کتنی زمینیں ہیں کائنات میں، اور وہ ان سب کا مالک اور بادشاہ ہے۔تو اس کے لشکر کتنے اور کیسے ہوں گے......؟ اس نے خود ہمیں بتایا قرآن میں کہ زمین اور آسمان کے تمام لشکر اس کے ہیں۔''

عبدالحق بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''......لِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ......'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''پر نکی......! بات تو وہی ہے۔ اللہ کو لشکروں کی کیا ضرورت......؟ اس سے کون لڑنے کی ہمت کرے گا......؟''

''دنیا میں تو روزِ ازل سے ایک جنگ لڑی جا رہی ہے دادی اماں......! نسل در نسل...... قیامت تک یہ جنگ جاری رہے گی۔ نیکی اور بدی کی، خیر و شر کی، حق و باطل کی، انسان اور شیطان کی جنگ......!''

''یہ تو میری سمجھ میں آتا ہے۔ پر جو حق کے لئے لڑے گا اس کے لئے جنت اور جو شیطان کا چیلا ہوگا اس کے لئے جہنم۔''

''ایک بات بتائیں اماں......! یہاں گھر میں کوئی گھس آئے اور مجھ پر ہاتھ اٹھائے......''

''تو میں اس کا ہاتھ توڑ دوں گی۔'' حمیدہ نے تڑپ کر کہا۔

''اور اگر وہ طاقت ور مرد ہو تو......؟''

''تو میں عبدالحق کو آواز دوں گی۔''

''اور اگر یہ گھر میں موجود نہ ہوں تو......؟''

حمیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''اس سے لڑوں گی۔ جان دے دوں گی۔ جیتے جی تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔''

''ماں جیسی محبت کرتی ہیں نا مجھ سے...... اس لئے...... اور دادی اماں......! اللہ اپنے بندوں سے ماں سے 70 گنا سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ اب ایک اور مثال لیں۔ دو ملکوں کے درمیان دوستی ہے۔ ان میں سے ایک پر ایک تیسرا ملک چڑھائی کرتا ہے تو دوسرا ملک اپنے دوست ملک کی ہر ممکن مدد کرے گا نا......؟''

''ضرور کرے گا...... کرنی چاہئے......!''

عبدالحق اب بہت دلچسپی سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔

''اللہ نے قرآن میں بتایا کہ دنیا میں ہر طرح کے انسان ہیں۔ لیکن بنیادی

طور پر دو ہی گروہ ہیں۔ ایک اللہ کے دوست اور دوسرے شیطان کے دوست...... حزب اللہ اور حزب الشیاطین۔ اللہ کے ماننے، اس کی اطاعت کرنے اور اس سے محبت کرنے والے اور دوسری طرف شیطان کے ماننے، اس کی اطاعت کرنے اور اس سے محبت کرنے والے۔''

''ہاں......! یہ تو ہے اور ان کی لڑائی ہے آپس میں۔''

''تمام شیاطین اپنے گروہ کی مدد کرتے ہیں دادی اماں......! تو کیا اللہ اپنے گروہ کو بے آسرا چھوڑ دے گا......؟ کیا وہ ان کی مدد نہیں کرے گا......؟''

حمیدہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھوا اور رخساروں پر طمانچے لگائے۔

''اللہ میری توبہ......! کیوں نہیں کرے گا......؟ یہ تو میں سمجھ گئی۔ اب تو مجھے اللہ کے لشکر کے بارے میں بتا۔ تو نے کہا تھا کہ سمندر بھی اللہ کے لشکر میں سے ہے۔''

''جی دادی اماں......!''

''یہ تجھے کیسے پتا چلا......؟''

ارجمند کو احساس ہونے لگا کہ عبدالحق کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ وہ اس کی طرف مڑی۔

''آپ میری مدد کریں نا آغا جی......!'' اس نے لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو بس یوں ہی کہہ دیا تھا۔''

''یوں ہی تو نہیں کہا ہوگا۔'' عبدالحق کا انداز لطف لینے والا تھا۔

''کوئی حوالہ تو ہوگا تمہارے پاس......؟''

''بس...... یہ خیال تھا کہ قرآن پاک میں کہیں پڑھا ہے۔ کہاں......؟ یہ یاد نہیں آ رہا ہے۔''

''وہ بنی اسرائیل کا ذکر ہے نا...... کہ جب وہ کسی طرح بھی نہیں مانے تو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ راتوں رات انہیں لے کر نکل جاؤ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے۔ فرعون کو پتا چلا تو وہ فوج تیار کرا کے ان

کے پیچھے روانہ ہوا۔ پھر صورتِ حال یہ ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے قوم کے سامنے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر......''

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔'' حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اللہ کا عطا کیا ہوا معجزے والا عصا تھا۔ اللہ نے فرمایا کہ اسے پانی پر مارو۔ موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل کی تو سمندر کے درمیان راستہ بن گیا۔ وہ اپنی قوم کو لے کر اس راستے پر چل دیئے اور پیچھے آنے والا لشکر بھی اس راستے پر چلا تو اللہ کے حکم پر رکا ہوا سمندر چل پڑا اور فرعون اپنے پورے لشکر کے ساتھ غرق ہو گیا۔''

''جی اماں......! یوں اللہ نے اپنے ماننے والوں کو کافروں کے کثیر لشکر سے بچالیا۔ بچالیا یعنی فتح عطا فرمادی۔''

حمیدہ اب عبدالحق کی طرف متوجہ تھی۔

''پر پتر......! کیسے ہوا ہوگا یہ سب......؟'' اس کے لہجے میں خوف بھی تھا اور حیرت بھی۔

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا سمندر پر مارا تو دو باتیں رونما ہوئیں۔ ایک تو سمندر اس مقام سے پھٹا اور اس کے درمیان راستہ بن گیا اور دوسری طرف وہ ساکت ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اسے پار کر گئے۔ اور جب فرعون اور اس کا لشکر اس حد میں پوری طرح داخل ہو گئے تو اللہ کے حکم سے سمندر پہلے کی طرح رواں ہو گیا۔ اور وہ سب غرق ہو گئے۔''

''انہیں ڈر بھی نہیں لگا۔ یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ تو رکا ہوا سمندر ہے، جو بھی بھی جاری ہو سکتا ہے۔''

''ڈرتا وہ ہے اماں......! جس کے دل میں معمولی سا بھی ایمان ہو۔ ان لوگوں کے درمیان تو اللہ نے ایک جلیل القدر پیغمبر کو معجزے دے کر بھیجا۔ انہوں نے جھٹلا دیا۔ انہیں ڈرانے کے لئے ان پر طرح طرح کے عذاب بھیجے۔ جب وہ کوئی عذاب دیکھتے تو اپنے پیغمبر سے کہتے کہ اپنے ربّ سے یہ عذاب ہٹانے کو کہو۔ پھر ہم ایمان لے آئیں گے۔ اور عذاب ہٹتے ہی وہ مذاق اڑانے لگتے۔ وہ عذاب کو کچھ سمجھتے

ہی نہ تھے۔ دوسرے اماں......! وہ مغرور بہت تھے۔ بنی اسرائیل کو بہت حقیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان کو اللہ کے بتائے ہوئے اس راستے سے گزرتے دیکھا تو وہ یہ کیسے سوچتے کہ وہ وہاں سے نہیں گزر سکیں گے۔''

حمیدہ کی آنکھیں اب مندنے لگی تھیں۔ اس نے تندسی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے پتر......! میں سمجھ گئی۔''

اور چند ہی لمحے بعد وہ سو چکی تھی۔

❁❁❁

عبدالحق حق نگر سے دل میں ایک ہی خیال لے کر آیا تھا...... یہ کہ اسے اللہ سے محبت کرنی ہے۔ اس کا دل اس ایک نقطے پر مرتکز ہو گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مولوی مہر علی کی باتیں اس پر پوری طرح اثر انداز نہیں ہو سکی تھیں۔

وہ سوچتا کہ یہی تو اس کے سفر کا نکتہ آغاز تھا۔ سب سے پہلے اس نے اللہ سے محبت ہی کی تو آرزو کی تھی۔ مگر پھر اسے نور بانو کی آواز سے محبت ہو گئی تھی۔ اس محبت نے اسے بہت کچھ دیا تھا۔

''نہیں......!'' اس کے اندر کسی نے اسے ٹوکا۔ اللہ نے اسے اس محبت کے ذریعے بہت کچھ عطا فرمایا تھا۔ اس نے عربی سیکھی، قرآن تک پہنچا اور بالآخر اسے ایمان عطا کیا گیا۔ نور بانو کی محبت ایک راستہ تھا۔

''ہاں......! یہ درست ہے۔'' اس نے دل میں تسلیم کیا۔ میں نے اللہ کی عطا کو نور بانو کی ذات سے منسوب کر کے ناشکرے پن کا ارتکاب کیا اور اللہ کا شکر ادا نہ کرنے سے اللہ کی عطا رک جاتی ہے۔

پھر نور بانو اسے مل گئی۔ وہ اس کے اللہ کی محبت کے سفر کے راستے پر پہلا پڑاؤ تھا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ پڑاؤ بھی آزمائش ہوتا ہے۔ پڑاؤ بھی اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندہ وہاں گھڑی دو گھڑی قیام کر کے سفر کی تھکان اتارے۔ اور پھر دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنا سفر شروع کر دے۔

اس نے بڑی غلطی کی۔ پڑاؤ کو منزل جان کر بے فکری سے مقیم ہو گیا۔ لمبے راستے کے مسافروں کو یہ زیب نہیں دیتا۔ ان کی نظر ہمیشہ منزل پر رہتی ہے۔ وہ راستے

کی دل پر فریبیوں کی طرف کبھی نگاہ نہیں کرتے۔ ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔

وہ سوچتا تو شرمندگی سے بے حال ہو جاتا۔ کیسی غفلت میں مبتلا ہو گیا تھا وہ۔ نفس کا غلام بن گیا۔ اعتدال کی راہ چھوڑ بیٹھا۔ منزل سے نظر ہٹالی تو پڑاؤ ہی منزل لگنے لگا۔ پہلے ہی مرحلے میں نماز سے محروم ہو گیا۔ اور جب اللہ کی رحمت سے وہ بحال ہوئی تو وہ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسی کو اللہ کی محبت سمجھ لیا۔

مولوی صاحب کی بات سچی تھی۔ فرض ادا کرنا عبادت ہے۔ اور دل نہ چاہتے ہوئے بھی، احسن طریقے سے، دل اور روح اور وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اللہ کو خوش کرنے کی نیت سے فرض ادا کرنا محبت ہے۔

اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اس کی شرمندگی اور بڑھ گئی۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ اس نے کبھی کوئی فرض اللہ کو خوش کرنے کی نیت سے ادا کیا ہو وہ تو خود کو، نور بانو کو اور اللہ کے بندوں کو خوش کرنے کے لئے فرض ادا کرتا رہا تھا۔

تو کیا اللہ اس کی زندگی کے سسٹم میں شامل نہیں رہا تھا.....؟

''استغفر اللہ.....!''

زبان سے ''الحمد للہ'' کہنا بہت اچھی بات ہے۔ عبادت ہے۔ لیکن زبان سے کہتے ہوئے دل میں، ذہن میں، روح میں بھی ''الحمد للہ'' ہو تو بات بنتی ہے۔ تب آدمی محبت کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔

''الحمد للہ'' آتا کہاں سے ہے.....؟

اللہ رحمت فرماتا ہے۔ بندے کی سوچ میں اپنی طرف سے شکر گزاری شامل فرماتا ہے۔ نعمتوں اور عنایات کا شعور اور ادراک عطا فرماتا ہے۔ تب بندے کی سوچ میں ''الحمد للہ'' ابھرتا ہے۔

پھر سوچ مستقیم رہے اخلاص کے ساتھ تو اللہ اپنا کرم بڑھاتا ہے۔ ''الحمد للہ'' زبان پر آجاتا ہے۔ زبان ''الحمد للہ'' کہنے لگتی ہے۔ لیکن اس دوسرے مرحلے میں بھی آزمائش ہے۔ اس میں سوچ کی استقامت اور اس کے ارتکاز کے تسلسل کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر اس کے ساتھ زبان وِرد کرتی رہے تو یہ قدرِ اخلاص، ذکر دل، دماغ اور روح میں جگہ بناتا رہتا ہے۔ لیکن زبان وظیفہ کرتی رہے اور سوچ دنیا کی جانب متوجہ

ہونے کی وجہ سے منتشر ہو جائے تو دل، دماغ اور روح سے زبان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ پھر وہ خالی خولی باتوں کی طرح ہوتا ہے، جیسے لوگ بے سوچے سمجھے محض بولنے کے لئے بولتے رہتے ہیں۔

ارے.....! یہی تو اس کے ساتھ ہوا۔ وہ محض زبان سے ''اللہ اللہ'' کرتا رہا۔ لیکن دنیا میں گم ہو گیا۔ اللہ کی رحمت تو اس کے ساتھ تھی۔ لیکن اس نے دنیا میں الجھ کر خود کو استفادے سے محروم کر لیا تھا۔

''الحمد للہ.....!'' اس نے دل کی گہرائی سے کہا۔

اللہ اپنے بندوں کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ وہ خود اس سے دُور ہو جاتے ہیں۔

''تو اب کیا کرنا ہے.....؟''

سمت درست کرنی ہے۔ نفس کی طرف سے چوکنا رہنا ہے اور اسے زیر کرنا ہے۔ نفس کے زیر اثر وہ سمت بھول کر غلط راستے پر چلا گیا اور بڑھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ وہ منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حالانکہ وہ منزل سے دور ہو رہا تھا۔ کتنی بھیانک خوش فہمی تھی وہ۔ ایسے میں اسے موت آجاتی، اور آخری لمحوں میں آنکھوں سے پردہ ہٹایا جاتا تو اسے پتا چلتا کہ وہ تو بہت بڑے خسارے میں ہے، اور تب وہ کچھ بھی نہیں کر پاتا۔

''الحمد للہ.....!''

مہربان ربّ نے اسے چونکا دیا۔ اصلاح کا موقع عطا فرما دیا۔

پچھلا سفر رائیگاں.....! اور اب پھر سے سفر شروع کرنا ہے۔ سوچ موجود ہے۔ اسے مستحکم اور مرتکز کرنا ہے۔ پھر اسے زبان سے دہراتے رہنا ہے۔ اس کے بعد عمل کا مرحلہ.....

کتنا وقت ضائع ہو گیا۔ اس نے تاسف سے سوچا۔

اسے سورۂ عصر یاد آئی۔ اللہ نے وقت کی قسم کھا کر فرمایا کہ بے شک انسان بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور لوگوں کو حق کی تلقین اور صبر کی نصیحت کرتے رہے۔

اللہ نے اسے ایمان عطا فرمایا۔ پھر نیک اعمال بھی عطا فرمائے۔ لیکن وہ تیسرا مرحلہ طے نہ کر سکا۔ اس نے تو اپنی بیوی کو بھی سمجھانے کی کوشش نہیں کی، جو اس

کی ذمہ داری تھی۔

وقت..... زمانہ کتنا اہم ہے کہ اللہ نے اس کی قسم کھائی..... اور اللہ نے جس چیز کی بھی قسم کھائی..... وہ انسان کے لئے بہت محترم ہوگئی۔ اب وقت ہی کو لو۔ وہ پیمانہ ہے ہماری مہلت کا، جو اس دنیا میں اللہ نے ہمیں عطا فرمائی۔ اور اس کی اہمیت اور بڑھ گئی کہ اللہ نے کسی کو نہیں بتایا کہ اس کی زندگی کب ختم ہونی ہے..... ؟ کسی کو نہیں معلوم کہ زندگی کا جو لمحہ وہ اس وقت گزار رہا ہے، اس کے بعد اس کے لئے زندگی ہے یا نہیں..... تو ہونا تو یہ چاہئے کہ وہ لمحہ موجود کو لمحہ آخر سمجھے۔ لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس اگر وافر کوئی چیز ہے تو وہ وقت ہی ہے۔ وہ بے فکری سے جیتا ہے۔ فکر کرتا ہے تو صرف فانی دنیا کی۔ ابدی زندگی کی فکر نہیں کرتا۔ اور فانی دنیا کی فکر میں کرتا کیا ہے..... ؟ کسی کا مال غصب کر لیا..... کسی کی بہن، بیٹی، بہو پر بری نظر رکھی..... کسی کی زمین ہتھیالی..... یعنی صرف برے اعمال..... نفس کی راہ پر چلتا رہتا ہے وہ۔

تو عبدالحق نے سوچا کہ اب وہ نئے سرے سے سفر شروع کرے گا۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے سفر کی تمام کوتاہیوں اور گناہوں پر اللہ سے توبہ کرے اور آئندہ سفر کے لئے ہدایت، توفیق اور آسانیوں کی دعا کرے۔ بس اب اسے یہی دو کام کرنے ہیں۔

اس موقع پر اسے سورۂ حم سجدہ کے آخری رکوع کی تین آیات یاد آئیں۔ مفہوم ان کا یہ تھا کہ

''نہیں تھکتا انسان بھلائی کی دعا مانگتے ہوئے۔ اور ذرا سی تکلیف اسے چھو جائے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ اور جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تکلیف اور پریشانی کے بعد تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کا حق تھا۔ اور وہ کہتا ہے کہ نہیں سمجھتا میں کہ آئے گی قیامت، اور اگر آئی تو میں اپنے رب کے ہاں اس سے بڑھ کر صلہ پاؤں گا۔''

جواب میں اللہ فرماتا ہے کہ

''کفر کرنے والوں کو ہم قیامت کے دن ان کے اعمال کے بارے میں بتائیں گے، اور انہیں چکھائیں گے مزہ شدید عذاب کا۔''

آگے اللہ فرماتا ہے۔

''جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور اکڑ جاتا ہے۔ اور جب کوئی پریشانی آجائے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔''

اور سورۂ شوریٰ میں اللہ فرماتا ہے۔

''اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اترا جاتا ہے۔ اور جب اسے کوئی مصیبت پہنچتی ہے اپنے ہی اعمال کی وجہ سے تو وہ ناشکرا بن جاتا ہے۔''

اللہ نے انسان کو خبردار کرنے کے لئے اس کی فطرت کے بارے میں قرآن میں بہت کچھ بتایا ہے۔

انسان جلد باز، بے صبرا اور ناشکرا ہے۔ نعمتوں پر پھیل جانے والا اور پریشانی اور تکلیف میں الزام تراشیاں کرنے والا۔

''اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ''

''کیا وہی نہ جانے، جس نے پیدا کیا ہو؟''

عبدالحق نے خود کو ان آیات کی کسوٹی پر پرکھا۔ اللہ نے اسے دنیا اور دین کی اتنی نعمتیں عطا فرمائیں کہ نہ ان کا شمار ممکن اور نہ ہی وہ انہیں سمجھ سکتا ہے۔ وہ اترایا تو نہیں۔ اس نے اپنی خوبیوں کو ان کی علت تو قرار نہیں دیا۔ حالانکہ یہ انسان کی فطرت ہے۔

''الحمد للہ.....!'' اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اور ایک بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ انسان اپنی فطرت سے ہٹ کر بھولا ہو تو اٹل بات یہ ہے کہ یہ اس پر اللہ کا کرم ہے۔ اور اس کرم پر اللہ کا شکر لازم ہے۔ اور وہ ناشکرا ہونے کے باوجود اللہ کا شکر ادا کرے تو یہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔ گویا ایک اور

شکر لازم۔ تو شکر تو ہر نفس پر ضروری ہے۔

اور اس نے ہمیشہ اللہ سے بہت دعائیں کیں۔ جب وہ جانتا نہیں تھا، صرف مانتا تھا، تب بھی اس سے باتیں کرتا، دُعائیں مانگتا تھا۔ اور اللہ دُعاؤں سے خوش ہونے والا اور دُعائیں قبول کرنے والا ہے۔ اس نے اس پر رحمت فرمائی اور اسے ایمان سے نوازا۔ دونوں جہانوں کی نعمتوں میں یہ ایمان اعلیٰ نعمتوں میں سے ہے۔

کیا اس نے اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا......؟

وہ محاسبے کی...... خود احتسابی کی گھڑی تھی، اور وہ اپنا محاسبہ کر رہا تھا۔

''الحمدللہ......!'' وہ ہمیشہ شکر گزار رہا۔

اندر سے اسے ٹوکتی ہوئی ایک آواز ابھری۔ ایسے نہیں کہتے۔ اور وثوق سے تو کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ تم جو کچھ کہو گے، اپنے شعور، اپنے علم کی بنیاد پر کہو گے۔ اور تمہارے علم اور شعور کی اوقات ہی کیا ہے......؟ پھر یہ سوچو کہ کس سے کہہ رہے ہو......؟ اس سے، جس سے کچھ پوشیدہ نہیں...... نہ ساتوں آسمانوں میں، نہ ساتوں زمینوں میں، نہ ان کے درمیان اور نہ سینوں میں۔

''بے شک......!'' اس نے کہا۔

''میں اپنی آگہی کے مطابق ہی کہہ رہا ہوں۔''

''تو مت کہو......! اس لئے کہ عین ممکن ہے، تم غلط کہہ رہے ہو...... اور جس سے کہہ رہے ہو...... وہ سب کچھ جانتا ہے۔''

عبدالحق کا ذہن الجھ گیا۔

''تو میں ''الحمدللہ'' نہ کہوں......؟''

''کیوں نہیں......؟ ضرور کہو......!'' اندر کی آواز نے کہا۔

''لیکن اپنی طرف خفیف ترین جھکاؤ کے ساتھ بھی نہ کہو......! یہ کہنا تو اکڑ ہے کہ تم ہمیشہ شکر گزار رہے۔ تمہارا رخ پوری طرح اللہ کی طرف ہونا چاہئے۔ یوں کہو کہ اللہ نے تمہیں شکر گزاری بخشی۔''

''بے شک......! اللہ نے ہی مجھے شکر گزاری بخشی۔'' عبدالحق عاجزی سے بڑبڑایا۔

''اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ...... پر غور کرتے رہو۔''

اب عبدالحق میں یہ کہنے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ غور کرتا ہے۔ رخ پھر اپنی طرف ہو جاتا اور ابھی اسے اس پر ٹوکا گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''غور کرنے سے سمجھ میں کہاں آتا ہے......؟''

''غور کرنا تمہارا کام ہے اور رہنمائی کرنا، سمجھانا اللہ کی رحمت۔ اور وہ جتنا چاہے، نواز دے۔ وہ تو اب بھی تمہیں اس آیت مبارکہ کے حوالے سے نواز رہا ہے۔''

عبدالحق خاموش رہا۔

''نہیں سمجھے نا......؟''

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا...... یہ بتاؤ...... میں کیا ہوں......؟''

''ایک آواز......!''

''اور یہ آواز کہاں سے آئی......؟''

''میرے اندر سے......!''

''تمہیں پتا تھا کہ میں تمہارے اندر ہوں......؟''

عبدالحق نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے وجود میں کتنے نہاں خانے، کتنے تہہ خانے ہیں......؟''

''نہیں......! مجھے نہیں معلوم......!'' عبدالحق نے ایک طویل لمحے کی شدید حیرانی کے بعد جواب دیا۔

''یہی نہیں معلوم تو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس تہہ خانے میں کیا ہے......؟ کس میں برائی ہے......؟ کس میں بھلائی ہے......؟ برائی بھلائی کا بھیس بدل کر نکلے گی تو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ بھلائی نہیں برائی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ اندر کی آواز نے کہا کہ تم بہت اچھے ہو......؟ کسی نیک عمل پر تمہیں داد دی......؟ تمہیں سراہا......؟''

''ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔''

''وہ بھلائی کے بھیس میں برائی ہوتی ہے۔ وہ تمہیں اپنی اچھائی کے گمان

میں مبتلا کرتی ہے۔ جو آگے جا کر غرور بن سکتا ہے۔ وہ تمہیں اللہ سے دور کر رہی ہوتی ہے۔ تمہیں یہ بات بھلا دیتی ہے کہ ہر تعریف اللہ کے لئے ہے۔''

عبدالحق تھرا کر رہ گیا۔

''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''آدمی کو صرف باہر سے نہیں، اپنے اندر کی طرف سے بھی چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ آدمی کے اندر سے کتنی آوازیں ابھرتی ہیں۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ کون دوست ہے اور کون دشمن......؟''

''تمہارا تو مجھے معلوم ہے کہ تم دوست آواز ہو......!''

''کیسے معلوم ہے تمہیں......؟''

''جو برائی پر ٹوکے...... وہ دوست ہی ہوتا ہے......!''

''اور ابھی میں تم سے کہوں کہ واہ......! تم بڑے چوکنے آدمی ہو...... بہت نیک ہو......!''

''میں سمجھ گیا...... اندر سے ابھرنے والی آواز تعریف کرے تو اس کی طرف سے خبردار رہنا چاہئے۔''

''درست......! زندگی کو آسان کبھی نہ سمجھنا۔ زندگی گزارنا سرکس کے خیمے میں سوفٹ اوپر تنی ہوئی رسی پر چلنے کے مترادف ہے، جس کے نیچے بچانے والا کوئی جال نہیں ہے۔ ہوا کا ایک نرم جھونکا بھی توازن خراب کرسکتا ہے۔ اسی لئے اللہ کے ولی ہر پل نفس کے خوفزدہ رہتے ہیں۔''

عبدالحق جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''ایک اللہ ہے، جو تمہارے وجود میں چھپے تمام تہہ خانوں سے واقف ہے، جو تمہارے اندر رہنمائی کرنے والی آواز کو ابھارتا ہے، جو تمہیں اندر سے ابھرنے والی غلط ترغیبات سے بچاتا ہے۔ وہی تو سب کچھ جانتا ہے۔''

''اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ''

''کیا وہی نہ جانے، جس نے پیدا کیا ہے؟''

''الحمدللہ......!'' عبدالحق نے دل کی گہرائی سے کہا۔

''کیسے اس نے مجھے سمجھایا......؟ میری رہنمائی فرمائی......!''

غور کرتے رہو۔ اللہ اپنے ہر بندے کو سمجھاتا رہتا ہے۔ جو غور ہی نہ کرے، وہ سمجھ نہیں پاتا۔

عبدالحق چند لمحے انتظار کرتا رہا۔ لیکن آواز معدوم ہوگئی تھی۔

''میں کہاں تھا......؟'' اس نے خود کلامی کی۔

''ہاں......! اللہ نے مجھے ایمان سے نوازا......! اور الحمدللہ......! اس پر مجھے اکڑ کے بجائے شکرگزاری عطا فرمائی۔''

''لیکن تم اس کا سبب نور بانو کو قرار دیتے رہے۔'' اندر کی آواز پھر ابھری۔

''وہ وسیلہ تو تھی نا...... اور اللہ کا حکم ہے کہ اللہ نے جسے وسیلہ بنایا ہو، اس کا احسان مانا جائے۔''

''ہاں......! مگر اسے اللہ کا کرم، اس کی رحمت تسلیم کرتے ہوئے۔ تم نے اس احسان کے نام پر نور بانو کو کیا سے کیا بنا دیا......؟ اسے بھی نقصان پہنچایا اور اپنی جان پر بھی ظلم کیا۔ تم نے اللہ کی شکرگزاری کو آلودہ کر دیا۔''

''میں اس پر اللہ سے رجوع کرتا ہوں اور دل کی گہرائی سے اس پر توبہ کرتا ہوں۔''

''بے شک......! وہ توبہ قبول کرنے والا اور اپنے بندوں کو پاک کرنے والا ہے۔''

پہلی آیت کی کسوٹی پر عبدالحق نے خود کو پرکھا تو ہل گیا۔ بے شک وہ بھلائی کی دُعائیں کرتا رہا، ذرا نہیں تھکا۔ وہ اللہ سے اپنے لئے اولاد کی دعا کرتا رہا۔ لیکن نور بانو کی موت نے اسے ایسا مایوس کیا کہ وہ اللہ کی عطا کی ہوئی اس بہت بڑی نعمت کو بھول گیا۔ خوش ہونا تو کجا، اس نے اس فضل پر اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کیا۔ وہ ایسے مایوس ہوا جیسے دنیا ہی ختم ہوگئی ہو۔

''مایوسی تو کفر ہوتی ہے۔'' عبدالحق نے گھبرا کر سوچا۔

''وہ مایوسی نہیں...... غم تھا...... جو فطری ہے۔''

''غم میں انسان زندوں کو نہیں بھول جاتا۔'' اندر کی آواز نے ٹوکا۔

اس بار اس نے فوراً ہی سرِ تسلیم خم کر دیا۔

”ٹھیک ہے......! اس پر بھی توبہ کرنی ہے۔“

دوسری آیات کے معاملے میں اللہ نے اسے بچا لیا۔

”الحمد للہ......!“ اس نے اللہ کی نعمتوں اور عنایات کو اپنا حق نہیں سمجھا۔ انہیں اپنے اعمال کا نتیجہ نہیں سمجھا۔ اور وہ آخرت کی طرف سے مطمئن اور بے خوف نہیں ہوا۔

”الحمد للہ......!“

”اب کرنا کیا ہے......؟“

”زندگی کا مقصد کیا ہے......؟“

”اللہ کی محبت کا حصول......!“

”اور طریق کار......؟“

”دنیا سے محبت نہیں کرنی، لیکن دنیا کو چھوڑنا بھی نہیں ہے۔ اپنے تمام فرائض اللہ کو خوش کرنے کی نیت سے بہ حسن و خوبی اور محبت کے ساتھ ادا کرنے ہیں۔ اپنے آرام کے وقت میں یکسوئی کے ساتھ اللہ کی عبادت، اس کا ذکر کرنا ہے۔ شکر ادا کرنا ہے اس کی نعمتوں کا اور استغفار کرنا ہے۔ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں پر۔ لیکن دنیا کے حقوق پوری طرح ادا کرنے ہیں۔ اپنے فرائض پورے کرنے ہیں۔“

”لیکن اب ماسوائے اللہ کے محبت کس سے نہیں کرنی......!“

یہ اس کا حتمی فیصلہ تھا، اور اس پر وہ مطمئن ہو گیا۔

❁❁❁

عارف کو پتا چلا کہ ارجمند بھی عبدالحق کے ساتھ کراچی آئی ہے تو وہ اس سے ملنے کو بے تاب ہو گیا۔ کتنے برسوں سے اس نے ارجمند کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی بہت گہری تھی۔ نادرہ کی یاد اس کے دل سے کبھی نہیں مٹی تھی۔ ارجمند نے اس کی اور نادرہ کی ساتھ بیٹھے ہوئے جو تصویر بنائی تھی، وہ اس نے بہت احتیاط سے، بہت سنبھال کر رکھی تھی۔ جب کبھی وہ اسے دیکھتا تو ارجمند اس کے تصور میں آ کھڑی ہوتی۔ وہ سوچتا، اب ارجمند کتنی بڑی ہو گئی ہو گی۔

پھر اسے پتا چلا کہ ارجمند کی عبدالحق سے شادی ہو گئی ہے۔ اسے بہت خوشی ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ ارجمند ناسمجھی کے عرصے سے ہی عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔ اس کے خیال میں اَن ہونی سرزد ہوئی تھی۔ وہ ارجمند کے لئے دُعا کرتا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ ارجمند کی مراد پوری ہونے والی نہیں۔ لیکن یہ شادی نور بانو نے کرائی۔ یہ اور بڑی اَن ہونی تھی۔

عارف ارجمند کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا تھا۔ شادی کا اسے پتا چلتا تو وہ ہر قیمت پر اس شادی میں شریک ہوتا۔ نہ صرف شریک ہوتا، بلکہ ایک باپ کی طرح اس کے لئے سب کچھ کرتا۔

اس پر اس نے عبدالحق سے بہت گلہ کیا تھا۔ لیکن صورتِ حال سامنے آنے پر اس کی شکایت دور ہو گئی۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ عبدالحق اسے کسی طور بھی اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔ اس بے چارے کو سنبھلنے کا موقع ہی کہاں ملا تھا......؟

وہ عبدالحق کے ہاتھ اس کے لئے کوئی تحفہ بھیجنا چاہتا تھا لیکن اسے پتا چلا کہ عبدالحق اس سے ملنے جاتا ہی نہیں۔ اس پر اس نے عبدالحق کو بہت کچھ سمجھایا بھی تھا کہ وہ نور بانو کی خاطر ارجمند کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔

پھر عبدالحق کا تبادلہ ہو گیا۔ بات ہی آئی گئی ہو گئی۔

اور اب وہ کراچی آ گئی تھی۔

عارف ارجمند سے ملنے اور اسے دیکھنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ عبدالحق نے اسے اپنی آمد کا فون کر کے بتا دیا تھا۔ عارف جانتا تھا کہ ارجمند آتے ہی سب سے پہلے اس سے ملنے کے لئے آئے گی۔ اور یہ وہ نہیں چاہتا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ وہ اس سے ملنے جائے۔ آخر اس کی شادی کے بعد وہ پہلی بار اس سے ملنے والا تھا۔ اور اس ملاقات میں وہ اسے تحفہ بھی دینا چاہتا تھا۔ اپنے گھر پر بیوی کے سامنے یہ ممکن نہیں تھا۔ ایک مستقل مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

اس نے عبدالحق کی کراچی آمد کے دن بہت محبت سے ارجمند کے لئے خریداری کی۔ عبدالحق کی اماں کو بھی وہ نہیں بھولا۔ اور اس نے عبدالحق کو کہہ دیا تھا کہ وہ انہیں لینے کے لئے ایئر پورٹ آئے گا۔ حالانکہ عبدالحق کی گاڑی موجود تھی اور اس

کے چند ملازم، جن میں ڈرائیور بھی تھا، دو دن پہلے ہی کراچی پہنچ چکے تھے۔ انہیں بھی وہ خود ہی ریلوے اسٹیشن سے ان کے گھر لایا تھا۔ دو دن میں انہوں نے گھر کی صفائی ستھرائی کا کام مکمل کرلیا تھا۔

ائیرپورٹ پر ارجمند کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کے تصور میں تو وہ اب بھی بچی ہی تھی۔ جوان ہونے کے بعد وہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین ہوگئی تھی۔

اسے نادرہ یاد آئی اور ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

ارجمند اسے دیکھ کر کھل اٹھی اور پھوپھا جان کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ لاہور کے اسپتال میں۔ اس روز جب ارجمند کی پھوپھی کا انتقال ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نادرہ کی اس سے شادی ہونے والی ہے۔ اس لئے اسے ارجمند کا اسے پھوپھا جان کہنا حیرت انگیز نہیں لگا۔ اور اسے یاد تھا کہ مرنے سے پہلے نادرہ نے اسے ذمہ داری نبھانے کی تلقین کی تھی۔ اور وہ ذمہ داری ارجمند ہی تھی۔

ارجمند پیچھے ہٹی اور اس نے عارف کو بہت غور سے دیکھا۔

''ارے پھوپھا جان......! کیا......؟'' اس نے بے ساختہ کہا۔

ضبط کے باوجود عارف کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ رومال نکال کر انہیں پونچھنے لگا۔

''کچھ نہیں گڑیا......! خوشی کے آنسو ہیں۔''

مگر ارجمند کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔ البتہ آنسو بہنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسے ہر وقت یاد رہتا تھا کہ اس نے عبدالحق سے ایک وعدہ کیا ہے، اور اسے اس کا پاس رکھنا ہے۔ لیکن اس وقت عارف سے مل کر اسے نادرہ اتنی شدت سے یاد آئی تھی کہ ضبط کے باوجود آنکھوں کو نم ہونے سے وہ اسے نہیں روک سکی۔

''میں اداسی اور دکھ کے آنسوؤں کو پہچانتی ہوں پھوپھا جان......!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

عارف نے ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''تو تم یہ کہہ رہی ہو کہ اتنے برسوں کے بعد تمہیں دیکھ کر، تم سے مل کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی......؟'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''میرا اور آپ کا دکھ مشترک ہے پھوپھا جان......!'' ارجمند نے کہا۔

''لیکن آپ کا دکھ بہت بڑا ہے۔''

عارف حمیدہ کی طرف مڑا۔

''آپ کیسی ہیں اماں جان......؟''

''اللہ کا شکر ہے پتر......! پر تم بہت کمزور لگ رہے ہو......؟''

''اب بڑھاپا شروع ہو رہا ہے نا اماں جان......!''

''کیسی بات کرتے ہو پتر......! میرے عبدالحق کے ساتھ کے ہو۔''

''نہیں اماں جان......! عبدالحق سے میں عمر میں کافی بڑا ہوں۔''

''پھر بھی بڑھاپے کی بات تو نہیں کر سکتے تم......!''

وہ گھر پہنچے جہاں تمام ملازم ان کے منتظر تھے۔ عارف ان کے ساتھ گھر میں چلا آیا۔

''ابھی میں آپ لوگوں کی جان نہیں چھوڑوں گا۔ بس مجھے پندرہ منٹ اور دے دیں۔ پھر آرام کر لیجئے گا۔''

''کیسی غیریت کی بات کرتے ہیں عارف بھائی آپ......!'' عبدالحق نے احتجاج کیا۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے۔ عارف نے جیب سے کار کی چابی نکال کر نوریز کو دی۔

''جا کر میری کار کی ڈگی میں رکھا سامان نکال لاؤ......!''

نوریز گیا تو رشیدہ آ گئی۔

''کچھ لاؤں آپ لوگوں کے لئے صاحب......؟'' اس نے عبدالحق سے پوچھا۔

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے عارف کی طرف دیکھا۔

''چائے کو تو واقعی دل چاہ رہا ہے۔ مگر کہیں آپ لوگوں کے ساتھ زیادتی نہ

ہو جائے۔" عارف نے کہا۔

"کھانا ہم لوگوں نے فلائٹ کے دوران کھایا تھا۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر رشیدہ کی طرف مڑا۔

"چائے لے آؤ......!"

اتنی دیر میں نوریز سارے پیکٹ لے آیا تھا۔ وہ عارف نے میز پر رکھوا دیئے۔ سب سے پہلے اس نے حمیدہ کی طرف دو بہت خوب صورت چادریں بڑھائیں۔

"یہ آپ کے لئے ہے اماں جان......!"

حمیدہ کو چادریں بہت اچھی لگیں۔

"بہت شکریہ بیٹے......! لیکن تم نے اتنا تکلف کیا......؟"

"ماں کو تو آدمی محبت سے دنیا کے سارے خزانے دے دے، تو بھی تسلی نہ ہو اماں جان......! آپ ان دونوں چادروں کو تکلف کہہ رہی ہیں......؟"

"بہت اچھی ہیں بیٹے......!"

لیکن جب عارف نے ارجمند کے لئے لائے ہوئے تحائف کھولے تو سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ان میں تین تو طلائی زیورات کے بھاری سیٹ تھے اور کئی بہت قیمتی جوڑے۔ ایک دُلہنوں والا سوٹ بھی تھا۔

"یہ تو آپ نے بہت زیادتی کی عارف بھائی......!" عبدالحق نے کہا۔

"تم میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو عبدالحق......!" عارف نے خفگی سے کہا۔

"ارجمند میرے لئے بیٹی کی طرح ہے۔ جن حالات میں یہ شادی ہوئی، ان کی وجہ سے میں نے تم سے کبھی شکایت نہیں کی۔ اس کے باوجود کہ تمہیں کم از کم فون پر رسمی طور پر اس شادی کے لئے مجھ سے اجازت لینی چاہئے تھی۔"

"آپ کی شکایت بجا ہے عارف بھائی......! لیکن سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔"

"فون تو کر سکتے تھے......مگر میں نے اس کی بھی شکایت نہیں کی۔ اور جو کچھ

میں اس وقت نہیں کر سکا، اب کر رہا ہوں تو تم اسے زیادتی کہہ رہے ہو......؟"

"یہ پتر عارف کا حق ہے عبدالحق......!" حمیدہ نے مداخلت کی۔

"حق نہیں اماں جان......! یہ میرا فرض ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو پتر......!"

"میں معافی چاہتا ہوں عارف بھائی......!"

"مُعاف تو میں تمہیں پہلے ہی کر چکا ہوں۔"

ارجمند گنگ بیٹھی تھی۔

"لیکن پھوپھا جان......! یہ جوڑا......؟" اس نے شادی کے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے تمہیں دلہن بنے نہیں دیکھا۔ میرے نزدیک تو تمہاری شادی آج ہوئی ہے۔"

"لیکن پھوپھا جان......!"

"آج تمہیں میری خاطر عبدالحق کی دلہن بننا ہوگا۔ اور ہاں......! تم اس طرح پھوپھا جان کہو گی تو میری بیوی میری زندگی عذاب کر دے گی۔"

"یہ رشتہ تو میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گی پھوپھا جان......! لیکن آپ فکر نہ کریں۔" ارجمند نے کہا۔

"آپ جس بات سے ڈر رہے ہیں، وہ انشاء اللہ نہیں ہوگی۔ میں سنبھال لوں گی۔"

عبدالحق نے سوچا کہ وہ اتنے دن بعد ملے ہیں۔ انہیں کچھ وقت ملنا چاہئے۔ اس نے اٹھتے ہوئے حمیدہ سے کہا۔

"چلیں اماں......! آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں......!"

حمیدہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

"اور تم خوش تو ہو نا......؟" عارف نے ارجمند سے پوچھا۔

"الحمدللہ......! اتنی خوش کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"عبدالحق تمہیں خوش رکھتے ہیں نا......؟"

''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اللہ نے آغا جی کو کتنا اچھا بنایا ہے۔ ان سے تو کوئی ناخوش ہو ہی نہیں سکتا۔''

ادھر حمیدہ اپنا کمرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سب کچھ تقریباً اس کے لاہور والے کمرے جیسا ہی تھا۔ یہ بنگلہ لاہور والے بنگلے سے تو چھوٹا تھا مگر پھر بھی بہت اچھا تھا۔

رشیدہ وہاں نورالحق کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ جیسے وہ برسوں بعد اسے ملا ہو۔ حالانکہ وہ صرف تین دن دور رہے تھے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا کہ یہ واقعی اس کے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہے۔

حمیدہ نے نورالحق کو دیکھا تو اسے ایک اور خیال آیا۔

''لا رشیدہ......! اسے مجھے دے۔ اس نے اپنے نانا کو تو سلام ہی نہیں کیا ہے۔''

رشیدہ نے نورالحق کو حمیدہ کی گود میں دے دیا۔ حمیدہ اسے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ عبدالحق اس کے پیچھے تھا۔

حمیدہ کو واپس آتے دیکھ کر عارف جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بچے کو دیکھ کر اسے اپنی بہت بڑی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ارجمند کی محبت میں اسے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ بچہ بھی ہے۔ اس نے اس کے لئے کچھ بھی تو نہیں خریدا تھا۔

''یہ لو پتر عارف......! تمہارا نواسا تمہیں سلام کرنے آیا ہے۔'' اس نے نورالحق کو عارف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

عبدالحق کو حمیدہ کا نورالحق کو عارف کا نواسا کہنا کچھ عجیب سا لگا۔ وہ ارجمند کا بیٹا ہوتا تو اور بات تھی۔

عارف نے بڑی محبت سے نورالحق کو گود میں لیا اور اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

''اماں جان......! میرے لئے تو یہ بھتیجا ہے...... عبدالحق کے حوالے سے۔''

پھر اس نے غور سے نورالحق کو دیکھا اور حیرت سے بولا۔

''ارے......! یہ تو بالکل ارجمند جیسا ہے......!''

''جی ہاں......! اللہ کی قدرت اور نوربانو کی ارجمند سے محبت کا

ثبوت......!'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

عارف کچھ کھسیا گیا۔ اس نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر بچے کے ہاتھ میں تھمایا اور اس کی مٹھی بند کر دی۔ پھر اس نے حمیدہ سے کہا۔

''میں صاحب زادے کے لئے کچھ نہیں خرید سکا۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ بچے کے لئے کیا لیا جائے......؟ یہ کام میں نے رضوانہ پر چھوڑ دیا۔''

حمیدہ نے دل میں کہا۔

''تمہارے خیال میں یہ نوربانو کا بچہ ہے۔ ارجمند کا ہوتا تو سب سے بڑھ کر تم اسے یاد رکھتے۔ لیکن تم نہیں جانتے کہ یہ ارجمند ہی کا بیٹا ہے۔ اور میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔''

ارجمند نے اچانک حمیدہ سے کہا۔

''دادی اماں......! آپ اجازت دیں تو میں پھوپھا جان کے گھر جا کر سلام کر آؤں......؟''

''ضرور جا نکی......!'' حمیدہ نے کہا۔ پھر بولی۔

''میں بھی چلوں......؟''

''نہیں دادی اماں......! آپ تو بڑی ہیں۔ وہ خود آپ سے ملنے آئیں گی۔ میری اور بات ہے۔ میں تو چھوٹی ہوں۔''

''چل ٹھیک ہے......! تو چلی جا......!''

ارجمند نے بچے کو عارف سے لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''آپ کچھ دیر بعد آ جائیے گا۔''

وہ چلی گئی۔ حمیدہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں عبدالحق اور عارف اکیلے رہ گئے۔

''میرا بیٹا کیسا لگا عارف بھائی......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''بہت اچھا...... بہت خوب صورت......!''

''اسے دیکھ کر آپ کو یقین آیا کہ نوربانو ارجمند سے کتنی محبت کرتی تھی......؟''

عارف کو عبدالحق سے اپنی وہ گفتگو یاد آئی۔

''اسے دیکھ کر کون انکار کر سکتا ہے اس کی محبت کا.....؟'' عارف کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''اللہ مجھے میری اس بدگمانی پر مجھے معاف فرمائے۔ تم بھی مجھے اس پر معاف کر دینا۔''

عبدالحق نے عارف کا ہاتھ پکڑ کر تھپتھپایا۔

''ایسے نہ کہیں.....! آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔''

❁❁❁

ارجمند نے عارف سے وعدہ بھی کر لیا تھا اور اس سلسلے میں اللہ سے دل میں دُعا بھی کی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ وعدہ کیسے نبھائے گی.....؟ اس سوچ میں غلطاں وہ عارف کے گھر میں داخل ہوئی۔

دروازہ رضوانہ نے کھولا۔ ارجمند نے سلام کرنے کے بعد کہا۔

''میں عبدالحق صاحب کے گھر سے آئی ہوں۔''

''اوہ.....! ان کی دوسری بیوی.....؟'' رضوانہ کا لہجہ کچھ طنزیہ تھا۔

''آؤ نا.....اندر آؤ.....!''

ارجمند اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

''بیٹھو.....!'' رضوانہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

ارجمند بیٹھ گئی۔ وہ رضوانہ کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش اسے بہت جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن کچھ یاد آتے آتے رہ جاتا تھا۔

''بہت کم عمر ہو تم.....!'' رضوانہ نے کہا۔

''لگتی ہوں شاید.....اتنی کم عمر ہوں نہیں۔'' ارجمند نے بے دھیانی سے کہا۔

وہ اب بھی اسے غور سے دیکھے جا رہی تھی۔

رضوانہ کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا۔

''تم مجھے اس طرح گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو.....؟''

''ماشاءاللہ.....! آپ بہت خوب صورت ہیں۔'' ارجمند نے گڑبڑا کر کہا۔

وہ اب بھی اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پائی.....کوشش کے باوجود۔

''یہ بات تو شوہر کے منہ سے اچھی لگتی ہے۔ ہمارے شوہر نے تو کبھی کہی نہیں یہ بات.....!''

پھر ایک دم ارجمند کی سمجھ میں وہ مشابہت آ گئی۔ ایک لمحے میں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو گرنے نہ پائیں، اس کوشش میں اس نے نچلے ہونٹ میں دانت گاڑھ دیئے۔

رضوانہ نے یہ دیکھا تو اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

''اے.....کیا ہوا تمہیں.....؟''

''آپ کو دیکھ کر کچھ خیال آ رہا تھا۔ ابھی سمجھ میں آیا ہے کہ آپ میری پھپھو سے بہت ملتی ہیں۔''

''تو یہ آنسو کیوں.....؟'' اب رضوانہ کا لہجہ بہت نرم تھا۔

''میری ایک ہی پھپھو تھیں۔ برسوں پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔''

''بہت محبت تھی تمہیں ان سے.....؟''

''جی..... بہت زیادہ.....ان کے علاوہ میرا کوئی تھا ہی نہیں۔ دادا، دادی، ابی جان، امی اور چچا سب پاکستان آتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔''

''اوہ.....!''

''اور میرا کوئی بھائی تھا ہی نہیں۔'' اب رضوانہ کے لہجے میں محبت تھی۔

''میں تمہاری پھپھو سے اتنا ملتی ہوں تو تم مجھے اپنی پھپھو ہی سمجھو۔ مجھے بھی کسی نے پھپھو کہہ کر نہیں پکارا۔''

اللہ نے بات خود بخود بنا دی تھی۔

''بہت شکریہ پھپھو.....! مجھے تو بہت بڑی دولت مل گئی۔''

''دولت تو یہ میرے لئے بھی ہے۔ یہ نور بانو ہی کا بچہ ہے نا.....؟''

''جی.....! یہ بھی آپ کو سلام کرنے آیا ہے۔''

''لاؤ.....! میری گود میں تو دو اسے.....!''

ارجمند نے نورالحق کو اس کی گود میں دے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگلا جملہ کیا ہوگا......؟ اب تو وہ یہ جملہ سننے کی عادی ہوگئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سننا اسے اچھا ہی لگتا تھا۔

رضوانہ نے غور سے بچے کو دیکھا۔

''ارے......! یہ تو بالکل تم جیسا ہے......!''

''جی......اللہ کی قدرت ہے......!''

''اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمہارا بچہ نہیں ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ممکن ہے......؟''

''وہ......آپی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں نا......!''

''تم نور بھابی کو آپی کہتی تھیں......؟''

''پہلے سے ہی کہتی تھی۔ اللہ بخشے...... انہوں نے ہمیشہ مجھے چھوٹی بہن ہی سمجھا۔''

''میں نے سنا ہے، یہ شادی بھی انہوں نے کرائی تھی......؟''

''جی......! بہت اصرار کیا تھا انہوں نے اس شادی کے لئے......!''

''کمال ہے......! وہ ایسی تھیں تو نہیں۔ ویسے بھی اپنے اوپر خود سوکن کون لاتا ہے......؟'' رضوانہ نے کہا۔

''اور تم نے بھی ان کی محبت میں ہی ہاں کی ہوگی......؟ ورنہ کم عمر بھی ہو، بہت خوب صورت بھی ہو۔ رشتوں کی کمی نہیں ہوسکتی تھی تمہارے لئے......! عبدالحق بھائی تو عمر میں تم سے کافی بڑے ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے پھپھو......! جوڑے تو اوپر بنتے ہیں۔''

''تم خوش تو ہو عبدالحق بھائی کے ساتھ......؟''

''الحمدللہ......! بہت زیادہ...... آغا جی جیسے لوگ تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔''

''آغا جی کہتی ہو انہیں......؟''

''جی......! پہلے سے ہی کہتی تھی۔''

رضوانہ نے بچے کو پیار کیا۔ پھر بولی۔

''میں نانی ہوں تمہاری......اور یہ تو تم بن بلائے آگئے ہو۔ کل دعوت کروں گی تمہاری اور اپنی بیٹی......'' وہ کہتے کہتے رکی۔

''کمال ہے......پھپھو بن گئی تمہاری اور تمہارا نام تک نہیں معلوم مجھے......!''

''میرا نام ارجمند ہے پھپھو......!''

''بڑا خوب صورت اور مختلف نام ہے ماشاء اللہ......! تو ارجمند......! کل تمہاری دعوت ہے رات کے کھانے پر۔''

''ایک بات کہوں پھپھو......! برا تو نہیں مانیں گی......؟''

''تمہارے تو میں ناز اٹھاؤں گی۔ پھپھو ہوں تمہاری...... برا کیوں مانوں گی......؟'' رضوانہ نے بہت محبت سے کہا۔

''گھر تو مرد کا ہوتا ہے۔ دعوت تو......''

''گھر میرا بھی ہے اور تم میری بھتیجی ہو۔ میرے رشتے سے یہ تمہارے پھوپھا ہوئے۔''

''میں انہیں پھوپھا کہہ سکوں تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔ لیکن انہوں نے یہ رشتہ قبول ہی نہیں کیا تو......؟''

''کیسے قبول نہیں کریں گے......؟''

اس لمحے باہر سے عارف کی آواز سنائی دی۔

''رضوانہ......! دیکھو تو کون آیا ہے......؟'' پھر عارف اندر آیا۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ نا......عبدالحق......! یہ تو تمہارا اپنا گھر ہے۔''

عبدالحق بھی اندر آگیا۔ اس نے رضوانہ کو سلام کیا۔

رضوانہ نے سلام کا جواب دینے کے بعد عارف سے کہا۔

''میں نے تو دیکھ لیا کہ عبدالحق بھائی آئے ہیں۔ مگر آپ کو نہیں پتا کہ کون آیا ہے ہمارے ہاں......؟ چلیں میں تعارف کرا دوں۔ یہ میری بھتیجی ہے...... ارجمند......!''

عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ لیکن عارف کا منہ تو کھلے کا کھلا رہ گیا۔

رضوانہ ارجمند کی طرف مڑی۔

''اب میں تمہارے سامنے ہی کہلوا دیتی ہوں تمہارے پھوپھا جان سے۔''

عارف تو بے ہوش ہونے کے قریب ہوگیا۔ ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

''جی...... ٹھیک ہے......!''

''سنیں جی......! میں کل اپنی بھتیجی کی دعوت کر رہی ہوں۔ اس کے شوہر اور ساس بھی آئیں گے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں......؟'' رضوانہ نے عارف سے کہا۔

''اگر میں اعتراض کروں تو یہ کفرانِ نعمت ہوگا۔ زندگی میں پہلی بار پھوپھا بننے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے مجھے...... اور یہ رشتہ تمہاری طرف سے ہے۔ میری طرف سے ہوتا تو میں اسے صرف دعوت نہیں رہنے دیتا۔''

''کیا مطلب......؟''

جو کچھ ہوا، وہ عارف کے لئے ناقابل یقین تھا۔ ارجمند نے نہ جانے کیا جادو کر دیا تھا رضوانہ پر۔ مگر اسے یقین آیا تو اسے موقع سے فائدہ اٹھانے کا خیال آگیا۔ اب وہ اپنی خواہش بھی پوری کرا سکتا تھا۔

''چھوڑو...... جانے دو...... پھوپھی تم ہو، میں کیا کہوں......؟'' اس نے کہا۔

''بتائیں نا...... کیا بات ہے......؟'' اس کی توقع کے عین مطابق رضوانہ نے اصرار کیا۔

''تم اپنی بھتیجی کی شادی میں شریک نہیں ہوئیں تو کم از کم اب اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔''

''کیسے......؟''

''یہ دونوں کل ہمارے ہاں نئے دولہا دلہن کی طرح آئیں......!''

''ہاں......! یہ ٹھیک کہا آپ نے......!'' رضوانہ نے کہا۔ پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔

''تم اپنی پھپھو کا حکم تو نہیں ٹال سکتیں......؟''

اس بار ارجمند کا چہرہ گلنار ہوگیا اس نے کن انکھیوں سے عبدالحق کی طرف دیکھا۔

رضوانہ اس خاموش اشارے کو سمجھ گئی۔ وہ عبدالحق کی طرف مڑی۔

''اب آپ میرے بھتیجے داماد بھی ہیں عبدالحق بھائی......!'' وہ بولی۔

''دو رشتے ہیں آپ سے میرے...... اور آپ کے بھائی کی بھی یہ خواہش ہے۔ بولیں...... پوری کریں گے......؟''

عبدالحق کھسیا رہا تھا۔ اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔

''سوچ لو عبدالحق......!'' عارف نے دھمکی دینے والے لہجے میں کہا۔

''آدمی کو کسی کوتاہی کا ازالہ کرنے کا موقع ملے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہوتی ہے۔ اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔''

عبدالحق جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے......؟ اس نے آہستہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے بھابی......! آپ کی خوشی ہے تو یوں ہی سہی......!''

''شکریہ عبدالحق بھائی......!''

''لیکن میرے لئے آپ بھابی ہی رہیں گی۔''

''آپ کی مرضی ہے......!''

''اور یہ دعوت آپ کو ہمارے گھر آ کر دینی ہوگی پھپھو......!'' ارجمند نے کہا۔

''درحقیقت آغا جی نے آپ کی اور پھوپھا جان کی محبت میں ہاں کر دی ہے۔ ورنہ یہ ان کا اختیار نہیں۔''

''میں سمجھی نہیں......!''

''آپ کی دعوت قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ نہ آغا جی کر سکتے ہیں اور نہ میں...... فیصلہ کرنے والی تو دادی اماں ہیں۔''

عبدالحق نے بہت تشکر سے ارجمند کو دیکھا۔ جو بات اسے کہنی چاہئے تھی، اور اسے کہنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا، وہ ارجمند نے کہہ دی تھی۔ وہ واقعی بڑی ذمہ دار لڑکی تھی۔

"ٹھیک ہے ارجمند......! تم فکر نہ کرو۔ میں ان سے بھی اجازت لے لوں گی۔"

حمیدہ کو محسوس ہوتا تھا کہ نور بانو تو دنیا سے رخصت ہو چکی لیکن اس کی پرچھائیں اب بھی عبدالحق اور ارجمند کے درمیان حائل ہے۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق نور بانو سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ محبت ایک دم سے ختم ہونے والی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ ارجمند بالآخر عبدالحق کے دل میں گھر کر لے گی۔ وہ اتنی اچھی تھی، اس میں اتنی خوبیاں تھیں، کون اسے نظرانداز کر سکتا تھا......؟

رضوانہ نے دعوت کی بات کی تو حمیدہ کو لگا کہ یہ اللہ کی طرف سے مدد آئی ہے۔ اس نے فوراً ہی دعوت قبول کر لی۔

عبدالحق اس صورتِ حال سے بچنا چاہتا تھا۔ ارجمند نے جب بات حمیدہ کی طرف بڑھائی تو اسے امید ہوئی کہ اماں انکار کر دیں گی۔ لیکن اماں کے کہنے کے بعد تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔

اور حمیدہ تو اس روز ایسے جوش میں تھی، جیسے سچ مچ ہی ان دونوں کی شادی ہو رہی ہو۔ ارجمند کے لئے تو ہر چیز نئی تھی، جو اس کے لئے عارف لایا تھا۔

اس نے رشیدہ سے کہا۔

"آج تجھے میری نکی کو نئی نویلی دُلہن بنانا ہے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں بیگم صاحبہ......! آپ دیکھ نہیں پائیں گی۔ لگے گا کہ چودھویں کا چاند نکل آیا ہے۔"

اس کے بعد حمیدہ کو عبدالحق کی فکر ہوئی۔

"تیرے پاس نئے کپڑے نہیں ہیں پتر......؟" اس نے فکرمندی سے کہا۔

"کمال کرتی ہیں اماں......! لگتا ہے سچ مچ شادی ہو رہی ہے۔" عبدالحق نے کھسیا کر کہا۔

اسے اب عارف پر غصہ آ رہا تھا، جس نے خواہ مخواہ یہ پخ لگا دی تھی۔

"مفت میں خوشی مل رہی ہے پتر......! اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ یہ تو اس کی رحمت ہے نا......!"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں......! لیکن نئے کپڑوں کی کیا تک ہے......؟"

عبدالحق نے کہا۔

"اور اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔"

اس لمحے نوریز نے دروازے پر دستک دی۔ عبدالحق کی آواز دینے پر وہ اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہینگر تھا، جس میں ایک سوٹ لٹکا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔

"یہ برابر والے صاحب دے کر گئے ہیں آپ کے لئے......!"

"لے دیکھ لے......! اللہ کی رحمت......!" حمیدہ نے خوش ہو کر کہا۔

عبدالحق نے کوٹ اور پینٹ کو اپنے جسم پر لگا کر رکھا۔ سوٹ بالکل اس کے ناپ کا تھا۔ پیکٹ میں متفرق چیزیں تھیں۔

"بے شک اماں......! یہ اللہ کا فضل ہے۔"

دعوت میں حمیدہ آبیہ کو ساتھ لے کر گئی۔ نورالحق کو سنبھالنا اس کی ذمہ داری تھی۔

وہ جیسے ایک نو بیاہتا جوڑے کی دعوت تھی۔ اور وہ چاند سورج کی جوڑی تھی۔ دونوں ایسے شرما رہے تھے جیسے دو دن پہلے ہی ان کی شادی ہوئی ہو۔ حمیدہ کبھی ایک کو دیکھتی کبھی دوسرے کو۔ رضوانہ بھی بہت خوش تھی اور اس کے بچے بھی۔ اس کی بیٹی رخسانہ تو ارجمند سے الگ ہونے کو کسی طرح تیار ہی نہیں تھی۔

"سوٹ کیسا رہا......؟" عارف نے عبدالحق سے پوچھا۔

"بالکل فٹ......! یہ بتائیں...... یہ آپ نے کیا کیسے......؟"

"یہ راز کی بات ہے۔ لیکن بتا دیتا ہوں۔ یاد ہے، ایک بار تم سے تمہارا سوٹ لیا تھا......؟"

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو میں وہ سوٹ اور یہ کپڑا لے کر ٹیلر کے پاس گیا۔ بہت نخرے کئے اس نے۔ میں نے خوشامد کی۔ ورنہ تین دن میں کون سوٹ سی کر دیتا ہے۔ مگر اس نے کہہ دیا تھا کہ فٹنگ کی گارنٹی نہیں دے سکتا وہ۔"

"میں تو یہی کہوں گا کہ اس نے کمال کر دیا.....!"

کھانے کے بعد عبدالحق نے اجازت چاہی۔ مگر عارف کے بچوں کے اصرار پر انہیں رکنا پڑا۔ عبدالحق اس دوران عشاء کی نماز پڑھ آیا۔

اور جب وہ گھر پہنچے تو عارف کی طرف سے ایک اور حیرت ان کی منتظر تھی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ وہ بھول گئے کہ اس وقت وہ کہاں ہیں.....؟ وہ منظر ہی ایسا تھا۔

وہ ان کا کمرہ تھا۔ لیکن ان کا کمرہ لگ ہی نہیں رہا تھا۔ وہاں تین چیزیں بالکل نئی تھیں۔ مسہری، الماری اور سنگھار میز...... اور اس وقت وہ محض کمرہ نہیں تھا۔ وہ حجلۂ عروسی تھا۔ پورا کمرہ بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ مسہری کے گرد گلاب کی لڑیاں تھیں، اور سیج بھی گلابوں کی تھی۔

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سن کھڑے تھے۔ پھر ارجمند آگے بڑھی اور الماری کو کھول کر دیکھا۔ پرانی الماری کی ہر چیز اس الماری میں موجود تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کام رشیدہ نے کیا ہے۔

اس نے پلٹ کر بلند آواز میں رشیدہ کو پکارا۔

رشیدہ کمرے میں آئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے.....؟"

"آپ دعوت میں گئیں تو کچھ لوگ یہ سامان لے کر آئے۔" رشیدہ نے کہا۔ "میں سمجھی کہ بڑے صاحب نے منگوایا ہے۔ پھر دو آدمی کمرہ سجانے کے لئے آئے۔ ان کے ساتھ برابر والے صاحب بھی تھے۔ وہ انہیں سمجھا کر فوراً ہی چلے گئے۔ وہ دونوں کمرہ سجا کر کچھ ہی دیر پہلے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے.....! تم جاؤ.....!"

ارجمند نے عبدالحق کی طرف دیکھا۔

"عارف بھائی کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" عبدالحق نے آہستہ سے کہا۔

"آپ تھک گئے ہوں گے۔ آرام سے لیٹ جائیں۔ کپڑے بدل کر۔ میں

ابھی آتی ہوں۔"

عبدالحق نے باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ پھر وہ واپس آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ ذہن کی عجیب کیفیت تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ یہ سب اس کے لئے خلافِ توقع تھا۔ پھر وہاں رچی ہوئی گلابوں کی خوشبو کچھ بھولے بسرے جذبوں کو جگا رہی تھی۔

ارجمند کمرے میں آئی تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ رشیدہ اس کے ساتھ تھی اور اس کے ہاتھ میں گرم پانی کا تسلا تھا، جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پھر اس نے الماری سے ایک تولیہ نکال کر ارجمند کو دیا، اور کمرے سے چلی گئی۔

"اٹھیں آغا جی......!" ارجمند نے کہا۔

"آج یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں......!"

"میرے لئے آج یہ ہر دن سے بڑھ کر ضروری ہے۔ اٹھ جائیں آپ......!"

"کم از کم کپڑے تو بدل لیتیں......؟" عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں بدلتی......؟ ایک کمی رہ گئی تھی، آج پھوپھا جان کی مہربانی سے وہ پوری کرنے کا موقع مل رہا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں......!"

"جس رات میں دُلہن بنی تھی، اس رات آپ کی یہ خدمت نہیں کر سکی۔ سوچا تھا، لیکن شرم کی وجہ سے کر نہیں سکی۔ آج دُلہن بنی ہوئی ہوں، اور آپ کی خدمت کروں گی۔ یہ میرے لئے بہت بڑی خوشی ہے۔ چلئے...... پاؤں پانی میں ڈالئے......!"

عبدالحق نے پاؤں پانی میں ڈالے۔ ارجمند مصروف ہو گئی۔

عبدالحق پورے دن ارجمند کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا تھا۔ مگر اب وہ چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ کمرے کا ماحول پہلے ہی اس پر اثر انداز ہو چکا تھا اور اب ارجمند کا بے پناہ حسن اسے مبہوت کر رہا تھا۔ وہ تو نشے جیسی کیفیت تھی۔

ارجمند اب تولیے سے اس کے پاؤں خشک کر رہی تھی۔

''بس کرو ارجمند......!'' عبدالحق نے بھاری آواز میں کہا۔

''اب میں برداشت نہیں کر سکتا......!''

ارجمند نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی تحریر بہت واضح تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''بہت بہتر آغا جی......! جو حکم آپ کا......!''

پھر وہ تسلا اٹھا کر باتھ روم میں لے گئی۔ وہاں سے وہ دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹی۔

''لائٹ آف کر دوں آغا جی......؟''

اس نے پوچھا۔

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایسے خوش نصیب کم ہی ہوتے ہوں گے جنہیں باہم سہاگ رات دوبارہ مل جائے۔ ان دونوں پر یہ نوازش ہوئی تھی۔

عبدالحق بے سدھ ہو کر سو گیا۔

پھر اس کی آنکھ کھلی تو شاید اسی لئے کہ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ بہت شدید پیاس تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ارجمند کو چھونا چاہا لیکن ارجمند کے بجائے اس کا ہاتھ نورالحق کے ننھے جسم سے ٹکرایا۔

اسے ایسا لگا جیسے جو کچھ ہوا، وہ خواب تھا۔ ہمیشہ کی طرح نورالحق اس کے اور ارجمند کے درمیان تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن ارجمند بستر پر موجود ہی نہیں تھی۔

''ارے......! یہ کہاں گئی......؟'' اس نے سوچا۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں پکارا۔

''ارجمند......! ارجی......!''

کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ نظر ذرا اندھیرے کی عادی ہوئی تو کمرے کے ایک گوشے میں اسے متحرک سفیدی نظر آئی۔ چند لمحوں بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ ارجمند تھی، اور وہ نماز پڑھ رہی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر حیرت سے سوچتا رہا۔ اس کا خیال درست تھا۔ اس نے

خواب ہی دیکھا تھا۔ ورنہ ارجمند اس وقت نماز کیسے پڑھ سکتی تھی......؟ مگر وہ بہت خوب صورت خواب تھا۔ اور اب وہ اس کی تعبیر چاہتا تھا۔ دل مچلنے لگا۔

ارجمند نے سلام پھیرا اور اٹھ کر اس کی طرف آئی۔ اندھیرے میں وہ اسے بیٹھا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔

''آپ نے مجھے آواز دی آغا جی......! آپ جاگ کیوں گئے......؟'' اس نے کہا۔

عبدالحق نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''گہری نیند سے آنکھ کھل گئی۔ بہت پیاس لگ رہی ہے۔''

''پانی تو یہیں رکھا ہے......!'' ارجمند نے پانی کا گلاس اسے دیا۔

عبدالحق نے پانی پی کر گلاس اسے دیا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔

''یہ پیاس ایسے بجھنے والی نہیں......!''

''دو رکعتیں اور پڑھنی ہیں آغا جی......! اجازت......؟''

''نماز سے کون روک سکتا ہے......؟'' عبدالحق نے جھرجھری سی لی۔

''جزاک اللہ......!''

''ایک بات کہوں......لائٹ آن کر دو......!''

''جی بہتر......!''

ارجمند نے روشنی کر دی۔ پھر وہ نماز کے لئے کھڑی ہو گئی۔

عبدالحق غور سے اسے دیکھتا رہا۔ اب وہ سادہ سفید عام سے کپڑوں میں تھی، اور پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی روشنی اور پاکیزگی تھی۔

''میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں۔'' عبدالحق نے زیر لب کہا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ارجمند نے اتنی دیر سے نماز کیوں پڑھی ہے......؟

ارجمند نے سلام پھیرا۔ دعا کی۔ پھر مصلیٰ سمیٹ کر الماری کے اوپر رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اب لائٹ آف کر دوں آغا جی..... ؟''

''ہاں.....!''

اندھیرا ہو گیا۔ رات پردہ پوش.....!

سفید لباس میں ہونے کی وجہ سے وہ اسے آتی نظر آئی۔ لیکن نظر نہ بھی آتی تو بے خود کر دینے والی وہ خوشبو ہی اس کی آمد کا پتا دینے کے لئے کافی تھی۔

پردہ پوش رات کے مہکتے اندھیرے میں عبدالحق نے سرگوشی کی۔

''پتا ہے..... میں نے خواب میں تمہیں اور خود کو دیکھا تھا۔ اور وہ بہت خوب صورت خواب تھا۔''

وہ خواب نہیں تھا آغا جی.....!'' ارجمند نے شرم گیں لہجے میں کہا۔

''تو کیا حقیقت بھی اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے.....؟''

اور چند لمحوں کے بعد وہاں سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔

اور وہ نیند کے صرف چند لمحے ہی تھے۔ پھر عبدالحق کو احساس ہوا کہ کوئی اسے جھنجوڑ رہا ہے۔ اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ وہ بہت میٹھی نیند تھی۔ ایسے میں کون اٹھنا چاہے گا.....؟

''کیا ہے..... کون..... ؟'' اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''اُٹھ جائیں آغا جی.....!''

وہ ارجمند کی آواز تھی۔

''نہیں اٹھ سکتا..... سونے دو مجھے.....!''

''فجر کا وقت ہو رہا ہے آغا جی.....! اٹھ جائیے.....! نماز کے بعد سو جائیے گا.....!''

''میں نے کہا نا..... مجھے سونے دو.....!''

''نہیں آغا جی.....! فجر کی نماز میں صرف پندرہ منٹ ہیں اور آپ کو غسل بھی کرنا ہے۔''

عبدالحق کو کرنٹ سا لگا۔ سب کچھ پہلی بار کی طرح ہو رہا تھا۔ بس ایک فرق تھا۔ اب وہ زیادہ چوکنا تھا۔ غسل کا سنتے ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا اور وہ ایک دم سے

اٹھ بیٹھا۔

''جزاک اللہ.....! ارجی.....!'' اس کے لہجے میں تشکر تھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اتنا چوکنا بھی نہیں تھا۔ ارجمند اسے نہ جگاتی تو وہ سوتا ہی رہ جاتا اور فجر کی نماز سے محروم رہ جاتا۔

اس نے غور سے ارجمند کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر لگا کہ وہ مصلیٰ سے اٹھ کر آئی ہو۔ تو کیا یہ سوئی ہی نہیں.....؟

''باتھ روم میں سب کچھ تیار ہے آغا جی.....!''

عبدالحق باتھ روم میں چلا گیا۔ ارجمند پھر مصلیٰ کی طرف چلی گئی۔ وہ غسل کر کے نکلا اور مسجد کی طرف چلا گیا۔

عارف اور رضوانہ کے خلوص اور محبت نے جو نہیں ایک رات دی تھی، وہ ان دونوں کے لئے ہی یادگار بن گئی۔ دونوں اس رات کے بارے میں مہینوں سوچتے رہے۔ لیکن دونوں کا انداز مختلف تھا۔ دونوں کی سوچ مختلف تھی۔ اس رات نے دونوں پر گہرے اور اَن مٹ اثرات چھوڑے۔

عارف اور رضوانہ کو کبھی پتا نہیں چلا کہ وہ رات اتنی اہم تھی۔

اس روز عبدالحق دفتر نہیں جا سکا۔

❁❁❁

پہلی پکنک والے دن عبدالحق نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک بار ان سب کو کاغان لے جائے گا۔ یہ دنیاداری نبھانی بھی ضروری تھی۔

ایک بات طے تھی۔ ارجمند میں بڑی خوبیاں تھیں۔ دل جیتنے کا ہنر اسے خوب آتا تھا۔ عبدالحق رضوانہ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے اندر نہ جانے کیسی تلخیاں تھیں کہ وہ قریب ہو کر بھی کسی کے بہت قریب نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ارجمند کے لئے وہ سچ مچ کی پھوپھی بن گئی تھی۔

عبدالحق نے پہلی پکنک پر بھی عارف کو دعوت دی تھی۔ لیکن اس نے مصروفیت کی وجہ سے انکار کر دیا تھا۔

''تو بھابی تو چلیں گی نا.....؟''

"نہیں بھائی......! ان کے بغیر مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" رضوانہ کے جواب نے اسے حیران کر دیا تھا۔

پھر عارف میں واضح تبدیلی نظر آئی۔ وہ خوش نظر آنے لگا تھا۔

عبدالحق نے اس سلسلے میں اس سے بات کی۔

"تبدیل میں نہیں ہوا عبدالحق......! میں تو اب بھی ویسا ہی ہوں۔ تبدیل تو تمہاری بھابی ہوئی ہیں۔" عارف نے کہا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" عبدالحق نے کہا۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں خود تصور نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار گھر سے کھانا آنے لگا ہے اور رضوانہ جس طرح سے اب میرا خیال رکھتی ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

عبدالحق نے غور سے اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے......؟

"یہ سب ہوا کیسے......؟"

"کیسے ہوا......؟ یہ تو میں نہیں جانتا۔ یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ارجمند کا جادو ہے، جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس نے رضوانہ کو اپنی پھپھو جیسا ہی بنا دیا ہے۔ کیسے......؟ یہ مجھے نہیں معلوم......! اور میں اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا۔"

لیکن عبدالحق تو پوچھ سکتا تھا۔

"پھپھی جان دل کی بہت اچھی ہیں۔" ارجمند نے کہا۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ البتہ وہ مجھے دیکھتی تھیں تو پوچھتی تھیں۔ میرے دفتر کھانا بھجوانے پر انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں کس طرح آپ کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی ہوں......؟ کہنے لگیں، مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ کوئی بتانے والا ہی نہیں تھا۔ اب سوچتی ہوں، میں نے ان کے ساتھ کتنی زیادتی کی۔ میں نے اللہ کے احکامات کے حوالے سے انہیں بتایا تو کہنے لگیں۔ کیا بگڑا ہے......؟ اب بھی تلافی ہو سکتی ہے۔"

"یہ تو واقعی کمال کر دیا تم نے......!"

"سب اللہ کی مہربانی ہے آغا جی......!" ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی خفگی

تھی۔

"بے شک......! الحمدللہ......!" عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

دوسری بار پکنک کی بات ہوئی تو عارف کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رضوانہ بول پڑی۔

"ضرور چلیں گے عبدالحق بھائی......!"

عبدالحق نے عارف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ عارف نے بے بسی کے اظہار کے طور پر کندھے اچکا دیئے۔

"اب بھی بھلا انکار کر سکتا ہوں......؟"

"ایسی بات نہیں...... آپ مصروف ہوں تو کوئی بات نہیں...... پھر کبھی سہی......!" رضوانہ نے جلدی سے کہا۔

"تمہاری خوشی کے لئے مصروفیت کو ٹالا بھی جا سکتا ہے۔"

"شکریہ جی......!"

"اور یہ پکنک ہر طرح سے کامیاب رہی۔ عبدالحق کو پتا چل گیا تھا، اس لئے وہ سب سے پہلے عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار پر رکے۔ عبدالحق نے حمیدہ کو بتایا کہ یہ بہت بڑے بزرگ کا مزار ہے۔

انہوں نے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ میٹھے پانی کے چشمے کا سن کر حمیدہ بہت حیران ہوئی۔

"جی اماں......! کراچی میں تو سمندر سے بہت دور بھی میٹھا پانی کم ہی نکلتا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"اور یہ چشمہ تو سمجھیں کہ سمندر سے ہی پھوٹا ہے۔"

"دیکھ لے پتر......! یہ بھی اللہ کی نشانی ہے۔ اللہ اپنے ولیوں کی کیسے کیسے شان بڑھاتا ہے......؟"

"بے شک اماں......!"

اس بار حمیدہ کے سب ارمان پورے ہوگئے۔ یہاں وہ پانی میں کھڑی ہو سکتی تھی۔ عبدالحق سہارا دینے کے لئے اس کے ساتھ کھڑا رہا۔

لیکن ارجمند نورالحق کو گود میں لئے کنارے پر کھڑی رہی۔ یہ وہ جگہ تھی کہ لہریں اس کے قدموں میں دم توڑ رہی تھیں۔ پھر سمندر کی شوخی بڑھی تو وہ کچھ اور پیچھے ہٹ گئی۔ عارف کی بڑی بیٹی فوزیہ اس کے ساتھ تھی۔

عبدالحق نے انہیں دیکھا تو حمیدہ کے پاس نوریز اور رشیدہ کو چھوڑ کر پیچھے آیا۔

''کیا ہوا......؟ تم یہاں کیوں کھڑی ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

''ڈر لگتا ہے پانی سے......؟''

''نہیں آغا جی......! یہاں غیر لوگ بھی ہیں۔ کپڑے بھیگ گئے تو بے حجابی ہوگی۔''

''اگر انجوائے ہی نہ کرو تو یہاں آنے کا فائدہ......؟''

''میں پوری طرح انجوائے کر رہی ہوں آغا جی......! اپنے بچے کو اللہ کی قدرت کا نظارہ کرا رہی ہوں۔''

اس نے جس بے ساختگی سے نورالحق کو اپنا بچہ کہا، اور یہ تو وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ نورالحق کو زیادہ تر اپنی گود میں ہی رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ عبدالحق کو بہت مصنوعی سا لگا۔ اس نے کہا۔

''جیسے تمہاری مرضی......!'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے پلٹا۔

ارجمند نے نورالحق کو سینے سے لگاتے ہوئے عبدالحق کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ کو شاید یقین نہیں آیا کہ میں انجوائے کر رہی ہوں......؟ آپ خفا ہوگئے آغا جی......؟''

''میں کیوں خفا ہوں گا......؟ کوئی زبردستی تھوڑا ہی ہے......؟''

''سمندر کا کیا پتا آغا جی......! اور بے حجابی اللہ کی نارضی کا سبب ہوگی۔'' ارجمند نے بے حد عاجزی سے کہا۔

''ویسے بھی یہاں میرا انجوائے کرنے کا انداز مختلف ہے۔''

''تو وہ دکھاؤ مجھے......!''

''ٹھیک ہے......! آپ نورالحق کو گود میں لیں اور میرے پاس بیٹھ کر

دیکھیں۔''

عبدالحق نے نورالحق کو گود میں لے لیا۔ وہ تینوں وہیں ریت پر بیٹھ گئے۔

''تم تو پانی میں جاؤ گڑیا......!'' عبدالحق نے فوزیہ نے کہا۔

''نہیں چچا جان......! جو باجی کہہ رہی ہیں، ٹھیک ہے......!'' پندرہ سالہ فوزیہ نے کہا۔

عبدالحق نے دل میں اعتراف کیا کہ ارجمند کو اپنا رنگ جمانا خوب آتا ہے۔ یہ بچی برسوں نوربانو کے قریب رہی، اس کے سامنے چھوٹی سے بڑی ہوئی، لیکن برسوں میں نوربانو سے اتنی قریب نہیں ہوئی، جتنی چند دنوں میں ارجمند سے ہوگئی ہے۔

اپنی سوچوں کو جھٹک کر اس نے ارجمند کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے گھروندا بنا رہی تھی اور فوزیہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ارجمند کو دیکھ کر عبدالحق کو لگا کہ جیسے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہے۔

لیکن اگلے ہی لمحے ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''دیکھ رہے ہیں آغا جی......؟''

''ہاں......! ساحل پر گھروندا بنا رہی ہو تم......؟''

''اور میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ الحمد للہ......! یہ میرا انجوانے منٹ ہے۔''

''میں سمجھ گیا...... مجھے اچھا لگا ہے۔''

''آپ کو کچھ یاد آیا اس گھروندے کو دیکھ کر......؟''

عبدالحق نے چند لمحے ذہن پہ زور دیا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں......! مجھے تو کچھ یاد نہیں آیا۔ کوئی خاص بات......؟''

''آپ کے لئے نہیں...... میرے لئے تو بہت خاص بات ہے۔''

''تو مجھے بھی بتاؤ......!''

''میں نے ایک بار پہلے بھی گھروندے بنائے تھے۔ فرق یہ ہے کہ یہ ریت کا ہے اور وہ برف کے تھے۔''

عبدالحق کو مری یاد آ گیا۔

’’ہاں......! یاد آ گیا......!‘‘ اس نے کہا۔

’’تم نے اسنو مین بھی بنایا تھا، اور اسے میرا ہیٹ اور کوٹ بھی پہنایا تھا۔‘‘

’’جی ہاں......!‘‘

’’اور تم نے اس کا اسکیچ بھی بنایا تھا۔ میں نے تصویریں کھینچی تھیں اس کی۔‘‘

عبدالحق کی نگاہوں میں وہ منظر پھر گیا۔

’’جی ہاں......! آغا جی......!‘‘

’’اور تم اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔‘‘

’’جی......! بس...... ظاہری طور پر...... اور صرف نو سال میں میں کتنی بڑی ہوگئی......؟‘‘

’’تمہیں پچھتاوا ہوتا ہے اس پر......؟‘‘ عبدالحق کے دل میں کانٹا سا چبھا۔

’’ہرگز نہیں......! ذرا بھی نہیں......!‘‘ ارجمند نے تڑپ کر کہا۔

’’مجھے تو خوشی ہوئی ہے اس پر۔ بڑی نہ ہوتی تو آپ کیسے......‘‘ وہ کہتے کہتے رکی۔ پھر اس نے بات پوری کی۔

’’خواب کی تعبیر کیسے ملتی مجھے......؟ سچ پوچھیں تو میں اس وقت بھی بڑی تھی۔ میرا خواب بڑوں کا خواب تھا نا آغا جی......؟‘‘

عبدالحق جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے......؟ اور وہ جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اس کی خلش دور ہوگئی۔

فوزیہ کی سمجھ میں ان دونوں کی باتیں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ تو بس سحر زدہ سی، گھروندے کو دیکھے جا رہی تھی۔

ارجمند نے بڑی نزاکت سے اپنا پاؤں باہر نکالا۔

’’گھروندا تیار......!‘‘ اس نے بچوں کی سی چہکار سے کہا۔

اس وقت وہ عبدالحق کو چھوٹی سی بچی ہی لگی۔

’’یہ گروندا کس کا ہے باجی......؟‘‘ فوزیہ نے پوچھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے خود ہی کہا۔

’’میرا ہے نا......؟‘‘

’’نہیں گڑیا......! اپنا گھروندا خود بنانے کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔‘‘

’’تو یہ کس کا ہے......؟‘‘

’’یہ تمہارے چچا جان کا ہے۔‘‘ ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

’’تو چچا جان کو خود بنانا چاہئے تھا۔‘‘ فوزیہ نے تنک کر کہا۔

’’آپ نے کیوں گھروندا بنایا ان کے لئے......؟‘‘

’’یہ بڑے ہیں نا...... ساحل پر بیٹھ کر بچوں کی طرح گھروندا بنائیں گے تو انہیں شرم آئے گی۔‘‘

’’واہ......! یہ کیا بات ہوئی......؟ پھر آپ میرے لئے بھی بنائیں ایک گھروندا......!‘‘

’’دیکھو فوزی......! میں نے نورالحق کے لئے بھی نہیں بنایا نا...... یہ بڑا ہو کر خود بنائے گا گھروندا اپنے لئے......!‘‘

’’مگر مجھ سے تو نہیں بنے گا۔‘‘

’’بنے گا...... میں تمہاری مدد کروں گی۔‘‘

’’پہلے یہ بتائیں کہ اس میں ایک دروازہ کیوں ہے......؟‘‘

’’گھروندے میں ایک ہی دروازہ ہوتا ہے گڑیا......! گھروندے والا اندر گیا تو آپ نے دروازہ بند کر دیا...... ایسے......!‘‘ ارجمند نے کہا اور گھروندے کے درواز پر اپنی چپل کھڑی کر دی۔

’’تا کہ وہ باہر نہ آ سکے......!‘‘

اس اشارتی گفتگو نے عبدالحق کے دل میں ہلچل مچا دی۔ ارجمند یہ سب کچھ درحقیقت اس سے کہہ رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ارجمند کے مزاج میں اتنی رومانیت ہے۔ ایسی لطیف گفتگو اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔

اس لڑکی کی کشش سے بچ نکلنا بہت دُشوار ہے۔ اس نے دل میں کہا۔

’’بہت...... بہت زیادہ دُشوار...... دنیا میں تو مکمل خوب صورتی کا وجود نہیں۔ لیکن روئے زمین پر مکمل خوب صورتی سے قریب تر یہی ہو سکتی ہے۔‘‘

’’گھروندے میں دو دروازے کیوں نہیں ہو سکتے باجی......؟‘‘ فوزیہ نے

ارجمند سے پوچھا۔

''دو دروازوں کا فائدہ......؟ آدمی ادھر سے اندر گیا اور دوسرے دروازے سے باہر......!''

''مگر مجھے تو دو دروازے ہی چاہئیں۔ آپ اور میں پاؤں ملا کر بڑا گھروندا بناتے ہیں۔ اس میں دو دروازے ہوں گے۔''

''تمہاری خوشی ہے تو یوں ہی سہی......!''

وہ دونوں بڑا گھروندا بنانے میں مصروف ہو گئیں۔

عبدالحق ارجمند کے بنائے ہوئے گھروندے کو دیکھتا رہا۔ الگ سے دیکھو تو یہ کتنا بھدا اور بدنما ہے لیکن ساحل پر یہ کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔

کوئی یاد تھی، جو اس کے اندر کہیں بہت گہرائی سے سر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن ابھر نہیں پا رہی تھی۔ کچھ یاد آتے آتے رہ جاتا تھا۔

''نہیں باجی......! یہ تو بہت برا لگ رہا ہے۔'' فوزیہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا۔ وہ بڑا گھروندا واقعی بہت بھدا لگ رہا تھا۔

''میں اسے گراؤں گی۔'' فوزیہ نے پاؤں گھروندے کی طرف بڑھایا۔

''نہیں فوزی......! بری بات......!'' ارجمند کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ فوزیہ ٹھٹک گئی۔

''گھروندے تو خواب کی طرح ہوتے ہیں اور خواب خوشی ہوتے ہیں، اور خوشی ہوا کے جھونکوں کی طرح ہوتی ہے۔ یہ سب پل دو پل کے مہمان ہیں۔ ان کا احترام کرنا ضروری ہوتا ہے۔''

فوزیہ حیرت سے ارجمند کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

عبدالحق بھی حیرت سے ارجمند کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی میں کتنی گہرائی ہے اور گہرائی میں یہ اس سے بھی زیادہ حسین ہے، جتنی اپنی سطح پر ہے۔

اسی لمحے ایک شریر لہر کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ آئی۔ ارجمند اور فوزیہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لہر واپس ہوئی تو دونوں گھروندے کھنڈر بن چکے تھے۔

''اللہ......! یہ کیا ہوا......؟'' فوزیہ نے تڑپ کر کہا۔

''دُکھ کیوں کرتی ہوں......؟ تم تو پاؤں مار کر گرانے والی تھیں اسے......؟''

''مجھے اپنے والے کا دکھ تھوڑی ہے......مگر آپ کا والا تو بہت اچھا تھا۔''

''میں نے کہا نا فوزی......! گھروندے تو خوب صورت خواب کی طرح ہوتے ہیں۔ آنکھ کھلی تو خواب ختم......لیکن خواب کی خوشی رہ جاتی ہے۔'' ارجمند نہ جانے کس کیفیت میں بول رہی تھی۔

''اور خوشی ہوا کے جھونکوں کی طرح ہوتی ہے۔ ہوا کا جھونکا ایک خوشگوار لمس چھوڑ کر گزر جاتا ہے۔ پل دو پل کے مہمان ہوتے ہیں یہ سب......!''

''آپ کو دکھ نہیں ہوا باجی......؟''

''نہیں......! دکھ کیوں ہوگا......؟ میرے پاس تو اس کی یاد رہ گئی ہے۔ جب یاد آئے گی، مجھے خوشی ملے گی۔ یہ گھروندا اصل گھروندا نہیں ہے فوزی......! اصل گھروندا تو دل میں بنتا ہے۔ اور کوئی لہر اسے ڈھا نہیں سکتی۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا باجی......!''

''کوئی بات نہیں......! بس میری باتیں یاد رکھنا۔ ایک وقت آئے گا کہ خود سمجھ میں آ جائیں گی یہ باتیں۔'' ارجمند نے کہا۔ پھر وہ عبدالحق کی طرف مڑی۔

''ایک اور انجوائے منٹ بھی ہے میرا آغا جی......! میں نے آپ کے پاس بہت سی سیپیاں دیکھی تھیں۔ الماری میں۔ وہ آپ کو کہاں سے ملیں......؟''

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہیں ان میں دلچسپی ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ارجمند نے اس سے کچھ پوچھا ہے۔

''یہیں سے جمع کرتا رہا ہوں میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں نے ان کے بارے میں پڑھا بہت ہے۔ دیکھیں آپ کی الماری میں، مجھے ان میں بڑی کشش محسوس ہوتی تھی۔ دیکھا تو اور بڑھ گئی۔''

عبدالحق کو خوشی ہوئی۔ وہ واقعی انجوائے کر رہی تھی۔

''تو اب جمع کرو سیپیاں......!''

"آپ نہیں چلیں گے......؟" ارجمند نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے کچھ مانگ رہی تھی۔ عبدالحق کو انکار کرتے ہوئے افسوس ہوا۔ لیکن وہ اس وقت کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔

"تم فوزیہ کے ساتھ جاؤ ارجی......! مجھے کچھ کام ہے۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو، یہاں بھی کوئی کام ہو سکتا ہے......؟

پھر وہ فوزیہ کا ہاتھ تھام کر ساحل کے متوازی سمت چلنے لگی۔

"خیال رکھنا...... یہ بڑا ارتکاز کا کام ہے۔" عبدالحق نے اسے پکارا۔

ارجمند ٹھٹکی اور اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"آدمی کو جستجو میں گم ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ اچھی سیپیاں نہیں ملتیں۔ میں تو یہاں آ کر خود کو بھول جاتا تھا۔"

"شکریہ آغا جی......! میں آپ کی بات یاد رکھوں گی۔"

عبدالحق چند لمحے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب اسے وہ کرنا تھا، جس کے لئے وہ یہاں رکا تھا، جس کے لئے اس نے ارجمند کی بات ٹالی تھی۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ خوش ہوگی۔

لیکن نورالحق اس کی گود میں تھا۔ اس نے رشیدہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، تاکہ بچے کو کچھ دیر کے لئے اسے دے دے۔ مگر آواز دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آبیہ اس کی طرف چلی آ رہی تھی اور رشیدہ جس طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس سے لگتا تھا رشیدہ نے ہی اسے بھیجا ہے۔

"لایئے بڑے صاحب جی......! چھوٹے صاحب کو مجھے دے دیں۔" آبیہ نے اس کے قریب آ کر کہا۔

عبدالحق نے بچے کو اس کی گود میں دے دیا۔ کبھی وہ بہت حیران ہوتا تھا۔ رشیدہ اور آبیہ اس کے بیٹے سے بہت محبت کرتی تھیں۔ یہی نہیں، وہ اس کا احترام کرتی

تھیں، حالانکہ وہ ابھی اتنا چھوٹا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے چھوٹے صاحب کہتی تھیں۔

عبدالحق کو اب جگہ کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سمندر آگے بڑھتا رہے گا۔ اسے ایسی جگہ منتخب کرنی تھی، جہاں ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی لہریں نہ پہنچ پائیں۔ وہ پیچھے کی طرف چل دیا۔

ایک جگہ رک کر اس نے سمندر کی سمت دیکھا...... اور بڑھتی اور بالآخر دم توڑتی لہروں کو بھی دیکھا۔ لہروں کے چھینٹے یہاں تک بھی آ رہے تھے۔

وہ اور پیچھے ہٹا، پھر اس جگہ رک کر اس نے طمانیت سے سر ہلایا اور وہاں ریت پر بیٹھ گیا۔ ریت وہاں بھی گیلی ہی تھی۔

اس نے اپنے جوتے اور موزے اتارے۔ پاؤں آگے رکھا اور گھروندا بنانے میں مصروف ہو گیا۔

نورالحق کو گود میں لئے آبیہ بھی اس کی طرف چلی آئی اور خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے انداز میں دلچسپی تھی۔

ذرا دیر میں وہ ایسا منہمک ہوا کہ اسے گردوپیش کا ہوش ہی نہیں رہا۔

ادھر ارجمند کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ایسی ریت اس نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ سرمئی رنگ کی ریت، جس پر سورج کی کرنیں منعکس ہوتیں تو لگتا کہ اس میں سونے کے ذرات بھی ملے ہیں، جو دھوپ میں چمک اٹھتے ہیں۔

ریت پر نظریں جما کر چلتے ہوئے اس پر خودتندیمی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کہیں چمک نظر آتی تو وہ رک کر دیکھتی۔ کوئی اچھی سیپ ہوتی تو وہ اٹھا کر اسے اپنے پرس میں ڈال لیتی۔ عام سیپیوں کو وہ نظرانداز کر رہی تھی اور وہاں کوڑیاں بھی تھیں۔ بعض کے ڈیزائن بہت غیر معمولی تھے۔ ایسی کوڑیوں کو بھی وہ اٹھا لیتی۔

"میں بھی جمع کروں باجی......؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں گڑیا......؟" اس نے بے دھیانی سے کہا۔

ادھر عبدالحق گھروندا مکمل کرنے ہی والا تھا کہ عارف، رضوانہ اور حمیدہ پلٹ کر اس کی طرف آئے۔ ان کے ساتھ رشیدہ بھی تھی۔

حمیدہ نے عبدالحق کو ریت پر بیٹھے دیکھا تو بولی۔

''دیکھو عارف......! کتنا بڑا گھروندا بنا رہا ہے میرا پتر...... پر اس وقت دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ ابھی بچہ ہی ہے۔''

''اللہ آپ کا سایہ اس کے سر پر رکھے...... آپ کی موجودگی میں تو بچہ ہی ہے۔'' عارف نے محبت سے کہا۔

رضوانہ کو اس کے لہجے میں ہلکی سی اداسی محسوس ہوئی۔

''اسے ٹوکئے گا نہیں اماں......!''

اور وہ اس کے پاس سے گزر گئے اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔ رشیدہ نے آبیہ کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ آبیہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ماں کے واضح اشارے کے بعد انکار نہ کر سکی۔

کچھ آگے جا کر عارف نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے پکارا۔

''عبدالحق......!''

عبدالحق نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسری پکار پر البتہ اس نے عارف کو دیکھ لیا۔

''جی عارف بھائی......!''

''ہم لوگ بائیں جانب والے باغ میں جا رہے ہیں۔ تم ارجمند اور فوزیہ کو لے کر وہاں آجانا۔ پھر کھانا کھائیں گے۔''

''جی عارف بھائی......!''

اور وہ پھر اپنے گھروندے میں کھو گیا۔

گھروندا مکمل کر کے اس نے اس کا جائزہ لیا، پھر طمانیت سے مسکرایا۔ گھروندا اس کی توقع سے بڑھ کر خوب صورت بنا تھا۔

اس لمحے پانی کی بہت ننھی منی چھینٹیں اس کے رخسار سے ٹکرائیں۔ اس نے پر تشویش نظروں سے دیکھا۔ سمندر کی پیش قدمی جاری تھی۔

''ارجمند جانے کہاں ہے......؟'' اس نے اللہ سے دعا کی کہ ارجمند کو دیکھنے سے پہلے یہ گھروندا موجوں کی نذر نہ ہو۔

اس نے اس کی طرف دیکھا، جدھر ارجمند اور فوزیہ گئی تھیں۔ وہ دونوں کافی

دور تھیں، اور آگے بڑھ رہی تھیں۔ فاصلہ اتنا تھا کہ اس کی آواز ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اور وہ اور آگے جانے کہاں تک جاتیں۔ گھروندا اتنی دیر نہیں بچ سکتا تھا۔

اس نے بے ساختہ زیر لب اسے پکارا۔

''ارجمند......!''

اور اسی لمحے اس نے ارجمند کو پلٹتے دیکھا۔

ارجمند کا رُخ اس کی طرف تھا۔ اسے اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ ارجمند براہِ راست اسے دیکھ رہی ہے۔

ارجمند نے پلٹ کر فوزیہ سے کہا۔

''چلو......! اب واپس چلیں......!''

''ٹھیک ہے باجی......! میں نے تو بہت سیپیاں جمع کر لی ہیں...... آپ سے بہت زیادہ......!''

''کوئی بات نہیں......! تو میں تم سے لے لوں گی۔''

''جی ضرور......!''

اور وہ واپس چل دیں۔

وہ وہاں پہنچیں تو عبدالحق سمندر کی طرف پشت کئے جیسے گھروندے کو بچا رہا تھا۔

''آپ یہاں ایسے بیٹھے ہیں آغا جی......؟''

عبدالحق نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''ارے واہ......! چچا جان نے بھی گھروندا بنایا ہے...... اور اتنا خوب صورت......!'' فوزیہ کی نظر گھروندے پر پڑی تو صوفیہ نے چہک کر کہا۔

تب ارجمند نے بھی اس گھروندے کو دیکھا۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ عبدالحق نے بنایا ہے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ جہاں خلا تھا، اس کے اوپر عبدالحق نے شاید انگلی سے بہت چھوٹا سا A لکھ دیا تھا۔

''کیا یہ اظہارِ محبت ہے......؟'' لیکن اس سوچ سے پہلے ہی دل نے اسے اثبات میں جواب دے دیا تھا۔

"تو آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں اس طرح.....؟" فوزیہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ عبدالحق سے مخاطب تھی۔

"گھروندے کو بچانے کے لئے.....!" عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

"پانی اب یہاں تک آ رہا ہے نا.....!"

ارجمند نے جھک کر عبدالحق کے لکھے ہوئے حرف A سے متصل ایک اور A اپنی انگلی سے بنا دیا۔ وہ دونوں ہی اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

"کیوں چچا جان.....؟ گھروندے کو کون بچا سکتا ہے.....؟"

"کوئی نہیں.....!" عبدالحق نے جواب دیا۔

"لیکن میں تم لوگوں کے آنے تک اسے بچانا چاہتا تھا۔"

اس جواب نے ارجمند کے دل کے اثباتی جواب کی مکمل تصدیق کر دی تھی۔ عبدالحق کو بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ کھسیایا، پھر گڑبڑا کر ایک طرف ہٹ گیا۔

"میں تمہیں دکھانا چاہتا تھا کہ میں بھی گھروندا بنا سکتا ہوں۔" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

اسی وقت ایک لہر گھروندے پر سے گزر گئی۔ فوزیہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ پیچھے کی طرف گئی۔ عبدالحق اور ارجمند وہیں کھڑے رہے۔

لہر پلٹ کر واپس گئی تو گھروندا حیرت انگیز طور پر اپنی جگہ موجود تھا۔ عبدالحق نے دیکھا کہ گھروندے پر اس کے لکھے ہوئے A کے ساتھ ایک اور A چمک رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ دوسرا A ارجمند نے لکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ فوزیہ دیکھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"بس اب فوراً چل دو.....سب لوگ کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

ارجمند بھی اس کی بات سمجھ گئی۔ وہ جلدی سے فوزیہ کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"آؤ چلیں.....!"

"وہ دیکھیں باجی.....! ایک اور لہر آ رہی ہے۔" فوزیہ نے کہا۔

اور وہ پچھلی لہر سے بڑی تھی۔ زیادہ آگے تک گئی۔ گھروندا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"اب چلو نا..... پھوپھا جان ناراض ہوں گے۔" ارجمند نے فوزیہ کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

فوززیہ اس کے ساتھ چلی۔ لیکن ان تینوں نے پلٹ کر دیکھا۔ واپس جاتی ہوئی لہر گزر گئی مگر گھروندا اب بھی سلامت تھا۔

"آپ کا گھروندا تو بہت مضبوط ہے چچا جان.....!"

"یہ بس اللہ کا کرم ہے گڑیا.....!"

اور اس کا گھروندا ڈھے گیا۔ لیکن وہ پوری طرح بکھرا نہیں تھا۔ وہ چھوٹا سا ایک کھنڈر لگ رہا تھا اور جہاں وہ دو حرف لکھے تھے، وہ جگہ اب بھی سلامت تھی۔ عبدالحق کو یقین تھا کہ دونوں A ابھی مٹے نہیں ہیں۔

"یہ گر کر بھی پوری طرح نہیں گرا ہے چچا جان.....! کس ترکیب سے بنایا تھا آپ نے.....؟"

"بتائیں نا آغا جی.....!" ارجمند نے بھی کہا۔

"میں نے کہا نا کہ یہ اللہ کی عنایت ہے۔"

"بے شک.....! لیکن یہ تو بتا دیں کہ اس میں اور میرے گھروندے میں کیا فرق تھا.....؟"

عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بس اتنا کہ میں نے اس کا دروازہ نہ سمندر کے آگے رکھا تھا نہ پیچھے.....وہ پہلو میں تھا۔ پانی تو اس میں گھستا تھا، لیکن براہِ راست نہیں اور فوری طور پر نہیں۔"

ارجمند نے فاخرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"واقعی.....! مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا.....!"

❁❁❁

عبدالحق بہت پریشان تھا۔ وہ بہت دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ پہلی بار صحیح معنوں میں اس کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ آدمی اپنے آپ سے کتنا بے خبر ہوتا ہے۔ اس

کے وجود میں کتنے تہ خانے ہوتے ہیں، اسے کبھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ یہ تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

دشواری یہ تھی کہ وہ سچا اور دیانت دار تھا، اور اپنا محاسبہ کرتے ہوئے خود سے نظریں چرانے کا قائل نہیں تھا۔

اور اس کا مسئلہ ارجمند تھی۔

نور بانو کی موت کے بعد وہ خود آگہی کے جن مراحل سے گزرا تھا، ان کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ صرف اللہ سے محبت کرے گا۔ اور دنیا کی ہر محبت صرف اللہ کو خوش کرنے کے لئے ہوگی۔ اس نے اللہ سے اس بات کا عہد کیا تھا۔

وہ عہد کرتے ہوئے وہ بے فکر تھا۔ اپنی دانست میں اسے ارجمند سے محبت ہرگز نہیں تھی۔ اس نے اس سے شادی صرف نور بانو کے مجبور کرنے پر کی تھی۔ اس سے محض چند روز کے تعلق کے بعد ایک طویل جدائی آ گئی تھی، اور وہ بھی نور بانو کی مہربانی سے تھی۔ لیکن اس جدائی میں اسے ارجمند کبھی یاد آئی اور نہ ہی اس کے ساتھ گزرا ہوا وقت۔ ہاں...... نور بانو کی کمی وہ شدت سے محسوس کرتا تھا۔

نور بانو کی موت کے بعد بھی اس صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ لاہور میں وہ اس کے ساتھ رہا۔ اس عرصے میں ارجمند نے اسے اپنی خدمت کا عادی بنا دیا۔ لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔

مگر کراچی آتے ہی صورتِ حال ایک دم بدل گئی۔ اور اس کا ذمہ دار رضوانہ اور عارف تھے۔ ان کے ہاں دعوت والی رات اس کے لئے سچ مچ سہاگ رات بن گئی۔ اس رات کا حسن اور اس کا تقدس وہ کبھی نہیں بھلا سکتا تھا۔

اس رات نے اور اس کے بعد کی کیفیات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جس طرح ارجمند کی طرف کھنچ رہا تھا، وہ اس کے لئے تشویش ناک تھا۔ اگرچہ اس رات کے بعد سے اب تک وہ اس کی قربت سے بچتا رہا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ جیسے ارجمند کے وجود میں اس کے لئے کوئی مقناطیس چھپا ہے، جو اسے کھینچتا رہتا ہے۔

وہ آنکھیں بند کر کے مسائل کو نظرانداز کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ تو غور کرنے، تجزیہ کرنے اور بات کی گہرائی تک پہنچنے والا آدمی تھا۔ چنانچہ اس نے اس

تبدیلی پر بھی غور کیا۔

غور کرنے پر جو کچھ اس کی سمجھ میں آیا، اس نے اس کی تشویش کو خاصا کم کر دیا۔ ارجمند کی کشش اس کے لئے غیر فطری ہرگز نہیں تھی۔ وہ شروع ہی سے حسن پسند تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی۔ اور وہ پوری سچائی سے کہہ سکتا تھا کہ ارجمند جیسی حسین لڑکی اس نے زندگی میں کبھی اور کہیں نہیں دیکھی۔ اور وہ اس کی منکوحہ تھی۔ تو اس کا اس کی طرف کھنچنا فطری تھا۔

دوسری طرف اس حقیقت نے کہ وہ ایک شادی شدہ مرد تھا اور جسم کے تقاضوں سے بے بہرہ نہیں تھا، اس کشش کو اور بڑھا دیا۔ اس پر یہ حقیقت کہ دو بیویوں کے ہوتے ہوئے نور بانو نے اپنی منت کے نام پر اسے تقریباً ایک سال تک فطری زندگی سے دور کر کے مایوسی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ ایسے میں تو وہ ارجمند کے لئے پاگل بھی ہو جاتا تو کم ہوتا۔

اب اس میں تشویش کی بات بس یہ تھی کہ یہ محبت، یہ تعلق، یہ کشش اللہ کی محبت کی خاطر نہیں تھی۔ یہ تو اس کے نفس کی وجہ سے تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ اللہ سے وعدہ کر کے پورا نہ کرنا نہایت تباہ کن ہے۔ اس میں تو سب کچھ برباد ہو جاتا۔

تو اب اسے بس اپنے نفس سے لڑنا تھا، اور یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ نور بانو کے حوالے سے وہ سمجھ چکا تھا کہ ازدواجی زندگی میں بھی نفس کو آزاد اور بے لگام چھوڑ دینا کتنا نقصان دہ ہوتا ہے۔

یوں اس کی اپنے نفس سے جنگ شروع ہو گئی۔

لیکن اس جنگ میں ارجمند کی خدمت گزاری اس کے لئے بڑی آزمائش بن گئی۔ اس کے پاؤں پر گرم پانی سے مساج کرتے ارجمند کے ہاتھ اس کو چھوتے تو اس کے جسم میں چنگاریاں سی اڑتیں۔ اور لمحوں میں شعلوں میں تبدیل ہو جاتیں اور جب وہ اس کے سر کی مالش کرتی تو اس کے وجود کی خوشبو اس کے مشامِ جاں میں سرور بن کر پھیلنے لگتی۔ اس کے ہاتھوں میں بجلی سی بھر جاتی، وہ مچلنے لگتے۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچتا، کھولتا، وعجیب سی تشنگی سی کیفیت تھی، جو اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ وہ ہر لمحہ خود کو اللہ سے کیا ہوا عہد یاد دلاتا۔ یہ نہ کرتا تو وہ یقیناً ہار جاتا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ارجمند کی خدمت سے جو آرام اور سکون اسے ملتا تھا، وہ اس سے محروم ہوگیا۔ خدمت کا ہر لمحہ اسے ساعتوں پر محیط معلوم ہوتا۔ وہ انتظار کرتا رہتا کہ کب یہ آزمائش ختم ہوگی۔ اس انتظار میں اس کے اعصاب چٹختے رہتے۔ اور آخر میں وہ بستر پر دراز ہوتا تو پہلے کی طرح پرسکون اور خوش نہ ہوتا، نہ پہلے کی طرح اسے لیٹتے ہی نیند آتی۔ اس کا جسم نڈھال ہوتا۔ دیر تک وہ کروٹیں بدلتا رہتا۔

آخر اس نے ارجمند کو روکنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس رات اس نے ارجمند سے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

''ایک بات کہوں ارجی......! تم برا تو نہیں مانو گی......؟''

ارجمند نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ایسے کیوں کہہ رہے ہیں آغا جی......! آپ تو مجھے حکم دے سکتے ہیں۔ آپ کا یہ لہجہ مجھ سے نہیں سہا جائے گا۔ مجھے لگے گا کہ مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔''

''یہ ایسی بات نہیں......اور تم جانتی ہو کہ حکم دینے کا میں قائل نہیں۔''

''مجھ سے آپ کا رشتہ حکم دینے ہی کا ہے۔'' ارجمند بولی۔

''اچھا......! کہیں نا......کیا بات ہے......؟''

''تم برا تو نہیں مانو گی......؟''

''آپ کو پورا اختیار دے دیا تو برا کیسے مان سکتی ہوں......؟''

''تم یہ سب کچھ کرنا چھوڑ دو......!'' عبدالحق نے ٹب کی طرف اشارہ کیا۔

ارجمند نے حیرت، صدمے اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

''اچھا نہیں لگتا آپ کو......؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''پوچھو کچھ نہیں......میں تمہیں سمجھا نہیں سکوں گا۔''

''جو حکم آپ کا......! لیکن اجازت ہو تو کچھ بتا دوں آپ کو......؟''

''کہو نا......! دیکھو نا......! میں نے تو یہ بات شرمندگی سے کی ہے۔ مجبوری نہ ہوتی تو کبھی نہیں کہتا۔''

''میرے لئے تو یہ اجر کا کام ہے۔ آپ مجھے اجر سے محروم کر رہے ہیں......؟''

''انشاء اللہ......! ایسا نہیں ہوگا۔'' عبدالحق نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''کیونکہ یہ میرے کہنے پر ہو رہا ہے۔ اس لئے تمہیں اجر ملتا رہے گا اللہ کے ہاں......بلکہ اللہ چاہے تو اجر بڑھ کر ہی ملے گا۔''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔

''اگر آپ کو اس سے تکلیف ہوتی تھی تو پھر یہ اجر والا کام تھا ہی نہیں......!''

''تم تو سکون کا سامان کر رہی تھیں۔ بے سکونی تو میری اپنی خرابی کی وجہ سے تھی۔''

یوں وہ معمول ختم ہوگیا۔ اس نے خود کو ایک نعمت سے محروم کرلیا۔ لیکن وہ مطمئن تھا کہ اللہ سے ایفائے عہد کرنا اس کے لئے اتنا دشوار نہیں رہا۔

لیکن کلفٹن والی پکنک پر جو کچھ ہوا، اس نے اس کی غلط فہمی یا خوش فہمی دور کر دی۔ یہ حقیقت اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی کہ وہ ارجمند سے محبت کرتا ہے، اور یہ کہ وہ محض نفس کا معاملہ ہرگز نہیں تھا۔

اس روز ارجمند نے ساحل پر اس کے لئے گھروندا بنا کر اس کے دل کے انجانے تاروں کو چھیڑ دیا۔ ارجمند کا وہ بالواسطہ اظہارِ محبت اسے بے خودی اور از رفتگی کی جن حدود میں لے گیا، وہ اس کے لئے بالکل نئی تھیں۔

ارجمند بہت سادگی سے بے لاگ اظہارِ محبت تو بہت پہلے کر چکی تھی۔ اور وہ اس سے بھی پہلے سے جانتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اس سلسلے میں خود نادرہ نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اسے اہمیت نہیں دی۔ اس کے نزدیک وہ کم عمری کی وہ محبت تھی، جو کسی کو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ درحقیقت وہ تو محبت سے محبت ہوتی ہے، کسی فرد سے نہیں۔ اور محبت کرنے والا جب شعور کی پختگی کی سرحد میں داخل ہوتا ہے تو وہ محبت مٹ جاتی ہے اور محبت کرنے والا بھی اس محبت کو یاد کر کے اپنی حماقت پر دل ہی دل میں ہنستا ہے۔

اس کا یہ نظریہ ارجمند سے شادی کے بعد بھی قائم رہا تھا۔

لیکن اس روز عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ تو خود بھی درحقیقت اپنے شعور کے بجائے اپنے لاشعور میں جی رہا تھا۔ وہ جو ایک عاقل و بالغ مرد تھا، جس نے عملی زندگی کے سرد و گرم دیکھے تھے، جس نے خود بھی محبت کی تھی۔

جو کچھ ہوا، سو ہوا۔ مگر بعد میں وہ سوچتا اور حیرت کرتا رہا کہ وہ خود سے بھی کتنا بےخبر تھا۔ اور جو خود سے بےخبر ہو وہ کسی دوسرے سے باخبر کیسے ہو سکتا ہے......؟

اس روز پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اپنی گنت خوبیوں کے علاوہ ارجمند میں ایک باطنی خوب صورتی اور بھی تھی۔ وہ بہت لطیف احساساتِ اور نازک سوچوں والی لڑکی تھی۔

ارجمند سیپیوں کی تلاش میں چلی گئی، اور وہ اس کے لئے گھروندا بنانے کی فکر میں لگ گی۔ وہ ساحل پر کافی پیچھے چلا آیا۔ کیوں......؟ وہ جانتا تھا کہ سمندر آگے بڑھ رہا ہے، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارجمند کے لئے بنایا ہوا اس کا گھروندا ارجمند کے دیکھنے سے پہلے ہی ڈھے جائے۔ وہ گھروندا بنا کر اسے دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا شعوری طور پر احساس نہیں تھا۔ یہ بات تو اب بعد میں غور کرنے پر وہ سمجھ رہا تھا۔

اور وہ گھروندا بنا کر ارجمند کو دکھانا کیوں چاہتا تھا......؟ اس نے خود سے پوچھا۔

وہ گھروندا اس کا جوابی اظہارِ محبت تھا۔

وہ اس وقت اپنی اسٹڈی میں کھلی کتاب سامنے رکھ کر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس جواب پر گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا، جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے کا ڈر ہو۔

اس نے تردید کرنی چاہی لیکن جان لیا کہ یہ بےسود ہے۔ حقیقت سے نظریں چرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

وہ کلفٹن کے ساحل کے اس منظر میں پھر سے جینے لگا......خوشی اور لذت کے لئے نہیں، اپنے محاسبے کے لئے۔

ان لمحوں میں گروندا بناتے ہوئے وہ نہ کچھ سوچ رہا تھا نہ سمجھ رہا تھا۔ اسے تو بس ایک دھن تھی، ارجمند کی اشاراتی گفتگو اسے ایک ایسی بےخودی کی کیفیت میں

چھوڑ گئی تھی، جس میں وہ کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اسے تو اپنے وجود میں چھپی ایک نامعلوم قوت کے حکم پر عمل کرنا تھا۔

گھروندا مکمل کرتے کرتے اس پر پانی کی چھینٹیں گریں۔ سمندر اس کی توقع سے کچھ تیز ہی بڑھ رہا تھا۔ وہ گھروندے کو اوٹ میں لے کر بیٹھ گیا۔ لیکن جانتا تھا کہ زیادہ دیر اسے نہیں بچا سکے گا۔

اس نے اس طرف دیکھا، جدھر ارجمند اور فوزیہ گئی تھیں۔ وہ کافی دور تھیں۔ اتنی دور کہ ان تک اس کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اور اس کی طرف ان کی پیٹھ تھی۔ اشارہ سے بھی بات نہیں بنتی۔

تو کیا اس گھروندے کو موجیں ڈھا دیں گی، اور ارجمند اسے دیکھ بھی نہیں پائے گی۔ اس نے سوچا۔ اسے بڑی شدت سے بےبسی کا احساس ہوا۔ اور اس نے بےساختہ زیرِلب ارجمند کا نام لیا۔

اور اگلے ہی لمحے جیسے کرشمہ ہو گیا۔

اب وہ یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ پہلے ارجمند نے پلٹ کر دیکھا یا پہلے اسے اپنے جسم میں سنسناہٹ کا احساس ہوا۔ بہرحال ارجمند براہِ راست اسے دیکھ رہی تھی۔ اس بات کا اسے یقین تھا۔ اور یہ بات بھی اس نے بغیر کسی اشتباہ کے سمجھ لی تھی کہ اس لمحے اس کے اور ارجمند کے درمیان ایک واضح رابطہ قائم ہوا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے وجود میں کیف و انبساط کی ایک لہر گردش کرنے لگی۔

اور ارجمند فوزیہ کے ساتھ اس کی طرف آنے لگی۔ دیکھنا تو محال تھا، لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا کہ ارجمند کے انداز میں عجلت ہے۔

وہ پانی کی طرف پیٹھ کئے گھروندے کو بچاتا رہا۔ پانی بڑھ رہا تھا۔ اس کی قمیص پیٹھ پر بھیگ گئی تھی۔ اسے اس وقت صرف اس بات کی فکر تھی کہ کہیں گھروندا بہہ نہ جائے۔

اور وہ آ گئیں......!

ارجمند نے اسی سے کچھ کہا، مگر اس نے نہیں سنا۔ البتہ فوزیہ نے گھروندے کو پہلے دیکھا تو وہ چونکا۔ اس کی نظر گھروندے پر پڑی۔ اس کے دروازے کے خلا کے

اوپر ایک A چمک رہا تھا۔ وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔

"یہ کہاں سے آ گیا......؟" اس نے سوچا۔ جواب صاف تھا۔ کوئی اور وہاں تک آیا ہی نہیں تھا۔ خود اس نے ہی گھروندا مکمل کرنے کے بعد انگلی سے وہاں یہ A بنایا ہوگا......A......ارجمند کے نام کا پہلا حرف۔

اب وہ شعوری حدوں میں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارجمند اور فوزیہ یہ دیکھیں۔ خاص طور پر فوزیہ کی نظروں میں اس بات کا آنا تو وہ گوارہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے حماقت سرزد ہوئی ہے۔ بچوں کی سی ناسمجھی۔ گھروندا نہ جانے کس رو میں اس نے بنایا تھا کہ کسی بات کا خیال ہی نہیں رہا۔ ابھی فوزیہ...... یا خود ارجمند پوچھ لے کہ یہ گھروندا کس کا ہے تو وہ کیا کہے گا......؟ جھوٹ بولنا پڑے گا اسے۔

بہرحال پہلا مسئلہ تو گھروندے پر انگلی سے لکھے حرف کی طرف فوزیہ کو متوجہ ہونے سے روکنا تھا۔

اسی لمحے فوزیہ نے پوچھ لیا کہ وہ یہاں اس طرح کیوں بیٹھا ہے......؟ صرف A کی فکر میں غلطاں، اس نے ایک اور حماقت کی اور کہہ دیا کہ وہ گھروندے کو بچانے کے لئے وہاں اس طرح بیٹھا ہے۔

اس پر فوزیہ نے ایک اور سوال کیا۔ اور اس نے اس کا بھی گڑبڑا کر جواب دیا۔ وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ کہاں تو وہ گھروندے کو بچانے کے لئے بھیگ رہا تھا۔ مگر ایک دم اس کا جی چاہا کہ کوئی تند موج آئے اور گھروندے کو گرا دے۔ کچھ یہ سوچ کر اور کچھ گھروندے پر لکھے حرف کو چھپانے کے لئے وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور گھروندے کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ناکام رہا ہے۔

اس نے کن انکھیوں سے گھروندے کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہاں اس کے لکھے ہوئے A کے برابر ایک اور A موجود تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے سمجھ لیا کہ یہ دوسرا A ارجمند نے لکھا ہے۔

اس نے ان لوگوں سے بائیں باغ کی طرف چلنے کو کہا اور خود بھی بڑھ گیا۔

خوش قسمتی سے ایک لہر فوراً ہی گھروندے پر سے گزر گئی۔

اس وقت اس کی کیفیت عجیب تھی۔ وہ پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ارجمند کے اور اس کے درمیان ایک مکمل رابطہ ہے۔ وہ کچھ کہے بغیر ایک دوسرے کی بات سمجھ رہے تھے۔ تبھی تو ارجمند نے صوفیہ کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"آؤ......چلیں......!"

اور وہ خود اس سے پہلے ہی چل پڑا تھا۔

بعد میں اپنی اسٹڈی میں بیٹھ کر اس پر سوچتے ہوئے اسے یاد آیا کہ گھروندے وہ پہلے بھی بنا چکا ہے۔ ٹھاکروں کی گڑھی میں ندی کنارے ویر جی...... وصال دین کے ساتھ۔

اس کی نگاہوں میں لڑکپن کے وہ منظر پھر گئے۔ برسوں کے بعد اسے ویر جی یاد آئے تھے۔

لیکن اس کا مسئلہ اپنی جگہ تھا۔ وہ گھروندا اس نے ویر جی کی یاد میں نہیں بنایا تھا۔ وہ اس نے ارجمند کے لئے بنایا تھا۔ اور وہ گھروندا اس کے اعتراف کا مظہر تھا کہ وہ بھی ارجمند سے محبت کرتا ہے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ یہ اس کے لئے ایک افتاد تھی...... ناگہانی افتاد......!

محبت اور افتاد......؟ وہ بھی اس شخص کے لئے جو صرف محبت کی خاطر جینا چاہتا تھا۔

"یہ ہوا کیا ہے آخر......؟"

وہ بیٹھا سوچتا رہا، خود کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ سمجھنا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ اس کے لئے وقت میں پیچھے کی طرف جانا اور خود پر غور کرتا تھا۔ کب سے اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔

وہ بھی بنیادی طور پر نازک احساسات اور لطیف جذبات رکھنے والا تھا۔ یہ بات اس پر اس وقت کھلی تھی، جب محبت کو سمجھنے کی کوشش میں وہ اُردو شاعری کی طرف راغب ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے اُردو کے استاد نے اس کی بڑی رہنمائی کی تھی۔

اُردو شاعری میں، خاص طور پر اُردو غزل میں دو بڑی جہتیں تھیں...... ایک رومانویت اور دوسرا تصوف۔ تصوف، جسے اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ عشق ہے۔ اور اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ عشق بندوں کے درمیان نہیں ہوتا۔ وہ تو بہت بلند اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ وہ ایک اصطلاح ہے، جسے بلاوجہ عامیانہ رنگ دے دیا گیا ہے۔ ورنہ عشق تو بس اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے ہے۔ اور اگر بندوں کے درمیان بھی ہو تو اس میں نفس اور جسم کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ عشق اس کی حقیقی منزل ہے۔ لیکن کم عمر ہونے کی وجہ سے وہ اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے محبت کے پھیر میں پڑ گیا تھا۔ ویسے بھی محبت، عشق کی راہ کا لازمی پڑاؤ ہے۔ جسے محبت کرنی نہیں آتی، وہ عشق بھی نہیں کر سکتا۔

اُردو شاعری میں محبت کے بھی دو رُخ تھے۔ ایک نازک اور لطیف احساسات والا، اور دوسرا ابتذال...... سراسر نفس، ہوس ہی ہوس۔

ابتذال کو تو اس نے ابتداء ہی میں مسترد کر دیا۔ اس کی طبع سے اس کا میل ہی نہیں تھا۔ سو شاعری نے اس کے نازک اور لطیف احساسات کو مہمیز کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ محبت کی جستجو میں لگا رہا۔ کالج میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی تھی، مگر اس کی نگاہ کبھی نہیں بہکی۔

اور پھر وہ قرآن پڑھنے والی ایک آواز کا اسیر ہو گیا۔ اسے اس سے محبت ہو گئی۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ عشق کی ابتدائی صورت تھی۔

اسے اس آواز کی مالک لڑکی کی صورت شکل، جسم سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کبھی اسے اس کو دیکھنے کی خواہش ہوئی تو وہ فطری تھی۔ لیکن موقع ملنے کے باوجود اس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسے عشق کی حرکت کا اور محبوب کی ناموس کا پاس تھا۔ اسی میں اس کے لئے طمانیت اور خوشی تھی۔

پھر جب اس نے نور بانو کو دیکھا اور پہچانا تو بھی اس کی محبت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کا جذبہ آزمائش کی کسوٹی پر پورا اترا۔ اسے ادراک تھا کہ نور بانو واجبی شکل وصورت کی لڑکی ہے۔ کالج میں بہت حسین لڑکیاں اس پر ملتفت رہیں، لیکن کوئی اس کے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ مگر نور بانو کو دیکھنے کے بعد اس کی محبت اور شدید ہو گئی۔

الٹا وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ نور بانو کے قابل نہیں ہے۔ اپنے ادراک کے باوجود نور بانو اسے دنیا کی حسین ترین لڑکی لگتی تھی، اور آج اسے یاد کرنے پر بھی وہی تصور سامنے آتا تھا۔

مگر پہلے جسمانی لمس نے اس محبت کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ جسمانی اور نفسانی خواہشوں سے آلودہ ہو گیا۔ وہ احساسِ گناہ سے نڈھال ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ صرف نکاح کے دامن میں ہی اسے پناہ مل سکتی ہے۔

اماں نے شادی سے پہلے اسے نور بانو کی حاسدانہ، قابضانہ فطرت کے حوالے سے خبردار کیا، بلکہ شادی سے باز رکھنے کی ہلکی سی کوشش بھی کی۔ مگر ایک تو نور بانو سے اس کی محبت سچی تھی، دوسرے شادی اس کے لئے عملی توبہ بن گئی تھی اس جسمانی لمس کی وجہ سے۔ اب وہ یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر وہ معاملہ نہ ہوتا، تب بھی وہ اماں کی بات اس طرح نظر انداز کرتا۔

وہ سوچنے اور تجزیہ کرنے بیٹھا تو شعور اور لاشعور کے درمیان کی دیوار گر گئی۔ جو کچھ پہلے لاشعور میں رہا تھا، اور اس نے اسے شعور تک نہیں آنے دیا تھا، اب شعور کی روشنی میں آ گیا۔

نور بانو اس سے محبت کرتی تھی، لیکن وہ خالص جسمانی اور نفسانی محبت تھی۔ اسے اس کے اچھے یا برے ہونے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے نزدیک شاید اسے اپنا اسیر بنائے رکھنے کے لئے نور بانو کے خیال میں جسم کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ بس اسے اپنے جسم میں الجھائے رکھنا چاہتی تھی۔ بلکہ جس طرح نور بانو نے اسے نماز کی طرف سے غفلت میں مبتلا کیا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ اسے اللہ کے ساتھ شیئر کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں تھی۔ اس چکر میں وہ خود بھی اللہ، نماز اور قرآن سے دور ہو گئی۔ حالانکہ وہ اسے ملا ہی قرآن کے حوالے سے تھا۔

یہ بات نہیں کہ عبدالحق اپنے حصے کا الزام نور بانو کے سر رکھ رہا ہو۔ وہ تو خود کو ہی ذمہ دار سمجھتا تھا۔ مجرم تو وہی تھا۔ اسے اپنا بھی خیال رکھنا تھا اور نور بانو کا بھی۔ لیکن محبت نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اس نے نور بانو کو کبھی نہیں ٹوکا۔

اور اب وہ یہ سوچ کر شرمندہ ہو رہا تھا کہ جو محبت محبوب کی فلاح کا خیال نہ رکھ سکے، وہ اچھی محبت تو نہیں کہلا سکتی۔ بلکہ شاید وہ محبت کہلانے کی مستحق نہیں۔

بہر حال اب نور بانو نہیں تھی۔ وہ تو ہوا کا جھونکا تھی، جو گزر گیا تھا اور اب اس کا لمس بھی مٹتا جا رہا تھا۔

اب اس نے ترجیحات متعین کر لی تھیں، منزل کا انتخاب کر لیا تھا، تو ایک بار پھر محبت عشق کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

سوال یہ تھا کہ یہ ہوا کیسے......؟

وہ قرآن فہمی اور اپنی نیکی کے حوالے سے ارجمند کی بہت قدر کرتا تھا۔ مگر وہ اس سے اغماض برتتا تھا۔ اس کا گمان تھا کہ وہ اس سے محبت ہرگز نہیں کرتا ہے۔ لیکن پکنک والے دن یہ گمان بھی بالکل غلط ثابت ہوا۔

''وجہ کیا تھی......؟''

نور بانو سے اس کے تعلق میں نزاکت، لطافت اور خوب صورتی ہرگز نہیں تھی، جس کی اسے طلب تھی۔ اس محرومی کے احساس کو اس نے لاشعور کی تاریکیوں میں چھپا رکھا تھا۔ ساحل پر گھروندے کے حوالے سے ارجمند نے جو گفتگو کی، اس سے ایک طرف تو اسے کچھ پالینے کا احساس ہوا، اور دوسری طرف برسوں کی محرومی کا احساس ابھر آیا۔ اس کے دل تک ارجمند کی محبت اپنی پوری شدت کے ساتھ اتنی آسانی سے اور ایسے موثر انداز میں پہنچی کہ نور بانو کی محبت برسوں میں ایسا نہیں کر سکی تھی۔ اس محبت کی لطافت اور نزاکت نے اسے بے خود کر دیا۔ اس بے خودی میں اس نے گھروندا بنایا، جو اس کا جوابی اظہارِ محبت تھا اور جب اس نے بے خودی کی کیفیت سے نکل کر اسے سمجھا تو یہ بھی جان لیا کہ وہ اظہارِ محبت شاید برسوں سے اس کے لاشعور میں چھپا ہوا تھا۔ وہ برسوں پہلے ارجمند کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہات کے تحت وہ خود سے بھی اس محبت کو چھپاتا رہا۔ بنیادی وجہ تو نور بانو تھی، جو یہ برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کی اور ارجمند کی عمر میں بہت بڑا فرق تھا۔ یہ تو لاشعوری وجوہات تھیں اور شعوری وجہ یہ تھی کہ اس کے خیال میں ارجمند کی محبت بچپن کی حماقت تھی، جس کی بالآخر اصلاح ہو جانی تھی۔

ایک بات اطمینان کی تھی۔ ارجمند پر اس نے کبھی نفس کا غلبہ نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کے انداز میں کوئی نفسانی جھلک بھی کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ تو جیسے

بس اس کی مرضی کی پابند تھی۔ وہ چاہے تو وہ سراپا سپردگی تھی، ورنہ محض ایک خدمت گزار بیوی تھی۔

ایک مسئلہ یہ تھا کہ جسم اور نفس یہاں بھی موجود تھا۔ وہ بہت خوب صورت اور پرکشش تھی، اور وہ بڑی شدت سے اس کا طلبگار تھا۔ اسی بات سے ڈر کر تو اس نے ارجمند کو خدمت کی قربت سے بھی روک دیا تھا۔

اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ اس نے بہت دیر کر دی۔ بہت وقت ضائع کر دیا۔ نزاکت احساس، لطیف سوچوں اور خوب صورتی سے معمور یہ محبت تو اس کا خواب تھی، لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے خود کو بروقت روک لیا۔ یہ وہ کیا کر رہا ہے......؟ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ سب تو یوں ہی ہونا تھا۔ اور اس میں شاید اس کے لئے آزمائش ہے۔ عشق کا دعویٰ کوئی آسان ہے......؟

بہر حال اب وہ محبت اس کے لئے نہیں تھی۔ وہ تو اللہ سے ایک عہد کر چکا تھا۔ لیکن اس نے سمجھ لیا کہ اس سلسلے میں ارجمند سے بات کرنا ضروری ہے۔ اس میں ارجمند کی بھی آزمائش ہے۔ دیکھا تو جائے کہ اس کا ردِعمل بھی کہیں نور بانو جیسا تو نہیں ہوتا۔ ہوا بھی تو کوئی بات نہیں۔ نور بانو کی بار وہ بے خبر تھا، جبکہ اب وہ پوری طرح چوکنا ہے۔

ارجمند نے اب تک اس پر قبضہ جمانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اسے سب کے ساتھ شیئر کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اسے اللہ کے ساتھ شیئر کرتی ہے یا نہیں......؟ اگر ایک مشاہدے کی وجہ سے اس کے دل میں شک نہ پیدا ہوا ہوتا تو وہ کبھی اس میں شبہ نہ کرتا۔ کیونکہ نور بانو کے برعکس ارجمند نے ہمیشہ اسے سختی کے ساتھ فجر کی نماز کے لئے جگایا تھا۔ اور وہ خود بھی اپنی نماز سے بے فکر نہیں ہوئی تھی۔

اور وہ مشاہدہ نور الحق کے بارے میں تھا۔

نور الحق کی دیکھ بھال کے لئے رشیدہ اور آبیہ بھی موجود تھیں لیکن ارجمند حتی الوسع نور الحق کو اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ وہ اسے خود سے دُور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بات عبدالحق کو غیر فطری لگتی تھی۔ ارجمند کم عمر تھی، ماں بننے کا اسے تجربہ نہیں ہوا تھا۔

چھوٹے بچے بھی اس نے بہت زیادہ نہیں دیکھے تھے۔ پھر نورالحق سے اتنی وابستگی بھی غیر ضروری ... یہ مکاری بھی ہو سکتی ہے ...؟ دکھاوا بھی....؟ اور وہ اس پر قابض ہونے کی ترکیب بھی.....؟

یہ بات اسے محتاط رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

❁❁❁

ارجمند بہت خوش تھی۔ اس نے جتنا مانگا تھا، اسے اس سے بہت زیادہ مل گیا تھا۔

اس نے عبدالحق سے محبت کی نہیں تھی، اسے تو عبدالحق سے محبت ہوگئی تھی۔ اور اس محبت نے اسے اللہ تک پہنچا دیا تھا۔ ایسی فیض رساں محبت کے بعد آدمی بھلا کچھ اور مانگ سکتا ہے.....؟

لیکن انسان کی فطرت ہے کہ وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کی طلب تو درخت کی مانند ہوتی ہے، جس میں نت نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں، شاخیں بڑھتی ہیں، درخت گھنا ہوتا رہتا ہے۔ اس نے جو بچپن گزارا تھا، اس نے اسے سوچنے اور غور کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ تنہائی کا یہی تو سب سے بڑا انعام ہوتا ہے۔ اس کے پاس پھپھو کے سوا تھا ہی کیا.....؟ اور وہ بھی اسے کم ہی ملتی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے بڑا کام کیا تھا۔ وہ اسے اچھی اچھی باتیں بتاتی تھیں۔ انہوں نے اسے قرآن سے جوڑ دیا تھا۔ اللہ کا راستہ دکھا دیا تھا۔

اور وہ کم عمر تھی، اور جانتی تھی کہ بے شک اس پر اللہ کی بڑی عنایت تھی۔ اللہ پاک خود اس کی رہنمائی فرماتے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو اس کی طلب کا درخت بھی خوب گھنا ہوگیا ہوتا۔ اللہ نے اسے کم عمری میں ہی ایسا یقین عطا فرمایا تھا۔ وہ تو بس اللہ کے وعدے پر تکیہ کر کے بیٹھ رہی تھی۔

اب وہ پیچھے جا کر دیکھتی اور سوچتی تو سمجھ میں آتا کہ عبدالحق کی محبت اسے اللہ نے عطا فرمائی تھی، اور وہ اپنی جگہ ایک مکمل نعمت تھی۔ اس کے بعد تو کسی طلب کا جواز ہی نہیں تھا۔ اللہ کی رحمت اور اس محبت نے مل کر اس کے لئے ایک روشن راستہ متعین کر دیا تھا۔ اسے ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اس کے باوجود اس محبت سے طلب کی ایک شاخ پھوٹی تھی۔ یہ کہ عبدالحق اسے مل جائے۔ وہ بس یہ چاہتی تھی کہ اس کے نام کے ساتھ عبدالحق کا نام جڑ جائے اور شاید وہ کم عمر تھی۔ بہت کچھ جانتی سمجھتی نہیں تھی، اسی لئے طلب اس سے آگے نہیں بڑھی۔ ورنہ تو طلب سے طلب نکلتی ہی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی رحمت تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا۔ اسے صبر اور یقین عطا فرمایا اور اس کی طلب کو وہیں روک دیا۔

پھر اللہ نے وعدہ پورا فرمایا اور کہانیوں جیسی صورتِ حال میں وہ عبدالحق سے جڑ گئی۔ پھر اللہ کی رحمت نے اسے سہارا دیا۔ وہ خوشی میں آپے سے باہر نہیں ہوئی۔ اس نے اللہ کی شکرگزاری کو معمول بنا لیا۔ اور اس نے اللہ کے حکم کے مطابق اس کی بھی شکرگزاری کی، جسے اللہ نے اس کے خواب کی تعبیر کے حصول کا ذریعہ بنایا تھا...... یعنی نوربانو......اور اس نے اس تشکر کو آخری حد تک نبھایا۔

اور جب وہ عبدالحق سے جڑ گئی تو جو اسے ملا تھا، وہ اس پر قانع، مطمئن بلکہ خوش و خرم ہوگئی۔ اس نے اتنا ہی کچھ مانگا تھا۔ اس نے اپنے اندر طلب کے نہ ختم ہونے والے تقاضوں کو سر اٹھانے ہی نہیں دیا۔ وہ کبھی اس بات پر نہیں جھنجلائی کہ اتنی جلدی اسے عبدالحق سے اتنا دور کر دیا گیا۔ وہ نارسائی اس کے لئے تعزیر کبھی نہیں بنی۔ وہ تو اللہ کا شکر ادا کرتی تھی کہ اس نے صرف عبدالحق کا شرعی ساتھ مانگا تھا، اللہ نے اسے اس کے بچے کی ماں ہونے کا اعزاز بھی عطا فرما دیا۔ اس کے لئے اتنا کافی تھا کہ وہ اس اعزاز کے بارے میں جانتی ہے۔ تبھی تو اس نے وہ اعزاز اپنی خوشی سے نوربانو کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس نے نوربانو کی احسان شناسی کا رشتہ بہت دور تک نبھایا۔

یہ کراچی اس کے لئے بہت مبارک شہر تھا۔ یہاں اللہ نے اسے کھوئی ہوئی پھوپھی کا متبادل عطا فرمایا، اور اس کے توسط سے اسے وہ خوب صورت رات عطا فرمائی، جس نے اسے سیر چشم کر دیا۔ ایسی ایک رات کے سامنے تو عمر بھر کی محرومی بھی ہنسی خوشی برداشت کی جا سکتی ہے۔

اس نے اس رات کی آرزو نہیں کی تھی۔ وہ تو اس میں بہت خوش تھی کہ وہ ایک استحقاق کے ساتھ عبدالحق کی خدمت کرتی ہے۔ اس کے پاؤں دھوتی ہے، اس کی تھکن اتارتی ہے، اس کے سر میں تیل لگاتی ہے۔ وہ جب پُرسکون ہو کر سو جاتا تو وہ

اسے دیکھ کر خوش ہوتی۔

اس رات عبدالحق کی وارفتگی اور اس کے والہانہ انداز نے اسے بہت بڑی خوشی دی تھی۔ لیکن اسے یہ خیال ہرگز نہیں آیا کہ اس کے پیچھے محبت کارفرما ہے۔ وہ تو بس فطری تقاضوں کی وجہ سے تھا۔ اس نے اللہ سے عبدالحق کو مانگا تھا، اس کی محبت کبھی نہیں مانگی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق نوربانو سے محبت کرتا ہے، اور اس جیسے لوگ زندگی میں بس ایک ہی بار محبت کرتے ہیں۔

جب عبدالحق نے اسے اس کی خدمت گزاری کے معمول سے روکا تو اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ اس کے خیال میں عبدالحق کا ردِعمل فطری تھا۔ جو کچھ اس رات ہوا، وہ عبدالحق کو نوربانو سے بے وفائی لگا ہوگا، اور وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ آئندہ ایسا ہو۔ اور اس کے لمس سے بشری تقاضے سر اٹھاتے ہوں گے، اس لئے عبدالحق نے اسے روک دیا۔

''کوئی بات نہیں......!'' اس نے دل میں سوچا۔

''میرے لئے یہ بہت ہے کہ میں ان کی بیوی ہوں، ان کی خلوت کی ساتھی ہوں۔''

لیکن کلفٹن کی پکنک اس کے لئے یادگار بن گئی۔

وہ فوزیہ کے ساتھ سیپیاں چننے چلی گئی تھی۔ اور وہ اس میں منہمک تھی۔ اچانک اس نے عبدالحق کی پکار سنی۔

''ارجمند......!''

آواز بہت...... بہت قریب سے آئی تھی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ اور اگلے ہی لمحے بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ پکار اس کے اندر سے ابھری تھی۔ اور اس کا مطلب تھا کہ عبدالحق اسے بلا رہا ہے۔

اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس سے پہلے صرف ایک بار ایسا ہوا تھا، اور وہ قرآن پڑھتے ہوئے ہوا تھا۔ اس وقت وہ لاہور میں تھی اور عبدالحق کراچی میں تھا۔ دونوں ایک ہی وقت میں قرآن کی ایک جیسی آیات پر غور کر رہے تھے۔ اس وقت اس نے عبدالحق کی موجودگی محسوس کی تھی۔

لیکن یہاں عبدالحق نے اسے پکارا تھا اور وہ پکار اس تک پہنچی تھی۔

اس نے سر گھما کر اس طرف دیکھا، جہاں اس نے عبدالحق کو چھوڑا تھا۔ وہاں بہت سے لوگ تھے، لیکن عبدالحق ان میں نہیں تھا۔ فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ عبدالحق وہاں نہیں ہے۔

بہرحال وہ اس پکار کے جواب میں فوزیہ کو ساتھ لے کر چل دی۔ اس دوران وہ ساحل کو نظروں سے ٹٹولتی رہی۔ پھر عبدالحق اسے نظر آ گیا۔ نظر آنا تو اسے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ فاصلہ اب بھی زیادہ تھا۔ لیکن وہ عبدالحق کو بہت دور سے بھی پہچان سکتی تھی۔

وہ عبدالحق ہی تھا، جو سمندر کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا، اور وہ اس مقام سے خاصا پیچھے تھا، جہاں اس نے اسے چھوڑا تھا۔

اس وقت وہ بہت خوش تھی۔ جو رابطہ اللہ کی رحمت سے اس کے اور عبدالحق کے درمیان قائم ہوا تھا، وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ عبدالحق بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ عبدالحق اعتراف کرے یا نہ کرے، اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

اس کی ہر سانس اس وقت اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اسے وہ عطا ہوا تھا، جو اس نے مانگا بھی نہیں تھا۔ عبدالحق کی محبت، اس کے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت تھی۔

لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے اس سے بھی سوا ملا ہے۔ اللہ کی رحمت ٹوٹ کر برسی تھی۔

وہ عبدالحق کے بنائے ہوئے خوب صورت گھروندے کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ تو اس کی سمجھ میں بعد میں آیا کہ وہ خوشی تو سمندر کی طرح تھی...... موج در موج...... پہلی وہ پکار جو فاصلوں کے باوجود اس تک پہنچی۔ پھر وہ گھروندا، جس نے اسے احساس دلایا کہ اس کے اور عبدالحق کے درمیان کیسی ہم آہنگی ہے۔ اس نے جان لیا کہ عبدالحق بھی محبت میں لطافت کا قائل ہے۔

پھر تیسری موج......!

اس نے گھروندے پر لکھا اپنے نام کا پہلا حرف دیکھا......A

A سے عبدالحق کا نام بھی آتا تھا۔ لیکن اس کے اندر ایسا یقین تھا کہ اس نے جان لیا کہ یہ اس کے نام کا A ہے۔

اور اس کا مطلب.....؟

گھروندے کے بارے میں اس نے فوزیہ سے جو گفتگو کی تھی، درحقیقت اس کا مخاطب عبدالحق تھا۔ اور عبدالحق نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی۔ اسے وہ سمجھ سکتی تھی کہ عبدالحق نے سیپیاں چننے کے لئے اسے فوزیہ کے ساتھ کیوں جانے دیا.....؟ خود ساتھ کیوں نہیں گیا.....؟

وہ اس کے لئے گھروندا بنانا چاہتا تھا۔

اور وہ گھروندا اس کا اظہارِ محبت تھا۔ اگر وہ اس پر اس کے نام کا پہلا حرف نہ لکھتا، تب بھی وہ سمجھ جاتی۔ ان کے درمیان رابطہ ہی ایسا تھا۔ لیکن عبدالحق نے کوئی ابہام نہیں چھوڑا۔

عبدالحق گھبرایا ہوا تھا، اور کھسیا رہا تھا۔ فوزیہ اس سے سوال کر رہی تھی۔ ارجمند نے موقع پا کر عبدالحق کے لکھے ہوئے A کے ساتھ انگلی سے ایک اور A بنا دیا۔

اور چوتھی موج.....!

فوزیہ نے پوچھا۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں اس طرح.....؟''

اور عبدالحق جیسے کسی کیفیت میں گم تھا۔ اس نے بے سوچے سمجھے کہا۔

''گھروندے کو بچانے کے لئے۔ پانی اب یہاں تک آ رہا ہے نا.....!''

''کیوں چچا جان.....! گھروندے کو کون بچا سکتا ہے.....؟''

''کوئی نہیں.....!'' عبدالحق نے جواب دیا۔

''لیکن میں تم لوگوں کے آنے تک اسے بچانا چاہتا تھا۔''

ایک اور موج.....!

وہ اسے یہ گھروندا دکھانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ذریعے اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ گھروندے کو بچانے کے لئے وہ سمندر کی طرف پشت کر کے بیٹھا تھا، وہ اس کی قمیص خاصی بھیک گئی تھی۔

عبدالحق کو احساس ہوا کہ بے خودی میں وہ کیا کہہ رہا ہے.....؟ وہ گڑبڑا کر ایک طرف ہٹا۔ تب اس نے گھروندے کے دروازے پر اپنے لکھے ہوئے A کے برابر ایک اور A دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔

''بس اب فوراً چل دو.....!''

ارجمند سمجھ گئی کہ وہ نہیں چاہتا کہ فوزیہ ان حروف کو دیکھے۔ وہ خود بھی یہ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے فوزیہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

''آؤ چلیں.....!''

وہ پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ گزرتی ہوئی موجیں بھی اس گھروندے کو نہیں ڈھا سکیں۔ کم از کم اس کی نظروں کے سامنے ایسا نہیں ہوا۔ ہوتا بھی تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس نے فوزیہ سے سچ ہی کہا تھا کہ اصل گھروندا تو دل میں بنتا ہے اور کوئی لہر اسے نہیں ڈھا سکتی۔

عبدالحق کا بنا ہوا وہ گھروندا عمر بھر کے لئے اس کے دل میں محفوظ ہو گیا تھا۔

اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے جو مانگا، اللہ نے اس سے بہت زیادہ عطا فرمایا۔ اس نے سوچ لیا کہ اسے اس پر عمر بھر اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔

اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ عبدالحق اس پر اس سے بات کرے گا اور اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عبدالحق نے تو اس سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ وہ اس کی بڑی عنایت تھی۔ ورنہ وہ کچھ کہنے والا آدمی نہیں تھا۔ اور وہ اس سے محبت بھی کرے گا کبھی، یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اس نے دیکھا کہ پکنک سے واپسی کے بعد سے عبدالحق گم سم ہو گیا ہے۔ دو راتوں تک وہ اپنی اسٹڈی میں گھنٹوں بیٹھا رہا۔ بظاہر وہ کچھ پڑھ رہا ہوتا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ تاہم اس نے مداخلت نہیں کی۔ مداخلت کی تو وہ ویسے بھی قائل نہیں تھی۔

تیسری رات وہ سونے کے لئے لیٹے تو عبدالحق نے کہا۔

''ارجی.....! مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' اس کے لہجے میں

محبت تھی۔

ارجمند اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ایسا نہ کہیں آغا جی......!'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''کہنا تو دور کی بات...... آپ کبھی ایسا سوچئے گا بھی نہیں۔ آپ کو کبھی کسی بھی معاملے میں مجھ سے معذرت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''تو میرے ضمیر کا بوجھ بڑھتا ہی رہے گا۔ کم کیسے ہوگا......؟''

''بوجھ کیسا......؟ مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے ہی نہیں...... اور یقین رکھیں، کبھی ہوگی بھی نہیں۔''

''تم عجیب لڑکی ہو......!'' عبدالحق کا لہجہ کچھ عجیب سا ہو گیا۔

''تمہارے سامنے میں خود کو بہت چھوٹا محسوس کرتا ہوں۔''

ارجمند نے بے سوچے سمجھے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''خدا کے لئے آغا جی......! ایسا نہ کہیں۔''

عبدالحق کے وجود میں کوئی پھل جھڑی سی چھوٹی۔

اس کے چہرے کا تاثر دیکھ کر ارجمند نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''میری نظروں میں آپ بہت بلند ہیں...... بہت بلند......!'' اس کے لہجے میں شدت تھی۔

عبدالحق نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بہت شرمسار دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ کیوں اتنے بوجھل ہو رہے ہیں......؟ کچھ بتائیے تو......!''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکا۔''

''اور میں کہتی ہوں کہ مجھے تو میری طلب سے زیادہ مل گیا۔ اتنا ملا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' ارجمند نے کہا۔

''اور سچ یہ ہے کہ میں نے آپ سے کچھ مانگا ہی نہیں۔ میں نے اللہ سے مانگا تھا۔ پہلے تو اس مانگنے کے نتیجے میں مجھے بہت کچھ ملا۔ اللہ پر یقین، اللہ سے تعلق...... یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اور جو کچھ میں نے اللہ سے مانگا تھا، اس کے ملنے کا

کوئی امکان تھا ہی نہیں۔ لیکن اللہ قدرت والا ہے، عطا فرما دے۔ سو مجھے وہ بھی مل گیا۔''

''کیا مانگا تھا تم نے......؟'' عبدالحق اس سحر زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ میرا نام آپ کے نام کے ساتھ جڑ جائے۔ اس سے زیادہ تو کچھ بھی نہیں مانگا تھا میں نے۔ لیکن کیا کیا کچھ مل گیا مجھے۔ میں شکایت کر سکتی ہوں بھلا......؟ میں تو عمر بھر اللہ کا شکر ادا کروں گی اور آپ کی احسان مند رہوں گی۔ آپ مجھ سے معذرت کا کبھی سوچئے گا بھی نہیں۔''

''میں نے دانستہ کچھ نہیں کیا۔ نور بانو کی محبت نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ مگر بعد میں میری سمجھ میں آگیا کہ میں نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی، حق تلفی کی تمہاری......''

ارجمند نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اگر آپ ایبٹ آباد کی بات کر رہے ہیں تو میں وہاں اپنی مرضی سے گئی۔ اللہ کا فضل تھا اور مجھ پر آپی کا احسان تھا کہ آپ سے میری شادی ہوئی۔ آپ کے لئے میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔''

''لیکن بیوی ہونے کی حیثیت سے مجھ پر تمہارے حقوق ہیں۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔'' ارجمند نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ نے بھی مجھ سے شادی اپنے لئے، اپنی خواہش سے تو نہیں کی نا......؟ آپ نے بھی آپی کی خاطر مجھ سے شادی کی۔ اور میں یہ بات جانتی تھی، اور میں نے اسے قبول کیا تو اپنے ہر حق سے گویا دستبردار ہو گئی۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ میں......''

رابطہ ایک بار پھر صاف اور واضح تھا۔ ارجمند نے جان لیا کہ وہ کیا کہنے والا ہے......؟ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس کے لئے یہ کہنا آسان نہیں ہے، چنانچہ اس نے اسے روک دیا۔

''میں جانتی ہوں...... آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

''کیسے جانتی ہو تم......؟''

"یہ بات آپ کو بھی معلوم ہے۔" ارجمند نے کہا۔

"ساحل پر اتنی دور سے آپ نے مجھے پکارا اور آپ کی پکار مجھ تک پہنچ گئی۔ پکارا تھا آپ نے......؟"

"ہاں......! اور تمہارے پلٹنے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔"

"میں جانتی ہوں کہ دل سے دل کا رابطہ کس بات کی دلیل ہے......؟"

"تو مجھے کہنے کیوں نہیں دیتیں......؟"

"آپ سب کچھ کہہ چکے اور میں نے سن بھی لیا۔ لفظ اتنے ضروری اور اہم تو نہیں ہوتے۔"

"مگر میں کہنا چاہتا ہوں، تم سے ہر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور مجھے معلوم ہے کہ یہ آپ کے لئے تکلیف دہ ہوگا۔"

"یہ تم نے کب سوچ لیا......؟"

"خود سے پوچھ لیں۔ اگر ہمارے درمیان رابطہ قائم ہے تو آپ کو دُشواری نہیں ہوگی۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"اوہ......! تمہارے خیال میں مجھے اس پر شرمندگی ہوگی......؟"

ارجمند نے کچھ نہیں کہا۔

"اور تمہارا خیال ہے کہ میرے نزدیک یہ نور بانو سے بے وفائی ہوگی......؟"

اس بار ارجمند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عبدالحق مسکرایا۔

"تب تو تم مجھے سمجھ نہیں سکیں۔ میں محبت کو باعث شرمندگی کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ میں تو محبت کو اللہ کا تحفہ سمجھتا ہوں۔ اور یہ بات تو میں نے مرحومہ نور بانو پر بھی واضح کر دی تھی کہ تم سے شادی کی ہے تو میں تم سے محبت بھی کروں گا۔"

"لیکن آپی کی موجودگی میں آپ کی محبت مجھ تک کبھی نہیں پہنچی۔ یہ تو پکنک والے دن پہلی بار مجھے احساس ہوا۔" ارجمند نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ اتنی تیزی سے دوری ہوئی کہ اپنا کوئی اختیار ہی

نہیں رہا۔"

"آپ نے آپی سے جس محبت کی بات کی، وہ تو وہ محبت تھی، جو ہر شوہر پر فرض ہوتی ہے۔"

"یہ درست ہے......!" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اب تم صرف سنو......! مجھے سب کچھ کہنے دو......! میرے لئے یہ ضروری ہے۔ اور میں شرمندگی کے ساتھ اعتراف کر رہا ہوں کہ اس میں میری ایک غرض ہے۔"

"اور یہ ذہن میں رکھیں کہ آپ کی غرض میری غرض ہے۔ اب آپ بات کریں، میں نہیں ٹوکوں گی آپ کو۔"

"میاں بیوی کے درمیان یہ ممکن نہیں کہ محبت نہ ہو۔" عبدالحق نے کہا۔

"تم سے شادی ہوئی تو مجھے تم سے محبت بھی ہو گئی۔ ازدواجی تعلق جتنا قریبی ہوتا ہے، کوئی اور تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں محبت تو خود بخود ہو جاتی ہے۔ محبت نہ ہو تو اللہ کی حدود قائم رکھنا تقریباً ناممکن ہو جائے، جنہیں قائم کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور میں تمہیں پسند پہلے سے کرتا تھا۔ تمہارے اوصاف کی وجہ سے۔ لیکن وہ اس طرح کی محبت نہیں تھی۔ پھر میں نے تم سے کہا کہ تم نور بانو سے میرے اور اپنے تعلق کو چھپاؤ تو وہ تمہاری بہتری کے لئے تھا۔ میں تو اس کا برملا اظہار کر سکتا تھا۔ لیکن نور بانو تمہاری زندگی اجیرن کر دیتی، اور اس کے نتیجے میں مجھے تم دونوں کو الگ کرنا پڑتا۔ میں تقسیم ہونے کا قائل نہیں تھا۔ اور اب تم نے بے وفائی کا گمان کیا تو میں واضح کر دوں کہ میرے خیال میں ایک سے زیادہ محبتیں مرد کے لئے فطری ہیں، تبھی تو اللہ نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ اس لئے میرے نزدیک اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔"

ارجمند کو یاد تھا۔ ایبٹ آباد میں یہ بات اس نے نور بانو کو بتائی بھی تھی۔

"تو میں وہ محبت تو تم سے کرتا تھا، جو شوہر کو بیوی سے ہوتی ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن پکنک کے دوران جو کچھ تم نے گھروندے کے حوالے سے کہا، اس

نے میرے اندر چھپے خوابیدہ جذبوں کو جگا دیا۔ میں بھی کبھی ایسا ہی تھا...... رومانویت پسند...... مرد اور عورت کی محبت میں پاکیزگی کی اہمیت کا قائل، لیکن نازک اور لطیف جذبات اور احساسات رکھنے والا۔ بدقسمتی سے مرحومہ نور بانو میں یہ حس تھی ہی نہیں۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے، وہ بے حد عملی عورت تھی۔ محبت کے نازک احساسات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے سمجھوتہ کرنا پڑا اور میں نے اپنے جذبوں کو سلا دیا۔

''لیکن اس دن تمہاری گفتگو سن کر میں برسوں پیچھے چلا گیا۔ میں نے تمہارے لئے گھروندا بنایا۔ بغیر سوچے سمجھے۔ گویا میں اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ غور کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ میں تو بہت پہلے سے تم سے محبت کرتا ہوں۔ بس مجھے اس کی کبھی خبر نہیں ہوئی۔ پھر جب تم سے رابطہ ہوا تو میری خوشی اور بڑھ گئی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ وہ محبت ہے، جس کی مجھے آرزو تھی۔''

''مگر آپ نے تو مجھے خدمت سے بھی محروم کر دیا۔'' یہ کہتے کہتے ارجمند کی نظریں جھک گئیں۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تم نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ مجھے نور بانو سے بے وفائی کا خیال ہے۔ حالانکہ یہ تو بچکانہ بات ہے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل میں کسی سے بے وفائی کا کیا سوال...؟ مجھے تمہیں یہ بتانا ہے کہ جیسے تم مجھ سے محبت کرتی ہو، ویسے ہی میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ لیکن افسوس......! یہ تمہارے لئے خوش خبری نہیں۔''

''ایسا نہ کہیں......!'' ارجمند نے پھر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ کہتے ہیں، یہ خوش خبری نہیں۔ یہ تو مجھے وہ ملا ہے، جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے تو میرے رب نے نہال کر دیا، مالا مال کر دیا۔''

''تم نے میری بات پوری نہیں سنی۔ یہ محبت میرا خواب تھی۔ میں اس محبت کی آرزو کرتا تھا۔ مگر یہ مجھے اس وقت ملی، جب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک بات بتاؤں......! کہنے والی بات نہیں۔ مگر تمہیں بتا سکتا ہوں۔ جب میں مسلمان نہیں تھا، اس وقت سے اللہ سے محبت کی آرزو رکھتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ عشق مجاز سے گزر کر اصل منزل پر پہنچتا ہے۔ ہم عام لوگ اللہ سے براہِ راست محبت کے لائق نہیں ہوتے۔ شاید

اسی لئے مجھے نور بانو سے محبت ہوئی۔ تم یقین نہیں کرو گی، میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ صرف اس کی آواز سنتا تھا، جب وہ قرآن کی تلاوت کرتی تھی۔ اور بلاشبہ وہ محبت اللہ کی عنایت تھی۔ مجھے تو قرآن کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ اس حوالے سے میں نے عربی سیکھی اور قرآن تک پہنچا اور بالآخر ایمان لایا۔ برسوں میں نے نور بانو کو دیکھا نہیں، بس اس سے محبت کرتا رہا۔ اس محبت کے ذریعے اللہ نے مجھے بہت کچھ دیا۔ اپنا روشن راستہ دکھایا، اس پر چلنا نصیب فرمایا۔ وہ بڑی بابرکت محبت تھی۔ لیکن جب وہ مجھے ملی تو سب کچھ بدل گیا۔ نفس چھا گیا۔ اس نے مجھے میرے راستے سے ہٹا دیا۔ میں محبت کو عظیم مانتا ہوں، اسے باعث شرمندگی نہیں سمجھتا۔ لیکن اس محبت نے مجھے شرمندہ کر دیا۔''

ارجمند کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

''تو اس لئے آپ نے مجھے خدمت سے محروم کر دیا......؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ارجی......! نور بانو کے جانے کے بعد میں نے توبہ کی اور اللہ سے عہد کیا کہ میں اپنی منزل کو یاد رکھوں گا اور اب کبھی دنیا کی نفسانی خواہشوں میں نہیں اُلجھوں گا۔ میرا مقصد صرف اللہ سے محبت کرنا ہے۔ مگر عارف بھائی اور بھابی کی اتنی محبت سے دی ہوئی اس رات نے ایک بار پھر میرے نفس کو بے لگام کر دیا۔ میں ڈر گیا جو کچھ تم میرے لئے کرتی تھیں، اس میں بہت سکون تھا میرے لئے۔ لیکن نفس نے اسے میری آزمائش بنا دیا۔ وہ خدمت میرے لئے باعث اذیت بن گئی۔ اس لئے میں نے تمہیں اس سے روک دیا۔ میں اب بھٹکنا، بہکنا نہیں چاہتا۔

''لیکن اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھ پر یہ راز کھلا تو میرے لئے بڑی الجھن کھڑی ہوگئی۔ اس نازک، لطیف محبت کو ردّ کر کے میں ناشکرا پن نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اب میں نفس کو خود پر مسلط بھی نہیں ہونے دوں گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں......؟''

''کوئی حل بھی سجھائی دیا آپ کو......؟''

''ہاں......! ایک حل سمجھ میں آیا...... لیکن وہ بہت مشکل، بہت اذیت ناک......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ارجمند کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کس طرف اشارہ کر رہا ہے.....؟

''نہیں......! وہ حل نہیں ہے۔ کم از کم میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔''
اس نے تیزی سے کہا۔

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر وہ بھی سمجھ گیا کہ وہ جان گئی ہے۔ ان کے درمیان جو رابطہ تھا، وہ لفظوں کا محتاج نہیں تھا۔

''تو تم مجھے سمجھا سکو گی......؟ کوئی حل بتا سکوں گی......؟''

''حل تو مسئلے کا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں......!''
ارجمند نے کہا۔

''لیکن میں آپ کو یہ بات سمجھا نہیں سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ میں اس معاملے میں فریق ہوں اور اپنی غیر جانبداری ثابت نہیں کر سکتی۔ مجھے خود بھی یہی خیال رہے گا کہ میں درحقیقت اپنے مفادات کا تحفظ کر رہی ہوں۔''

''تو پھر......!''

ارجمند نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ میرے مقابلے میں صاحب اختیار ہیں، اور میں بے بس ہوں۔ اور صاحب اختیار لوگوں کو بہت محتاط رہنا چاہئے۔ جلد بازی میں فیصلہ کرنا آپ کے شایانِ شان نہیں۔ آپ کے نزدیک یہ مسئلہ ہے تو میں اس کا حل پیش کر دیتی ہوں۔ لیکن آپ کا حل میرے لئے ناقابل قبول ہے۔''

''مگر تمہیں کیا معلوم کہ میں......''

''مجھے معلوم ہے جس لمحے مجھے آپ کی محبت ملی، میرے اور آپ کے درمیان ایک رابطہ قائم ہو گیا۔ آپ کی کوئی بات اب مجھ سے چھپی نہیں۔''

''تو تم اپنا حل بتاؤ مجھے......!''

''اب میں جو کچھ کہوں گی، اس پر اللہ کو گواہ بنا رہی ہوں۔ میں نے اللہ سے صرف آپ کا شرعی ساتھ مانگا تھا، آپ کا نام مانگا تھا۔ اور اللہ نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ اس پر میں عمر بھر اس کا شکر ادا کروں گی۔ اور سچی بات کہہ رہی ہوں۔ آپ کی اس

محبت......'' ارجمند نے لفظ ''اس'' پر خاص طور پر زور دیا۔

''اس سے زیادہ مجھے کچھ چاہئے بھی نہیں۔ اب میں اعلان کرتی ہوں کہ میں اپنا ہر حق آپ پر معاف کرتی ہوں۔''

''مگر......''

''اب تو آپ کا مسئلہ حل ہو گیا نا...... اب میرے معاملے میں انشاء اللہ......! اللہ آپ سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا۔ اور میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے کسی دباؤ کے تحت اکراہ کے ساتھ یہ بات نہیں کہی۔ میں اپنے وجود کی سچائی کے ساتھ، خوش دلی اور محبت کے ساتھ یہ بات کہہ رہی ہوں۔''

عبدالحق نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہے مجھ پر......!''

''ایسا نہ کہیں...... میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اور محبت میں کوئی احسان، احسان نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو ایک بلند مقام کی آرزو ہے تو وہاں پہنچنے میں آپ کی مدد کرنا محبت کے حوالے سے بھی، اور بیوی ہونے کے حوالے سے بھی مجھ پر فرض ہے۔ میں آپ کو ناکام ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

عبدالحق حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''یہ لڑکی ہر قدم پر مجھے حیران کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' اس نے سوچا۔

''اور جو محبت آپ کو مجھ سے اس وقت ہے، میرا اس پر بھی اصرار اور دعویٰ نہیں۔ وہ نہ رہے تو بھی میں اس پر آپ سے گلہ نہیں کروں گی۔ آپ میرے شوہر ہیں۔ یہ اعزاز میرے لئے بہت کافی ہے۔ میں ہمیشہ آپ سے محبت کرتی رہوں گی۔''

عبدالحق سن سا بیٹھا رہا۔

''اب آپ سو جائیں۔'' ارجمند نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

اور وہ دراز ہو گیا۔

❁❁❁

عبدالحق اپنے آفس میں تھا کہ اس کے پرائیویٹ فون کی گھنٹی بجی۔ اسے حیرت ہوئی۔ یہ فون وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا۔ اور یہ نمبر بھی اس نے گھر کے سوا کسی کو نہیں دیا تھا۔ اور ارجمند نے کبھی اسے اس نمبر پر فون نہیں کیا تھا۔

اس کی دھڑکنیں کچھ بے ربط ہوئیں۔

''اللہ خیر کرے......! یہ غیر معمولی بات ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔

ریسیور اٹھا کر اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام......!''

دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی، یہ تو اس کے لئے ممکن تھا کہ وہ اس آواز کو نہ پہچانتا۔ لیکن اس لہجے کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ خالص عرب لہجہ...... وہ تو اس نے کہیں اور سنا ہی نہیں تھا۔

وہ سعودی شہزادہ تھا۔ شہزادہ محمد بن عثمان......!

''نہیں پہچانے......؟'' اتنی دیر جواب نہ ملنے پر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا۔ شہزادے کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے یور ہائی نس......!''

''تو پھر یہ توقف......؟''

''عزت افزائی پر یقین نہیں آرہا تھا۔''

''ہم جسے بھائی کہہ دیں، اسے کبھی نہیں بھولتے۔''

''یہ بس آپ کی عنایت ہے۔''

''تکلف کر رہے ہو......؟''

''نہیں یور ہائی نس......! آپ کی مصروفیت کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔''

''اور یہ یور ہانس کیا ہے برادر......؟''

''معذرت چاہتا ہوں برادرِ محترم......!'' عبدالحق نے دل کی گہرائی سے کہا۔

''اور آپ کیسے ہیں......؟''

''الحمدللہ......! مجھے تو بہت پہلے رابطہ کرنا تھا۔ لیکن مصروفیت کی وجہ سے نہیں

کر سکا۔ دراصل پاکستان سے واپس جانے کے ایک ماہ بعد ہی مجھے امریکہ بھیج دیا گیا تھا۔ اب میں وہیں ہوں۔ اور تم سناؤ......! تمہاری طرف کیا حال ہے......؟''

''جی الحمدللہ......! سب ٹھیک ہے......!''

''مجھے ایک بات پر بہت افسوس ہے برادر......! بلکہ شکایت بھی ہے۔''

عبدالحق اس پر چونکا۔

''کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے برادرِ محترم......؟''

''ہاں......! اور میرے خیال میں بہت بڑی......!'' شہزادے نے کہا۔

''تم سرکاری مہمان کی حیثیت سے حج پر آنے والوں میں شامل نہیں تھے......؟''

''جی برادرِ محترم......!'' یہ کہتے ہوئے عبدالحق کے دل میں طمانیت تھی۔

''اس کی وجہ......؟'' شہزادے نے پوچھا۔ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔

''کوئی ذاتی معاملہ نہ ہو تو......''

''ایسی کوئی بات نہیں برادرِ محترم......!'' عبدالحق کے لہجے میں طمانیت تھی۔

''مجھ پر بہت بھاری ذمہ داری ڈال دی تھی آپ نے...... میں نے بڑی احتیاط سے لوگوں کا انتخاب کیا تھا۔ اور سب وہ لوگ تھے جو باعمل بھی تھے اور اس محکمے میں ہوتے ہوئے بھی حرام سے پرہیز کرتے تھے۔ اسی وجہ سے صاحب حیثیت بھی نہ تھے۔ خود کو شامل کرنے میں ان میں سے کسی ایک کی حق تلفی ہوتی۔ اس لئے میں نے اپنا نام کاٹ دیا۔''

''برا نہ ماننا برادر......! لیکن تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''میں الحمدللہ......! صاحب حیثیت ہوں برادرِ محترم......! اللہ نے چاہا تو اپنے طور پر بھی یہ سعادت حاصل کر لوں گا۔''

''اللہ کرے......! ایسا ہی ہو......!'' شہزادے نے کہا۔

''لیکن یہ حرم شریف کا معاملہ دنیا کے معاملات سے الگ ہوتا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں برادرِ محترم......!'' عبدالحق کا دل عجیب طرح سے دھڑکا۔

''ان معاملات کو سمجھانا بھی آسان نہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ جس دربار

کی یہ بات ہے، وہاں آنے والا ہر شخص، بادشاہ ہو یا فقیر، اللہ کا مہمان ہوتا ہے اور وہاں صرف ایک میزبان ہے...... اللہ جل شانہٗ...... شاہ نے بھی کبھی خود کو میزبان نہیں سمجھا۔ ان کا سب سے بڑا اعزاز خادم حرمین شریفین ہے۔ یہ ہمارے لئے اعزاز ہے کہ اس نے ہمیں منتظم بنایا۔ لیکن منتظم اعلیٰ تو اللہ خود ہے۔ اور ہم سے بڑھ کر اور ہمارے اوپر کتنے منتظمین ہیں، جو ہم سے کہیں زیادہ اہم ہیں، یہ وہی جانتا ہے۔ ذرا سوچو، کتنے لوگ ہر سال اللہ کے مہمان ہوتے ہیں......؟ لاکھوں......! اور نہ وہ سب ایک ساتھ آ سکتے ہیں اور نہ ہی ایک ساتھ رخصت ہو سکتے ہیں۔ اندازہ تو لگاؤ کہ یہ مہمان داری کا سلسلہ کتنا پہلے سے شروع ہوتا ہے......؟ اور کتنے بعد تک جاری رہتا ہے......؟ ان لوگوں کا قیام، ان کا طعام، ان کی نقل و حرکت کا سلسلہ، کون یہ انتظام کر سکتا ہے......؟ اللہ کے سوا کوئی نہیں......! ذرا سوچو برادر......! کہ امریکہ کتنا منظم اور وسائل سے مالا مال ملک ہے۔ اور نیویارک کتنا بڑا شہر ہے۔ وہاں اولمپکس کا انعقاد ہو تو دنیا بھر سے کتنے لوگ آئیں گے وہاں......؟ ہزاروں نا......! لاکھوں تو نہیں......؟ اس کے باوجود انتظامی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، جبکہ آنے والے صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو دولت مند ہوتے ہیں اور ضرورت کی ہر چیز اور ہر آسائش خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اور چھوٹا سا شہر مکہ معظمہ لاکھوں حجاج کی مثالی میزبانی کرتا ہے۔ اس کی اپنی آبادی سے زیادہ مہمان ہوتے ہیں وہاں۔ اور الحمدللہ......! ہر ایک کی ہر ضرورت پوری ہوتی ہے۔ آپ مسائل کا تصور کریں تو تھرتھری چڑھ جائے گی آپ کو۔ کوئی اور جگہ ہو تو ہر طرح کی غلاظتوں کے ڈھیر لگ جائیں۔ بازار سے اشیائے خورد و نوش غائب ہو جائیں۔ ان کے نرخ آسمان کو چھونے لگیں۔ غریب آدمی تو بھوکا مر جائے۔ ذرا سوچیں تو......!''

اور عبدالحق پر واقعی تھرتھری چڑھ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کا جسم ہی نہیں، اس کا پورا وجود اندر سے، دل سمیت کسی سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا، جو تیز ہوا کے تھپیڑوں کی زد میں ہو۔

''......لیکن ایسا نہیں ہوتا برادر عبدالحق......! بالکل نہیں ہوتا۔ کیسے اور کیوں کر......؟ صرف اس لئے کہ وہاں اللہ کا گھر ہے۔ اللہ جو اپنی ہر مخلوق کو رزق دیتا ہے،

جو پتھر میں چھپے کیڑے کو بھی رزق عطا کرتا ہے۔ اللہ جسے مہمانوں کی تواضع پسند ہے۔ اللہ جو کائنات کے تمام وسائل، تمام خزانوں کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کے گھر آئے ہوئے کسی مہمان کو کوئی محرومی ہو......؟ یہ تو اللہ کا معجزہ ہے برادر......! جس کے سامنے ساری دنیا عاجز ہے کہ اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔''

''اب دوسرے زاویے سے دیکھو۔ میرے گھر، تمہارے گھر تو کوئی بن بلایا مہمان بھی آ سکتا ہے۔ لیکن اللہ کے گھر یہ ممکن نہیں۔ وہاں تو سب کچھ طے شدہ ہوتا ہے۔ مہمانوں کی فہرستیں بہت پہلے تیار ہوتی ہیں اور ان کی تیاری میں ہم حکمرانوں کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تم نے سمجھا ہوگا کہ میں صاحب اختیار تھا، سو میں نے چار افراد کو سعودی حکومت کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے حج کی دعوت دے دی......؟''

شہزادے نے کچھ توقف کیا۔

عبدالحق نے جواب نہیں دیا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس نے یہی سوچا تھا۔

''مگر ایسا نہیں ہے برادر......! کسی کی مجال ہے کہ ربّ کی مرضی کے بغیر اس کے گھر کسی کو مہمان کی حیثیت سے بلائے......؟ سب اس کے حکم سے اور اس کی مرضی سے ہوتا ہے، یہ ہمارا ایمان ہے اور یہی حق بھی ہے۔ اب میری طاقت اور میرے اختیار کو دیکھو۔ میں نے تمہیں تین افراد کے ساتھ بلوایا، لیکن خود مجھے تو حج کی سعادت نصیب نہیں ہو سکی۔ مجھے امریکہ جانا پڑا۔ یہ ہے ہماری حیثیت......!''

عبدالحق کا لرزہ اور بڑھ گیا۔ درحقیقت اس کی آنکھیں کھلی رہی تھیں۔

''ایسی بے شمار مثالیں ہیں برادر عبدالحق......! میں تمہیں ایک مثال سناتا ہوں۔'' شہزادے نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''یہاں ہمارے ہاں ایک مصری انجینئر تھا۔ پندرہ برس وہ مکہ معظمہ میں رہا۔ اس عرصے میں اس کے تمام اہل خانہ نے مصر سے آ کر حج کی سعادت حاصل کی۔ جب اس کے ماں باپ حج کے لئے آئے تو میں نے اس سے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ حج کر لے، تو اس نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ میرا کیا ہے......؟ میں تو یہیں رہتا ہوں، کبھی بھی حج کر لوں گا۔ اور جانتے ہو برادر......! کیا ہوا......؟ وہ اس کے بعد

بارہ سال مکہ میں مقیم رہا اور وہیں اسے موت آئی۔ لیکن ارادے اور کوشش کے باوجود اسے حج کرنا نصیب نہیں ہوا اور تو اور، کچھ قوانین اور ضابطے ایسے آڑے آئے کہ اسے وہاں دفن ہونا بھی نصیب نہیں ہوا۔ وہ مصر میں دفن ہوا۔''

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا دل خوف سے بھر گیا۔

''میں نے کہا نا کہ ایسی بے شمار مثالیں میرے علم میں ہیں۔'' شہزادے نے مزید کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ میں غلط ہوں یا صحیح، لیکن میں نے یہ راز سمجھا ہے کہ کسی کو دین اسلام پر پیدا کرنے کے بعد یہ اللہ کا عطا کیا ہوا سب سے بڑی شرف، سب سے بڑی عزت ہے، اور جو اس سے منہ موڑے، وہ اس کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔ اور بے شک اللہ غفور الرحیم ہے۔''

''لیکن میں نے منہ تو نہیں موڑا برادرِ محترم.....!'' عبدالحق کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔

''بے شک.....! تم نے اچھے جذبے کے تحت ایسا کیا برادر.....! لیکن میرے خیال میں غلط کیا۔ دنیا کے معاملات میں ایثار کرنا، پیچھے رہ جانا بہت اچھا ہے۔ لیکن نیکیوں، سعادتوں اور آخرت کے معاملے میں اللہ کو دوڑ کر سبقت لے جانے والے پسند ہیں۔ سورۂ واقعہ میں اللہ نے سبقت لے جانے والوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ اس کے مقرب ہیں۔ دیکھو نا..... جماعت میں پہلی صف میں جگہ پانے کے لئے لوگ کتنی تگ و دو کرتے ہیں۔ وہ بڑی سعادت ہے۔ لیکن اللہ کے گھر مہمان ہونا تو بہت بڑی سعادت، بہت بڑا اعزاز ہے۔ کیونکہ وہ خود تمہیں بلا رہا ہے۔ یہ وہ مقام ہے برادر عبدالحق.....! جہاں ادب کا تقاضا حد ادب سے بہت آگے جا کے بھی پورا نہیں ہوتا۔ یہاں صرف اور صرف مجسم عاجزی اور شکر ہو کر اللّٰھم لبیک کہنے سے کم شاید بے ادبی میں شمار ہوتا ہے۔ دیکھو، یوں سمجھو کہ وہ تو اللہ ہے، کائنات کا مالک، بادشاہوں کا بادشاہ۔ میں اس کا حقیر بندہ، ذرۂ ناچیز..... اگر تمہیں اپنے گھر کسی دعوت میں بلاؤں اور تم اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دو تو تمہاری نیت کیسی ہی ہو.....؟ مجھے تو اہانت محسوس ہو گی۔''

عبدالحق کا لرزہ ایسا بڑھا کہ ریسیور تھامنا مشکل ہو گیا۔

''اللہ تمہیں اپنے گھر بلائے اور تم یہ سوچ کر اپنی سعادت اسے دے دو کہ وہ بے چارہ تو خود سے جا نہیں سکے گا، اور تم تو استطاعت رکھتے ہو تو اس میں کئی خراب پہلو نکلیں گے۔ ایک تو یہ کہ تمہاری استطاعت ہے کیا.....؟ اسی کی تو دی ہوئی ہے۔ دوسرے وہ چاہے تو اس بے حیثیت کو تم سے زیادہ اعزاز کے ساتھ بلا لے گا اور چاہے تو تمہیں اس سعادت سے محروم کر دے گا۔ خواہ تم نے تکبر سمجھ کر نہ کیا، لیکن یہ سوچنا بہر حال تکبر ہے کہ تم اپنی مرضی سے، جب چاہو گے، وہاں چلے جاؤ گے۔ اور تکبر کی معافی نہیں۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ تم نے سب سے بڑے اعزاز کے ساتھ بے نیازی برتی، جبکہ بے نیازی صرف اللہ کے لئے ہے۔ تو اس بات کا ڈر ہے کہ تم اس اعزاز سے محروم کر دیئے جاؤ۔ باقی وہ نیتوں سے آگاہ، بہت مہربان، بہت بخشنے والا ہے۔''

عبدالحق کا یہ حال تھا کہ گھٹی گھٹی آواز میں استغفر اللہ کے سوا اس کے منہ سے کچھ نہیں نکل رہا تھا۔

''اب تمہیں ایک اور بات بتاؤں.....!'' شہزادے نے مزید کہا۔

''چار آدمیوں کے لئے وہ دعوت تھی، لیکن ان میں سے صرف تین ہی حج کر سکے، کوئی ایک بیماری کی وجہ سے نہیں آسکا اور مجھے یقین ہے برادر.....! یہ محروم وہی ہو گا، جسے تم نے اپنی جگہ بھیجنا چاہا.....؟''

عبدالحق کے لئے بولنا ناممکن تھا۔ وہ تو بس استغفار کئے جا رہا تھا۔

''میں تمہیں بھائی سمجھتا ہوں، اس لئے تمہیں خبردار کرنا فرض سمجھا۔ اور میں پوری طرح سمجھا نہیں سکا ہوں۔ ایسی باتیں پوری طرح سمجھنا بھی آدمی کے بس میں نہیں ہوتا، کسی کو سمجھانا تو بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔''

''میں آپ کا از حد شکر گزار ہوں برادرِ محترم.....!'' عبدالحق نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''آپ نے بہت اچھی طرح مجھے سمجھا دیا۔''

''تم اللہ سے توبہ کرتے رہو برادر.....! میں تمہارے لئے دعا بھی کروں گا اور کوشش بھی۔ لیکن یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس معاملے میں کوئی کچھ نہیں کر

سکتا۔“

”آپ نے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے برادر......!“ عبدالحق نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”میں نے تو اپنے تئیں اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ الحمد للہ......! آپ نے مجھے احساس دلا دیا کہ وہ میری جہالت تھی، ورنہ میں عمر بھر اسی خوش گمانی میں رہتا۔ پہلی بار میری سمجھ میں آیا ہے کہ کبھی صرف اچھی نیت بھی ناکافی ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر گستاخی اور بے ادبی نیک نیت کے باوجود قابل معافی نہیں ہوتی۔ اللہ نے آپ کے ذریعے میری رہنمائی فرمائی۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر...... اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“

”بے شک......! سب اللہ کی طرف سے ہے برادر......!“ شہزادے نے کہا۔

”اور تمہارے اہل خانہ کیسے ہیں......؟ والدہ کیسی ہیں......؟ اور تمہاری ازواج......؟“

”الحمد للہ......! سب عافیت سے ہیں۔ البتہ میری پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔“

”کیسے......؟“

”بچے کی پیدائش کے دوران۔“

”اور بچہ......؟“

”اللہ نے مجھے بیٹا عطا فرمایا ہے برادرِ محترم......!“

”الحمد للہ......! دیکھو اللہ نے اپنی امانت لینے سے پہلے ہی تمہیں اس کا صلہ عطا فرما دیا۔“

”بے شک......! یہ اس کا فضل عظیم ہے برادر......!“

شہزادے نے اس سے بیٹے کا نام پوچھا...... اسے بہت دعائیں دیں۔

”انشاء اللہ تعالیٰ......! پھر بات ہو گی برادر......!“ اس نے کہا اور السلام علیکم کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

عبدالحق جانے کتنی دیر تک کانپتے جسم کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس میں ہلنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس زیر لب استغفار پڑھے جا رہا تھا۔

وہ شاید یوں ہی بیٹھا رہتا۔ مگر دروازے پر دستک ہوئی اور اس کا پی اے کمرے میں آیا۔ عبدالحق پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا گیا۔ عبدالحق کا چہرہ سپید ہو رہا تھا، جیسے اس کے جسم میں خون کی بوند بھی نہ رہی ہو۔ بس اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

”کیا ہوا سر......! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے......؟“ اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”الحمد للہ......! میں ٹھیک ہوں۔“

پی اے لپک کر باہر گیا اور اس کے لئے ایک گلاس میں پانی لے کر آیا۔

عبدالحق نے تشکر کے ساتھ پانی قبول کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے اس وقت پانی کی ضرورت تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے کام کی طرف متوجہ ہونا چاہا، لیکن وہ کچھ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔

کافی دیر تک وہ یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ سب سے پہلے اسے کچھ معلومات کرنا تھیں۔ اس نے گھنٹی بجا کر پی اے کو طلب کیا۔ وہ آیا تو اس نے کہا۔

”جو لوگ سعودی حکومت کی طرف سے سرکاری مہمان کی حیثیت پر حج کے لئے بھیجے گئے تھے، ان کی فائل لا کر دو......!“

”وہ تو سر......! کلکٹر صاحب کے آفس میں ہے۔“

”کلکٹر صاحب کے آفس کا نمبر ملا کر مجھے دو......!“

پی اے چلا گیا۔ چند لمحے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف کلکٹر صاحب کا پی اے تھا۔ عبدالحق نے اس سے فائل کے بارے میں بات کی۔

”ٹھیک ہے سر......! میں بجھواتا ہوں۔ دس منٹ لگیں گے۔“ کلکٹر صاحب کے پی اے نے کہا۔

عبدالحق نے ریسیور رکھ دیا۔ یہ یاد کرنے میں اسے ذرا دشواری نہیں ہوئی

کہ اپنی جگہ اس نے حج پر جانے والوں میں کس کے نام کی منظوری دی تھی۔

دس منٹ بعد فائل اس کے سامنے تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس فائل کو کھولا۔

اور اگلے ہی لمحے شہزادہ محمد بن عثمان کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ اس نے اپنی جگہ جسے بھیجنے کی جسارت کی تھی، اللہ نے اس کے لئے منظوری نہیں دی تھی۔

اس پر پھر لرزہ چڑھ گیا۔

اس نے اللہ کے چار مہمانوں کے انتخاب میں بہت وقت صرف کیا تھا۔ بہت احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ اس پر غور کیا تھا۔ اس کا خلوص اپنی جگہ، لیکن اس نے سمجھ لیا تھا کہ فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ اس کی بدترین غلطی تھی۔

''فیصلہ کرنے والا تو صرف اللہ ہے۔''

اس کا دل جیسے سینے میں سما ہی نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس کے دل میں بس ایک خیال تھا۔

''یہ میں نے کیا کر دیا......؟'' وہ سمجھ گیا تھا کہ کیا ہوا ہے......؟

اس نے خود کو اپنی من چاہی، بہت بڑی سعادت سے محروم کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اللہ نے اس کی توثیق فرما دی تھی۔ لیکن اس نے اپنی جگہ جسے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا، اللہ نے اس فیصلے کو رد فرما دیا تھا۔

اللہ کی توفیق کے بغیر تو فیصلہ نافذ نہیں ہوتا۔

کچھ دیر بعد طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے پی اے سے کہہ کر مشکور صاحب کو بلوا لیا۔

مشکور صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو اس بے وقت کی پیشی پر کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔

''آپ نے یاد فرمایا سر......؟''

''تشریف رکھئے......!'' عبدالحق نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

مشکور صاحب سہمے ہوئے سے بیٹھ گئے۔

''کوئی غلطی ہوگئی سر......؟''

عبدالحق بے ساختہ مسکرایا۔

''ارے نہیں......! کچھ اپنے علم میں اضافہ کرنا تھا۔''

بات مشکور صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ نظریں جھکائے بیٹھے رہے۔

''آپ کا نام تو سرکاری مہمان کی حیثیت سے حج پر جانے والوں میں شامل تھا......؟'' بالآخر عبدالحق نے بات چھیڑی۔

''جی سر......! آپ کی عنایت تھی۔'' مشکور صاحب نے عاجزی سے کہا۔

عبدالحق کے ذہن میں روشنی کا جھما کا سا ہوا، جیسے دریچے ہی دریچے کھل گئے ہوں۔

''یقیناً...... تبھی تو آپ جا نہیں سکے......؟'' اس نے بغیر سوچے سمجھے بے ساختہ کہا۔ خود اسے لگا جیسے وہ خود نہیں، اس کے اندر سے کوئی اور بولا ہو۔

''میں سمجھا نہیں سر......!''

''میں خود بھی نہیں سمجھا تھا۔ بات تو اب سمجھ میں آنی شروع ہوئی ہے۔'' عبدالحق کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

''مناسب خیال کریں تو مجھے بھی سمجھا دیں سر......!''

''میری عنایت سے آپ وہاں کیسے جا سکتے تھے......؟ وہاں تو بندہ صرف اللہ کی رحمت، اس کے فضل اور اس کی منظوری سے جا سکتا ہے۔'' عبدالحق نے افسردگی سے کہا۔ پھر پہلی بار اس نے مشکور صاحب کو غور سے دیکھا۔

مشکور صاحب کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ اب بھی کچھ نہیں سمجھے۔ عبدالحق نے سوچا۔

''کون کسی کو سمجھا سکتا ہے......؟ یہ سمجھنا سمجھانا بھی تو اللہ کی طرف سے ہے۔''

''آپ کے ساتھ ہوا کیا مشکور صاحب......؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں سر......! میں بہت خوش تھا کہ برسوں کی آرزو پوری ہو رہی ہے۔'' مشکور صاحب نے کہا۔

''آرزو کیا سر......! خواب تھا میرے لئے ...... کہ جس کی تعبیر کا کوئی امکان نہیں تھا۔ آپ کے لئے دعا کرتا تھا کہ آپ کی مہربانی سے تعبیر مل رہی ہے۔''

''یہی تو آپ کی غلطی تھی مشکور صاحب......! مہربانی تو صرف اللہ کی ہوتی ہے۔'' عبدالحق سے برداشت نہ ہوا۔

''سچ ہے سر......! لیکن وسیلہ بھی تو ہوتا ہے۔''

عبدالحق بہت بدمزہ ہوا۔ اس نے سمجھ لیا کہ سمجھانا بے کار ہے۔ اور وہ کوشش کرے گا تو تلخ ہو جائے گا۔ اپنی ہی تلخی کچھ کم نہیں ہے۔ یہ اور برا ہوگا۔

''اللہ کو ناگوار گزرا تو......؟''

''آپ کچھ بتا رہے تھے......!'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''جی سر......! جس شام کی فلائٹ تھی، اس صبح میرے پیٹ میں ایسا شدید درد ہوا کہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ بچے مجھے اسپتال لے گئے۔ وہاں کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ مسئلہ کیا ہے......؟ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا۔ مجھے اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ بس مسکن دوائیں دی جاتی رہیں۔ تین دن تو یوں گزرے کہ مجھے ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر درد ایک دم سے غائب ہو گیا۔ اسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔ لیکن کمزوری بہت تھی سر......! دس دن تو میں سہارے کے بغیر اٹھنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ میں تو یہ بھی بھول گیا سر......! کہ میں اپنے خواب کی تعبیر سے محروم ہو گیا۔''

''مجھے افسوس ہے مشکور صاحب......! اللہ ہم پر رحم فرمائے......!'' عبدالحق نے دل کی گہرائی سے کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر مشکور صاحب نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اب میں جاؤں سر......؟''

''جی ضرور......! زحمت کا شکریہ......!''

ان کے جانے کے بعد عبدالحق کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے ان تین افراد سے بھی بات کرنے کا فیصلہ کیا، جنہیں اللہ نے کامیاب کیا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے ان تینوں کو بلوایا اور ان سے بات کی۔ الفاظ ضرور مختلف تھے، لیکن مفہوم

سب کا ایک ہی تھا۔

عبدالحق ان تینوں سے ایسی عزت سے ملا، جیسے کم رتبے والے لوگ عالی مرتبت لوگوں سے ملتے ہیں اور یہ حقیقت تھی۔ انہیں اللہ نے وہ عزت اور سعادت عطا فرمائی تھی جس سے اس نے خود کو محروم کر لیا تھا۔

وہ تینوں بہت خوش تھے۔ اور مشکور صاحب کے برعکس ان تینوں نے اس سعادت کو اللہ کی رحمت اور کریمی قرار دیا۔ ان کے انداز میں بڑی عاجزی تھی۔ ان کی خوشی میں بھی عاجزی تھی۔

''سر......! اللہ نے وہاں مجھے وہ عزت اور وہ نعمتیں عطا فرمائیں، جن کا ہم یہاں تصور بھی نہیں کر سکتے...... بڑا کرم فرمایا اللہ نے جناب......!''

''وہاں میں آپ کو یاد رہا......؟'' عبدالحق نے تینوں سے یہ سوال کیا۔

''میرے لئے بھی دُعا کی آپ نے......؟''

اور تینوں کا جواب ایک ہی تھا۔ تینوں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

عبدالحق کا دل غم سے بھر گیا۔ جب اللہ ہی ناخوش ہو تو اس کے دربار میں کوئی کیسے اس کے لئے دُعا کر سکتا ہے......؟

''دل چھوٹا نہ کریں۔'' اس نے ان کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے کہا۔

''دُعا بھی اللہ کے اذن کے بغیر نہیں ہوتی۔ اللہ نہ چاہے تو بندہ خود اپنے لئے بھی دُعا نہیں کر سکتا۔''

''بے شک سر......! بندے کی کیا حیثیت......؟''

اور عبدالحق نے رخصت ہوتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ چوما۔ نہایت عقیدت اور محبت سے۔ ان ہاتھوں کو کیسی کیسی مبارک اور مقدس چیزوں کا لمس نصیب ہوا تھا۔

ان کے جانے کے بعد اس نے سوچا۔

''اللہ کا شکر......! ان ہاتھوں کی وساطت سے میرے ہونٹوں کو اپنی محرومی میں خفیف سی کمی کرنا تو نصیب ہوا۔ اب کون جانے......؟ کون جانے......؟''

❁❁❁

عبدالحق کے لئے تو وہ بہت بڑا صدمہ، بہت بڑا دھچکا تھا۔ اسے تو لگا کہ وہ جیسے آسمان سے زمین پر آ گرا ہو۔ یہ کیسا اتفاق تھا کہ عین اس وقت، جب وہ اللہ کی محبت کی طرف پہلا قدم بڑھانے کا ارادہ کر رہا تھا، اسے بتا دیا گیا کہ اس کی اوقات کیا ہے......؟ محبت کرنے والا، جس سے محبت کر رہا ہو، اس سے اور خود سے اتنا بے خبر ہے کہ اس سے گستاخی سرزد ہوئی اور اسے پتا بھی نہ چلا۔ سچی محبت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ محبوب ناراض ہو......؟ اور محبت کرنے والے کو اس ناراضی کی خبر ہی نہ ہو......؟ اس بے خبری سے تو بے نیازی جھلکتی ہے، اور محبت تو نیاز ہی نیاز ہے۔ بے نیازی کا کیا سوال......؟ اور سچ یہ ہے کہ بے نیازی تو صرف اللہ کا وصف ہے۔ وہ غنی ہے، وہ صمد ہے۔ بے نیازی اس کی ذات کا حسن ہے۔

اس کا دن کا سکون اور راتوں کی نیند جاتی رہی۔ وہ خود کو دو بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان ایک بہت تنگ گھاٹی میں محصور محسوس کر رہا تھا۔ جہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا، جہاں سے اس کی آواز کہیں نہیں جا سکتی تھی، بلکہ پہاڑوں کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی اور محض اس کی سماعت تک محدود رہتی۔ وہ جیسے ایک گہرا کنواں تھا، جس میں سے خود نکلنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ وہ ان سیدھے پہاڑوں پر چڑھ نہیں سکتا تھا۔ وہاں کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ اور وہ اتر کر وہاں نہیں آیا تھا۔ وہ تو پہاڑ کی چوٹی سے گرا تھا۔ خود سے اوپر کیسے جا سکتا تھا......؟

اور اسے کسی نے گرایا نہیں تھا۔

اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، انسان خود اپنے آپ پر، اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ بے شک انسان خود ہی ظالم ہے۔ بے شک اس نے خود ہی اپنی جان پر ظلم کیا۔ بے خبری میں نیکی جان کر اس نے دو جرم کئے۔ اللہ کی عطا کی ہوئی سعادت سے منہ موڑا۔ اور صرف یہی نہیں، ایسا اس گمان کے تحت کیا کہ وہ صاحب استطاعت ہے، اپنے طور پر حج کر لے گا۔

یہ سوچتے ہوئے اس کے اندر ایک مدافعانہ آواز ابھری...... صفائی پیش کرتی ہوئی۔

''میں نے جو سوچا، اس آگہی، اس اعتراف کے ساتھ سوچا کہ وہ استطاعت

اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔''

اس سوچ پر اس نے خود کو اندر سے ٹٹولا اور کچھ مطمئن ہوا۔ کیونکہ اس کے علم کی حد تک یہ درست تھا۔

مگر کہیں، اس کے اندر ہی سے یہ اعتراض ابھرا۔

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ استطاعت ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی؟ کیا تمہیں اس کی ضمانت دی گئی ہے؟ اور تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم جب چاہو، اس سے استفادہ بھی کر سکتے ہو؟ اللہ کے اذن کے بغیر! اللہ کے ساتھ تو بندے کا ایک ہی معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ جب اپنی کریمی سے جو کچھ عطا فرمائے، اسے سر جھکا کر عاجزی سے قبول کر لو اور اس کا شکر ادا کرو۔ جو کچھ ملا ہوا ہے، اللہ کی عطا، اللہ کے فضل سے ہے، اور جب وہ چاہے، اسے واپس لے لے گا۔''

''بے شک......!'' اس نے کب گمان کیا تھا کہ وہ نور بانو کو پا سکے گا۔ لیکن اللہ نے کرم فرما دیا۔ اور پھر جب چاہا تو اسے واپس بھی لے لیا۔

''بے شک......! مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔ لیکن......''

''لیکن مت کہنا...... یہ اس سے بھی بڑی بھول ہوگی۔ اندر سے ابھرنے والی تنبیہ نے اسے دہلا دیا۔ وہ اپنے بندوں سے بے سبب تو کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ وہی تو ہے، جو سب کچھ جانتا ہے۔ اس نے فرمایا...... اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ...... اور بے شک......! وہ تمہارے وجود کی تمام کوٹھریوں سے، اور ان میں چھپی تمام بلاؤں سے واقف ہے، اور تم کچھ نہیں جانتے۔''

وہ سہم کر بیٹھ گیا۔ اس نے ذہن کے، سوچوں کے سب دریچے بند کر لئے۔ شرمندگی ایسی گہری تھی کہ خود سے نظر ملانا بھی ممکن نہیں تھا۔ لیکن آدمی خود سے تو چھپ سکتا ہے، اللہ سے تو چھپنا، بچنا ممکن ہی نہیں۔

وہ اپنی اسٹڈی میں دبک کر بیٹھ جاتا اور استغفار کرتا رہتا۔ ارجمند میز پر پانی سے بھرا جگ اور گلاس رکھ جاتی۔ مقررہ وقت پر اس کے لئے چائے لے آتی۔ لیکن وہ اس سے کچھ پوچھتی نہیں تھی۔ یہ اس کی ایک اور خوبی تھی۔ وہ دیکھتی کہ وہ کسی خاص کیفیت میں ہے تو اسے کبھی نہ چھیڑتی۔ وہ اس سے کھانے کو بھی نہ کہتی۔ اماں اور وہ

اس کا انتظار کرتی رہتیں۔

ارجمند نے تو اس سے کچھ نہیں پوچھا، لیکن حمیدہ نے پوچھ لیا۔

''تو آج کل پریشان کیوں ہے پتر.....؟''

''نہیں اماں.....! ایسی تو کوئی بات نہیں.....!''

''بات تو ہے..... تو بتانا ہی نہیں چاہتا.....؟''

''تم نے کس بات پر یہ خیال کیا اماں.....؟''

''جب آدمی کھانا بھی بھولنے لگے تو اسے کوئی نہ کوئی پریشانی ہوتی ہے۔''

عبدالحق نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ دس بج چکے تھے، جبکہ وہ عام طور پر کھانا عشاء سے پہلے ضرور کھا لیتے تھے۔ اسے افسوس ہوا کہ اس کی وجہ سے سب بھوکے بیٹھے رہتے ہیں۔

''بھوک ہی نہیں لگتی اماں.....! کیا کروں.....؟'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''آپ لوگ میرا انتظار نہ کریں۔ کھانا کھا لیا کریں۔''

''میں شکایت نہیں کر رہی ہوں پتر.....! تیری پریشانی کی فکر ہے مجھے.....!''

''بس اماں.....! میرے لئے دُعا کرتی رہو.....!''

''دعا تو ہمیشہ کرتی ہوں۔''

اگلے دن سے عبدالحق نے کھانے کے وقت کا خاص خیال رکھا۔ لیکن اس کی بھوک تو واقعی ختم ہی ہو گئی تھی۔ دل ہر وقت خوف سے بوجھل رہتا تھا۔ اللہ آپ سے ناراض ہو، اس سے زیادہ خوفزدہ کرنے والی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اور جو اس بات کو سمجھے ہی نہیں، وہ تو بہت خسارے میں ہے۔

وہ استغفار کرتا رہا۔ لیکن دل کا منظر نہیں بدلا۔ آنکھیں ویسے ہی خشک رہیں۔ اس کا خوف اور بڑھ گیا۔ یہ تو بہت بڑی ناراضی کی علامت ہے۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔

اسے مولوی مہر علی کی بات یاد آئی۔ وہ کہتے تھے، کوئی غلطی ہو جائے جس سے اللہ کی ناراضی کا ڈر ہو تو کثرت سے استغفار کرو۔ اور صلوٰۃ التوبہ تو پہلے ہی پڑھ لو۔

وہ ہر روز صلوٰۃ التوبہ پڑھ رہا تھا۔

اور مولوی صاحب نے کہا تھا، آنسوؤں کی بڑی اہمیت ہے پتر عبدالحق.....! آنسو نہ ہوں تو دل پھٹ جائیں۔ پھر انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا۔ کسی تکلیف، صدمے یا نقصان پر جو آنسو نکلتے ہیں، وہ آدمی کو جسمانی نقصان سے بچاتے ہیں۔ لیکن جو آنسو اللہ کے خوف سے، اس کے حضور ندامت سے نکلیں، اسے گریہ کہتے ہیں۔ اور گریہ بہت بڑی نعمت ہے پتر.....! استغفار کے ساتھ گریہ نہ ہو تو مقبولیت کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ اور گریہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اصل اور حقیقی گریہ تو بندے کے بس کی بات ہی نہیں۔

''اور استغفار کرتے ہوئے رونا نہ آئے تو بندہ کیا کرے.....؟'' عبدالحق نے ان سے پوچھا۔

''رونا نہ آئے تو رونے جیسی صورت ہی بنا لے.....!''

''لیکن مولوی صاحب.....! یہ تو مکاری ہو گی.....؟''

''نا پتر جی.....! بندے کو یہ خیال ہو کہ اللہ سب جانتا ہے، اس سے کچھ بھی چھپا نہیں، تو یہ مکاری نہیں، بے بسی کا اظہار ہو گا۔ یہ اللہ کے رحم کو پکارنا ہو گا۔ کون جانے..... اللہ کی رحمت جوش میں آئے اور وہ اسے گریہ عطا فرما دے.....!''

''لیکن مولوی صاحب.....! آنسوؤں کو تو کمزوری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر مردوں کے لئے.....!''

''یہ سب انا والوں کی باتیں ہیں پتر.....! جو اپنی مردانگی پر تکبر کرتے ہیں۔ میں نے کہا نا..... کہ کسی بہت بڑی تکلیف، صدمے یا نقصان پر آنسو بہہ کر آدمی کے بوجھ کو ہلکا نہ کریں تو دل پھٹ جائے یا دماغ جواب دے جائے، جسم کو کوئی نہ کوئی نقصان پہنچ جائے اور یہ بھی سچ ہے کہ آنسو کمزوری کا اظہار بھی ہیں۔ آدمی اپنے سے طاقتور سے مغلوب ہو کر روئے تو یہ بھی فطری ہے۔ اگرچہ یہ ایمان کی کمزوری ہے۔ سب سے طاقتور پر ایمان ہو تو وقتی طور پر مغلوب ہونے پر آدمی اللہ سے رجوع کرے گا۔ لیکن ایمان کے یہ بلند درجات تو صرف اسی کو ملتے ہیں، جسے اللہ نواز دے۔ میں تو پھر بھی آنسوؤں کو بڑی نعمت سمجھوں گا۔ اور رہی بات گریہ کی، تو اس کے بارے میں تو

ایسا سوچنا بھی میرے خیال میں گناہ ہے۔ اللہ کے حضور کمزوری اور بے بسی کا اظہار تو بندگی ہے، اور اس سے گریز تکبر ہے۔''

''وہ سورۂ بقرہ کی آیت یاد کرو پتر......! جس میں اللہ نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ ان کے دل پتھر جیسے سخت، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ اس آیت میں اللہ نے فرمایا کہ پتھر بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے۔ ایسے بھی ہیں، جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اس سے تمہیں نہیں لگتا کہ اللہ میاں بندوں کے لئے اپنے خوف کی اہمیت بیان فرما رہا ہے......؟ آدمی اللہ سے ڈرے گا تو روئے گا، اور رونا لفظوں کے بغیر اور اس سے زیادہ سچائی کے ساتھ بخشش طلب کرنا اور اس کی پناہ میں داخل ہونا ہے۔''

''لفظوں سے زیادہ سچائی کے ساتھ کیسے مولوی صاحب......؟''

''جو لفظ اللہ نے سکھائے، ان کو چھوڑ کر لفظ مکمل درستی کے ساتھ نہیں بولتے پتر......! کہیں مبالغہ ہو جاتا ہے اور کہیں کمی رہ جاتی ہے۔ کہیں شرمندگی کے اظہار کے لئے لفظ کم پڑ جاتے ہیں اور کبھی بندہ زبان سے استغفار کرتا ہے، لیکن دل و دماغ اور روح اس میں شامل نہیں ہوتے۔ وہ خالی الفاظ ہوتے ہیں۔ لیکن آنسو سچے ہوتے ہیں۔ وہ پورے وجود کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا مولوی صاحب......! سبحان اللہ......!''

''اور اللہ نے اس آیت کریمہ میں یہ بھی بتا دیا کہ آدمی اللہ کے خوف سے دور ہوگا تو اس کا دل سخت ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جائے گا۔ یعنی مردہ ہو جائے گا۔''

''مردہ کیسے......؟''

''پتر......! تو جمادات ہے نا پتر......! یعنی مردہ...... نہیں مردہ نہیں، بے جان کہو...... جان دار نہیں ہیں نا......''

''جی مولوی صاحب......!''

مولوی صاحب کی گفتگو یاد کرتے ہوئے اس وقت عبدالحق پر شدید خوف

طاری ہونے لگا۔

''تو کیا میں مردہ ہو چکا ہے......؟'' اس نے سوچا۔

''اور مردے تو قیامت کے دن ہی زندہ ہوں گے۔''

اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

مگر پھر اسے مولوی صاحب کی بعد کی گفتگو یاد آئی تو دل کو ڈھارس سی ہوئی۔

''پانی کی بڑی اہمیت ہے پتر......!'' مولوی صاحب نے کہا تھا۔

''پانی اللہ کی بڑی اور کھلی نشانیوں میں سے ہے۔ روئے زمین پر زندگی ہی پانی کے دم سے ہے۔ قرآن میں کئی جگہ اللہ نے فرمایا کہ مردہ زمین کو دیکھو کہ کہیں زندگی کا نام و نشان نہیں۔ پھر ہم نے بارش نازل فرمائی۔ تو وہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔ ہر طرف سبزہ لہلہانے لگا۔ طرح طرح کی نباتات پیدا ہو گئی۔ پھل اور غذائی اجناس جو ہمارا رزق ہے۔ اور خوب صورت پھول اور پودے، جو روح کی خوشی اور امید سے سرشار کرتے ہیں۔ ہم صحرا میں رہنے ولوں سے زیادہ اس کا مشاہدہ اور کسے ہو سکتا ہے بھلا......؟''

اور عبدالحق کو اپنا بچپن یاد تھا۔ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔

''اس صورتِ حال کو ذہن میں رکھ کر میں نے دل کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی پتر......! اور اللہ کریم نے میری رہنمائی فرمائی۔ زمین بھی ایک دم سے مردہ نہیں ہوئی پتر......! آخری بارش کا پانی جو اس کے اندر اترا ہوتا ہے، وہ اس کے سینے کو تری دیتا رہتا ہے۔ اور جب بہت عرصے تک بارش نہیں ہوتی اور اندر اترا ہوا پانی ختم ہوتا جاتا ہے تو زمین پر مردنی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ وہ سوکھتی چلی جاتی ہے۔ نباتات جھاڑ جھنکاڑ میں تبدیل ہونے لگتی ہے، یہاں تک کہ معدوم ہو جاتی ہے۔ بس اسے بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''میں نے دل کو زمین کی جگہ رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی پتر......! دل ایمان سے، اللہ کی بندگی اور اس کے خوف سے اور اس کے احکامات ماننے سے کھلتا اور لہلہاتا ہے۔ اور جب بندہ ان سے دور اور محروم ہونے لگے تو وہ اندر پہلے سے موجود تری پر گزارہ کرتا ہوگا۔ یہ اللہ کی طرف سے مہلت ہوتی ہوگی کہ وہ اب بھی اللہ سے رجوع

کر لے اور وہ تری ختم ہو جانے پر دل سوکھی ہوئی زمین کی طرح بے آب و گیاہ ہو جاتا ہوگا۔ مگر امید کا ایک کمزور سا دھاگہ پھر بھی بندھا رہ جاتا ہوگا...... رکوع کر لے۔ اب بھی رجوع کر لے۔ غفلت جھوٹ، بندگی اختیار کر، ایمان کو تازہ کر اور اللہ سے توبہ کر...... اور جب ایسا نہیں ہوتا تو دل پتھر ہو جاتا ہوگا۔ پتھر سے بھی زیادہ سخت، جس میں نمی کا شائبہ بھی نہ ہو۔ ایسی ہی صورتِ حال کے لئے اللہ نے فرمایا ہوگا کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، اب وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔"

عبدالحق کو یاد تھا، وہ تصور میں دیکھ سکتا تھا کہ یہ کہنے کے بعد مولوی صاحب نے جھرجھری لی تھی اور کہا تھا۔

"اللہ سب کو اس سے محفوظ رکھے پتر......! ان کے دلوں پر اللہ مہر لگا دے......؟"

"عبدالحق بھی جھرجھری لے کر رہ گیا تھا۔ اس سے میں نے آنسوؤں کی اہمیت سمجھنے کی کوشش کی پتر......! پانی کی بڑی اہمیت ہے۔ پانی مردہ زمین کو پھر سے زندہ کر دیتا ہے تو مردہ دل کو بھی زندہ کر دے گا۔ اور دل کو زندہ کرنے والا پانی آنسو ہے۔ لیکن بارش کی طرح آنسوؤں پر بھی آدمی کو اختیار نہیں۔ دونوں بارشیں اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہیں اور شاید دونوں سے محرومی بھی اللہ کی ناراضی کا اظہار ہے۔ اور دلوں پر مہر لگ جائے پتر......! تو لوگوں کو اللہ کی ناراضی کا پتا ہی نہیں چلتا اور جو اللہ کو بھول بیٹھے، اسے تو اس کا خیال ہی نہیں آ سکتا۔"

"اب سوچو پتر......! کہ جب موسم گزرنے لگیں اور بارش نہ ہو۔ زمین اور فصلیں سوکھنے لگیں، قحط کے آثار نمایاں ہونے لگیں تو اللہ کو ماننے والے مل کر نمازِ استسقا ادا کرتے ہیں، گریہ و زاری کے ساتھ دعا کرتے ہیں، اللہ سے بخشش اور مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اعتراف کرتے ہیں کہ اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوگا تو اللہ رحمت فرماتا ہے۔ بارش ہو جاتی ہے۔"

"لیکن اہل زمین قحط سے دوچار بھی تو ہوتے رہتے ہیں مولوی صاحب......؟"

"وہ تو اللہ کا قہر ہوتا ہے۔ اجتماعی سزا ہوتی ہے۔" مولوی صاحب نے کہا

تھا۔

"معاشرے کفر، شرک، فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں، اللہ کی نافرمانی عام ہو جائے تو ایسا ہوتا ہے۔ دیکھو نا...... معاشرے تو افراد سے بنتے ہیں۔ ہوتا یہی ہے کہ نیک تعداد میں کم اور بد تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ فرق بہت زیادہ بڑھ جائے تو قدرتی آفتیں آتی ہیں۔ میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ بارش نہ ہو تو اجتماعی طور پر نمازِ استسقا ادا کی جاتی ہے، اور دل سخت اور آنکھیں خشک ہو جائیں تو آدمی کو صلوٰۃ التوبہ پڑھنی چاہئے اور کثرت سے استغفار کر کے اللہ سے رحم اور بخشش کی طلب کرنی چاہئے۔"

"لیکن مولوی صاحب......! آدمی اپنی کسی بھی تکلیف پر اور محرومی پر، جو اسے بڑی لگتی ہے، رو دیتا ہے۔"

"یہی تو دنیادار دل کی نشانی ہے۔ پاک آنسو اور پاک کرنے والے آنسو تو وہی ہوتے ہیں، جو صرف اللہ کے لئے ہوں، جو نعمتوں پر اللہ کی شکر گزاری کا اظہار ہوں، جو اللہ کی خشیت اور اس کی قدرت کا اعتراف ہوں۔ اور وہ اللہ ہی عطا فرماتا ہے، جب بندے سے خوش ہو۔ گریہ اللہ کی بہت بڑی رحمت، نعمت اور انعام ہے پتر......! کہ اس سے دل میں اللہ کی بندگی، تقویٰ اور شکر گزاری کے پھول کھلتے ہیں اور دل گلزار ہو جاتا ہے۔ بات ہے اللہ کو خوش کرنے کی۔ ایمان کے ساتھ نیک اور صالح عمل اور اللہ کی مکمل اطاعت ضروری ہے۔ اللہ سے رجوع رکھنا پہلی چیز ہے۔ اور پھر آگے ہی آگے بڑھتے جانا ہے۔ دل کی فکر کرنا بہت ضروری ہے پتر! اور دل اللہ کے ذکر سے گداز ہوتے ہیں۔ بے خبری انہیں پتھر بنا دیتی ہے۔"

"اور کثرتِ استغفار کے باوجود آنسو نصیب نہ ہوں تو؟"

"آدمی ایمان کے ساتھ اللہ کو خوش کرنے کے لئے نیک اعمال کرے۔ لوگوں کے کام آئے اور استغفار کرتا رہے۔ اس کے سوا بندے کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا پتر......!"

اور عبدالحق وہی کر رہا تھا لیکن سینے میں اب بھی پتھر رکھا تھا۔ بس دھڑکن کی آواز گواہی دیتی تھی کہ وہ دل ہے۔

وہ کھانا کھاتا اور دوبارہ اسٹڈی میں چلا آتا۔ وہاں سے وہ عموماً بہت دیر سے اٹھتا۔ سونے کے لئے بیڈ روم میں جاتا تو ارجمند جاگ رہی ہوتی۔ ایک دن اسے خیال آیا کہ یہ تو ارجمند کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس صبح وہ چار بجے سونے کے لئے آیا تھا۔ ارجمند کو جاگتے دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ آج ارجمند تہجد سے محروم ہو گئی۔ یہ تو وہ وقت ہے، جب وہ تہجد کے لئے بیدار ہوتی تھی، اور آج وہ سوئی ہی نہیں ہے۔

اسے بہت ملال ہوا کہ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہ دن میں کبھی نہیں سوتی ہے۔

''ارجمند...... ! تم میرے لئے نہ جاگا کرو... اپنے وقت پر سو جایا کرو......!'' اس نے کہا۔

''آپ کو کوئی ضرورت بھی تو ہو سکتی ہے...؟''

''اتنی رات کو مجھے کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ میری وجہ سے تم تہجد سے محروم ہو جاؤ تو یہ مجھ پر بوجھ ہوگا۔''

ارجمند نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا...... لیکن فوراً ہی سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

عبدالحق جانتا تھا... وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ مسئلہ کیا ہے...؟ لیکن اس نے پوچھا نہیں۔

''لیکن آغا جی...!''

''لیکن ویکن کچھ نہیں... ! یہ میرا حکم ہے...!'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''جو حکم آپ کا آغا جی...!'' ارجمند نے کہا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولی۔

''جزاک اللہ...!''

❁❁❁

ارجمند بہت پریشان تھی۔

وہ عبدالحق کی طرف سے بہت زیادہ فکر مند تھی۔ وہ بالکل اچانک ہی بدل گیا تھا۔ اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ اس تبدیلی کی کوئی وجہ سامنے نہیں تھی۔ بلکہ اب

سوچتی کہ شاید اسے اس کا احساس بھی کچھ دیر سے ہوا ہے۔

اور جو کچھ بھی ہوا، وہ کم از کم گھر میں نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس تبدیلی کا تعلق گھر کے کسی فرد سے ہرگز نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا، وہ گھر سے باہر ہی ہوا تھا۔

ایک دن اس نے بیٹھ کر سکون سے اس پر سوچنے اور یاد کرنے کی کوشش کی۔

کراچی آتے ہی تبدیلیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کا آغاز پھوپھا جان کے گھر ہونے والی ان کی دعوت سے ہوا تھا۔ وہ رات اس کی زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ اللہ کی طرف سے بہت بڑا انعام..... اور وہ تھا عبدالحق کا التفات۔ لیکن نہیں......! وہ التفات سے بہت آگے کی بات تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ عبدالحق نے پہلی بار اسے دیکھا اور اس پر مفتون ہو گیا ہے۔ اور صرف اس قربت میں ہی نہیں، عبدالحق کی ہر نگاہ، اس کے ہر انداز، اس کے ہر لمس میں محبت کی ایسی شدت تھی، جو وہ سمجھتی تھی کہ وہ خواب میں بھی نہیں پا سکتی۔ وہ ایسی وارفتگی تھی کہ جس کی آرزو کی جائے۔

اس نے اس پر اللہ کا بہت شکر ادا کیا تھا۔

پھر اچانک ہی پہلی تبدیلی آئی۔ عبدالحق اس سے نظریں چرانے لگا، اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرنے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس گریز میں کھنچاؤ نہیں تھا، بلکہ شرمندگی تھی۔ وہ ٹب میں نیم گرم پانی سے اس کا مساج کرنے کے لئے اس کے پاؤں چھوتی تو اس کے پیروں میں تھرتھراہٹ سی محسوس ہوتی، جیسے ان میں کوئی کرنٹ دوڑ گیا ہے۔

لمس کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ لفظ جھوٹے ہو سکتے ہیں، لیکن نہ تو لمس کبھی جھوٹا ہوتا ہے اور نہ ہی لمس پر اس کا ردِعمل، جسے چھوا جا رہا ہو۔ اور ارجمند وہ زبان خوب سمجھتی تھی۔

اس تھرتھراہٹ میں اکراہ ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ اس میں ایک تڑپ، ایک لپک تھی۔ اس میں محبت میں لپٹی ہوئی ناتمام خواہش تھی۔ اور بے شک، اس میں گریز بھی تھا۔ اس کی وجہ وہ نہیں سمجھ پائی، اور الجھ کر رہ گئی۔ اس میں کوئی ناراضی ہوتی تو وہ ضرور سوچتی کہ اس سے کوئی ایسی غلطی ہوئی ہے، جس پر عبدالحق اس سے خفا ہے۔

لیکن اسے یقین تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

پھر عبدالحق نے اسے اس خدمت سے، اس معصوم قربت سے روک دیا۔ اور اس کے انداز میں معذرت تھی، عاجزی تھی، لیکن اس نے اس کی وجہ نہیں بتائی، بلکہ اسے پوچھنے سے بھی روک دیا۔

وہ اس کے لئے ایک بڑی محرومی تھی۔ لیکن دستبرداری بھی اس کے لئے مسئلہ نہیں تھی۔ محبت کا اس کے نزدیک جو مفہوم تھا، وہ اطاعت سے عبارت تھا۔ اسے تو بس اپنے محبوب کو خوش کرنا اور خوش رکھنا تھا۔ اگر وہ اس کے بغیر خوش ہے تو یوں ہی سہی۔

پھر اسے ایک اور نعمت ملی......!

عبدالحق کا رویہ اس کے ساتھ معذرت خواہانہ اور شرمندگی کا تھا، جیسے اس کے دل پر کوئی بوجھ ہو۔

پھر ایک رات عبدالحق نے اپنے دل کا وہ بوجھ اتار ہی دیا۔ اس نے اس سے معذرت کی کہ وہ اسے کچھ بھی نہیں دے سکا۔ اس نے بھی اس رات عبدالحق سے دل کھول کر بات کی۔ اس کی اور عبدالحق کے درمیان پکنک والے دن سے جو رابطہ قائم ہوا تھا، اس سے اسے معلوم ہوگیا تھا کہ عبدالحق بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن یہ بات عبدالحق کے منہ سے سننے کی خوشی ہی اور تھی۔

پھر عبدالحق نے اس پر یہ راز کھولا کہ اس نے اسے اپنی خدمت سے کیوں محروم کیا......؟ وہ تو اس کے لئے بہت بڑی خبر تھی۔ یہ تو اللہ کا اپنا فرمان ہے کہ سب سے بڑھ کر محبت اس سے ہی کی جانی چاہئے۔ اس کے لئے قابلِ فخر بات تھی کہ اس کا شوہر اس جذبے سے مالا مال تھا، اور یہ اس کی منزل تھی۔

وہ خود بھی بہت کچھ نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس بات میں اسے کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس معاملے میں عبدالحق کے سوچنے کا انداز غلط ہے۔ وہ اللہ کی محبت کو عام اور دنیاوی انداز میں لے رہا تھا۔ اس کی اپروچ یہ ہے کہ جیسے اللہ کی محبت کے لئے دنیا کی ہر محبت کو ترک کر دینا ضروری ہو۔ حالانکہ اللہ نے رہبانیت کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ اللہ نے دنیا ترک کرنے کو کبھی نہیں کہا۔

وہ عبدالحق کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ لیکن اس میں حیا مانع

تھی۔ عبدالحق یہ گمان کرے کہ وہ اپنی ضرورتوں کے تحت یہ کوشش کر رہی ہے، یہ وہ نہیں چاہتی تھی۔ اور عبدالحق لامحالہ یہی سمجھتا۔

دوسرے اس نے عبدالحق کے کہے بغیر یہ بات سمجھ لی کہ عبدالحق اس وقت جذباتی طور پر جہاں پہنچا ہوا ہے، وہاں اس کے لئے ہر دنیاوی تعلق کو ختم کر لینا بہت آسان ہے۔ بلکہ وہ اپنے اور اس کے تعلق کے بارے میں اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔

اس بات نے ارجمند کو دہلا دیا۔ اور اس کا انداز دفاعی ہوگیا۔

اور اس نے اس بات کو غیر مؤثر کرنے کے لئے اللہ کو گواہ بنا کر اپنا ہر حق عبدالحق پر معاف کر دیا۔ اور یہ بات اس نے نہایت خلوص سے، اپنے وجود کی تمام تر سچائی کے ساتھ کہی تھی۔ اور اس نے یہ بھی سچ کہا تھا کہ اگر عبدالحق کو ایک بلند مقام کی آرزو ہے تو بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کی ہر ممکن مدد کرنا اور اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کرنا اس پر فرض ہے۔

اس وقت ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ وہ بہت بڑی بات کہہ رہی ہے۔ بشری کمزوریوں سے کون بچ سکتا ہے......؟

''مجھے خود پر پورا بھروسہ ہے۔'' اس نے تنبیہی سوچ کے جواب میں خود سے کہا۔

''میں نے غلط نہیں کہا کہ ان کی بیوی ہونا میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ مجھے ان سے کچھ بھی نہیں چاہئے۔ میں ان سے ہمیشہ محبت کروں گی۔''

اور اس کے بعد اچانک یہ نئی تبدیلی آئی۔ ایسا لگا کہ عبدالحق دنیا سے بے تعلق ہوگیا ہے۔ کھانا بھی وہ رغبت سے نہ کھاتا۔ بلکہ کھانا اسے یاد ہی نہ رہتا۔ بس وہ اسٹڈی میں بیٹھا رہتا۔ وہ کیا سوچتا......؟ کیا کرتا ہے......؟ یہ وہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ اس کے پاس پانی کا جگ اور گلاس رکھ آتی۔ کبھی چائے لے کر جاتی۔ بس اس کے ہونٹ اسے ہلتے نظر آتے۔

پہلے تو اس نے یہی سوچا کہ عشق میں ایسی کیفیات آتی ہیں۔ لیکن دو تین دن بعد اسے احساس ہوا کہ ان کیفیات میں سرمستی اور خوشی ہوتی ہے، جبکہ عبدالحق سراسر ناخوش نظر آ رہا ہے۔

کوئی بات تھی ضرور، لیکن وہ اس سے پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔

اسٹڈی میں عبدالحق کا قیام طویل تر ہوتا گیا۔ اور بری بات یہ ہوئی کہ وہ ایک اور خوشی سے محروم ہوگئی۔ ہفتے کی رات اور اتوار کے دن دوپہر کے کھانے کے بعد وہ دونوں بیٹھ کر قرآن کی آیات پر باہم غور کرتے، تبادلۂ خیال کرتے۔ لیکن عبدالحق کی اس کیفیت میں وہ سلسلہ بھی موقوف ہوگیا۔ ارجمند نے دو تین بار اسے یاد بھی دلایا۔ لیکن عبدالحق نے اسے ٹال دیا۔

عبدالحق اسٹڈی میں رہتا اور وہ اس کے انتظار میں جاگتی رہتی۔ صبح چار بجے اٹھنا اس کا معمول تھا۔ عبدالحق کی وجہ سے دیر سے سونے سے اس میں خلل تو نہیں پڑا۔ لیکن اس کی صحت پر اثر پڑنے لگا۔ وہ تھکی تھکی رہتی۔ دن میں اسے نیند نہیں آتی تھی۔

پھر ایک رات اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ چار بجے تھے اور عبدالحق ابھی تک خواب گاہ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے دل پر گھونسہ سا لگا۔

''ارے......! آج میں تہجد سے محروم رہ گئی۔'' اس نے دکھ سے سوچا۔

اسی لمحے عبدالحق خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو اسے احساس ہوا کہ اس کی وجہ سے وہ تہجد سے محروم ہوگئی ہے۔ اس نے اسے حکم دیا کہ وہ اس کے لئے نہ جاگا کرے، اپنے وقت پر سو جایا کرے۔

ارجمند نے خوشی سے اس حکم کو قبول کیا۔ وہ اپنی سب سے بڑی روحانی خوشی سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اللہ نے اپنے فضل سے اس رات بھی اسے محروم نہیں ہونے دیا۔ فجر کا وقت ساڑھے پانچ بجے کا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ جو اس کے بیدار ہونے کا وقت ہے، اس میں اسے نیند بھی آئے گی، اور آگئی تو وہ پونے پانچ بجے اٹھ بھی سکے گی۔ لیکن اس نے سوچا۔

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے......؟''

اس نے اللہ سے دعا کی اور پونے پانچ بجے جاگنے کی نیت کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ اللہ کی رحمت کہ لیٹتے ہی اسے نیند بھی آگئی اور ٹھیک پونے پانچ بجے اس کی آنکھ بھی کھل گئی۔

اگلے روز سے وہ اپنے وقت پر سونے لگی۔ عبدالحق کے لئے وہ بہت دعا کرتی تھی کہ جو بھی اس کا مسئلہ ہے، وہ حل ہو جائے، اس کی پریشانی دور ہو جائے۔

دعا کی قبولیت کا تو اسے پتا نہ چلا۔ لیکن ایک رات شدید گھبراہٹ کے عالم میں اس کی آنکھ اس احساس کے ساتھ کھلی کہ ایک نہایت شدید طوفان نے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

وہ سہم کر رہ گئی۔ کچھ کہہ نہیں سکی۔ کچھ کر بھی نہیں سکی۔

❀❀❀

عبدالحق بہت تنہا تھا...... بہت اکیلا......!

تنہائی تو ہمیشہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ تنہائی میں ہمیشہ اسے اللہ کی قربت کا احساس ہوتا تھا۔ ساعتیں پل کی طرح گزرتی تھیں۔ لطف ایسا کہ روح سرشار ہو جاتی تھی۔ تنہائی میں یادِ خدا تھی، ذکرِ خدا تھا، قربِ خدا تھا۔ وہ تو عبادت کے بغیر بھی عبادت تھی۔ آپ بیٹھ کر اپنے ربّ کے، اس کی شان کے بارے میں سوچتے رہیے۔ اندر قطرہ قطرہ سکون گرتا رہے، جمع ہوتا رہے۔

اب پہلی بار اسے تنہائی اور اکیلے پن کا فرق معلوم ہو رہا تھا۔

یادِ خدا تو اب بھی تھی۔ ذکرِ خدا بھی تھا۔ عبادت بھی تھی، لیکن وہ قربِ خدا سے محروم تھا۔ اللہ اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ تو اس سے خفا تھا، اور وہ نہیں تھا تو وہ اکیلا تھا۔ نہایت اکیلا...... اسے پتا چلا کہ تنہائی خوب صورت کیوں ہوتی ہے......؟ تنہائی میں آدمی اکیلا نہیں ہوتا۔ کوئی محبوب اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور وہ محفل سے زیادہ پُرلطف اور دل نشیں ہوتی ہے۔ اس میں تو دل پھول کی طرح کھل جاتا ہے...... رگ و پے میں خون کی جگہ سرشاری رقص کرتی ہے۔

اس نے بہت سوچا، لیکن تنہائی کا کوئی متبادل لفظ اسے نہیں ملا۔ اکیلا پن...... ایک کیفیت تھی۔ اسے تنہائی کا متبادل سمجھنے پر دل آمادہ نہیں تھا۔

اس تنہائی کا نام کچھ اور رکھا جائے
جس تنہائی میں خود سے بھی وحشت ہو

وہ سوچتا کہ جسے وہ تنہائی کہتا تھا، وہ تو بہت لطیف اور غیر ارضی...... بلکہ

آسمانی نعمت تھی...... اور اگر یہ بھی تنہائی ہے تو بے حد مہیب تنہائی ہے۔ اس میں تو دل بوجھل رہتا ہے۔

وہ آفس میں بھی، مصروفیت اور لوگوں کے بیچ میں اکیلا رہتا تھا اور بھرے گھر میں بھی اکیلا۔ لوگوں سے باتیں کرتا، ان کے درمیان بیٹھتا۔ لیکن درحقیقت نہ وہ وہاں ہوتا تھا، اور نہ ہی وہ بات کر رہا ہوتا تھا۔ وہ تو اس کے اندر کوئی مشین تھی، جو خودکار طریقے سے چل رہی ہوتی تھی۔

وہ محسوس کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔

گھر میں وہ اسٹڈی میں بیٹھا رہتا۔ صرف نماز کے لئے باہر جاتا اور پھر وہیں آبیٹھتا۔ ارجمند چائے لاکر دیتی تو وہ چائے پی لیتا...... بغیر کسی خواہش کے۔ وہ اس کے ذائقے کو بھی محسوس نہ کر پاتا۔ ارجمند پانی کا جگ اور گلاس رکھ جاتی۔ مگر اسے پانی پینے کا خیال بھی نہ آتا۔ کبھی وہ آتی اور دیکھتی کہ جگ ویسے کا ویسا رکھا ہے تو گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیتی۔ وہ انکار نہ کرتا، پی لیتا۔ لیکن نہ اسے ضرورت محسوس ہوتی نہ پانی پینے کے بعد تشفی کا کوئی احساس ہوتا۔

ایک اور بات ہوئی۔ استغفار سے سینے میں رکھا پتھر نرم نہ ہوا تو اس کے ارتکاز میں بھی خلل پڑنے لگا۔ وہ نہایت کثرت سے استغفار کر رہا تھا۔ استغفار اس کا وظیفہ بن گیا تھا۔ پڑھتے پڑھتے زبان لڑکھڑانے لگتی، استغفار کے حروف خلط ملط ہونے لگتے۔ الفاظ کچھ کے کچھ ہو جاتے اور اسے پتا نہ چلتا۔ پتا چلتا تو شرمندگی اور بڑھتی۔ وہ پھر دھیان قائم کرتا۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد پھر وہی کیفیت ہو جاتی۔

اس نے اس کی وجہ پر غور کیا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کا دل یکسو نہیں تھا۔ وہ پتھر تھا، لیکن لرزتا محسوس ہوتا تھا۔ کیوں......؟ جب یہ پگھلتا نہیں تو لرزتا کیوں ہے......؟ اسے پتھر والی آیت کا ایک حصہ یاد آیا۔ اور کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

''تو یہ تو اچھی نشانی ہے۔'' اس نے سوچا۔ لیکن تسلی نہیں ہوئی۔ کیا اس کے دل میں اللہ کا خوف ہے......؟

''شاید ہو......! لیکن ایسا لگتا تو نہیں۔ تو پھر وہ لرزہ کیسا......؟''

اچانک اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ خوف نہیں، ہول ہے...... خوف سے بہت آگے کی چیز...... جس میں ہر پل لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے...... کچھ بہت برا ہونے والا ہے......؟

اس کی زندگی میں اس طرح کا ایک ہی تجربہ تھا۔

وہ لڑکپن کی بات تھی، جب اس کی ماں بستر مرگ پر تھیں اور باپ نے کہا تھا کہ بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ تمہاری ماتا جی کو جیون دان دے، اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پوجا کے کمرے میں پرارتھنا کے لئے گیا تھا۔ اس وقت اس کے دل کا وہی حال تھا، جو اب ہے۔

ہاں......! وہ خوف تھا اور غم تھا۔ وہ ہول تھا کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ البتہ اس وقت اسے یہ احساس تھا کہ ماتا جی مر جائیں گی۔ غم یہ تھا کہ وہ دوبارہ انہیں کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ اسے دوبارہ کبھی نہیں ملیں گی۔

مگر یہ ہول اس وقت کے ہول سے بہت بڑھ کر تھا۔

شاید اس لئے کہ اس وقت اسے معلوم تھا کہ کیا بہت برا ہونے والا ہے......؟ اور اب وہ پوری طرح بے خبر تھا...... اندھیرے میں تھا۔

ایک دم اسے ایک آیت مبارکہ کا خیال آیا۔

''وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ......''

یہ آیت قرآن میں، بلکہ سورۂ بقرہ میں ہی متعدد بار آئی ہے۔

اس آیت میں ایمان لانے والوں کے لئے بشارت ہے۔ اللہ خوش خبری دیتے ہیں...... اور نہ ان کے لئے کوئی خوف ہے نہ غم۔

اس نے سوچا۔

''ماتا جی والا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس وقت اوتار سنگھ تھا۔ لیکن اب ایسا کیوں......؟''

اور اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

''اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ خدانخواستہ میں ایمان سے محروم ہو چکا ہوں......؟''

یہ خیال تو بہت ہی جاں کاہ تھا۔ وہ استغفار بھول کر اپنے باطن کی جانچ پڑتال میں مصروف ہو گیا۔

وہ بن دیکھے اللہ پر ایمان لایا ہے.....؟ وہ اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانتا ہے.....؟ وہ تمام فرشتوں پر، تمام پیغمبروں پر، تمام آسمانی کتابوں پر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری پیغمبر ہونے پر یقین کامل رکھتا ہے.....؟ اسے اس پر یقین ہے کہ وہ مقررہ وقت پر مرے گا..... دفن ہو گا اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اس کے اعمال کا اس روز حساب کتاب ہو گا، فیصلہ ہو گا کہ اسے جنت میں جانا یا جہنم میں.....؟ وہ نماز قائم کرتا ہے.....؟ زکوٰۃ ادا کرتا ہے.....؟ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں اللہ کو خوش کرنے کے لئے خرچ کرتا ہے.....؟

آخری سوال کو چھوڑ کر اپنے علم کی حد تک اس کا سچا جواب اثبات میں تھا۔ آخری سوال کے جواب میں یہی کہہ سکتا تھا کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کون جانے..... وہ کم خرچ کرتا ہو.....؟ کون جانے..... وہ دکھاوا کرتا ہو.....؟ اللہ سب کچھ جانتا ہے، اور وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

تو ایمان تو اس کا ٹھیک ہے، کمزور سہی۔ لیکن وہ ایمان سے محروم تو نہیں۔

''پھر یہ خوف اور غم کیوں.....؟''

''یہ تو اس لئے ہے کہ اللہ تم سے ناراض ہے۔ اس نے تمہیں خود سے دور کر دیا ہے۔ لیکن نہیں.....! تم خود اس سے دور ہو گئے..... اپنے ایک برے عمل کی وجہ سے..... اور جب اللہ سے دور ہو گے تو خوف اور غم تو ہو گا۔''

''لیکن اللہ ایسا ناراض ہونے والا کہاں ہے.....؟ اسے ناراض کرنا کوئی آسان نہیں، کیونکہ وہ تو بہت رحم کرنے والا، بخشنے والا ہے، تمہارے کتنے ہی گناہ تو وہ یوں ہی تمہاری بے خبری میں معاف کر دیتا ہے۔ تمہارے نامہ اعمال سے مٹا دیتا ہے۔ اسے ناراض کرنا تو سب سے بڑی بدبختی ہے۔ ماں کو ہی دیکھو، کچھ بھی کر لو، خفا نہیں ہوتی۔ خفا ہو تو بددعا نہیں دیتی۔ دکھ میں دیکھے تو تڑپتی ہے، دیکھا نہیں جاتا اس سے۔ اس کی تکلیف دور کرنے کے لئے تڑپ کر دعا کرتی ہے اور اللہ تو ماں سے 70 گنا سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے اپنے بندوں سے اور وہ قادرِ مطلق بھی ہے۔ وہ تو بغیر دعا

کے بھی تکلیف دور کر دیتا ہے۔''

''یہ ہوا کیا ہے آخر.....؟''

اچانک اسے خیال آیا کہ اپنا جرم، اپنی بدبختی تو اسے معلوم ہے۔ اللہ نے بہت بڑی سعادت، نعمت عظمیٰ اس کی طرف بڑھائی اور اس نے عجز اور تشکر کے ساتھ اسے قبول کرنے کے بجائے اس سے منہ پھیر لیا۔ جرم تو بہت بڑا ہے۔ اور نیت کے اخلاص کا اللہ کے سامنے کون دعویٰ کر سکتا ہے.....؟ وہی تو ہے جو سب کچھ جانتا ہے، ساتوں آسمانوں میں، ساتوں زمینوں میں اور ان کے درمیان اور سینوں میں چھپے ہر بھید سے بھی وہ باخبر ہے۔

''اور اللہ پر ایمان.....!''

یہ تو آسان ہے بھی نہیں۔ ایمان کے لئے جاننا ضروری ہے، اور اللہ کو کوئی نہیں جان سکتا، کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ فہم و علم و شعور کے ہر ذریعے سے ماورا ہے۔ جاننے والے اسے اتنا ہی سمجھ اور جان سکتے ہیں، جتنا اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ اور جتنا بتایا، وہ تو اس کے ایک معمولی حصے سے بھی واقف نہیں۔

اللہ کی تمام صفات پر ایمان ضروری ہے۔ یہی نہیں، اپنے پورے وجود پر اس آگہی کا نفاذ بھی ضروری ہے۔ یوں وہ عقیدے میں شامل ہو گا اور پھر آپ کے اعمال اس کے تابع ہوں گے۔ شرک سرزد ہونے کا خطرہ تو ہر سانس کے ساتھ تلوار کی طرح سر پر لٹکتا رہتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ بندہ چوکنا رہنے کی حد کر دے۔ لیکن وہ تو بڑی لاپرواہی سے زندگی گزارتا رہا ہے۔

اس نے اپنے جرم پر غور کیا۔ اللہ نے اس کی طرف بہت بڑی نعمت اور سعادت بڑھائی، اور اس نے وہ کسی اور کی طرف بڑھا دی۔ کیا اسے اس کا حق حاصل تھا.....؟ کیا وہ نعمت اس کے اختیار میں تھی.....؟ نہیں.....! اور اس نے نعمت جس کی طرف بڑھائی، اللہ نے استفادہ نصیب نہیں ہونے دیا۔ یعنی اسے جتا دیا کہ اس کی مرضی سے کچھ نہیں ہو گا۔ حکم تو اللہ کا ہی چلتا ہے۔

اس نے غور کیا تو احساس ہوا کہ اس سے کئی بڑے بڑے جرائم اس سے سرزد ہوئے۔ منہ موڑنا، اور اللہ منہ موڑنے والے کو سخت ناپسند فرماتا ہے۔ بے نیازی

تو صرف اسی کو زیبا ہے۔ پھر اس نے گمان کیا کہ وہ صاحب استطاعت ہے، اور یہ گمان کرتے ہوئے اس نے نہ یہ سوچا اور نہ ہی اس پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کے پاس جو کچھ ہے، اللہ کی عطا اور اس کے فضل سے ہے۔ اور اس نے سوچا کہ وہ یہ سعادت خود ہی حاصل کر لے گا۔ یہ تو غضب ہی ہو گیا۔ نادانستگی میں، بے خبری میں ہی سہی، اس نے اللہ کی قدرتِ کاملہ کا انکار کیا۔ یہ تو کفر ہے۔

اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

اتنے بڑے بڑے جرائم......! اللہ کے سامنے عجز کے بجائے بے نیازی اختیار کرنا، اور جیسا کہ شہزادہ محمد بن عثمان نے کہا کہ اس نے تکبر کیا......اور پھر کفر......!

''توبہ کیسے قبول ہوگی......؟''

''پہلے کفر سے پاک ہونے کے لئے ایمان تو لاؤ......!'' اس نے خود سے کہا۔

اس نے استغفار کو چھوڑا اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے وِرد میں مصروف ہو گیا۔

کبھی اسے خیال آتا کہ وہ اللہ سے محبت کا دعویدار تھا...... اتنا بڑا دعویٰ، اتنا بڑا ارادہ، اور اوقات اس کی کیا تھی......؟ یہ کہ وہ اپنے ایمان کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ جس سے محبت کرنا چاہتا تھا، وہ اس سے روٹھ گیا تو وہ اسے منانے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا۔ جبکہ وہ بہت مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

نتیجہ کچھ نہیں نکلا تو اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اب اس کا ایک ہی کام ہے۔ یکسو ہو کر اپنے روٹھے ہوئے رب کو منانا۔ یکسوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

گھر میں تو کوئی اس سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ سب نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کسی باطنی بحران سے دوچار ہے۔ اور اپنے ہی طور سے اس سے نمٹے گا۔ کسی نے اس سے گلہ نہیں کیا۔ لیکن نورالحق تو بچہ تھا۔ وہ یہ سب کہاں سمجھتا تھا......؟

اس روز اس نے دفتر سے آ کر کپڑے بدلے۔ کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ نورالحق کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ لفظ نہیں تھے۔ لیکن اس میں بڑی واضح پکار تھی۔ کسی چیز نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

نورالحق بستر پر لیٹا تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عبدالحق کو اس کی نگاہوں میں کھلی محبت دیکھ کر حیرت ہوئی۔

''کیا اتنے چھوٹے بچے بھی محبت کرتے ہیں...؟ کیا انہیں محبت کا اظہار کرنا بھی آتا ہے......؟''

اسے اپنی طرف متوجہ پا کر نورالحق نے ہاتھ پاؤں بھی چلانے شروع کر دیئے اور پھر اس میں تیزی آتی گئی۔ دوسری طرف کی بے لفظ صداؤں کا تاثر بھی بڑھنے لگا۔ ان آوازوں میں تڑپ تھی، التجا تھی۔

عبدالحق کا دل چاہا کہ لپک کر اسے اٹھائے اور سینے سے لگا لے۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ اس نے سوچا، میرا بھی تو یہی حال ہے، لیکن میرا ربّ میری طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

ادھر نورالحق نے دونوں ہاتھ بھی اس کی طرف پھیلا دیئے۔ اس کی نگاہوں میں بھی التجا تھی۔

''سوری بیٹے......! مجھے ایک اور مہم درپیش ہے...... بہت بڑی مہم......!''

عبدالحق بڑبڑایا اور پھر منہ پھیر کر کمرے سے نکل آیا۔

وہ کمرے سے نکلا تو ارجمند نظر آئی۔

''آپ......؟''

''مجھے چائے اسٹڈی میں دے دینا۔''

عبدالحق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اسٹڈی کی طرف چل دیا۔

اس رات اس نے ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ صبح دفتر پہنچتے ہی استعفیٰ دے دے گا۔

مگر اس رات اس نے خواب میں بہت عرصے کے بعد ان بزرگ کو دیکھا، جنہوں نے دہلی میں اسے مسلمان کیا، اس کا نام عبدالحق رکھا اور اسے نماز پڑھنا سکھایا تھا۔ وہی بزرگ جنہیں اس نے اس سے پہلے ایک بار ٹھاکروں کی گڑھی میں بھی دیکھا تھا، جب وہ ماتاجی اور پتاجی کے ساتھ اماں کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

وہ بہت دل گرفتہ اور ملول لگ رہے تھے۔

''آپ اتنے اداس کیوں ہیں......؟'' اس نے ان سے پوچھا۔

''تجھے اس حال میں جو دیکھ رہا ہوں......!'' انہوں نے جواب دیا۔

''تو میرے لئے دعا کریں نا......!''

''دُعا تو بہت لوگ کرتے ہیں تیرے لئے...... مگر کبھی کوئی معاملہ اللہ او
بندے کے درمیان ہوتا ہے تو اس میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ معاملہ تو تجھے خود ہی ٹھیک
کرنا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں......؟'' اس نے بے بسی سے کہا۔
''آپ ہی میری رہنمائی کریں۔''

''اللہ رہنمائی کرتا ہے تو تیری سمجھ میں نہیں آتا......!''

''کیوں سمجھ میں نہیں آتا......؟''

''سب کچھ سمجھنے کے بعد بھول گیا نا......؟'' بزرگ کے لہجے میں ملامت
تھی۔

''بندے کا یہ تمام مقام نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے۔ اس کے وجود میر
صرف دل ہی ایسا ہوتا ہے، جو اللہ کی بات سمجھ سکتا ہے۔ دل میں خرابی ہو تو کیسے سمجھے گ
کوئی۔ سب چھوڑ کر دل کو ٹھیک کر لے......!''

''کیسے کرلوں......؟ کیا کروں......؟''

''میں اتنا ہی بتا سکتا ہوں، جتنی مجھے اجازت ہے۔ شرک کے علاوہ اللہ توب
کرنے پر ہر گناہ معاف کر دیتا ہے۔ لیکن استغفار سے پہلے معاملات درست کر
ضروری ہے۔ کفرانِ نعمت بہت بری بات ہے۔ اس سے خود کو بچا۔ کفرانِ نعمت پر اللہ
مہربان بخش دے اور چاہے تو وہ نعمت بھی تیرے پاس رہنے دے، چاہے تو وہ نعمت
ایک مدت کے لئے چھین لے اور چاہے تو ہمیشہ کے لئے چھین لے۔''

''بخشش کے باوجود......؟''

''ہاں......! بخشش کے باوجود...... یہ احساس بندے کو ہو جائے تو وہ کبھی ک
نعمت سے منہ نہ موڑے۔ اور ایک بار غلطی ہو جائے تو دوبارہ ہمیشہ محتاط رہے۔ اور میں
تجھے کفرانِ نعمت سے زیادہ بری بات سے آگاہ کروں......! جو اللہ کو غضب ناک کرتی

ہے۔'' بزرگ نے کچھ توقف کیا، پھر بولے۔

''وہ ہے اللہ کی کسی نعمت کو کسی بھی وجہ سے اپنے اوپر حرام کر لینا۔ اللہ نے
جس پر بندے کو مکلف نہیں کیا، بندے کا اسے از خود اپنے پر مکلف کر لینا۔ یہ شیطان
کی پیروی کرنا ہوتا ہے۔ پھر اللہ خود اسے اس بندے پر حرام کر دیتا ہے۔ یہ کام بنی
اسرائیل نے بڑی کثرت سے کیا اور محروم اور ذلیل وخوار ہوئے۔''

''اور اگر کفرانِ نعمت پر اللہ کسی کو اس نعمت سے محروم کر دے تو......؟''

''تو اس کے سوا کوئی نہیں، جو اسے دوبارہ عطا کرے۔ تو اسے خوش کرنے
کی کوشش کرو۔ ایمان کو مستحکم کرو۔ اللہ کی اطاعت کرو۔ جس کو اس نے کرنے کا حکم دیا،
وہ کرو، جس چیز سے منع فرمایا، اس سے رک جاؤ۔ صالح اعمال کی طرف لپکو۔ کفرانِ
نعمت پر اس سے توبہ استغفر اللہ کرتے ہوئے اس نعمت کے لئے دعا کرتے رہو، خواہ عمر
تمام ہو جائے۔ جب وہ خوش ہوگا تو عطا فرما دے گا۔''

عبدالحق کو خواب میں بھی دلی طمانیت کا احساس ہوا۔

''لیکن تو تو ایک اور غلطی کرنے جا رہا ہے۔''

''وہ کیا......؟'' عبدالحق پھر خوفزدہ ہوگیا۔

''ملازمت چھوڑنے والا ہے نا......؟''

''جی......! لیکن......''

''تو یقین سے کہہ سکتا ہے کہ وہ نعمت نہیں ہے......؟ اللہ سے ڈرنا یہی تو ہے
کہ بندے کو نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی چیز کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس ڈر سے وہ اسے نہیں
چھوڑتا کہ کہیں کفرانِ نعمت نہ سرزد ہو جائے۔ جب اللہ چاہے گا، خود بندے کو اس سے
اور اس چیز کو بندے سے دور کر دے گا۔''

''میں سمجھ گیا حضرت......!''

''یہ تو اللہ جانتا ہے کہ سمجھا یا نہیں...... ایک اور بات تجھے سمجھانی ہے۔ منزل
تک پہنچنے کا کوئی ایک راستہ نہیں ہوتا۔ بہت راستے ہوتے ہیں۔ ایک راستہ ایسا ہوتا
ہے، جو سیدھا اور صاف ہوتا ہے۔ مگر وہ بے حد طویل ہوتا ہے۔ دیگر راستے مختصر ہوتے
ہیں، لیکن ان میں بندے کے لئے طرح طرح کے خطرات ہوتے ہیں۔ خطرہ جان کا

وہ تو بندہ مول لے سکتا ہے۔ لیکن ایمان کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ اور سن ......! فضول چیز اہم بھی نہیں ہوتی، نہ ملے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن آخرت کی منزل نہ ملی تو اس کی کوئی تلافی، کوئی ازالہ ممکن نہیں ہوتا۔ جہنم کی ابدی زندگی ہی درحقیقت سب سے ڈراؤنی چیز ہوتی ہے۔ اور تو نے تو اپنے لئے ویسے ہی بہت دشوار منزل منتخب کی ہے۔ اللہ تجھے کامیاب کرے۔ لیکن راستہ صحیح منتخب کرنے میں ہی عافیت ہے۔ یہ جلد بازی کا کھیل نہیں۔ سیدھے اور طویل راستے پر منزل تو سامنے نظر آتی رہتی ہے، بھٹکنے کا ڈر نہیں ہوتا۔ لیکن مختصر اور پرُخطر راستے پر تو آدمی راہ سے بھٹک بھی جاتا ہے۔ آدمی اللہ کی عطا کی ہوئی آسانی چھوڑ کر مشکل کی طرف لپکے تو اس میں اللہ خوش نہیں ہوتا، ویسے ہی جیسے آدمی اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت کو خود پر حرام کر کے اسے ناخوش کرتا ہے۔ جلد از جلد منزل پا لینے کی ہوس میں ایمان گنوا دینا بہت ہی بڑا اور ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا حضرت ......!''

''میں تیرے لئے اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اتنی ہی اجازت دی گئی تھی مجھے...... اب آگے تو جان اور اللہ جانے ......!''

اور عبدالحق کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے دیکھا۔ ارجمند اٹھ چکی تھی، اور نماز پڑھ رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی فجر کا وقت نہیں ہوا ہے، ورنہ ارجمند اسے جگا دیتی۔ وہ بستر پر لیٹا خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے خیال میں خواب واضح تھا۔ اسے ملازمت چھوڑنے سے روک دیا گیا تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ اسے ملازمت نہیں چھوڑنی، وقت آئے گا، اللہ کو منظور ہوگا تو اسے خود ہی رہائی مل جائے گی۔

خواب حوصلہ افزا تھا کہ اللہ کی طرف سے رابطہ تھا۔ ناراضی تو ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اسے اللہ کو اور زیادہ ناراض کرنے سے بچا لیا گیا تھا۔

اس صبح ناشتہ کرتے ہوئے اخبار کی ایک خبر پر نظر پڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

واشنگٹن میں کار کے ایک حادثے میں سعودی شہزادے محمد بن عثمان کا انتقال

ہو گیا تھا۔

بے ساختہ اس کی زبان پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن جاری ہو گیا۔ اس نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

آخری بار فون پر بات کرتے ہوئے شہزادے نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لئے کوشش کریں گے، بشرطیکہ اللہ کو منظور ہوا۔ اور شاید اس بات سے اسے کچھ امید بھی بندھی تھی۔ یقین سے وہ بہرحال کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

لیکن اس موت سے یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ اس کے لئے اللہ کی منظوری نہیں تھی۔

خواب میں بزرگ نے کہا تھا...... کوئی معاملہ اللہ اور بندے کے درمیان ہوتا ہے تو اس میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ معاملہ تو تجھے خود ہی ٹھیک کرنا ہے۔

اور خواب دیکھنے کے ساعت بعد ہی یہ بات ثابت ہو گئی تھی۔

❀❀❀

اس نے سوچا تھا کہ خواب کے بعد صورتِ حال بہتر ہو گی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ سینے میں موجود دل پہلے ہی کی طرح پتھر تھا اور آنکھیں خشک۔

اس نے اپنی یادداشت کی حد تک خواب کی ہر بات اپنی ڈائری میں لکھ لی تھی، کیونکہ اس کے خیال میں ان میں اس کے لئے اشارے تھے۔ اور وہ انہیں پڑھتا رہتا تھا۔

دوسری طرف نورالحق کے معصوم تقاضوں میں اور شدت آ گئی تھی۔ اب وہ جب بھی اسے دیکھتا تو ہاتھ پھیلاتا اور تیزی سے پاؤں چلاتے ہوئے منہ سے آوازیں نکالتا۔ جیسے اسے بلا رہا ہو۔ اور وہ آواز لہجے اور مفہوم سے عاری نہیں تھا۔ اس میں تڑپ، محبت اور بلاوا تھا۔

لیکن عبدالحق تو اپنی پریشانی میں گم تھا۔ اس نے بچے کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ اس سے نظریں چرانے لگا۔

خواب میں بزرگ نے کہا تھا...... اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کرو، ایمان کو مستحکم کرو۔ اللہ کی اطاعت کرو۔ توبہ استغفار کرتے ہوئے اس نعمت کے لئے دعا

کرتے رہو، خواہ عمر تمام ہو جائے۔

خواب نے اسے ایک اطمینان بہر حال دلا دیا تھا، یہ کہ وہ ایمان سے محروم نہیں ہوا ہے۔ تبھی تو ایمان کو مستحکم کرنے کے لئے کہا گیا۔ نیک اعمال میں نماز اور زکوٰۃ کے بعد اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اس کو خوش کرنے کے لئے خرچ کرتا تھا۔ اس نے صدقات اور خیرات میں اضافہ کر دیا، اور وہ کوشش کرتا کہ اس کے اور لینے والے کے علاوہ اللہ کو چھوڑ کر کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ اس نے زبیر کو فون کر کے اسے بھی یہ ہدایت کر دی۔

اب اس کے بعد تو بہ استغفار ہی رہ گیا تھا۔ اس نے اس میں بھی جان لگا دی۔

لیکن سب کچھ پہلے جیسا ہی رہا۔ بلکہ اکیلے پن کا احساس اور بڑھ گیا۔ اسے لگتا کہ کہیں کوئی اس کا اپنا نہیں ہے۔ بھری دنیا میں وہ اکیلا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے نہ کچھ نظر آتا تھا، نہ سنائی دیتا تھا۔ اب تو اپنے بیٹے کی مطالبہ کرتی ہوئی پکار بھی اس کی سماعت تک نہیں پہنچتی تھی۔

اسے احساس ہوتا تھا کہ اس کے اندر مایوسی اور جھنجلاہٹ پیدا ہوئی ہے۔ اور بڑھتی جا رہی ہے۔ مایوسی سے وہ بہت ڈرتا تھا کہ وہ کفر ہے۔ لیکن شکر ہے کہ وہ مایوسی خود اپنے آپ سے تھی۔ اللہ سے مایوسی تو تباہ کن ہوتی ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ خود سے مایوسی بھی بالواسطہ اللہ سے ہی مایوسی ہوگی۔ اس لئے وہ اس سے اپنے وجود کی پوری طاقت سے لڑتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جھنجلاہٹ شدید ہوتی گئی، بلکہ اندر غصہ بھی بھر گیا۔

وہ سوچتا۔

''اللہ کے سوا کوئی میرا نہیں، اور وہ مجھ سے خفا ہے۔ میں اسے منانے میں ناکام ہوں۔ اور مجھے بتا دیا گیا ہے کہ دعائیں میرے لئے بہت لوگ کرتے ہیں۔ لیکن معاملہ میرے اور اللہ کے درمیان ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے ہی ٹھیک کرنا ہے۔''

لیکن اسے کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

اسی رات وہ اپنی خواب گاہ میں پہنچا تو غصے اور جھنجلاہٹ سے لبالب بھرا ہوا

تھا۔ اس کا بس چلتا تو دیوار سے سر ٹکرا کر اسے پاش پاش کر دیتا۔ اس کے اندر وہ وحشت اور دیوانگی بھری ہوئی تھی، جس کا اسے کوئی سابقہ تجربہ ہی نہیں تھا۔

اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ لائٹ آف کرنے سے پہلے اس کی نظر ارجمند پر پڑی۔ وہ سوتے میں بہت بے ترتیب ہوگئی تھی۔ وہ اس کے قریب چلا گیا اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگا۔

اس وقت وہ ذہنی طور پر اس کے حسن کو دیکھنے اور اللہ کی قدرت اور صناعی کو سراہنے کے قابل نہیں تھا۔

''میں اکیلا کہاں ہوں......؟'' اس نے سوچا۔

''یہ میری منکوحہ ہے...... اللہ نے اسے میرے تصرف میں دیا ہے......!''

لیکن پھر اندر غصے اور جھنجلاہٹ کا سمندر بپھرا۔

''لیکن یہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ پھر اس کی رو بدلی۔ اس نے کچھ کیا بھی نہیں۔ میں تکلیف میں ہوں اور یہ آرام سے سو رہی ہے۔ یہ میرے اکیلے پن کو دور کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ کچھ مصرف نہیں اس کا۔''

وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔

اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی گرفت میں بے پناہ سختی تھی۔

❁❁❁

ارجمند کی آنکھ گھبراہٹ سے کھلی۔ گہری نیند سے جاگنے پر کچھ دیر تک تو ویسے ہی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بات پوری طرح سمجھ میں آنے سے پہلے اسے یہ احساس بہر حال ہوا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تو اس کے لئے پسندیدہ ہے، لیکن جس انداز میں ہو رہا ہے، وہ اس کے لئے بے حد اذیت ناک ہے۔

لیکن اس حال میں بھی اسے احساس رہا کہ ایسا کچھ نہ ہو۔ جس سے عبدالحق کی اہانت یا دل آزاری ہو۔ اس نے خود کو طوفان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

اور جب وہ پوری طرح بیدار ہوئی تو طوفان گزر چکا تھا۔

چند لمحے تو وہ دم سادھے لیٹی رہی۔ اس میں جیسے ہلنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ پھر عبدالحق کی سانسوں کی لے سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ سو چکا ہے۔ اس نے

سر گھما کر اسے دیکھا۔ لیکن اندھیرے میں وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی۔ چند
لمحوں میں اس کی نگاہ اندھیرے کی عادی ہوئی تو عبدالحق کا چہرہ اسے نظر آیا۔ وہ
واقعی سو چکا تھا۔

چند لمحوں میں اس طرح بے سدھ ہو کر اس کا سو جانا...... اسے حیرت ہوئی۔
پھر خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب کچھ ایسے میں ہوا ہو کہ عبدالحق بھی سو رہا ہو۔
وہ خود نیند میں تھی، اس لئے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ لیکن یہ بات اس کے دل کو
لگی، کیونکہ جو کچھ ہوا، وہ عبدالحق کی فطرت اور اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اس کی جسمانی
کیفیت ایسی تھی، جیسے جسم کسی بہت بھاری ملبے کے بوجھ تلے دبے رہنے کے بعد باہر
نکلا ہو۔ اور یہی نہیں، اس کی روح بھی زخمی تھی۔

نیند اس کی غائب ہو چکی تھی۔ ایسے میں وہ سوچنے کے سوا کیا کر سکتی
تھی...... ؟ اور سوچنے کو عبدالحق کے سوا تھا ہی کیا...... ؟ سوچا تو بات اس کی سمجھ میں آنے
لگی۔

عبدالحق تو بہت دن سے پریشان تھا۔ کوئی بہت بڑی بات تھی جس نے اسے
ہلکان کر رکھا تھا۔ اور یہ طے ہے کہ اس نے اس بارے میں کسی سے بھی بات نہیں کی
تھی۔ دادی اماں سے بھی نہیں۔ دادی اماں نے تو خود اس سے کہا تھا...... عبدالحق کو
کوئی بہت بڑی پریشانی ہے۔

”تو آپ ان سے پوچھیں نا...... آدمی دل کا بوجھ ہلکا نہ کرے تو پریشانی بہت
بڑی بن جاتی ہے۔“ اس نے کہا تھا۔

”پوچھا تھا...... پر کچھ بتایا نہیں اس نے۔ نکی...... ! تو پوچھ نا اس سے......
دیکھ تو سہی...... گھلتا جا رہا ہے۔“

”آپ کو نہیں بتایا تو مجھے کیا بتائیں گے...... ؟“

”بہت سی باتیں آدمی صرف اپنی بیوی سے ہی کر سکتا ہے...... ؟“

اور اماں کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ عبدالحق نے بات اسی سے کی تھی،
لیکن زبان سے نہیں، اسے روندنے کے عمل سے۔ اور اس طرح اس نے سب کچھ بتا

دیا تھا...... بتا دیا تھا کہ وہ اتنا پریشان ہے کہ اس کی شخصیت ہی مسخ ہو گئی ہے۔

اسے اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہئے لیکن وہ کیا کر سکتی ہے...... ؟ اسے اس سے
پوچھنا چاہئے کہ مسئلہ کیا ہے...... ؟ یہ اس کی فطرت نہیں تھی۔ وہ خود کو شوہر پر تھوپنے کی
قائل نہیں تھی۔ لیکن دوسری طرف وہ اسے خسارے میں پڑتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

وہ ہمت کر کے اٹھی، باتھ روم گئی، غسل کر کے نکلی اور تہجد کے لئے کھڑی
ہو گئی۔ نماز کے بعد اس نے بہت دعا کی، عبدالحق کے لئے بھی کہ اس کی ہر پریشانی دور
ہو جائے، ہر مشکل آسان ہو جائے اور اس کا ہر مسئلہ حل ہو جائے۔ بالخیر...... ! اور اپنے
لئے بھی کہ اللہ اس کی رہنمائی فرمائیں کہ اسے کیا کرنا چاہئے...... ؟

پھر اس نے باتھ روم میں عبدالحق کے لئے پانی تیار کیا اور اسے جگا دیا۔ اس
کی آنکھ کسی طرح کھل ہی نہیں رہی تھی۔ مگر اس نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر اسے اٹھا دیا۔

”آغا جی...... ! باتھ روم میں جا کر غسل کر لیجئے۔ میں نے پانی تیار کر دیا
ہے۔“

اس صبح وہ عبدالحق کے دفتر جانے کے لئے کپڑے نکال رہی تھی کہ عبدالحق
کمرے میں آیا۔ اس کے آتے ہی اسے نورالحق کی ننھی منی عجیب سی آوازیں سنائی
دینے لگیں۔ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

اور وہ بہت عجیب منظر تھا۔

وہ زبان کوئی اور تھی، لیکن اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ
نورالحق عبدالحق سے باتیں کر رہا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، وہ بار بار عبدالحق کی طرف
ہاتھ پھیلاتا، جیسے اصرار کر رہا ہو کہ اسے گود میں لے لے۔

لیکن عبدالحق اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں ارجمند کو گمان
ہوا کہ وہ دانستہ بچے سے نظریں چرا رہا ہے۔

اور نورالحق کا اصرار...... بلکہ جوش و خروش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آوز بلند ہو رہی
تھی اور اب وہ ہاتھ پاؤں بھی چلا رہا تھا۔ اور وہ کھلی اور صاف محبت تھی، جو عبدالحق کو
دیکھتے ہوئے بچے کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔

اس معصوم محبت کو دیکھ کر ارجمند کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

عبدالحق ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھا داڑھی میں کنگھا کر رہا تھا۔

"سنیں آغا جی.....! اسے تو دیکھیں ذرا.....!" اس نے عبدالحق کو پکارا۔

"کیسے دیکھوں......؟" عبدالحق کی نظریں اب بھی آئینے میں اپنے عکس پر تھیں۔

"نورالحق کو......!"

"کیا ہوا اسے......؟"

"دیکھیں تو سہی......!"

عبدالحق نے بچے کی طرف دیکھا اور بے پرواہی سے بولا۔

"بہت خوش نظر آ رہا ہے......!"

"خوش نہیں......! یہ آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ آپ کی گود میں آنا چاہتا ہے۔"

"کمال کرتی ہو ارجمند......! اتنا سا بچہ باتیں کیسے کر سکتا ہے......؟"

"بچے تو باتیں کرتے ہیں۔ ہماری زبان سیکھنے سے پہلے اپنی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔"

"اور تم اس کی یہ زبان سمجھتی ہو......؟" عبدالحق نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کیسے پتا چلا تمہیں کہ یہ میری گود میں آنا چاہتا ہے......؟"

"یہ جو اتنی تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے، اس کا یہی مطلب ہے......!"

"بچے تو غوں غاں کرتے ہیں ارجمند......! اور ہاتھ پاؤں بھی چلاتے ہیں۔ کسی کو بھی دیکھ کر ایسا کر سکتے ہیں۔"

"یہ کسی کو دیکھ کر ایسا نہیں کرتا۔ یہ صرف آپ کے ساتھ ایسا کر رہا ہے۔"

"بھلا کیوں......؟"

"اس لئے کہ یہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ۔"

اس دوران بچے کی آوازوں اور ہاتھ پاؤں چلانے میں اور تیزی آ گئی تھی۔

"تمہیں یہ کیسے معلوم......؟"

"میں نے اسے ابتداء سے ہی تلقین کی تھی کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد

اسے سب سے زیادہ محبت آپ سے کرنی ہے۔ پیدائش سے پہلے سے میں اسے یہ تلقین کرتی رہی ہوں۔"

عبدالحق نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پیدائش سے پہلے کیسے......؟"

ارجمند گڑبڑا گئی۔ وہ بے سوچے سمجھے بول گئی تھی۔ اس نے جلدی سے بات بنائی۔

"میں آپی مرحومہ کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں اس سے باتیں کرتی تھی۔ اسے قرآن پڑھ کر سناتی تھی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو ارجمند......؟" عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

"ماں کے پیٹ میں بچے سنتے بھی ہیں......؟"

"اس سے زیادہ قربت تو ممکن ہی نہیں ہوتی آغا جی......!"

"تو وہ قربت تو اس کی نور بانو سے تھی نا......؟"

"جی آغا جی......! تو آپی بھی اسے یہی تلقین کرتی تھیں۔"

"تم نے یہ کیسے کہا کہ یہ میری گود میں آنا چاہتا ہے......؟"

"میں اس کا ہر انداز پہچانتی ہوں آغا جی......!" ارجمند نے نہایت اعتماد سے کہا۔

"اس کی یہ ہیجانی کیفیت صرف اس وقت ہوتی ہے، جب یہ بھوکا ہوتا ہے اور میں اسے دودھ پلاتی ہوں۔"

عبدالحق کو اس جملے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہوئی۔ ارجمند نے یہ نہیں کہا کہ جب میں اسے دودھ کی بوتل دیتی ہوں، اس نے کہا کہ جب میں اسے دودھ پلاتی ہوں اور اس میں بھی زور "میں" پر تھا۔ جبکہ ارجمند کی غیر موجودگی یا مصروف ہونے کی صورت میں کبھی اماں، کبھی رشیدہ اور کبھی آبیہ اسے دودھ کی بوتل دیتی ہوں گی۔

ارجمند کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اب عبدالحق کا دھیان ہٹانا ضروری تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"میں آپ پر یہ بات ثابت کر سکتی ہوں۔"

"تو ثابت کرو.....!"

"آپ اس کے پاس آئیں اور گود میں لینے کے لئے ہاتھ پھیلائیں۔ اگر میرا مشاہدہ درست اور دعویٰ سچا ہے تو اس کا ہیجان اور بڑھ جائے گا۔"

عبدالحق اٹھ کر بچے کی طرف آیا اور اس نے ہاتھ پھیلائے۔

اور واقعی..... نورالحق تو جیسے مشین بن گیا۔ اس کی آوازیں بھی تیز ہوئیں اور ہاتھ پاؤں میں تو جیسے بجلی بھر گئی۔ اور آواز میں وقفے وقفے سے سسکیوں کا تاثر شامل ہونے لگا۔

"دیکھا آپ نے.....؟" ارجمند نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"اب آپ اسے گود میں لیں تو یہ پُرسکون ہو جائے گا، جیسے دودھ پیتے وقت ہوتا ہے۔"

عبدالحق جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

"تمہاری باتوں میں آفس سے لیٹ ہونے والا ہوں میں۔ اب اس وقت تو یہ ممکن نہیں۔ لاؤ جلدی سے کپڑے دو مجھے.....!"

اور نورالحق ایسے بلک بلک کر رویا کہ ارجمند کا دل کٹنے لگا۔

❁❁❁

اس شام عبدالحق نے رشیدہ کو اسٹڈی میں بلا لیا۔

"میں دیکھتا ہوں کہ ارجمند بچے کو ہر وقت لئے رہتی ہیں۔"

رشیدہ کو لگا کہ وہ اسے فارغ کرنے والا ہے۔ بے مصرف ہونے کی وجہ سے اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں صاحب جی.....! ایسا نہیں ہے۔ آپ خود سوچیں نا..... بی بی صاحبہ کھانا تو خود ہی پکاتی ہیں نا.....؟"

"ہاں..... ! یہ تو ہے.....!" عبدالحق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"ایسے میں بچے کو بھوک لگے تو پھر.....؟"

"میں اور آیہ ہیں نا صاحب جی.....! دودھ کی بوتل بنا کر چھوٹے صاحب

کو دیتے ہیں ہم.....!"

"اور دودھ کی بوتل دینے پر وہ کیا کرتا ہے.....؟"

"دودھ پیتے ہیں صاحب جی.....!" رشیدہ نے سادگی سے کہا۔

"میرا مطلب ہے، وہ کچھ اظہار تو نہیں کرتا.....؟ جیسے ناراضی کا یا خوشی کا.....؟"

رشیدہ نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔

"نہیں صاحب جی.....! بس وہ دودھ پیتے رہتے ہیں۔ اور اب تو انہیں دلیہ بھی دیا جاتا ہے۔"

"اچھا.....ٹھیک ہے.....! تم جاؤ.....!"

لیکن رشیدہ چوکنا ہو گئی تھی۔ اس نے اس خیال سے کہ صاحب جی کو کچھ شک ہو گیا ہے، آیہ کو بھی خبردار کر دیا اور حمیدہ اور ارجمند کو بھی یہ بات بتا دی۔ صرف ارجمند ہی اصل بات سمجھ سکی کہ اس کے منہ سے نکلی بات مصیبت بن سکتی ہے۔

عبدالحق کے معمولات وہی کے وہی تھے۔ کیفیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یہ اس کی سب سے دوری کا سبب تھا۔ جب تک اللہ راضی نہ ہو جائے، اسے دنیا میں کسی سے رغبت نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے وہ اپنے کمرے میں گیا ہی نہیں کہ وہاں نورالحق اسے گود میں لینے کی ضد کرے گا۔

ارجمند کی صبح کی باتوں سے اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا، جیسے کوئی اہم بات ہے، جو اس پر کھل رہی ہے۔ لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا ہے۔ اس بات کی نوعیت کیا ہے.....؟ اس کا بھی اسے کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔ بس وہ ایک خلش سی محسوس کر رہا تھا۔

رشیدہ سے بات کرنے کے بعد ارجمند کی یہ بات کمزور ہو گئی تھی کہ نورالحق یا تو اسے دیکھ کر، اس کی گود میں آنے کے لئے بے تاب ہو کر یوں ہیجانی کیفیت میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہے، یا بھوک کے عالم میں دودھ سامنے آنے پر۔ رشیدہ نے اس دوسری بات کی تردید کر دی تھی۔

اس نے اس پر سوچا۔

ارجمند جھوٹ کبھی نہیں بولتی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ نورالحق صرف ارجمند کے ہاتھ سے دودھ پیتے ہوئے ایسا کرتا ہوگا۔ اور اس کا مطلب یہ کہ وہ ارجمند سے محبت کرتا ہے۔''

پھر ایک اتفاق ایسا ہوا کہ رشیدہ کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ۔

فوزیہ گھبرائی ہوئی آئی اور اس نے ارجمند سے کہا۔

''جلدی سے چلیں باجی......! امی کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔''

اور ارجمند عارف کے گھر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد نورالحق کے رونے کی آواز نے عبدالحق کو چونکا دیا۔ وہ عام طور پر روتا ہی نہیں تھا۔ اور اس طرح تو اسے روتے اس نے کبھی سنا ہی نہیں تھا۔

وہ لپک کر باہر نکلا۔ رشیدہ نظر آئی۔ ان کے چہرے پر پریشانی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' اس نے رشیدہ سے پوچھا۔

''وہ...... چھوٹے صاحب کو بھوک لگی ہے صاحب جی......! یہ ان کا دودھ پینے کا وقت ہے۔''

عبدالحق کو یہ بات عجیب سی لگی کہ رشیدہ دودھ بنانے کے بجائے پریشان کھڑی ہے۔

''تو دودھ بنا کر دو اسے......!'' اس نے کہا۔

''جی صاحب جی......!'' رشیدہ نے کہا اور کچن میں چلی گئی۔

عبدالحق بیڈروم میں جانے کے بجائے وہیں کھڑا رہا۔

رشیدہ دودھ کی بوتل لے کر کمرے میں گئی تو عبدالحق بھی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بچے کی نظروں میں آئے بغیر اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

رشیدہ نے نورالحق کو گود میں لیا۔ مگر وہ اس کی گود سے نکلنے کے لئے بری طرح مچل رہا تھا۔ دودھ کی بوتل دیکھ کر وہ پرسکون نہیں ہوا۔ بلکہ عبدالحق کو تو ایسا لگا کہ وہ اور بھڑک گیا ہے۔

رشیدہ کو احساس تھا کہ عبدالحق دیکھ رہا ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ

صورتِ حال قابو میں آنے والی نہیں۔ اس کا رواں رواں اللہ سے دعا کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ آج کہیں راز ہی نہ کھل جائے......؟

رشیدہ نے فیڈر بچے کے منہ میں دینے کی کوشش کی۔ لیکن بچے نے فیڈر اس سے لے کر دور پھینک دی، اور پہلے سے زیادہ زور سے چنگھاڑنے لگا۔

عبدالحق کمرے میں داخل ہوا اور اس نے فیڈر اٹھا کر اپنے ہاتھ سے بچے کو دی۔

''لو......! دودھ پی لو......!'' اس نے چمکار کر کہا۔

لیکن بچے کے فیڈر لے کر پھر دور پھینک دی۔

عبدالحق کو شاک لگا۔ نورالحق تو اس وقت اس کے پاس آنے کے لئے ہاتھ پھیلا رہا تھا، نہ ہی مشین کی طرح پاؤں چلا رہا تھا۔ اور اس نے اس کا دیا ہوا دودھ بھی قبول نہیں کیا تھا۔

''یہ کیا بات ہے......؟'' اس نے رشیدہ سے پوچھا۔

''یہ تو دودھ لے ہی نہیں رہا ہے......؟''

''اس وقت ضد ہوگئی ہے چھوٹے صاحب کو...... اب تو بی بی صاحبہ کے ہاتھ سے ہی پئیں گے۔''

بچہ رو رو کر نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ عبدالحق سے برداشت نہیں ہوا۔

''تو اسے ارجمند کے پاس لے جاؤ......!'' اس نے کہا۔

اور یہ سنتے ہی رشیدہ بچے کو لے کر دروازے کی طرف لپکی۔

''تم فیڈر تو بھولے ہی جا رہی ہو۔'' عبدالحق نے اسے پکارا۔

''اس کی ضرورت......'' رشیدہ نے بے ساختہ کہا۔ پھر ایک دم رک گئی۔

''ایک لمحے کے بعد اس نے سوچا۔

''جی صاحب جی......! اس کے بغیر تو کام نہیں چلے گا۔ میں گھبراہٹ میں بھول ہی گئی تھی۔''

❁❁❁

رضوانہ کی طبیعت بہت خراب تھی۔

وہ گردے کے درد کا معاملہ تھا۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ فوزیہ اس کی کمر سہلا رہی تھی۔ عارف اور دوسرے بچے اس کے گرد پریشان کھڑے تھے۔

''کیا ہوا پھوپھا جان......؟'' اس نے عارف سے پوچھا۔

''اچانک ہی درد اٹھا ہے۔ میں انہیں اسپتال لے جا رہا ہوں۔''

''میں بھی ساتھ چلوں......؟''

رضوانہ کچھ بولنے کے قابل نہیں تھی۔ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''میں فوزیہ اور حماد کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ہماری واپسی تک تم یہاں رک سکو گی......؟'' عارف نے پوچھا۔

''جی پھوپھا جان......! کیوں نہیں......؟''

عارف نے رضوانہ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

ان کے جانے کے بعد ارجمند جواد اور فوزیہ کی دلجوئی میں لگ گئی۔ جو بے حد پریشان تھے۔ اس کی باتوں سے ذرا دیر میں ان کی پریشانی کم ہو گئی۔

ذرا دیر ہی ہوئی تھی کہ کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے نور الحق کی آواز لگی۔ اور رونے کی آواز قریب آ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ نور الحق کی آواز ہے۔

پھر اسے یاد آیا کہ یہ تو نور الحق کے دودھ پینے کا وقت ہے۔ وہ دروازہ کھولنے کے لئے لپکی۔

رشیدہ اس حال میں اندر آئی کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گود میں نور الحق تھا، جسے سنبھالنا اس کے لئے دشوار ہو رہا تھا، اور اس کے ایک ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی۔

''انہیں سنبھالیں بی بی صاحبہ......!'' رشیدہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اس کی سانسیں بھی ناہموار تھیں۔

ادھر ارجمند کو دیکھتے ہی نور الحق کا رونا موقوف ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھ ماں کی طرف پھیلا دیئے۔

ارجمند نے اسے گود میں لیا۔ گود میں آتے ہی وہ سسکیاں لینے لگا۔ اس

رونے میں بڑی مظلومیت اور شکایت تھی۔

ارجمند دیوانہ وار اسے چومنے لگی۔ بچہ خاموش ہو گیا۔

''سوری میرے بیٹے......!'' ارجمند سرگوشی میں اس سے باتیں کرنے لگی۔

''آپ تو بڑے صابر بچے ہیں، اتنا ہنگامہ کیوں مچایا آپ نے......؟''

''صاحب بھی پریشان ہو گئے تھے۔'' رشیدہ نے معنی خیز لہجے میں اسے بتایا۔

ارجمند نے اس کے ہاتھ سے دودھ کی بوتل لی اور عارف کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ نور الحق اب بول بھی رہا تھا اور بہت تیزی سے ہاتھ پاؤں بھی چلا رہا تھا۔

''آ جاؤ بیٹے......!''

کچھ دیر بعد ارجمند کو احساس ہوا کہ نور الحق سو چکا ہے۔ اس نے اسے بڑی نرمی اور آہستگی سے بستر پر لٹا دیا۔ پھر اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے کھڑکی کھول کر فیڈر کا دودھ باہر گرا دیا۔

وہ یہ سوچ کر لرز رہی تھی کہ اگر وہ پھوپھا جان کے ساتھ ہاسپٹل چلی جاتی تو کیا ہوتا......؟

وہ باہر نکلی تو جواد اور صوفیہ اپنے اپنے کمرے میں تھے۔ البتہ رشیدہ وہیں موجود تھی۔

رشیدہ نے اسے تفصیل بتانے کے بعد کہا۔

''مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے بی بی صاحبہ......! ایسے تو یہ راز کسی بھی وقت کھل جائے گا......؟''

''ہمارے پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہو گا رشیدہ......! اللہ ہی پردہ رکھنے والا ہے۔'' ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

❀❀❀

ارجمند کے دل میں خوف بیٹھ گیا تھا۔

عبدالحق کے معمولات تو وہی تھے بلکہ شاید اس کی جھنجلاہٹ اور بڑھ گئی تھی۔

ارجمند سوتو جاتی تھی، لیکن وہ بہت گہری نیند نہیں سو پاتی تھی۔ عبدالحق سونے کے لئے کمرے میں آتا تو خوف سے اس کی نیند اچٹ جاتی۔ اسے ڈر لگتا کہ شاید اس کے ساتھ پھر وہی کچھ ہونے والا ہے اور جب تک عبدالحق سو نہ جاتا، اس کی دوبارہ آنکھ نہ لگتی۔

جو کچھ ہوا تھا، اس کے جسمانی اثرات تو زائل ہو چکے تھے۔ لیکن روح کے زخم آسانی سے بھرنے والے نہیں تھے۔ اس رات اس کی عزتِ نفس روندی گئی تھی، اور اسے بحال بھی روندنے والا ہی کر سکتا تھا۔

یہ تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عبدالحق اگر اس وقت نیند میں نہیں تھا تو بھی کم از کم اپنے آپے میں ہرگز نہیں تھا۔ ورنہ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق کتنا حساس آدمی ہے۔ دوسروں کا حد درجہ احساس کرنے والا۔ وہ تو اس سے صرف معذرت پر اکتفا نہ کرتا۔ بلکہ تلافی کی کوششیں کرتا اور کرتا رہتا۔ اس پر مطمئن بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اسے تو جیسے یاد ہی نہیں تھا۔

اس سوچ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے زخم بھول گئی اور اسے عبدالحق کی فکر لاحق ہو گئی۔ یہ قیاس کرنا بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ کون سی پریشانی ہو سکتی ہے، جس نے عبدالحق جیسے اللہ سے رابطہ رکھنے اور رجوع کرنے والے کو اس حال کو پہنچا دیا ہے۔

اس کی سمجھ میں یہ آ گیا کہ اس معاملے کا تعلق اللہ سے ہی ہے۔ دنیاوی معاملات میں عبدالحق کو کوئی پریشانی نہیں تھی، اور ہوتی بھی تو وہ اس کے لئے اتنا پریشان ہونے والا نہیں تھا۔

اور عبدالحق تو وہ تھا جو اللہ کی محبت کے سفر پر نکلا تھا...... اس سے اس کے تمام حقوق معاف کرا کر۔ ایسے آدمی کی پریشانی، اور پریشانی بھی ایسی کہ اس سے اس سلسلے میں اماں تک سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

”یقیناً کوئی بہت بری بات ہو گی......!“ اس نے سوچا۔

”کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے ان سے......؟ مگر اس سے کیا...... وہ جانتے ہیں کہ بندہ صدقِ دل سے توبہ کرے تو اللہ ہر گناہ بخش دیتا ہے۔“

”میں کیا کروں......؟“ اس نے بے بسی سے سوچا۔

وہ جو ہفتہ اور اتوار کو ان کا معمول تھا کہ وہ قرآنی آیات پر تبادلۂ خیال کرتے تھے، اس پریشانی میں وہ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے درمیان کوئی رابطہ ہی نہیں رہا تھا۔

سچ بات ہے۔ اس کا تو عبدالحق سے رابطہ اللہ ہی کے توسط سے ہے۔

”تو پھر......؟“

کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ آج وہ عبدالحق کو کم از کم اس معمول کے بارے میں یاد ہی دلا دے۔

اور وہ دن بھی ہفتے کا تھا۔

❀❀❀

عبدالحق مایوسی کی انتہاء کو پہنچ گیا تھا۔

سینے کا پتھر تو جوں کا توں رکھا تھا۔ وہ تو کم ہی نہیں ہوا تھا۔ اب اس کا دل استغفار میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔

وہ اس آیت مبارکہ پر غور کرنے لگا۔

”پھر سخت ہو گئے تمہارے دل یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی......“

”کون سا منظر......؟“ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

لیکن اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں آیا۔

اسی وقت ارجمند کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”میں مخل تو نہیں ہو رہی ہوں آغا جی......!“

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے ارجمند......؟“

”آپ کو کچھ یاد دلانا چاہتی ہوں۔“

”کیا......؟“

”آج ہفتہ ہے......!“

عبدالحق کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

”تو پھر......؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

"ہمارا ایک معمول تھا ہفتے اور اتوار کے دن کا..... جو کئی ہفتوں سے رکا ہوا ہے۔ اور مجھے اس سے نقصان ہو رہا ہے۔"

"کس معمول کی بات کر رہی ہو.....؟"

"قرآن پر تبادلۂ خیال.....!"

اور عبدالحق کے ذہن میں ایک دم روشنی سی ہوگئی۔

"واقعی.....! نقصان تو مجھے بھی ہو رہا تھا۔ لیکن میں سمجھ نہیں پایا۔"

اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"تم نے مجھے پہلے یاد کیوں نہیں دلایا.....؟"

"آپ اتنے مستغرق ہوتے تھے کہ ہمت نہیں ہوئی۔"

"آؤ..... بیٹھو نا.....!"

ارجمند بیٹھ گئی۔

عبدالحق نے اسے وہ آیت مبارکہ سنائی۔

"میں اس وقت اس پر غور کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کس منظر کی بات ہے.....؟"

"آپ کو یاد نہیں.....؟"

عبدالحق نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ وہ گائے والا معاملہ ہے۔ جس کی قربانی کا اللہ نے....."

"بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا۔" عبدالحق نے بے صبرے پن سے اس کی بات مکمل کر دی۔

"جس کے سلسلہ میں انہوں نے بڑی ٹال مٹول اور حجت کی تھی کہ کس عمر کی ہو.....؟ کیسا رنگ ہو.....؟ وغیرہ وغیرہ۔"

"جی..... وہی.....!"

"اور بالآخر انہوں نے انشاء اللہ کی برکت سے اس کی قربانی کر دی تھی۔"

"جی ہاں.....! پھر اللہ نے حکم دیا تھا کہ اس گائے کے گوشت یا ہڈی سے ایک مقتول کے جسم پر ضرب لگاؤ.....!"

"ہاں..... اور اس کے نتیجے میں وہ مقتول زندہ ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے قاتل کے بارے میں بتایا تھا اور پھر دوبارہ مر گیا تھا۔" عبدالحق کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا ذہن کھل گیا ہے۔

"جی آغا جی.....! اس واقعے کے حوالے سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی کھلی اور روشن نشانیاں دیکھنے کے باوجود بندہ یقین نہ کرے تو اس کا دل پتھر سے بھی سخت ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم.....! اس واقعے میں اللہ نے مردے کو نہ صرف زندہ کر دکھایا..... بلکہ اس سے گواہی بھی دلوائی۔ اس کے بعد اگر دیکھنے والے اس میں شک کریں کہ اللہ قیامت کے دن سب کو اٹھا کر حساب لے گا تو ان کے لئے تباہی ہے۔"

"اور دل کا پتھر سے بڑھ کر سخت ہو جانا بہت بڑی تباہی ہے۔"

عبدالحق نے جھرجھری لے کر یوں بدن چرایا، جیسے جسم پر کوئی کوڑا لگا ہو۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔

"بنی اسرائیل کو تو اللہ نے بے شمار نشانیاں دکھائیں۔ اتنی نشانیاں کہ کسی قوم کو بھی نہیں دکھائی گئیں۔"

"بے شک.....! قرآن بتاتا ہے کہ پھر بھی وہ سرکشی کرتے رہے۔ دریا کا پھٹ کر انہیں راستہ دینا اور آلِ فرعون کا غرق ہونا۔ اس کے بعد صحرا میں دھوپ کی شکایت کی تو اللہ نے انہیں سایۂ ابر عطا فرمایا۔ بھوک کی شکایت کی تو بغیر کسی محنت مشقت کے انہیں اعلیٰ ترین رزق عطا فرمایا۔ پیاس کا گلہ کیا تو پانی کے بارہ چشمے بے آب و گیاہ صحرا میں عطا فرمائے تاکہ بارہ قبیلوں کے درمیان پانی پر فساد نہ ہو۔ لباس میسر نہیں تھا تو لباس کو بوسیدگی اور بدبو اور میلے پن سے پاک کر دیا۔"

"اللہ نے انہیں آلِ فرعون سے زیادہ نشانیاں دکھائیں۔"

"جی..... کہیں زیادہ.....!"

"سورۂ زخرف میں اللہ نے فرمایا ان کے بارے میں کہ وہ انہیں ایک کے بعد ایک نشانی دکھاتا رہا، اور ہر نشانی پہلے سے بڑی ہوتی تھی۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن بنی اسرائیل کو ان سے زیادہ نشانیاں دکھائیں۔"

"جی ہاں.....!"

"لیکن آلِ فرعون غرق کر دیئے گئے اور بنی اسرائیل آج بھی موجود ہیں۔ کیوں.....؟"

"اللہ کی مرضی.....!" ارجمند نے کہا۔

"بظاہر تو دونوں میں ایک ہی فرق نظر آتا ہے۔ آلِ فرعون کافر تھے اور بنی اسرائیل اہلِ ایمان اور اہلِ کتاب تھے۔ اللہ نے خود فرمایا کہ اس نے ان پر بڑی عنایات کیں، انہیں اپنے عہد کے تمام لوگوں پر مرتبہ اور فضیلت عطا فرمائی۔ لیکن وہ ناشکرے بھی تھے اور سرکش بھی۔ اپنے مفادات انہیں بہت عزیز تھے۔ اس کے لئے وہ اللہ کے احکامات کو نظرانداز کرتے تھے۔ کتاب میں تحریف کرتے تھے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے انبیاء کو قتل بھی کیا۔ یوں انہوں نے خود کو اللہ کی رحمت سے دور کیا اور اس کے غضب کو پکارا۔ پھر ذلت، رسوائی اور دربدری ان کا مقدر بن گئی۔"

"یعنی اہلِ کتاب اور ایمان لانے کی وجہ سے وہ نیست و نابود ہونے سے بچ گئے.....؟"

"اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے آغا جی.....! مگر ایک حقیقت ہے۔ یہ کہ آلِ فرعون کے بعد کوئی قوم اللہ کے قہر و عذاب میں تباہ نہیں کی گئی۔ قرآن کی زبان میں یوں کہیں کہ پھر کسی قوم کی جڑ نہیں کاٹی گئی۔ کیوں.....؟ یہ میں نہیں کہہ سکتی۔"

"میری سمجھ میں اس کی وجہ آتی ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"مجھے بھی بتائیے.....!"

"یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک کی برکت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوئی۔ دین مکمل ہوا اور شریعت بھی۔ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت اللعالمین بنایا تو قیامت تک کے لئے مہلت عطا فرما دی۔"

"جی..... یہ بات سمجھ میں آتی ہے، دل کو لگتی ہے۔"

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی بڑی بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد یہودی شرک اور انکار کیسے کرتے ہیں.....؟ وہی تو اللہ کے بارے میں شاید سب سے زیادہ جانتے

ہیں۔ بس انہوں نے اللہ کو علانیہ نہیں دیکھا۔ باقی تو سب کچھ انہیں دکھا دیا گیا۔"

عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

ارجمند چند لمحے کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ پھر بولی۔

"مجھے ایک خیال آتا ہے۔ کہیں یہ اس سامری کے بچھڑے کی وجہ سے تو نہیں ہوا.....؟ دیکھیں نا.....! اللہ نے سمندر پھاڑ کر ان کے لئے راستہ بنایا۔ وہ بحفاظت پار اترے اور ان کے پار ہوتے ہی ان کی آنکھوں کے سامنے سمندر برابر ہوا اور اس نے فرعون اور ان کے پورے لشکر کو نگل لیا۔ یہ بہت بڑی نشانی دیکھی تھی انہوں نے، اس وقت جب وہ کمزور، بے بس اور محکوم تھے۔ اللہ نے انہیں نجات دلائی۔ پھر اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طلب فرمایا اور وہ اپنی قوم کو حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد کر کے چلے گئے۔ ان کے غیاب میں بچھڑے والا واقعہ پیش آیا۔ اللہ کی اتنی بڑی نشانی دیکھنے کے فوراً بعد ہی وہ بت پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔"

"اور وہ بھی اس حد تک کہ انہوں نے اپنے محسن پیغمبر حضرت ہارون علیہ السلام کو اس حد تک دبا لیا تھا کہ انہیں جان کا خطرہ لاحق ہو گیا۔" عبدالحق نے کہا۔

"اور اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ ان کے کفر کے سبب وہ بچھڑا ان کے دل میں رچ بس گیا تھا۔ تو ممکن ہے، اس بچھڑے کی پرستش سے ان کے دل ٹیڑھے ہو گئے ہوں اور اس وجہ سے وہ بار بار شرک کرتے ہوں.....؟"

"نہیں ارجمند.....!" عبدالحق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"اس پر تو انہوں نے اللہ کے حکم کے مطابق کفارہ ادا کر دیا تھا۔ میں نے تفسیر میں پڑھا ہے، انہوں نے بڑی تعداد میں خود کو قتل کیا تھا۔"

"یعنی وہ خطا ان کی بخش دی گئی تھی۔"

"اللہ بہت مہربان تھا ان پر۔ ان کی تو بڑی بڑی خطائیں بخش دی گئیں۔ لیکن وہ تھے ہی کچھ عجیب۔ کیا کہوں.....؟" عبدالحق نے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سر اٹھاتے ہوئے بولا۔

"بس..... ایک ہی لفظ آتا ہے میرے ذہن میں ان کے لئے.....!"

ارجمند سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ظاہر میں......!" بالآخر عبدالحق نے کہا۔

"وہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ذہنیت کی قوم تھے، جو آنکھوں کے سامنے ہے جب تک ہے سوحقیقت ہے، اور نگاہوں کے سامنے سے ہٹا تو خواب......!"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ......!" ارجمند نے اس کی تائید کی۔

"طور کو اپنے سروں پر معلق دیکھا تو سب کچھ مان لیا اور بعد میں اس کی دہشت یاد ہی نہیں رہی۔ حضرت موسیٰ علیہ لسلام کے ساتھ گئے، اللہ کی آواز میں احکام سنے اور واپس آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہوتے ہوئے ان میں ردوبدل کرنے لگے۔"

"بچوں کی سی ذہنیت تھی ان کی۔" عبدالحق نے کہا۔

"اللہ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھ لیں۔ پھر ایک بت پرست قوم کو دیکھا تو پیغمبر علیہ السلام سے فرمائش کرنے لگے کہ اے موسیٰ......! ہمارے لئے بھی ایسا بت بنا دو......!"

عبدالحق کو پہلی بار اپنا بوجھ ہلکا ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس گفتگو سے اسے بہت فائدہ ہوا تھا۔

"میری سمجھ میں آتا ہے آغا جی......! کہ یہ تکبر کا معاملہ ہے۔"

تکبر پر عبدالحق کو اپنا خیال آ گیا۔ وہ نظریں چرانے لگا۔

"بات شرک کی ہو رہی ہے۔ یہ تکبر کہاں سے آ گیا......؟"

"دیکھیں آغا جی......! مشرک بھی ایمان لے آئے اور توبہ کر لے تو اسے اللہ معاف کر دیتا ہے۔ لیکن متکبر کی بخشش نہیں۔"

عبدالحق کے تو جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"شرک کے ہی بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب سے بڑا گناہ ہے۔"

"تکبر شرک سے بہت بڑا ہے آغا جی......!" ارجمند نے کہا۔

"وہ کون ہے......؟ جس کے لئے مہلت تو قیامت تک کی ہے، لیکن بخشش نہیں۔"

"شیطان......!" عبدالحق نے زیر لب کہا۔

"کیوں......؟ شرک تو شیطان نے کبھی کیا ہی نہیں۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

"ہاں......! اس کے بارے میں یہی پڑھا ہے کہ وہ موحد ہے۔"

"میرے پاس علم نہیں آغا جی......! لیکن میرا دل کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔"

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیسے......؟"

"قیامت کے دن کوئی موحد جہنم میں نہیں جائے گا۔ جبکہ شیطان کے بارے میں اللہ فیصلہ کر چکا ہے۔"

"بات تمہاری معقول ہے لیکن......"

"دیکھئے...... اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والا اللہ سے ڈرے بغیر تو نہیں رہ سکتا۔"

"اور ڈرنے والا گناہ کیسے کرے گا......؟" عبدالحق نے اعتراف کیا۔

"فطرت میں ہے، اس لئے...... گناہ کے بعد ڈرے گا تو توبہ کرے گا۔ اسی لئے اللہ نے توبہ قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ کو توبہ بہت پسند ہے...... کیوں......؟ اس لئے کہ بندہ اسے معبود واحد مان کر اس سے ڈر رہا ہے۔ شیطان تو موحد ہے ہی نہیں۔"

"جبکہ اس نے کبھی شرک نہیں کیا۔ وہ معلم الملکوت تھا۔ جانتا تھا کہ اللہ واحد اور احد ہے۔"

"جی ہاں......! اس نے شرک نہیں کیا۔ شرک کرنے والے مرعوب لوگ ہوتے ہیں، کمزور ہوتے ہیں۔ وہ کوئی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں تو اس کے آگے سر جھکا کر شرک کرتے ہیں، کسی اور کو شریک ٹھہراتے ہیں اللہ کا۔ لیکن شیطان نے تکبر کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ پھر بھی اللہ نے جسے اس سے افضل کہا، اس نے اسے حقیر جانا۔ روبرو اللہ کے حکم سے انکار کیا۔ تو اس نے شرک نہیں کیا۔ اس نے خود اللہ کا شریک بننے کی جسارت کی۔ اس نے اللہ کو چیلنج کیا۔ شرک تو اس کے سامنے بہت

چھوٹی چیز ہے۔ مشرک تو خود کو حقیر سمجھتا ہے، تبھی شرک کرتا ہے۔ لیکن اللہ کے بارے میں جانتے ہوئے اسے چیلنج کرنا......! کبریائی تو صرف اللہ کو زیبا ہے آغا جی......!''

عبدالحق پر لرزہ چڑھ گیا۔

''اللہ کے سامنے اپنی تعریف اور توصیف کرنا، اس کی کسی مخلوق پر اس کے فیصلے کے برعکس اپنی فضیلت اور برتری بیان کرنا، یہ جانتے ہوئے کہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے، اللہ ہی کا عطا کیا ہوا ہے اور صرف اللہ ہی ہے، جو سب کچھ جانتا ہے، یہ تو چیلنج ہے، بغاوت ہے، اور بغاوت کے لئے تو دنیا کے قانون میں بھی انتہائی سزا ہے۔''

''دنیا میں بڑے بڑے متکبر لوگ گزرے ہیں۔''

''وہ سب شیطان کے چیلے تھے، شیطان کی سنت پر عمل کرنے والے......!'' ارجمند نے کہا۔

''مگر فانی انسان تھے۔ اللہ نے انہیں ڈھیل دی۔ انہیں تکبر میں اور آگے بڑھایا۔ پھر انہیں نہایت ذلیل و حقیر کر کے خاک میں ملا دیا۔''

''بے شک......!'' عبدالحق نے کہا۔ بات سے بات نکلتی ہے تو بہت کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ اسی لئے اللہ نے قرآن میں غور و فکر کرنے کو کہا۔ وہ سورۂ بقرہ کی ایک آیت مبارکہ ہے نا......جس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ اور اللہ نہیں شرماتا اس سے کہ مثال دے کسی مچھر کی یا اس سے بھی حقیر کسی شے کی۔''

''جی آغا جی......!''

''میں اس پر غور کرتا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔''

''پھر سمجھ میں آیا......؟''

''اللہ نے فضل فرمایا۔ جب میں نے تفسیر میں نمرود کے انجام کے بارے میں پڑھا تو سمجھ میں آیا۔''

''مجھے بھی بتائیے نا......!''

''نمرود نے اللہ سے جنگ کے لئے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ اور اللہ نے اس سے لڑنے کے لئے صرف مچھروں کو بھیجا، اور مچھروں نے نمرود سمیت اس پوری فوج

کو نیست و نابود کر دیا۔ نمرود کی موت میں بہت بڑی عبرت ہے کہ ایک مچھر اس کی ناک کے رستے اس کے دماغ میں گھس گیا۔ اس کے دماغ سے سارا تکبر نکل گیا اور اس کی موت نہایت اذیت ناک تھی۔ تو سچ ہے کہ اللہ حقیر سے حقیر چیز کی مثال دیتے ہوئے کیوں شرمائے......؟ وہ جب چاہے، کسی حقیر ترین چیز کو انسان تک پر غالب فرما دے۔ وہ چاہے تو کمزور اور حقیر کو طاقتور بنا دے۔ کیا ہم کسی بھی شے کے حقیر کہنے کا حق رکھتے ہیں اور رہی بات اللہ کی، تو اس کے لئے سب حقیر ہیں۔''

''بے شک آغا جی......! اصحاب فیل کا انجام بھی ہمارے سامنے ہے۔''

''اور مکھی والی آیت کے بارے میں تو تم نے ہی مجھے بتایا تھا۔''

''کہ مکھی اگر تم سے کچھ چھین کر اڑ جائے تو تم تمام انسان مل کر بھی اس سے وہ چیز واپس نہیں لے سکتے۔''

عبدالحق نے اقرار میں سر ہلایا۔

''اللہ کے چیلنج کا کون سامنا کر سکتا ہے......؟''

''اللہ نے ہر تکبر کرنے والے کو خاک میں ملا دیا۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالحق نے جھرجھری سی لی۔ اسے اپنے تکبر کا خیال بار بار آتا تھا۔

''لیکن سب سے بڑے شیطان کو اتنی مہلت کیوں دی......؟''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''اللہ کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ مگر غور کرنے پر سمجھ میں آتا ہے۔ شیطان اللہ کو جاننے اور ماننے والا تھا۔ اپنی اوقات بھی جانتا تھا اور اللہ کی بے پناہ قدرت سے بھی واقف تھا۔ منہ سے بات نکلتے ہی سمجھ گیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مرتبہ، مقام سب گیا۔ اب تو راندۂ درگاہ ہی ہونا ہے۔ مہلت کے سوا کچھ نہیں مل سکتا۔ مہلت اس کے لئے ضروری تھی۔ وہ آدم علیہ السلام کی نفرت اور انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کے خیال میں انہی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ اولادِ آدم کو ذلیل و خوار کرنا اور انہیں اپنی سزا میں شریک کرنا۔ یعنی جہنم کی ابدی زندگی میں۔ اس نے چیلنج کیا کہ جسے تو نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، تو مجھے مہلت دے تو میں ان سب کو تیرے خلاف کر کے خود اسے ملا لوں گا۔ اللہ نے فرمایا کہ میں ان سب سے جہنم

کو بھر دوں گا۔ اور جو تیری بات نہیں مانیں گے، ان کے لئے جنت ہے۔ جا...... تجھے قیامت تک کے لئے مہلت دی۔"

"لیکن اللہ نے اسے سزا کے بجائے مہلت کیوں دی......؟"

"اللہ اپنی مرضی کا مالک ہے...... جو چاہے وہ کرتا ہے۔ اس سے کوئی کچھ پوچھ نہیں سکتا۔ بلکہ وہی قیامت کے دن سب سے پوچھے گا۔"

"بے شک......! لیکن اس کی ایک سنت بھی ہے۔ وہ اس کے بارے میں بتاتا بھی ہے۔ ہمیں سوچنا تو چاہئے۔ غور کرنے کا حکم دیا ہے اس نے۔"

"میں اس کی عاجز اور بے علم بندی ہوں آغا جی......!"

"میں بھی عاجز اور بے علم ہوں۔ مگر وہ آپ ہی رہنمائی فرماتا ہے۔"

"ایسی بات ہے تو مجھے بھی بتائیں......!"

"کئی زاویے ہیں۔ کوئی اللہ کو چیلنج کرے اور وہ اسے قبول نہ کرے، یہ اللہ کی شان کے خلاف ہے۔"

"بے شک آغا جی......! سبحان اللہ......!"

"اور وہ کسی جان پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ عدل ہے۔ حجت تمام کئے بغیر وہ آخری فیصلہ نافذ نہیں فرماتا۔"

"بے شک......!"

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کے اور قرآن پاک نازل فرما کے اس نے انسانوں اور جنوں پر حجت تمام کر دی۔ صرف مہلت رہ گئی۔"

"مہلت کب تک......؟"

"وہ تو انفرادی ہے...... ہر فرد کے لئے نزع سے پہلے تک۔ اللہ سب جانتا ہے۔ بندہ رجوع کرے اخلاص کے ساتھ...... توبہ کرے تو وہ قبول فرما لے گا۔ عمر بھر کے گناہ ایک پل میں بخشے جاتے ہیں۔ ایسی ہے اس کی رحمت......!"

"بے شک آغا جی......! الحمدللہ......!"

"اور ایمان والوں سے بھری ہوئی جنتیں شیطان کی شکست کا ثبوت ہوں گی۔"

"یہ تو طے ہے کہ تکبر شرک سے بہت بڑا ہے......؟"

"ہاں......! کیونکہ وہ تو خود کو اللہ کا شریک بنانا، خود کو اس کا ہم سر سمجھنا ہے...... نعوذ باللہ......!" عبدالحق نے پھر جھرجھری لی۔

"لیکن ارجمند......! سب سے بڑا تکبر تو شیطان نے ہی کیا......؟"

"اور جو لوگس نے خدائی کے دعوے کئے......؟"

"وہ تو جہالت میں، بے خبری میں کئے نا...... جبکہ شیطان نے جان کر سب کچھ کیا۔ وہ تو حقیقت سے واقف تھا۔"

"لیکن دعوے کرنے والے دنیا میں ہی ذلت کے ساتھ مٹا دیئے گئے۔ اور مٹتے ہوئے ان میں سے ہر ایک پر حقیقت بھی کھل گئی۔"

"ہاں...... یہ تو ہے......!"

ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں آغا جی......"

"عبدالحق چند لمحے ہچکچایا۔ پھر بالآخر اس نے کہا۔

"ضرور پوچھو......!"

"آپ پچھلے کافی عرصے سے کچھ پریشان ہیں......"

"ہاں......! ہوں تو......!"

"مجھے اس کے بارے میں بتائیں گے......؟"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

"جو بات اللہ اور بندے کے درمیان ہو، اسے کسی اور پر کھولنا مناسب نہیں ہوتا۔"

"بعض اوقات کسی کی کسی معمولی اور غیر متعلق بات سے بھی اللہ راستہ کھول دیتا ہے۔"

عبدالحق خاموش رہا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔

"اچھا......! یہ تو بتا دیں کہ آپ نے جو اپنی منزل مقرر کی تھی، اس کی طرف تو

بڑھ رہے ہیں نا......؟''

''وہ بھی اللہ اور بندے کے درمیان کی بات ہے۔'' عبدالحق نے بے رخی سے کہا۔

پھر اسے خیال آیا کہ اکیلے یہ بوجھ اٹھائے اٹھائے وہ تھک گیا ہے۔ بات کرنے سے شاید کچھ ہلکا ہو جائے۔ البتہ پوری بات بتانے کی ضرورت نہیں۔

''وہ منزل تو بہت دور کی بات ہے ارجمند......! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرا اپنے رب سے رابطہ ہی نہیں رہا۔''

''اللہ نہ کرے......! ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ......؟'' ارجمند تڑپ ہی گئی۔

''ایسا ہی ہے......!''

''کچھ بتائیں تو......!''

عبدالحق پھر ہچکچایا۔

''مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا...... بہت بڑا گناہ...... مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ احساس دلایا گیا تو میں اللہ سے بہت ڈرا۔ بہت نادم ہوا۔ میں نے صلوٰۃ التوبہ پڑھی، استغفار کیا۔ لیکن توبہ قبول ہونے کی کوئی نشانی مجھے نظر نہیں آئی۔''

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی توبہ قبول ہی نہیں ہوئی۔'' ارجمند نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''جب سے اب تک میری آنکھ بھی نم نہیں ہوئی ہے ارجمند......!'' ارجمند نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں آغا جی......!'' ارجمند نے کہا۔

''انشاءاللہ......! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میرے لئے تو بہت بڑی بات ہے۔ اور ٹھیک ہونے کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔''

''میں انشاءاللہ......! اس کمرے سے جاتے وقت آپ کو اس کا ثبوت دے کر جاؤں گی۔ لیکن اس وقت میں آپ سے ایک اور بات کرنے کی اجازت چاہتی

ہوں۔''

''اجازت......!''

''چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہے آغا جی......!'' ارجمند نے بے حد عاجزی سے کہا۔

''اللہ جسے چاہے بڑی بات عطا فرما دیتا ہے۔ منہ تو سبھی کے چھوٹے ہوتے ہیں۔''

''آپ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں کبھی زبان نہ کھولتی۔''

''کچھ بولو تو......!''

''جب سے آپ نے اپنی اللہ سے محبت کی آرزو کے بارے میں مجھے بتایا، میں آپ کے لئے کسی وقت بھی دعا کرنا نہیں بھولی۔ لیکن آغا جی......! یہ بہت بڑی آرزو ہے۔ اللہ عطا فرما دے تو کائنات کی سب سے بڑی نعمت ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اس قابل نہیں۔ لیکن اللہ کی رحمت......اس کے فضل و کرم اور اس کی عطا سے لو لگاتا ہوں۔''

''مگر اس کے لئے اللہ کے بنیادی احکامات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس میں کوتاہی ہوگی تو بات کیسے بنے گی......؟''

''یہ بات بھی ٹھیک ہے......! تم میری کسی کوتاہی کی نشان دہی کرنا چاہتی ہو تو جھجکنے کی ضرورت نہیں۔''

''بات یہ ہے آغا جی......! کہ حقوق العباد کو احسن طریقے سے ادا کئے بغیر آپ اللہ کو خوش نہیں کر سکتے۔ اللہ کی محبت تو بہت دور کی بات ہے۔''

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا۔

''آپ کو برا لگا ہے آغا جی......!'' ارجمند کے لہجے میں معذرت تھی۔

''ارے نہیں......! ہرگز نہیں......!'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

''حقوق العباد سے کوتاہی تو بہت آسان ہے۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ تم مجھے بتاؤ نا......کیا کوتاہی ہوئی ہے مجھ سے......؟''

''وہ [illegible] استغفار کرتا رہا۔ دل کو [illegible] سے نہیں رہ سکتا

اور اللہ بہت معاف کرنے والا ہے اور مہربان ہے۔"

"تو میں نے دیدہ و دانستہ کوتاہی کی ہے......؟" عبدالحق کے لہجے میں خوف اور آواز میں لرزش تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں آغا جی......!" ارجمند نے اسے دلاسہ دیا۔

"ہو جاتا ہے، کسی سے بھی ہو جاتا ہے۔ آپ تو بہت اچھے انسان ہیں...... سب کا خیال رکھنے والے...... لیکن اللہ سے محبت کی شدید آرزو نے آپ کو غفلت میں مبتلا کر دیا۔"

"مجھے بتاؤ تو......!"

ارجمند اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرے خیال میں آپ نے اپنے ننھے معصوم بیٹے کا حق ادا کرنے میں ظالمانہ کوتاہی کی ہے۔ جبکہ وہ زبان سے شکایت بھی نہیں کر سکتا۔ آپ اسے نظرانداز کر کے اس کا دل دکھاتے رہے ہیں۔ یہ میرا خیال ہے، جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔ میں جا رہی ہوں، تاکہ آپ تنہائی میں سکون سے بیٹھ کر اس پر غور کر سکیں۔"

عبدالحق کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔

ارجمند دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مگر باہر نکلنے سے پہلے اس نے پلٹ کر عبدالحق کو دیکھا۔

"اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ جانے سے پہلے میں آپ کو اس کا ثبوت دے کر جاؤں گی کہ انشاءاللہ......! آپ کے سب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

عبدالحق منتظر نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔

"اللہ کے کلام سے بڑھ کر کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔" ارجمند نے کہا۔

"آپ سورۂ زمر کے چھٹے رکوع کی پہلی آیت غور سے پڑھ لیجئے گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی اور کمرے سے نکل گئی۔

❀❀❀

عبدالحق خود کو پہلے کی نسبت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ارجمند سے بات کر کے ہمیشہ کی طرح [illegible]

ہے جو کچھ کہا تھا، اس کا اشارہ تو اسے اللہ کی طرف سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ بدقسمتی سے اس نے اس اشارے کو بڑے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کے بجائے محدود کر دیا۔ وہ اللہ سے مسلسل رابطے کے لئے ملازمت چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اس سے روک دیا گیا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ ملازمت چھوڑنا ترکِ دنیا کا پہلا مرحلہ تھا، اور اسے اس سے روکا جا رہا تھا۔

پچھلے عرصے کو یاد کیا تو سمجھ میں آیا کہ اس نے دفتر کے علاوہ سبھی کچھ تو چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر کے تمام لوگوں سے، تمام معاملات سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ وہ اماں کے پاس جانے کا معمول بھی بھول گیا تھا۔ اماں کتنی پریشان ہوں گی اس کے لئے......؟

"اور ننھا نورالحق......؟"

وہ منظر اس کے تصور میں جیتا جاگتا آ گیا۔ جوش میں مشین کی طرح ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا، منہ سے محبت بھری پکاریں نکالتا ہوا معصوم بچہ...... اس کے نظرانداز کرنے پر کیسے مایوس ہوتا ہوگا......؟ کیسے دل دکھتا ہوگا اس کا......؟ اور یہ بات اللہ کو کیسے ناراض کرتی ہوگی......؟

"کوئی بات نہیں......!" اس نے سوچا۔

"صبح انشاءاللہ......! اس کی تلافی کر دوں گا۔ معذرت کر لوں گا اپنے معصوم بچے سے۔ مگر پہلے اللہ سے تو بخشش طلب کر لوں۔"

اس نے صلوٰۃ التوبہ پڑھی، استغفار کیا۔ لیکن اپنی توقع کے برعکس گریہ سے وہ پھر بھی محروم رہا۔ البتہ دل میں ہلکی سی جنبش کا سا احساس ضرور ہوا۔ لیکن وہ اس کی توقع سے بہت کم اور مایوس کن تھا۔

مایوسی نے اسے پھر سوچنے پر مجبور کر دیا۔

اللہ کی محبت تو بہت آگے، بہت دور کی بات تھی۔ یہاں تو تکبر پر بخشش کا مسئلہ درپیش تھا۔ جب تک بخشش نہیں ہوتی، سب کچھ رائیگاں ہے۔ اور اس سے پہلے ہی موت آ گئی تو......؟ موت کا کیا پتا......؟ ایک پل کی بھی خبر نہیں ہوتی آدمی کو۔

اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ساری خوش امیدی ہوا ہو گئی۔

وہ بےیقینی کے ساتھ استغفار کرتا رہا۔ دل میں اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگتا

رہا۔ لیکن آخر میں اسے ہر روز کی طرح ناکام و نامراد ہی اٹھنا پڑا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔

یہیں، اسی جگہ کھڑے ہو کر، جاتی ہوئی ارجمند نے اس سے کچھ کہا تھا۔

''کیا کہا تھا......؟ کوئی بہت اہم بات تھی......؟''

وہ ذہن پر زور دیتا رہا۔

''ہاں......! یاد آیا......کوئی آیت کریمہ پڑھنے کو کہا تھا اس نے۔''

''کون سی آیت......؟'' اس نے ذہن پر اور زور دیا۔

''اتنا یاد آتا ہے کہ سورۂ زمر کی کسی آیت کریمہ کی بات تھی...... آیت نمبر......؟''

اس نے بے بسی سے اللہ کو پکارا۔

''مجھے یاد دلا دیجئے میرے مہربان ربّ......!''

اور اس کی ساعت میں ارجمند کی آواز گونجی۔ صاف اور واضح آواز......

''سورۂ زمر کے چھٹے رکوع کی پہلی آیت......''

وہ پلٹا اور شیلف کی طرف لپکا۔ قرآن پاک ہاتھ میں لئے وہ میز کی طرف گیا اور کرسی پر بیٹھ کر اس نے آیت نور پڑھ کر اللہ سے نورِ ہدایت کے لئے دعا کی۔ پھر اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ قرآن پاک کو کھولا۔

اور اگلے ہی لمحے سورۂ زمر کی وہ آیت کریمہ اس کے سامنے تھی۔

اس کی بے تابی کا یہ عالم تھا کہ اس سے نظر جمائی نہیں جا رہی تھی اور پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ جسم میں ایسی سنسنی تھی، جیسے کوئی بہت بڑا راز اس پر کھلنے والا ہے۔

بہت کوشش کر کے اس نے نظر کو ٹھہرایا اور پڑھا۔

'' قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْ عَلٰے اَنْفُسِهِمْ لَاتَقْنَطُوْ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ o اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا o اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ o ''

وہ سمجھ سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے نیچے لکھا ہوا ترجمہ پڑھا۔

''کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے ظلم کیا ہے اپنی جانوں پر، مایوس نہ ہونا اللہ کی رحمت سے۔ بلاشبہ اللہ معاف فرما دیتا ہے سارے گناہ۔ یقیناً وہ تو ہے ہی گناہ معاف فرمانے والا مہربان۔''

اتنی مدت میں پہلی بار اس کے دل کو سکون ہوا۔ ایسا لگا، جیسے ٹیسوں سے تپتے ہوئے زخم پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ طویل بے سکونی کے بعد وہ کیفیت اسے بالکل نئی لگی۔ دل کو قرار آ گیا۔

لیکن اگلا ہی لمحہ مایوسی کا تھا۔ دل کی ہیئت تو اب بھی وہی تھی۔ نہ کوئی نرمی، نہ کوئی نمی، وہ تو ویسے کا ویسا ہی تھا۔

اور اس سے اگلا لمحہ تھرتھری کا تھا۔ اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

''ارے...... اللہ نے مجھ سے خطاب فرمایا۔ مجھ سے بات کی۔ مجھے دلاسہ دیا، زخم پر مرہم رکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اے اپنی جان پر ظلم کرنے والے......! تو میرا بندہ ہے تو اپنے گناہ سے نہ گھبرا۔ میری رحمت بے پایاں ہے۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہوں...... بڑے سے بڑے گناہ...... میں تو ہوں ہی مہربان اور معاف کرنے والا۔ بس رجوع کر لے......توبہ کر لے......!''

''اور مایوس ہو کر جائے گا کہاں......؟ ہے کوئی پناہ گاہ میرے دامن رحمت کے سوا......؟ آجا......! آجا......!''

وہ اضطرار کی کیفیت میں......''میں توبہ کرتا ہوں...... میرے اللہ......!'' کی تکرار کرنے لگا۔

اور بالآخر چند لمحوں کے بعد دل کو پھر قرار آ گیا۔

اب اس وقت دل پتھر ہے تو کیا......؟ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ......! اللہ نے وعدہ فرمایا ہے اور اس کا وعدہ سچا۔ وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ وہ جب چاہے گا، پتھر پگھل جائے گا۔ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

اس کی عادت تھی کہ کوئی آیت خاص طور پر پڑھتا تو اس سے پہلے اور بعد کی آیات ضرور پڑھتا تھا۔ یہ رکوع کی پہلی آیت تھی، اس لئے اس نے اس کے بعد کی

آیت پڑھی۔

"اور پلٹ آؤ اپنے ربّ کی طرف اور فرمانبردار بن جاؤ اس کے۔ اس سے پہلے کہ آجائے تم پر عذاب، پھر نہ مدد مل سکے تمہیں کہیں سے بھی یہ اللہ کا طریق کار ہے۔ خوش خبری کے بعد ڈرانا، اور ڈرانے کے بعد امید دلانا۔"

اس نے اپنا سر اللہ کے حضور جھکاتے ہوئے، بلا تامل سرگوشی میں کہا۔

"آپ کا شکر ہے میرے اللہ......! آپ نے حکم فرمایا اور میں نے مان لیا۔ اپنے عذاب سے مجھے بچا لیجئے......! میں آپ کا فرمانبردار ہوں۔ آپ کی رحمت کے دامن کی طرف لپک رہا ہوں۔ میرے ربّ! مجھے پناہ دیجئے......!"

اس نے سجدہ کیا اور تین بار یا ربّ اغفرلی پڑھا اور پھر اٹھا اور اگرچہ وہ وضو سے تھا، پھر بھی نئے سرے سے وضو کر کے آیا۔ دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھنے کے بعد اس نے استغفار کی دو تسبیح پڑھیں، پھر سیّد الاستغفار پڑھ کے اللہ سے توبہ اور دعا کی اور اسٹڈی سے نکل کر اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔

اس بار دل کے پتھر نے اسے مایوس نہیں کیا۔ آدمی کو ہر چیز اللہ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے وقت پر ہی ملتی ہے، اس نے سوچا۔ جب اللہ چاہے گا، دل بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ پہلی رات تھی کہ وہ پرسکون نیند سویا۔

❁❁❁

ناشتے کے بعد وہ دیر تک حمیدہ سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے ان سے معذرت کی کہ اتنے دن سے اس نے انہیں بالکل وقت نہیں دیا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہوں گی اماں......! مجھے معاف کر دیں۔"

"ناراض تو نہیں، پریشان تھی پتر......! ہر وقت اللہ سے دعا کرتی تھی کہ تیری پریشانی دور ہو جائے۔"

"تمہیں کیسے پتا تھا اماں......! کہ میں پریشان ہوں۔"

"اللہ ماؤں کے دلوں کو سب بتا دیتا ہے پتر......!" حمیدہ نے اس کی پیشانی

چومتے ہوئے کہا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ کتنے لوگ اس کے لئے پریشان رہے، اس کے لئے دعائیں کرتے رہے، اور وہ سب کو چھوڑ کر بیٹھا رہا۔ کسی احسان ناشناس کی بات ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی جو آوازیں آنی شروع ہوئیں، انہوں نے اسے چونکا دیا۔ نورالحق تو اسے یاد ہی نہیں تھا۔

اس نے سر گھما کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ نورالحق کی وہی کیفیت تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے محبت بھری آوازیں نکال رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

عبدالحق صرف آزمائش کے لئے اس کی نظروں سے دور ایک گوشے کی طرف بڑھا۔ بچے نے لیٹے ہی لیٹے اپنی پوزیشن تبدیل کی۔ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

ارجمند باتھ روم سے باہر آئی اور دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگی۔

عبدالحق نے پھر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن بچے نے اسے ناکام بنا دیا۔ اس کا جوش وخروش اور بڑھ گیا۔

اس کا مطلب ہے کہ ارجمند نے سچ کہا تھا۔ بچہ اس کے لئے تڑپتا ہے۔ عبدالحق نے حیرت سے سوچا۔

"کیا آزما رہے ہیں آغا جی......! یہ تو سورج مکھی کا پھول ہے۔ اس کا چہرہ تو آپ ہی کی طرف رہے گا۔"

ارجمند کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے ارجمند کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے کھیل میں لگا ہوا تھا۔

اس نے سر گھما کر ارجمند کو دیکھا۔

"اب اور نہ ستائیں اسے۔ دیکھیں نا...... کتنی مشقت اٹھاتا ہے آپ کے لئے......!" ارجمند نے کہا۔

عبدالحق کو شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ بیڈ کی طرف بڑھا۔ بچے کی مشین اور تیز

ہوگئی۔

عبدالحق اس کے پاس پہنچ کر سکا۔

"تو بیٹے نورالحق......! آپ میری گود میں آنا چاہتے ہیں......؟" وہ بچے سے مخاطب تھا۔

بچہ ایک لمحے کو ساکت ہوا۔ پھر اس کی بانہیں عبدالحق کی طرف اٹھیں اور پاؤں مشین کی طرح چلنے لگے۔

عبدالحق کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ بچے کی آواز پل پل رنگ بدل رہی تھی۔ کبھی اس میں رونے کا رنگ غالب آتا اور کبھی قلقاریاں محسوس ہوتیں۔ کبھی امید، کبھی مایوسی، کبھی جھنجلاہٹ......

عبدالحق نے جھک کر اسے گود میں اٹھا لیا......اور جیسے ہر چیز ٹھہر گئی۔

بچے نے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں کس کر حمائل کر دیئے۔ اس کی گرفت ننھے بچے کے حساب سے بہت سخت تھی، جیسے اسے چھن جانے کا ڈر ہو۔ اور اس کا سر اس کی گردن اور بائیں کندھے کے نقطہ اتصال پر جا ٹکا۔

ہر طرف سکوت تھا۔ نہ کوئی آواز نہ جنبش۔ ارجمند بھی بت کی طرح کھڑی تھی۔

پھر اچانک ہی بچے نے رونا شروع کر دیا۔ وہ چیخ کر نہیں رو رہا تھا۔ آواز دھیمی تھی۔ لیکن وہ بہت دردناک رونا تھا۔ آنسوؤں کا اندازہ عبدالحق کو اپنی بھیگتی ہوئی گردن سے ہوا۔

عبدالحق نے بے بسی سے ارجمند کی طرف دیکھا۔

"اسے کیا ہوا......؟ یہ کیوں رو رہا ہے......؟ اس کا رونا سن کر میرا دل کٹا جا رہا ہے۔"

"نہیں سمجھے آپ......؟" ارجمند نے کہا۔

"یہ آپ سے شکایت کر رہا ہے۔"

عبدالحق کو محسوس ہوا کہ اس کا دل دھیرے دھیرے مائع میں تبدیل ہو رہا ہے۔ پتھر پگھل رہا تھا۔

پھر بچے نے سر ہٹایا، اسے پیچھے کی طرف لا کر آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور ہنسا...... فاتحانہ ہنسی، سچی خوشی سے چھلکتی ہوئی ہنسی۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی وہ ہنسی بہت دل گداز تھی۔

عبدالحق کی آنکھوں میں آنسو اتنی تیزی سے آئے کہ انہیں روکنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔

بچے نے سر پھر اس کے کندھے پر لٹکایا اور پھر رونے لگا۔ البتہ آواز اور دھیمی ہوگئی تھی۔

آنسو تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ لیکن پھر ایک دم جیسے دل پگھل گیا، بند ٹوٹ گیا۔ عبدالحق کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔

ارجمند حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

بچے نے اپنی حرکت کئی بار دہرائی۔ وہ پیچھے ہٹ کر عبدالحق کو دیکھتا، پہلے بے یقینی سے، پھر شکایت سے اور پھر محبت سے۔ پھر کھلکھلا کر ہنستا اور پھر عبدالحق کے کندھے سے سر ٹکا دیتا۔ اور پھر رونے لگتا۔

طوفان جہاں پہلے آیا تھا، پہلے تھما بھی وہیں۔ اور جو بڑا تھا، اس کا طوفان بھی بڑا تھا۔ عبدالحق کو تو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا وجود ہی آنسوؤں میں بہہ جائے گا۔

ارجمند نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اسے تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی مخل ہو رہی ہے۔ لیکن باہر جانے کو اس کا دل نہیں مانا۔ باپ بیٹے کے انوکھے ملاپ کے ایک لمحے سے بھی وہ محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔

بالآخر عبدالحق کے آنسو بھی تھمے۔ مگر جسم میں اب بھی لرزش تھی۔ پھر پہلا احساس اسے یہ ہوا کہ خاصی دیر سے بچے نے اپنے عمل کو دہرایا نہیں ہے۔ وہ ساکت تھا۔ اس نے اسے ہلایا، مگر وہ بے سدھ تھا۔

"ارجمند......! اسے دیکھو تو......!" اس نے وحشت بھرے لہجے میں پکارا۔

"کیا ہوا......؟" ارجمند کے لہجے میں تشویش تھی۔

"یہ...... یہ ساکت ہے......!"

ارجمند اس کے پیچھے گئی اور نورالحق کے چہرے کو دیکھا۔ پھر وہ اس کے

سامنے آئی تو وہ مسکرا رہی تھی۔

اسے مسکراتا دیکھ کر عبدالحق کو کچھ سکون ہوا۔ پھر بھی اس نے پوچھا۔

''خیریت تو ہے......؟''

''جناب......! نورالحق تو بے سدھ، بے خبر سو رہے ہیں۔ لایئے......! میں اسے لٹا دوں......!''

اس نے نورالحق کو بڑی نرمی اور نزاکت سے گود میں لیا اور بستر پر لٹا دیا۔ حالانکہ وہ ایسے سو رہا تھا کہ شاید بستر پر پٹخ بھی دیا جاتا تو اس کی آنکھ نہ کھلتی۔

''مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ یہ سو گیا ہے......؟'' عبدالحق نے کہا۔

''کیسے پتا چلتا......؟ آپ کو تو اپنا ہوش بھی نہیں تھا۔''

عبدالحق کھسیا گیا۔

''لیکن اس کے اس طرح سونے پر مجھے بھی حیرت ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

عبدالحق نے اسے مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ معمولات کا بچہ ہے۔ وقت پر کھانا پینا، وقت پر سونا...... ہر کام اپنے وقت پر کرتا ہے۔''

''دیکھو......کوئی گڑبڑ تو نہیں......؟'' عبدالحق نے گھبرا کر کہا۔

''ارے نہیں......اب سمجھ میں آیا۔'' ارجمند بولی۔

''اتنا رویا، اتنا رویا کہ نڈھال ہو گیا۔ اس کے بعد سونا تو تھا ہی......!''

عبدالحق باتھ روم کی طرف لپکا۔ وہ بلاتاخیر شکر کے نفل ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کھوئی ہوئی دولت اسے واپس مل گئی تھی۔

❁❁❁

عبدالحق کے لئے دنیا بہت خوب صورت ہو گئی تھی۔

کئی نئی باتیں اس کی سمجھ میں آئیں۔ آدمی کی فطرت ایسی ہے کہ وہ جلد باز بھی ہے اور ناشکرا بھی۔ نعمت کو وہ نعمت سمجھتا ہی نہیں۔ جب اس سے محروم کر دیا جائے، تب کہیں اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ نعمت تھی۔

خود اس نے بھی یہ بات نعمت کو کھونے کے بعد ہی سمجھی تھی۔ گریہ اسے میسر تھا

تو وہ اسے اپنی باطنی کیفیت سمجھتا تھا۔ اور جب اس سے محروم ہوا تو احساس ہوا کہ وہ تو اللہ کی عطا کی ہوئی بہت بڑی نعمت تھی۔ کیسے وہ اس کے لئے تڑپتا رہا۔ اس عرصے میں وہ سوچتا کہ آنکھ میں صرف ایک آنسو بھی آ جائے تو وہ عمر بھر اللہ کا شکر ادا کرے گا۔

پھر اللہ نے کرم فرمایا اور نعمت اسے اضافے کے ساتھ دوبارہ دے دی۔

اور ایک بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اسے اس کے راستے کے بارے میں بتا دیا گیا۔ حقوق العباد کے بغیر اسے کچھ نہیں ملے گا۔ بیٹے کا حق ادا کئے بغیر اللہ نے اسے معاف نہیں کیا۔ اور اس کا خود پر ظلم یہ تھا کہ وہ اس زیادتی سے بے خبر تھا۔

تو آدمی کے لئے یہ سمجھنا بھی آسان نہیں کہ کب وہ کسی کے حق کی ادائیگی میں تساہل اور غفلت کا شکار ہوا ہے۔ حقوق کا سلسلہ تو بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ تو اپنے بیٹے کے حق کو بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

اور نعمتوں کے بارے میں تو آدمی غور ہی نہیں کرتا۔ وہ تو اسے اپنا حق سمجھ بیٹھتا ہے۔ سوچا جائے تو سب سے بڑی اور بنیادی نعمت زندگی ہے۔ اور آخرت کی بڑی بڑی نعمتوں کا امکان بھی اسی زندگی کے دم سے ہے۔

پھر اللہ نے ہدایت سے نوازا۔ دین اسلام میں داخل فرمایا۔ جہنم سے بچت کا امکان تو پیدا ہوا۔ پھر وہ ہر لمحہ بندے کو اعلیٰ ترین توفیق سے نوازتا ہے اب بندہ اس سے کس حد تک استفادہ کرتا ہے، یہ وہ جانے......اور توفیق کو نظرانداز ہی کر بیٹھے تو یہ اس کی بدبختی۔ اللہ تو کرم فرماتا ہے۔

اس نے سوچا کہ نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا ادراک بندے کے لئے ممکن ہی نہیں۔ ایک چھوٹے سے لمحے میں اللہ لاکھوں نعمتوں سے نوازتا ہے۔ جو سامنے ہوتی ہیں، بندہ تو انہیں بھی نہیں سمجھ پاتا، اور جو کچھ اس کے غیاب میں، اس کی نگاہوں سے دور کرم ہوتے ہیں، ان کا تو اسے کبھی علم ہی نہیں ہو سکتا۔ شاید حساب کچھ ایسا ہے کہ ایک نعمت کا ادراک ہوتا ہے تو ایک لاکھ نعمتیں نظر اور شعور سے اوجھل ہوتی ہیں...... بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔

اور جن نعمتوں کی اللہ نے بندوں کو آگہی اور شعور دیا، وہی اتنی ہیں کہ ان کو ترتیب سے یاد کرنے کی کوشش کرے تو کثرت کے سبب سے دماغ میں سب کچھ گڈمڈ

ہو جائے۔ کہاں کچھ یاد آتا ہے۔ سامنے کی نعمتیں بھی بھول جاتا ہے بندہ۔ یاد نہیں رہتا کہ شکر ادا کرنے والی زبان بھی اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت ہے۔

جب جانتا نہیں تو پھر بندہ شکر کیسے ادا کر سکتا ہے۔

نہیں کر سکتا۔ لیکن کوشش تو کر سکتا ہے، خواہ وہ کوشش کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو......؟ اللہ تو رائی کے برابر عمل کو بھی اپنے فضل اور رحمت سے کچھ کا کچھ بنا دے۔ جو نعمتیں یاد ہوں، ان پر شکر ادا کرو، اور پھر تمام معلوم اور نامعلوم نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو۔ کیونکہ وہی تو سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ نہیں جانتے۔

اور حق تو یہ ہے کہ محبت سب سے بڑھ کر اللہ سے کی جائے۔

جس ماں نے جنم دیا، دودھ پلایا، پالا پوسا، تکلیف سے بچایا، اس سے محبت کرتے ہو نا......تو اس ربّ سے کتنی زیادہ محبت کرنی چاہئے، جس نے ماں کو بنایا اور اسے تمہاری محبت دی۔

بے شک......! لیکن محبت بہت بڑی چیز ہے۔ پہلے اس کی بندگی تو کر لو......!

عبدالحق بندگی پر غور کرتا تو اس کی سمجھ میں چار عناصر آتے...... ایمان کے بعد......اللہ کی حمد و ثناء، شکر، استغفار اور دُعا۔

احسن طریقے سے بندگی کی تکمیل کے بعد کہیں محبت کی سرحد سامنے آتی ہے۔

عبدالحق خوش تھا کہ ذہن کھل گیا ہے۔ باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ بس اللہ سے عمل کی دُعا کرنی ہے۔

مگر پھر وہ اچانک سہم کر رہ گیا۔

نامعلوم نعمتوں پر شکر ادا کرنا آسان ہے...... بہت آسان...... مگر جسے روزِ روشن کی طرح کھلی نعمتیں بھی نظر نہ آئیں، کیا اللہ اس کا شکر قبول فرمائے گا......؟

برسوں کی محرومی کے بعد اللہ نے اسے بیٹے جیسی نعمت عظمیٰ عطا فرمائی۔ اس پر شکر ادا کرنا تو دور کی بات...... وہ بیٹا اس کی آغوش کو، اس کی ایک نگاہِ التفات کو ترستا رہا......معصوم، بے زبان بچہ...... یہاں تک کہ اللہ اس سے ناراض ہو گیا۔ اور اللہ نے

پھر بھی رحمت فرمائی۔ وہ تو کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اللہ نے اسے سمجھایا اور اس کی بخشش کا سامان فرمایا اور آگے کا راستہ ہموار کیا۔

"الحمدللہ......! شکر اللہ......!"

"اب میں سمجھ گیا ہوں۔ سیدھا صاف راستہ مجھے دکھائی دے رہا ہے۔" اس نے سوچا۔

لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ آدمی جب سمجھنے کا گمان کرتا ہے تو اور زیادہ بڑی ناسمجھی میں مبتلا ہو رہا ہوتا ہے۔

❀❀❀

ارجمند کی بات سچی ثابت ہوئی۔

ننھا نورالحق معمولات کا پابند تھا۔ اور اس نے عبدالحق کو بھی اپنے معمولات میں شامل کر کے پابند کر دیا۔ اور یہ سب کچھ اس نے اسی روز شروع کر دیا، جب اس کی عبدالحق سے صلح ہوئی۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ عبدالحق عشاء کی نماز پڑھ کر آیا تو نورالحق نے اس سے گود میں لینے کا مطالبہ کیا۔ اب عبدالحق میں اس کی کوئی بات ٹالنے کی ہمت نہ تھی۔

وہ اس وقت حمیدہ کے کمرے میں تھے۔ حمیدہ یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

پھر اچانک نورالحق بے چین سا ہوا۔ اس نے منہ سے کچھ آوازیں نکالیں۔ پھر اس کا جوش و خروش بڑھنے لگا۔

"یہ کچھ کہہ رہا ہے آپ سے......!" ارجمند نے کہا۔

"کیا کہہ رہا ہے......؟ میری تو سمجھ میں نہیں آتی اس کی زبان۔" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم......!"

پھر بچہ عبدالحق کے بال کھینچنے لگا۔

"کوئی نیا مطالبہ ہے......!" ارجمند نے پرُخیال لہجے میں کہا۔

"کیا......؟"

''اچھا...... آپ ذرا کھڑے ہوں......!''

عبدالحق کھڑا ہوگیا۔ بچہ پُرسکون ہوگیا۔ پھر اس نے عجیب حرکت کی۔ اپنے طور پر اس نے عبدالحق کو پوری طاقت سے بھینچا اور پھر اس کے رخسار پر ہونٹ چپکا دیئے۔

حمیدہ نے تو اس کی بلائیں لے لیں۔

''ربا میرے......! کتنا محبت والا ہے میرا نورالحق......!'' پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔

''مجھے نہیں پتا تھا نکی......! کہ اسے پیار کرنا آتا ہے۔''

''ایسا اس نے پہلی بار کیا ہے دادی اماں......!''

بچے نے اپنے ہونٹ عبدالحق کے رخسار سے ہٹائے اور دوبارہ اس کے بال کھینچنے لگا۔

''کوئی اور مطالبہ......؟'' ارجمند بڑبڑائی۔

''اس نے تو مجھے اپنا گھوڑا بنا لیا ہے۔ میرے بال اس کی باگیں ہیں۔'' عبدالحق نے شکایتاً کہا۔

''تو تو اس سے بہت بڑا تھا پتر......! جب وصال دین کے ابا تیرا گھوڑا بنتے تھے۔'' حمیدہ نے اسے یاد دلایا۔

''یہ تو بہت چھوٹا ہے۔ پر تجھ پر ہی گیا ہے نا......؟''

بچہ بال کھینچتے ہوئے آوازیں نکال رہا تھا۔

''اب مطالبہ کیا ہے اس کا......؟''

''باہر نکل کر دیکھیں۔'' ارجمند نے کہا۔

عبدالحق کمرے سے نکلا۔ حمیدہ اور ارجمند بھی اس کے ساتھ تھیں۔ بچہ عبدالحق کے بالوں کو واقعی باگوں کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ بال کھینچتے کھینچتے وہ اسے لان میں لے گیا۔

''چاہتے کیا ہو میاں......؟'' عبدالحق کے لہجے میں شفقت تھی۔

''میرا خیال ہے کہ میں سمجھ رہی ہوں آغا جی......!'' ارجمند نے کہا۔

''یہ اس کا سونے کا وقت ہے۔''

''تو پھر......؟''

''اسے گود میں لے کر ٹہلیں۔ یہ آپ کی گود میں سونا چاہتا ہے۔''

عبدالحق ٹہلنے لگا۔ بچہ پُرسکون ہوگیا۔ مگر ذرا دیر بعد وہ پھر اس کے بال کھینچنے لگا۔

''اب کیا ہے......؟'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

بچہ جواب تو نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بال کھینچتا رہا۔

عبدالحق نے امداد طلب نظروں سے ارجمند کو دیکھا۔

''اب تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

اور بچہ بال کھینچے جا رہا تھا۔

عبدالحق نے اسے باتوں سے بہلانا چاہا۔

''چلو...... میں تمہیں کچھ سناتا ہوں۔ سورۂ رحمان سنو گے......؟''

اور عبدالحق نے سورۂ رحمان کی قرأت شروع کر دی۔

بچہ ایسے ساکت ہوگیا، جیسے بہت دھیان سے سن رہا ہو۔

سورۂ رحمان پڑھتے ہوئے عبدالحق پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔ سورۂ مکمل ہوئی تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ نورالحق کو گود میں لئے لان میں ٹہل رہا ہے۔ اماں اور ارجمند ایک بینچ پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''اب تو خوش ہو ننھے میاں......!'' اس نے بچے کو پکارا۔

لیکن بچہ تو ساکت تھا۔ سانسوں کی دھیمی آواز بتا رہی تھی کہ وہ سو چکا ہے۔

''ارجمند......! ذرا دیکھو تو...... شاید سو گیا ہے یہ......؟'' اس نے ارجمند کو آواز دی۔

ارجمند اٹھ کر آئی اور نورالحق کو دیکھا۔

''جی ہاں......! سو گیا ہے۔ میں نے کہا تھا نا...... کہ یہ اس کا سونے کا وقت ہے۔''

عبدالحق نے بھی سر گھما کر دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا۔ کوئی دس منٹ دور نورالحق

وہ گھر میں چلے گئے۔ عبدالحق نے بچے کو بستر پر لٹا دیا۔

''اب یہ معمول آپ کو ہر روز نبھانا پڑے گا۔'' ارجمند نے کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''یہ معمولات کا بچہ ہے۔ اب یہ ہر روز اسی طرح سونا چاہے گا۔''

''تم اسے کچھ زیادہ ہی بڑا نہیں سمجھتی ہو۔''

''آپ خود دیکھ لیجئے گا......!''

لیکن ننھے نورالحق کو تو ابھی ایک اور معمول بنانا تھا۔

صبح عبدالحق دفتر جانے کے لئے تیار ہونے لگا تو وہ پھر اس پر لد گیا۔ اور باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ اپنے گھوڑے کو پھر لان میں لے گیا۔ البتہ اب بار کچھ فرق تھا۔ اب وہ کچھ سننے کے نہیں، بلکہ سنانے کے موڈ میں تھا۔ وہ اپنی زبان میں جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ اور وقتاً فوقتاً وہ پیچھے ہٹتا اور بڑی محبت سے عبدالحق کے رخسار کو چوم لیتا۔

حمیدہ تو اس پر واری صدقے ہو رہی تھی۔ اور ارجمند کی نگاہوں میں فخر تھا اور زبان پر کلمہ شکر۔

عبدالحق ذرا رکتا تو نورالحق اس کے بال کھینچتا۔ یہ صورتِ حال کوئی بیس منٹ تک جاری رہی۔ پھر عبدالحق نے کہا۔

''اب تو میں دفتر کے لئے لیٹ ہو جاؤں گا بیٹے......! اور مجھے شرمندگی ہوگی۔''

اور نورالحق نے فوراً اس کے بال چھوڑ دیئے۔ یہیں نہیں......اس نے ارجمند کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

ارجمند نے اسے گود میں لے لیا۔

عبدالحق دفتر جانے کے لئے نکلنے لگا تو ارجمند نورالحق کو گود میں لئے، اسے رخصت کرنے کار تک آئی۔

عبدالحق کار میں بیٹھنے لگا تو ارجمند نے بچے سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں سمجھ رہی ہوں آغا جی......!'' ارجمند نے کہا۔

عبدالحق نے پلٹ کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ حیران رہ گیا۔

نورالحق نے اپنا سیدھا ہاتھ سر پر رکھا اور محبت سے اسے تکنے لگا۔

عبدالحق بے ساختہ مسکرایا۔

''جیتے رہو بیٹے......! خوش رہو......! اللہ ہمیشہ تم سے راضی رہے۔''

نورالحق کو جانے کیا ہوا......؟ وہ ہاتھ اٹھا کر بار بار سلام کرنے لگا۔

عبدالحق ہنسنے لگا۔

''بس کرو بیٹے......! کیا سات سلام کئے بغیر نہیں رکو گے......؟''

بچہ بھی ہنسنے لگا۔

''اسے پیار کریں نا آغا جی......!''

عبدالحق پلٹا اور اس نے بچے کو پیار کیا۔ بچے نے فوراً اسے جوابی پیار کیا۔

''اب شام کو ملیں گے...... اللہ حافظ......!'' عبدالحق نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو نوریز......!''

اس روز دفتر جاتے ہوئے پہلی بار عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ اپنی کوئی بہت قیمتی چیز پیچھے چھوڑے جا رہا ہے۔

اس رات ارجمند کی دوسری بات کی بھی تصدیق ہوگئی۔ ننھے نورالحق نے اپنے بابا کو اپنے معمولات میں شامل کر لیا تھا۔

اور آئندہ اتوار کو ایک تیسرا معمول بھی قائم ہو گیا۔

صبح ناشتے کے کچھ دیر بعد ارجمند اور عبدالحق قرآن پر بات کرتے تھے۔ اسٹڈی میں آنے سے پہلے عبدالحق خاصی دیر تک نورالحق کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ پھر وہ ارجمند کے ساتھ اسٹڈی میں چلا آیا۔

باتیں کرتے کرتے ارجمند کو کچھ احساس ہوا تو اس نے سر گھما کر دیکھا۔

''ارے......! آپ یہاں بھی چلے آئے......؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

عبدالحق نے بھی سر گھما کر دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا۔ کوئی دس منٹ دور نورالحق

قالین پر بیٹھا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

عبدالحق نے اٹھنا چاہا تو ارجمند نے ہاتھ کے دباؤ سے اسے روک دیا۔

''رہنے دیجئے آغا جی......!''

''کیسی باتیں کرتی ہو ارجمند......؟ یہ نیچے بیٹھا ہے جانے کب سے......؟''

''کوئی بات نہیں......! کارپٹ پر ہے نا......فرش پر تو نہیں......!'' ارجمند نے بے پرواہی سے کہا۔

''اور یہ اپنی مرضی سے آیا ہے۔ جبکہ یہ اس کا وقت بھی نہیں......!''

''ارے......یہ ننھا سا بچہ ہے......!''

''آپ اس میں دخل نہ دیں آغا جی......! یہ بچے کی تربیت کا معاملہ ہے۔'' ارجمند نے سخت لہجے میں کہا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ ارجمند نے اس سے اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ عبدالحق کو حیرت ہوئی اور جس بات پر اس نے یہ سختی اختیار کی تھی، وہ اپنی جگہ حیرت انگیز تھی۔

''تربیت......؟ نہ یہ بول سکتا ہے، نہ تمہاری بات سمجھ سکتا ہے۔ ایسے میں تربیت کیسی......؟''

''جو پیدائشی گونگے بہرے ہوتے ہیں، وہ بھی ناسمجھ نہیں ہوتے۔ ہر بات سمجھتے ہیں۔'' ارجمند کا لہجہ نرم ہو گیا۔

''وہ اور بات ہے......!''

''جی نہیں......! آپ بھول رہے ہیں کہ بغیر لفظوں کے اس نے اپنی بات نہ صرف آپ تک پہنچائی، بلکہ منوائی بھی۔'' ارجمند نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور جو اتنے دنوں تک آپ اسے نظر انداز کرتے رہے...... وہ زیادتی تھی......؟''

عبدالحق کھسیا کر رہ گیا۔ وہ معذرت طلب نظروں سے بچے کی طرف دیکھتا رہا۔ بچہ اسے اور ارجمند کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے اب تک منہ سے ایک بار بھی کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔

''میری طرف دیکھئے نورالحق......!'' ارجمند نے اسے پکارا۔

بچے کی نگاہیں ارجمند پر مرکوز ہو گئیں۔

''یہ وقت آپ کا نہیں ہے۔ آپ کو آپ کا حصہ مل چکا۔'' ارجمند نے ایسے کہا جیسے بچہ ہر بات سمجھ رہا ہو۔

''اس وقت ہم قرآن پڑھتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ یہاں آ گئے تو کوئی بات نہیں......! بس......اب آپ یہاں خاموش بیٹھے رہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔''

بچے نے یوں سر جھکا لیا کہ اس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جا لگی۔

''جی آغا جی......! تو آپ کیا کہہ رہے تھے......؟'' ارجمند نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

مگر عبدالحق اب کچھ سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کا دل بچے میں اٹکا ہوا تھا۔ ارجمند کسی آیت کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ لیکن عبدالحق بار بار کن انکھیوں سے بچے کو دیکھتا۔ اب اس کا سر جھکا ہوا نہیں تھا۔ وہ ارجمند کو دیکھ رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کی بات غور سے سن رہا ہو۔

عبدالحق کو ارجمند کی وہ حرکت ظالمانہ لگی۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں لفظ......سوتیلی ماں...... گونجا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اسے جھٹک دیا۔ اسے احساس تھا کہ اس سے کہیں بڑا ظلم وہ بچے پر کرتا رہا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ارجمند کو کھل کر ظالم سوتیلی ماں قرار دیتا۔ لیکن جو کچھ وہ بچے کے ساتھ کرتا رہا تھا، اسے کسی کی بھی یادداشت سے مٹانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

عبدالحق نے کوشش کی کہ بچے کی طرف نہ دیکھے لیکن وہ تو ایک بے اختیار عمل تھا۔ اور اس کی وجہ سے وہ ارتکاز سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ارجمند نے یہ بات محسوس کر لی ہے۔ لیکن اس نے اسے ٹوکا بہرحال نہیں۔

وہ ان کی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی نشست ہوتی تھی۔ بالآخر ارجمند نے کہا۔

''اب مجھے کچھ وقت اپنے شہزادے بیٹے کو دینا ہے آغا جی......! اور اس کے بعد کھانے کی بھی فکر کرنی ہے۔''

عبدالحق کو بچے کے ساتھ اتنے سخت روّیے کے بعد اسے اتنے لاڈ سے شہزادہ بیٹا کہنا بہت عجیب لگا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اس نے بچے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلائے۔

لیکن بچے نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ ارجمند کی طرف متوجہ تھا۔

ارجمند مسکراتی ہوئی اٹھی۔

''یہ معمولات کے بہت پکے ہیں آغا جی......! یہ وقت ان کا میرے لئے ہے۔'' پھر وہ نورالحق کے سامنے جھکی ہی تھی کہ نورالحق نے دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیئے۔ عبدالحق کھسیا گیا۔

ارجمند نے اسے گود میں لیا تو وہ اس سے لپٹ گیا۔ پھر وہ اسے بار بار پیار کرنے لگا۔

ارجمند نے عبدالحق کی طرف شکرگزاری سے دیکھا۔

''آپ کا شکریہ آغا جی......!''

''کس بات کا......؟''

''شہزادے نے پہلی بار مجھے پیار کیا ہے۔''

''تو پھر......؟''

''آپ کو پیار کرنے سے پہلے یہ کسی اور کو پیار کرنے والا نہیں تھا۔''

عبدالحق کو یقین نہیں آیا۔ اسے لگتا تھا کہ ارجمند بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہے۔

لیکن شام کو حمیدہ نے بھی بہت خوش ہو کر اسے یہ اطلاع دی۔

''پتا ہے پتر......! آج نورالحق نے مجھے پیار کیا۔''

عبدالحق نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کا بیٹا اس سے اتنی محبت کرتا ہے۔

'بہت محبت والا بچہ ہے یہ......!''

''الحمد للہ......! اماں......!''

✿✿✿

ارجمند بہت خوش تھی کہ عبدالحق پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اسے یہ تو پتا نہیں چل سکا کہ وہ بحران کیا تھا......؟ جس نے اس جیسے آدمی کو مایوسی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ لیکن یہ بات ہی کافی تھی کہ وہ بحران بالآخر ختم ہو گیا۔

اور جس طرح سے سب ٹھیک ہوا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس نے مرض کی درست تشخیص کی تھی۔ اور یہ اللہ کی رہنمائی سے ہی ممکن ہوا تھا۔ بچے کا دل دکھانے پر ہی اللہ میاں آغا جی سے ناراض تھے۔ انہوں نے تلافی کر دی اور اللہ نے معاف فرما دیا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ، بے دردی سے، محبت کے بغیر روندے جانے کا احساس اب بھی اسے ستاتا تھا۔

اسے عبدالحق سے کوئی شکایت، کوئی گلہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ ہوا، وہ عبدالحق کے مزاج کے برعکس تھا۔ وہ ایک ایسی کیفیت میں عبدالحق سے سرزد ہوا ہوگا، جس میں عبدالحق کو خود اپنا ہوش بھی نہیں ہوگا۔

لیکن زخم تو بہرحال زخم ہی ہوتا ہے۔

اور اس زخم پر مرہم عبدالحق ہی رکھ سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس صورت میں زخم فوراً ہی مندمل بھی ہو جائے گا۔

مگر اس کے لئے وہ عبدالحق کے التفات کے انتظار کے سوا کیا کر سکتی تھی......؟

اور وہ انتظار تو جیسے قیامت کا انتظار تھا۔ عبدالحق ہر طرح سے خوش اور مطمئن تھا۔ نورالحق کے ساتھ اس کے معاملات اور معمولات طے پا گئے تھے۔ وہ اپنے طور پر سب کے حقوق ادا کر رہا تھا۔ حمیدہ کے پاس وہ باقاعدگی سے جاتا۔ کھانا سب کے ساتھ کھاتا۔ نورالحق کو تو کبھی اضافی وقت بھی مل جاتا۔ لیکن اسے کبھی اس کا خیال نہیں آتا تھا۔

یہ حقیقت تھی اور ارجمند کو اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ عبدالحق اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتا۔ اس کی ضرورتوں کی فکر کرتا۔ اس کی کچھ ضرورتیں ایسی تھیں، جن کے لئے وہ خود کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ عبدالحق ان کا خاص

طور پر خیال رکھتا۔ ضرورت پڑنے پر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کی ضرورت کی وہ چیز موجود نہ ہو۔ عبدالحق ضرورت پڑنے سے پہلے ہی وہ اسے لا دیتا تھا۔

اور کئی بار ایسا ہوا کہ عبدالحق نے اسے شاپنگ کے لئے اپنے ساتھ بازار لے جانا چاہا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔

''لیکن کیوں ارجی......؟''

''مجھے بازار جانا اچھا نہیں لگتا آغا جی......!'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن کیوں......؟''

''بازار کوئی اچھی جگہ نہیں ہوتی۔''

''اس کے باوجود ان کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت کی چیزیں ملتی ہیں وہاں سے۔ جانا تو پڑتا ہے۔''

''مجھے تو اس کی ضرورت نہیں......!''

''وہ کیسے......؟''

''مجھے ہر چیز آپ خود ہی لا دیتے ہیں۔''

عبدالحق نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

''لیکن اپنی پسند کی کسی چیز کو بھی تو آدمی کا دل چاہتا ہے کبھی......؟''

''آپ کی پسند میری پسند کے عین مطابق ہوتی ہے۔''

''یہ بات کہنے کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن کہیں فرق بھی پڑ جاتا ہوگا۔ تمہیں اپنے لئے ہر چیز خود منتخب کرنی چاہیئے۔''

''میں نے محض کہنے کے لئے یہ بات نہیں کہی۔ پوری سچائی کے ساتھ کہا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی لائی ہوئی ہر چیز ہمیشہ مجھے بہت اچھی...... بہترین لگی۔ ناپسند ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

مگر عبدالحق مطمئن نہیں ہوا۔

''ایک وعدہ کرو مجھ سے......!'' اس نے کہا۔

''جی...... فرمایئے......!''

''کبھی میری لائی ہوئی کوئی چیز ناپسند ہوئی یا اس سے بہتر ذہن میں ہوئی تو

مجھے بتا دو گی۔''

''جی...... ٹھیک ہے......! یہ وعدہ رہا......!''

اور یہ کافی پرانی بات تھی۔ پھر عبدالحق نے اس سے کبھی بازار چلنے کو نہیں کہا۔ لیکن اس کے بعد وہ پہلے سے بڑھ کر اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔

عبدالحق کی عادت تھی کہ گھر کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ موسم کے پھل تو وہ ہر روز لاتا تھا۔ حمیدہ کے لئے شہد، بادام اور زیتون کے تیل کا وہ خاص خیال رکھتا تھا۔ نورالحق کے لئے کھلونے بھی باقاعدگی سے آتے۔ خود اس کے لئے کپڑے وہ بہت شوق سے لاتا اور جب بھی ایسا ہوتا تو وہ حمیدہ کے لئے بھی کپڑے ضرور لاتا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے خوشبو بہت پسند ہے۔ وہ اس معاملے میں خود بھی بہت خوش ذوق تھا۔ خوشبو اس کے لئے بہت کثرت سے لاتا اور وہ ہوتی بھی بہت اعلیٰ۔

ایک دن ارجمند نے اسے ٹوک دیا۔

''میرے پاس ضرورت سے بہت زیادہ کپڑے ہیں۔ آپ اتنے زیادہ نہ لایا کریں۔''

''اس میں حرج کیا ہے......؟'' عبدالحق نے کہا۔

''اللہ کے ہاں حساب بھی تو ہونا ہے......؟''

''ہاں......! یہ تو ہے......!'' عبدالحق نے کہا۔

''تم اس سلسلے میں کچھ نہیں کرتیں......؟''

''کرتی ہوں...... ملازموں کو دیتی رہتی ہوں۔ کسی ضرورت مند کا پتا چلے تو اسے دے دیتی ہوں۔''

''تو پھر کیا پریشانی ہے......؟ بس بندہ اللہ سے ڈرتا رہے۔''

''پھر بھی......!''

عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''دیکھو نا...... جیسے تمہیں اپنے حساب کی فکر ہے، ویسے ہی مجھے تمہارے حقوق کی فکر ہے۔ تم مجھے مت ٹوکو...... اور تم اگر بغیر سلا ہوا کپڑا بھی کسی کو دے دو گی تو میں تمہیں نہیں ٹوکوں گا۔''

"آپ کو برا نہیں لگے گا کہ میں نے آپ کا دیا ہوا تحفہ کسی اور کو دے دیا......؟"

"میں نے تمہیں تحفہ دیا تو وہ تمہاری ملکیت ہوگیا۔ تم اس کا جو چاہو، کرو......!"

ارجمند مطمئن ہوگئی۔

"اور عطر کا تو میرے پاس خزانہ جمع ہوگیا ہے۔" اس نے ذرا توقف سے کہا۔

"وہ تو میں لاتا ہی بہت تھوڑا ہوں۔ تمہیں پتا ہے نا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو سے کتنی محبت تھی......؟"

ارجمند لاجواب ہوگئی۔ لیکن کوئی بے نام خلش اسے ستاتی رہی۔

پھر ایک دن وہ خلش بھی دور ہوگئی۔

اس روز عبدالحق دفتر میں تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ نوریز کو حمیدہ نے کسی کام سے بھیجا تھا۔ رشیدہ نے آکر اسے بتایا کہ باہر کوئی عبدالحق سے ملنے کے لئے آیا ہے۔

"تم نے بتایا نہیں کہ وہ آفس گئے ہوئے ہیں۔" ارجمند نے کہا۔

"کوئی بوڑھے آدمی ہیں، کہتے ہیں، ضروری ملنا ہے۔ صاحب نہیں ہیں تو بیگم صاحبہ سے بات کرادو۔"

وہ چند لمحوں کے لئے جھجکی۔ مگر پھر دروازے پر چلی گئی۔ دروازے پر جو شخص کھڑا تھا، وہ اتنا بوڑھا نہیں تھا۔ 50 کے قریب عمر ہوگی۔ کچھ صحت بھی خراب تھی۔

"جی...... فرمائیے......!" ارجمند نے کہا۔

"عبدالحق صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"بیگم صاحبہ......! وہ آئیں تو انہیں بتا دیجئے گا کہ گاؤں میں میرے دادا کا انتقال ہوگیا ہے۔ ہم سب گاؤں جارہے ہیں۔ میرا نام قمر ہے جی......!"

"اوہ......! ان کو مدد کی ضرورت ہے۔" ارجمند نے سوچا۔ پھر بولی۔

"آپ ذرا رُکئے......! میں ابھی آئی......!" یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ اپنے پرس میں سے اس نے دو سو روپے نکالے اور لے کر واپس آئی۔ اس نے وہ نوٹ اس

کی طرف بڑھا دیئے۔

"لیجئے......! یہ رکھ لیجئے......!"

"میں اس لئے نہیں آیا تھا بیگم صاحبہ......!" اس شخص کی آواز رندھ گئی۔

"میں تو......"

ارجمند نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

"لے لیجئے......! دیکھئے میں آپ کی بیٹی جیسی ہوں نا......؟"

بوڑھے شخص نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ارجمند کے اصرار پر اس نے رقم لے لی۔ تاہم اس نے کہا۔

"اللہ آپ کو بہت دے بیگم صاحبہ......! لیکن میں یہاں اس لئے نہیں آیا تھا۔"

"کوئی اور ضرورت ہو تو بلا جھجک بتا دیجئے......!"

"جی...... عبدالحق صاحب کو بتا دیجئے گا کہ اس مہینے ہمارے لئے راشن نہ بھیجیں......!"

ارجمند ہکا بکا رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

اسی وقت نوریز آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ ان صاحب کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"آپ یہاں کیسے قمر صاحب......؟"

"وہ میں یہ......"

لیکن نوریز ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گیٹ کی طرف لے گیا۔ پھر ارجمند نے ان دونوں کو نوریز کے کوارٹر میں داخل ہوتے دیکھا۔ تجسس سے اس کا برا حال تھا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں باہر نکلے۔ نوریز نے انہیں رُخصت کیا اور دروازے کی طرف آگیا۔

"اس تھیلے میں کیا ہے نوریز......؟"

"اماں جی نے کچھ چیزیں منگوائی تھیں، وہ لایا ہوں بی بی صاحبہ......!"

"یہ دادی اماں کو دے کر ڈرائنگ روم میں آؤ......! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" ارجمند نے کہا اور ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔

وہ وہاں بیٹھی ہی تھی کہ نوریز آ گیا۔

"جی بی بی صاحب......؟"

"بیٹھو......!" ارجمند نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

نوریز جانتا تھا کہ وہ اسے بھائی کا درجہ دیتی ہے۔ اور اس نے اس حقیقت کو قبول بھی کر لیا تھا۔ لیکن وہ اپنے اندر کی قدرتی جھجک کو ابھی تک نکال نہیں سکا تھا۔ بہرحال وہ صوفے پر ٹک گیا۔

"یہ صاحب کون تھے......؟"

"یہ قمر صاحب تھے بی بی صاحبہ......!"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں کیوں آئے تھے......؟" ارجمند نے نرم لہجے میں کہا۔

"تم مجھے ان کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ کہ یہ کیا معاملات ہیں......؟"

نوریز گڑبڑا گیا۔

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا بی بی صاحبہ......!"

ارجمند جانتی تھی کہ نوریز جھوٹ بولنے والا نہیں۔ اس نے کہا۔

"کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں......؟"

"نہیں بی بی جی......! لیکن صاحب نے مجھے بہت سختی سے منع کیا ہے کہ اس سلسلے میں کسی کو بھی پتا نہ چلے۔"

"مگر مجھے تمہارے بتائے بغیر ہی معلوم ہو گیا۔"

"تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں......؟"

"مجھے پوری بات معلوم نہیں ہوئی، اس لئے......!"

"آپ صاحب سے پوچھ لیجئے گا۔"

ارجمند جانتی تھی کہ عبدالحق یہ پسند نہیں کرے گا۔ وہ کسی حد تک معاملے کی نوعیت کو سمجھ بھی گئی تھی۔ جانتی تھی کہ جو چھپایا جا رہا ہے، وہ کوئی عیب یا برائی ہرگز نہیں،

نیکی ہے۔ اور زندگی میں پہلی بار تجسس اس پر حاوی آ گیا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ پوری بات جان کر اس کے دل میں عبدالحق کی عزت اور بڑھے گی۔

"دیکھو نوریز......! وہ میرے شوہر ہیں۔ وہ اپنی نیکی کو اللہ کے سوا سب سے چھپانا چاہتے ہیں تو الحمدللہ......! یہ ان کی خوبی ہے۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ وہ نوریز کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

نوریز بڑی شدت سے تائید میں سر ہلا رہا تھا۔

"میں ان سے پوچھ سکتی ہوں، مگر جانتی ہوں کہ اس سے انہیں شرمندگی ہوگی۔ حالانکہ اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ وہ سمجھیں گے کہ ان کی نیکی گھٹ گئی۔ اس لئے میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ اور یہ وعدہ کرتی ہوں کہ انہیں کبھی پتا نہیں چلے گا کہ مجھے کچھ معلوم ہے۔"

نوریز ہچکچا رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ میں تمہیں سگے بھائی جیسا سمجھتی ہوں۔"

"جی بی بی صاحبہ......! لیکن......"

"تم بے فکری سے مجھے بتا دو......!"

بہت زیادہ اصرار کے بعد نوریز زبان کھولنے پر آمادہ ہوا۔

"یہ قمر صاحب دل کے مریض ہیں بی بی صاحبہ......! ایک دن صاحب دفتر سے میرے ساتھ گھر آ رہے تھے کہ راستے میں ان پر نظر پڑ گئی۔ مجھ سے گاڑی رکوائی، اتر کر ان کے پاس گئے، ان سے کچھ بات کی، پھر انہیں اپنے ساتھ گاڑی میں لے آئے۔ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے، دوا دلوائی اور ان کے گھر چھوڑنے کے لئے گئے۔ راستے میں ان سے ان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں۔ پانچ بیٹیاں ہیں۔ دو کی شادی ہو گئی۔ تین یہاں ان کے ساتھ ہیں۔ یہ رنگ روغن کا کام کرتے تھے۔ ایک سال پہلے دل کی تکلیف ہوئی تو کام ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ جب ہمیں ملے تو صبح سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور گھر میں بھی کچھ نہیں تھا۔

"یہ سن کر صاحب نے بازار سے ان کے لئے راشن لیا اور گھر لے گئے۔ اس دن سے پہلی تاریخ کو یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں ان کے گھر راشن پہنچاتا

ہوں۔''

''صرف راشن......؟''

نوریز یوں شرمندہ ہوا جیسے اس پر چوری کا الزام ثابت ہو گیا ہو۔

''ساتھ 50 روپے بھی ہوتے ہیں بی بی صاحبہ......! اور میں ہر پندرہ دن بعد قمر صاحب کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہوں۔ ان کو دوائی وغیرہ دلاتا ہوں۔''

ارجمند چند لمحے غور کرتی رہی۔ وہ سمجھ گئی کہ ایسے اور لوگ بھی ہوں گے۔ لیکن ایسے نوریز سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے کہا۔

''ان کے انداز میں کوئی خاص بات ہو گی۔ ورنہ تمہارے صاحب کیسے پہچانتے کہ وہ ضرورت مند ہیں......؟''

نوریز ایک دم پُرجوش ہو گیا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں تھا بی بی صاحبہ......! وہ پورا دن وہاں کھڑے رہتے تو کوئی ان کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اللہ نے صاحب کو کوئی خاص نظر دی ہے۔ راستے میں ادھر ادھر دیکھتے رہتے ہیں اور اس طرح کے آدمی کو ایک نظر میں پہچان لیتے ہیں۔''

ارجمند نے اب بھی جلد بازی نہیں کی۔ نزاکت سے بات کو آگے بڑھایا۔

''پھر بھی......کبھی دھوکہ ہو جاتا ہو گا تو کتنی شرمندگی ہوتی ہو گی۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوا بی بی صاحبہ......!'' نوریز نے کہا۔

''صاحب نے جب بھی کسی کے لئے گاڑی رکوائی تو وہ ضرورت مند ہی نکلا۔''

''اور ایسے کتنے لوگ ہیں......؟''

نوریز گڑبڑا گیا۔ مگر اب جواب دینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

''دس سے زیادہ لوگ ہیں بی بی صاحبہ......! کچھ لوگوں کی بیٹیوں کی شادی بھی کرائی ہے صاحب نے۔ پر آپ انہیں کچھ نہیں کہئے گا بی بی صاحبہ......!''

''پاگل ہو گئے ہو۔ اوّل تو میرا کوئی حق نہیں انہیں روکنے کا......اور ہو تو میں انہیں نیکی سے روکوں گی......؟ میں تو انہیں یہ بھی پتا نہیں چلنے دوں گی کہ مجھے کچھ معلوم ہے۔ قمر صاحب کے بارے میں انہیں بتاؤں گی اور ان کا پیغام انہیں پہنچا دوں گی۔''

''شکریہ بی بی صاحبہ......!'' نوریز نے یوں کہا جیسے یہ اس پر احسان ہو۔

''ٹھیک ہے......تم جاؤ......!''

ارجمند سمجھ گئی تھی۔ نوریز نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اللہ نے صاحب کو کوئی خاص نظر دی ہے۔ اس نے اللہ سے دعا کی ہو گی ایسے لوگوں کی پہچان کی۔ اور وہ اللہ نے قبول فرمائی ہو گی۔ وہ ایسے لوگوں کی مدد کر رہا تھا جن کے لئے اللہ نے خاص طور پر حکم دیا ہے، وہ لوگ جو اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہیں، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے، صرف اللہ سے مانگتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو پہچاننا کتنا مشکل کام ہے۔ اللہ ہی شعور عطا فرما دے تو الگ بات ہے۔

اور اللہ نے عبدالحق کو وہ سمجھ عطا فرما دی تھی۔ اس کے لئے بہت بڑے اجر کا سامان کر دیا تھا۔

اس کے خیالات کی رو اپنے زخم کی طرف مڑ گئی۔

وہ عبدالحق جو سوال نہ کر سکنے والے عزت دار ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے۔ کیا اپنے سب سے قریبی رشتے کی ضرورت سے بے خبر ہے......؟ کیا وہ نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی ضرورت کے لئے اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتی......؟ اس سے سوال نہیں کر سکتی......؟ کیا وہ اس کے زخم کے بارے میں نہیں جانتا...... جو خود اس نے اسے دیا ہے......؟

اس آخری سوال کا جواب اسے معلوم تھا۔ وہ جو کچھ ہوا، عبدالحق کو اس کا ادراک ہی نہیں تھا۔ ہوتا تو وہ نوبت ہی نہ آتی۔ اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اسے اب تک بھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا، ورنہ وہ اس سے معذرت ضرور کرتا۔

اور اس کا مطلب تھا کہ وہ تلافی بھی نہیں کر سکے گا۔ تلافی کے لئے زیادتی کا علم ہونا تو ضروری ہے۔ گویا اس کے لئے اسے عبدالحق کے سامنے دست سوال دراز کرنا ہو گا۔

یہ وہ کیسے کر سکتی ہے......؟ ناممکن......!

تو اس زخم کی مسلسل اذیت سے چھٹکارا ممکن نہیں......؟

وہ سوچتی اور الجھتی رہی۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ یہ اس کا حق تھا

عبدالحق پر۔ بے شک اس کی فطرت کچھ ایسی تھی کہ اس معاملے میں اسے حیا آتی تھی۔
پھر ایک بات اور تھی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ مانگنے کے نتیجے میں جو کچھ ملے گا، وہ اس زخم کا مرہم بھی بن سکے گا۔ دل کے زخم کے بارے میں کوئی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بن مانگے ملنے کی اور بات تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ جو مسئلہ حل نہ ہو اور اندر چلا جائے، وہ بہت طاقت ور ہو جاتا ہے اور اپنا دل آپ ہی تلاش کر لیتا ہے۔

❀❀❀

عبدالحق بہت مطمئن اور خوش تھا۔

بیٹے سے محبت کا تو اسے احساس ہوا کہ اللہ کی ناراضی تو اس کے لئے بہت بڑی رحمت تھی۔ اس ناراضی ہی کی وجہ سے وہ اپنے دل میں موجود بیٹے کی محبت سے روشناس ہوا۔ اسے تو علم ہی نہیں تھا کہ اس نے بلاوجہ خود کو کتنی بڑی نعمت سے محروم کر لیا ہے۔

اب بیٹے کے ساتھ جو وقت وہ گزارتا تھا، وہ اسے بہت نافع محسوس ہوتا تھا۔ ایک طرف تو اسے بہت بڑی خوشی مل رہی تھی اور دوسری طرف اللہ اس سے راضی اور خوش تھا۔

اسے اس کا کھویا ہوا ارتکاز بھی واپس مل گیا تھا۔ اب نماز میں حضوری کا احساس بھی تھا اور قرآن پڑھتے ہوئے گریہ بھی طاری ہوتا تھا۔ اس کا تہجد کا معمول بھی جاری ہو گیا تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

اور اسے احساس ہوتا تھا کہ اللہ اس سے خوش ہے۔ راضی ہے۔ اللہ نے اس کے لئے روحانی ارتقا کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ذکر کرتے ہوئے وہ اللہ کا نام لیتا تو دل سے روشنی نکل کر پورے وجود میں پھیلتی محسوس ہوتی۔ محبت...... صرف اور صرف محبت کا احساس دل و دماغ پر چھا جاتا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ وہ اتنی خوب صورت کیفیت ہوتی کہ اس سے باہر آنا بہت برا لگتا۔ لیکن بالآخر وہ کیفیت ختم ہو جاتی۔ اور اس کیفیت کے ختم ہونے میں گھر سے اٹھنے والی کسی آواز کا دخل ہوتا۔

ایسے میں وہ چڑ جاتا۔ دنیا اور دنیا کی ہر چیز اسے بری لگتے لگتی۔

''یہ دنیا ہی رکاوٹ ہے۔'' وہ بڑبڑاتا

''جی چاہتا ہے کہ دنیا ہی چھوڑ دوں۔''

لیکن پچھلا تجربہ اسے یاد تھا۔ اس نے سیکھ لیا تھا کہ دنیا سے منہ موڑنے سے اللہ نہیں ملتا، بلکہ دوری ہو جاتی ہے۔ اللہ نے دنیا کو پرکشش بنا کر آدمی کو دنیا میں یہ دیکھنے کے لئے بھیجا کہ وہ اپنے اندر موجود دنیا کی محبت کے باوصف اسے کتنا یاد رکھتا ہے......؟

یہ مقام شکر تھا کہ اسے دنیا سے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی اور وہ اللہ کی محبت کا خواہش مند تھا۔ بلکہ اب تو اللہ سے اس کی محبت کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ لیکن دنیا داری نبھانا بھی ضروری تھا۔

اس کے ذکر میں اللہ کی حمد و ثناء کے ساتھ کثرت سے درود شریف پڑھنا بھی شامل تھا۔ سیرتِ طیبہ سے بھی اسے بہت کے محبت تھی۔

ایک دن اسے خیال آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ آپ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات شروع کرتے وقت ہمیشہ کہتے کہ میرے ماں باپ، بیوی بچے اور جان و مال آپ پر قربان...... اور یہ صرف زبان سے کہنے کی بات نہیں تھی، یہی ان کا عمل بھی تھا۔ اور تفسیر کے مطالعے کے دوران اس نے ایک روایت پڑھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

وہ اس پر غور کرتا رہا۔

تو پھر بات یہ ہے کہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی، اس نے اللہ سے محبت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے تقریب کا یقینی وسیلہ ہیں۔

اسے رشک آنے لگا۔ جو لوگ اس دور میں رہے، جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دید، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل نشیں قربت نصیب ہوئی، جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی ہی محبت کی کہ اپنا سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کرنے کے لئے ہر پل تیار رہتے تھے، کتنے خوش نصیب تھے۔ کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ

کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا.....؟

''کاش میں اس دورؐ میں پیدا ہوتا.....؟'' اس نے سوچا۔

لیکن اگلے ہی لمحے ایک خیال نے اسے دہلا دیا۔

سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کی یہ سوچ کھلا ہوا ناشکرا پن ہے۔ کیا اس نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اس پر کیسا کرم فرمایا.....؟ وہ مشرکوں میں پیدا ہوا اور اللہ نے بچپن ہی سے اس کی رہنمائی فرمائی۔ اسے اسلام قبول کرنے کی سعادت عطا فرمائی اور اس کے ساتھ ایمان سمیت، جو کچھ بھی عطا فرمایا، وہ ساری دنیا کے تمام خزانوں سے بڑھ کر ہے۔ کتنی عنایت ہے اس پر اس کے ربّ کی۔

اور رہی بات اس دور میں پیدا ہونے کی تو اسی دور میں کتنے ہی بدبخت ایسے تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے مرتے دم تک دشمنی پر کمربستہ رہے، جو ابد تک جہنم کے بدترین درجے میں رہیں گے۔ وہ اس دور میں پیدا ہوتا اور اسے ہدایت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نصیب نہ ہوتی تو وہ کہاں ہوتا.....؟

اس خیال سے اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

سب اللہ ہی اللہ ہے۔ سب اسی کی عطا سے ہے۔ ہدایت، توفیق اور محبت اس کے بہت اعلیٰ خزانے ہیں۔ وہی تو ہے، جو دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔ والدین کو اور خصوصاً ماں کو اولاد کے لئے محبت اس کی عطا ہے۔ محبت اور اس سے متعلق تمام جذبے اسی نے انسان کو عطا کئے۔ نرمی، ہمدردی، ایثار، خیال رکھنا اور کام آنا۔ تبھی تو انسان جانوروں تک کا خیال رکھتا ہے۔ زندگی کا جو نظام اس نے قائم فرمایا ہے، محبت اس کا ایک اہم ستون ہے، ورنہ معاشروں کی جگہ جنگل ہوتے۔ اور اس نے قرآن میں بتایا کہ بندوں کو سب سے بڑھ کر اس سے ہی محبت کرنی چاہئے۔ تو محبت تو بہت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہوا نا...... یہ الگ بات کہ انسانوں نے محبت اور عشق کو اپنے نفس کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے عامیانہ اور مبتذل الفاظ دیا...... خالی خولی الفاظ۔ ورنہ جس چیز کا حکم اللہ اپنے بندوں کو اپنے لئے دے، وہ تو اعلیٰ ترین ہی ہو سکتی ہے۔

اور وہ خود بھی تو اللہ سے ایسی ہی محبت کرنا چاہتا ہے۔

اور اللہ کی اپنے بندوں سے محبت دیکھو کہ وہ فرماتا ہے کہ میرے بندوں سے

میری خاطر محبت کرو تو وہ تم مجھ سے محبت کر رہے ہو گے۔ تو اس نے بتایا نا کہ وہ اپنے بندوں سے اس محبت سے 70 گنا، بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ کرتا ہے، جو ایک ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔

اب کوئی اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے تو وہ اس سے محبت کرنے کے اور اعلیٰ درجے پر پہنچا دے گی۔

اس نے غور کیا تو احساس ہوا کہ اللہ نے ایک بہت مشکل کام کو اپنے بندوں کے لئے بہت آسان کر دیا۔

''اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۝''

وہ جانتا تھا کہ اس کے بندے اپنے حواس کے کتنے محتاج ہیں۔ بغیر دیکھے ایمان لانا بھی آسان نہیں۔ بغیر دیکھے محبت کرنا تو تقریباً ناممکن ہی ہے سو اس نے اپنی رحمت سے اس کو بھی آسان کر دیا۔

میرے بندوں سے محبت کرو تو یہ مجھ سے محبت ہو گی۔ تم ان کا خیال رکھو گے، میں تمہارا خیال رکھوں گا۔ تم ان کے ساتھ نرمی کرو گے، میں تمہارے ساتھ نرمی کروں گا۔

کتنا آسان......!

اور پھر اگلا درجہ......!

تم میرے محبوب سے محبت کرو تو یہ تو ہے ہی مجھ سے محبت۔

مگر یہ بھی بغیر دیکھے کی جانے والی محبت...... بہت دشوار......!

اللہ نے اسے بھی آسان کر دیا۔ میں اور تمام فرشتے میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں، تم بھی درود بھیجو۔ یہ میری اتباع ہو گی۔ دل کی زمین نرم ہو گی۔ محبت کے بیج کے لئے نمو کا سامان ہو گا۔ اور محبت کا بیج کیا ہے......؟ محبت کی خواہش......!

اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پڑھو۔ ان کے اوصافِ حمیدہ کے بارے میں جانو گے تو محبت پیدا ہو گی۔ اپنے نفس سے لڑ کر اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کرو گے تو محبت ہو گی۔ اللہ کے دین کی تبلیغ کی راہ میں ان کی صعوبتوں کا

تصور کرو گے تو اللہ کی قدرت اور ایمان کی شان نظر آئے گی۔ وہ کتنے اکیلے تھے اور دشمن کتنے طاقت ور تھے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دشمن نہیں سمجھا۔ ان کی بھلائی کے لئے دُعا فرماتے رہے۔ تبھی تو رحمت اللعالمین ہیں۔ جو ایذائیں پہنچاتے تھے، ان کے لے ہدایت کی دعا کرتے تھے۔ اس معاشرے میں ان سا شریف، ان سا امین اور ان سا صادق کوئی نہیں تھا، اور قیامت تک کوئی ہو بھی نہیں سکے گا۔ ان کی قوم ان تمام اوصاف کی قائل تھی۔ لیکن ہدایت پیش کرنے پر سب دشمن بن گئے۔ توہین کی گئی، ایذا دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوڑا پھینکا گیا، راہ میں کانٹے بچھا دیئے گئے، پتھر برسائے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر واستقامت کی وہ مثال چھوڑی، جو رہتی دنیا تک بے نظیر رہے گی۔ تو اس صبر واستقامت پر فخر کرو گے نا...... اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیتوں پر رونا بھی آئے گا۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غلبہ حاصل ہوا تو آپ کا عفو و درگزر...... کسی فاتح میں ایسا ظرف کبھی نہ دیکھا۔ یہ سب پڑھ کر یہ نہیں سوچو گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ محبت کرنی چاہئے، جو آپ نے کبھی کسی سے نہیں کی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس کا حق ہوتا ہے محبت پر۔

اور یہ حقیقت تھی۔ عبدالحق جب بھی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرتا تو اس کے وجود میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا سمندر موج زن ہو جاتا۔ وہ طائف کا واقعہ پڑھتا، جہاں کافروں کی سنگ باری نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لہولہان کر دیا تھا اور آپ کی نعلین مبارک خون سے بھر گئے تو تو روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔ اور اللہ کا وہ محبوب، جس کے ایک اشارے پر احد کا پہاڑ سونے کا بن جاتا، فاقوں سے چور، پیٹ پر پتھر باندھ کر جہاد میں حصہ لیتا تو اس کا دل پھڑ کنے لگتا۔

تو بات یہ ہے کہ ذرا سی توجہ ہو تو محبت بہت آسان ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے نہ ہو تو محبت ناممکن۔ اللہ نے تو سب کچھ آسان کر دیا ہے۔ راہِ عشق میں کوئی دشواری نہیں رہنے دی۔

اب یہ اتنی بڑی دولت بے طلب تو نہیں دی جا سکتی۔ دل میں خواہش تو ہو۔

وہ کثرت سے درود شریف پڑھنے لگا۔

آدمی کے اندر کی کیفیات اسے سب کچھ بتا دیتی ہیں۔ وہ مطمئن تھا کہ وہ صحیح

راستے پر چل رہا ہے۔ اندر کی کیفیات اس کی گواہی دے رہی تھیں۔

وہ خوش تھا کہ زندگی کسی سبک روندی کی طرح بہہ رہی تھی۔

پھر گڑبڑ ہوئی، اور اس طرف سے ہوئی، جہاں سے اسے کوئی خدشہ نہیں تھا۔

اس رات وہ بیڈ روم میں گیا اور وضو کر کے بستر پر آلیٹا۔ ارجمند بے خبر سو رہی تھی۔ وہ معمول کے مطابق درود شریف کا ورد کرتا رہا۔ ذرا ہی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

پھر اس کی آنکھ اس احساس کے ساتھ کھلی کہ کوئی اس سے لپٹا ہوا ہے۔ دو نرم مہربان ہاتھ اس کے چہرے کو اور اس کے سینے کو ٹٹول رہے ہیں۔

خواب گاہ میں اندھیرا تھا۔ تیز اور بھاری سانسوں کے سوا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر، لپٹنے والے کو پرے دھکیلا، مگر اس بار پورا بوجھ اس کے سینے پر آ گیا۔

وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ شناخت ارجمند کی خوشبو سے ہوئی یا اس کی آواز سے۔ کیونکہ شاید دونوں کا شعور ایک ہی لمحے ہوا تھا۔

''میں آپ سے محبت کرتی ہوں آغا جی...... ! میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔'' ارجمند بوجھل سانسوں کے درمیان یہی ایک جملہ دہرائے جا رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو ارجمند......؟'' اس نے سخت لہجے میں کہا اور دوبارے اسے دھکیلا۔

''آغا جی...... پلیز......؟'' وہ تو کوئی نازک بیگ تھی، جو سہارے کے لئے ایک درخت کی طرف لپک رہی تھی، لپٹے رہنا چاہتی تھی۔

عبدالحق کے دماغ پر نیند کا غلبہ تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''یہ کیا بچپنا ہے ارجمند......؟ ہٹو......!'' اس نے پھر دھکیلا۔

مگر ارجمند میں اس وقت نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی۔ مگر جسمانی اصرار کے باوجود اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''پلیز آغا جی......! پلیز......!''

''ارجمند......!''

"آپ تو مجھ سے محبت کرتے ہیں آغا جی......!" وہ اسے یاد دلا رہی تھی۔

"ہاں......! لیکن......"

"تو پھر میری عزتِ نفس کا آپ خیال نہیں رکھیں گے......؟" ارجمند کے لہجے میں حیرت اور التجا کا امتزاج تھا۔

عبدالحق سمجھ نہیں سکا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے......؟ اس نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اب اس کی نگاہ کمرے کی تاریکی سے ہم آہنگ ہوگئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ارجمند کی آنکھیں بند ہیں۔ اس کے دونوں ہاتھ اندھا دھند اسے ٹٹول رہے تھے۔

"ارجمند......! کیا کر رہی ہو......؟ آنکھیں کھولو......! ادھر دیکھو......!"

اس عالم میں بھی ارجمند کو اس کے حکم کی تعمیل کا خیال رہا۔ اس کی پلکیں پھڑپھڑائیں۔ آنکھیں کھلیں۔

مگر ان آنکھوں میں خالی پن تھا۔ وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں۔

اور اس کی تکرار جاری تھی۔

"پلیز آغا جی......! پلیز......! آپ تو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ میری عزتِ نفس کا خیال نہیں رکھیں گے......؟"

اب عبدالحق پوری طرح جاگ رہا تھا اور وہ جھنجلا رہا تھا۔ وہ صورتِ حال کو سمجھ گیا تھا۔ بچہ تو نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ ارجمند کیا چاہ رہی ہے......؟

اس نے بہت تیزی سے سوچا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وقت کیا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کتنی دیر سویا ہے۔ البتہ یہ اسے معلوم تھا کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ پھر یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی بہت تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد اسے نیند بہت گہری آئے گی۔ پھر اتنی سردی میں غسل...... کم از کم تہجد سے تو وہ محروم ہی ہو جائے گا۔

یہ اسے گوارہ نہیں تھا۔ پہلے بھی کئی بار وہ راستہ گم کر چکا تھا۔ اب پہلی بار وہ عشق کی مملکت کی سرحد پر کھڑا تھا۔ اتنا خوش اور مطمئن وہ پہلے کبھی نہیں رہا تھا۔ یہ آزمائش پھر اسے پیچھے لے جا سکتی تھی۔

"لیکن نہیں......! اللہ سے محبت کرنے والے ایسی آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ گزرتے ہیں۔" اس نے فیصلہ کرلیا۔

ارجمند اب پھر اس سے لپٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"ارجمند......!" اتنی سختی سے اس نے زندگی میں کبھی کسی کو بھی نہیں پکارا تھا۔

"ہوش میں آؤ......! آنکھیں کھولو......!" اس کی آواز بھی بلند تھی۔

ارجمند کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس بار اس نے سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھا اور ایک پل میں لاشعور کی ہر چیز اس کے شعور میں چلی آئی۔

وہ گھبرا کر عبدالحق سے علیحدہ ہوئی۔ عبدالحق کا یہ لہجہ اور اتنی بلند آواز اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔ یہی بات تو اسے ہوش میں لائی تھی۔ وہ سہم گئی تھی۔

"کیا ہوا آغا جی......؟"

"تمہیں نہیں معلوم......؟" عبدالحق نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"معلوم تو نہیں تھا...... مگر اب سمجھ سکتی ہوں۔" ارجمند نے دبی دبی آواز میں کہا۔

عبدالحق جانتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ اور اس وقت بھی وہ سچ بول رہی ہے۔ مگر وہ اس وقت دور کی سوچ رہا تھا۔ جی چاہتے ہوئے بھی اس نے اپنا لہجہ نرم نہیں کیا۔

"ایسا کیوں ہوا......؟" اس نے پوچھا۔

ارجمند کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے شرمسار لہجے میں کہا۔

"میں بھی انسان ہوں آغا جی......!"

"مگر وعدے کی پاسداری کی بڑی اہمیت ہے۔"

"جی...... بے شک......!"

"تو پھر......؟"

ارجمند کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے نزدیک وعدے کی پاسداری کا حوالہ ایک غیر متعلقہ بات تھی۔

''میں سمجھی نہیں آغا جی......!''

''تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔''

''وعدہ......؟'' ارجمند نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں......! اپنے حقوق کے بارے میں تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔''

ارجمند کے ذہن میں ایک پھل جھڑی سی پھوٹی۔ ایک پل میں اسے وہ وعدہ یاد آ گیا۔ اس کی نظریں اور جھک گئیں۔ شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ زمین میں دھنس کر عبدالحق کی نظروں سے چھپ جاتی۔

''میں بھول گئی تھی آغا جی......!''

''وعدہ بھولنے کے لئے نہیں ہوتے۔'' عبدالحق نے سرزنش کرن یوالے انداز میں کہا۔

''سوری آغا جی......! میں بہت شرمندہ ہوں۔'' ارجمند نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

عبدالحق نے ان نرم و نازک اور خوب صورت ہاتھوں کو دیکھا، جو ذرا پہلے اس کے جسم پر مچل رہے تھے۔ اس لمحے اسے اس پر شدت سے پیار آیا۔ اس نے ان ہاتھوں کو علیحدہ کر دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ارجی......! اب ذرا میری طرف دیکھو......!''

''میں تو اب ساری زندگی آپ کے سامنے نظر نہیں اٹھا سکتی۔'' ارجمند نے شرمسار لہجے میں کہا۔

''ایسی بات نہ کرو......! غلطی تو کسی سے بھی ہو جاتی ہے۔ اس کو سمجھ لینا، اسے مان لینا بہت کافی ہوتا ہے۔ ادھر دیکھو......!''

''نہیں آغا جی......! یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''یہ میرا حکم ہے......!''

''پہلے آپ مجھے معاف کریں......!''

''وہ تو میں کر چکا......!''

ارجمند نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ مگر ایک لمحے کے بعد ہی نظریں جھکا

لیں۔

عبدالحق نے نرمی سے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے لٹا دیا۔

''اب سکون سے سو جاؤ...... جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ...... جیسے کچھ ہوا ہی نہیں......!''

''جی آغا جی......!'' ارجمند نے کہا۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ یہ ممکن نہیں۔

عبدالحق لیٹا اور چند لمحوں میں ہی گہری نیند سو گیا۔

لیکن ارجمند جاگ رہی تھی۔

❁❁❁

اب پتا چلا کہ عبدالحق نے نادانستگی میں اس کی عزتِ نفس کو جو زخم دیا تھا، جسے وہ بڑی اہمیت دیتی رہی تھی، وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس رات کی شرمندگی کی تو کوئی نظیر ہی نہیں تھی۔ اسے حیرت تھی کہ وہ اس شرمندگی سے مر کیوں نہیں گئی۔

کاش......! زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتی۔

اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

''یہ شرمندگی کیسے مٹے گی......؟ یہ تو کسی طور بھی مٹنے والی نہیں......!''

اگلے ہی لمحے اس نے زیر لب ''لا حول ولا قوة'' پڑھا۔

''یہ میں کس انداز میں سوچ رہی ہوں......؟ اللہ غفور الرحیم ہے۔ وہ تو بڑے سے بڑا گناہ بھی مٹا دیتا ہے۔ بے شک......! وعدے کی پاسداری کا اللہ نے بڑی سختی سے حکم دیا ہے۔ لیکن بندوں سے غلطی تو ہو جاتی ہے۔ اور پھر آغا جی نے مجھے معاف کر دیا تو اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔ بس سچے دل سے توبہ کرنی ہے۔''

''لیکن یہ ہوا کیوں......؟ کوئی بہت بڑی غلطی، اللہ کو ناراض کرنے والی کوئی بات تو میں نے کی ہوگی......؟ مجھے اس کو کھوجنا ہوگا اور اس پر اللہ کی بارگاہ میں توبہ پیش کرنی ہوگی۔''

''جو وعدہ میں نے کیا تھا، وہ مجھے یاد کیوں نہیں رہا......؟''

یہ تو اسے یاد تھا کہ وہ وعدہ کیا تھا......؟ مگر وہ اللہ کو ناراض کرنے والی بات کی جستجو میں تھی۔ اسے اس روز کی ہر بات، اپنا کیا ہوا ہر لفظ یاد کرنا ہوگا۔ مگر کیا اب وہ

اسے پوری طرح یاد آ سکے گا......؟

''ہاں......! اگر اللہ مدد کرے تو کچھ بھی ناممکن نہیں...... !''

اس نے دل اور سوچ کی گہرائی سے اللہ کو مدد اور رہنمائی کے لئے پکارا۔

اور اگلے ہی لمحے اس کا ذہن جیسے روشنی سے بھر گیا۔

وہ اسی دن کی اپنی اور عبدالحق کی گفتگو یاد کر رہی تھی۔

عبدالحق نے اس کی محبت کا اعتراف کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی منزل اللہ کی محبت ہے۔ اس لئے وہ نفس کی آزمائش میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اسی لمحے وہ اس کے لمس سے بھی ڈرنے لگا ہے۔ وہ ترکِ دنیا کی بات کر رہا تھا۔ اس سے محبت کے باوجود اس نے اسے چھوڑنے کا اشارہ بھی دیا تھا۔ تب اس نے وہ وعدہ کیا تھا۔

اسے ہر بات، ہر لفظ یاد آ گیا۔ اس نے عبدالحق کو بتایا کہ اس نے اللہ سے صرف اس کا شرعی ساتھ مانگا تھا، صرف اس کا نام مانگا تھا۔ اور اللہ کی کریمی کہ اس نے اسے سب کچھ دے دیا۔ اس کی محبت بھی، اور اس نے کہا تھا کہ اس پر میں عمر بھر اللہ کا شکر ادا کروں گی اور اس نے اللہ کو گواہ بنا کر اعلان کیا تھا کہ اس کی بیوی ہونا اور اس کی محبت حاصل ہونا اس کے لئے اتنا بڑا اعزاز ہے کہ اس سے زیادہ اسے کچھ چاہئے بھی نہیں۔ اور وہ بغیر کسی دباؤ اور اکراہ کے، خوش دلی اور محبت کے ساتھ اپنا ہر حق اس پر معاف کرتی ہے۔

عبدالحق نے اسے احسان کہا خود پر تو اس نے کہا تھا کہ محبت میں کوئی احسان نہیں ہوتا۔ اگر عبدالحق ایک بہت بلند مقام کی آرزو کرتا ہے تو وہاں پہنچنے میں اس کی مدد کرنا محبت کے حوالے سے بھی اور بیوی ہونے کی حیثیت سے بھی اس پر فرض ہے۔ وہ اسے ناکام ہوتے کیسے دیکھ سکتی ہے۔

اور آخری بات اسے لفظ بہ لفظ یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔

''جو محبت آپ کو مجھ سے اس وقت ہے، میرا اس پر بھی اصرار اور دعویٰ نہیں۔ وہ نہ رہے تو بھی میں اس پر آپ سے گلہ نہیں کروں گی۔ آپ میرے شوہر ہیں۔ یہ اعزاز میرے لئے کافی ہے۔ میں ہمیشہ آپ سے محبت کرتی رہوں گی۔ میں آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔''

اس وقت ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ وہ بہت بڑی بات کہہ رہی ہے۔ بشری کمزوریوں سے کون بچ سکتا ہے......؟ اور اس کے جواب میں اس نے سوچا تھا۔

''مجھے خود پر پورا بھروسہ ہے۔ مجھ ان سے کچھ بھی نہیں چاہئے۔ میں ان سے ہمیشہ محبت......''

ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور اس کے لئے سوچنا ممکن ہی نہیں رہا۔

شرمندہ تو وہ پہلے ہی تھی۔ اب شرمندگی اور تاسف میں شرابور ہو گئی۔ اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔

''یہ تو ہونا ہی تھا'' اس نے بہت افسوس اور ندامت سے سوچا۔

''میں نے تو جہالت کی حد کر دی۔ جو نوالہ آدمی کے ہاتھ میں ہو، اللہ کے اذن کے بغیر وہ اسے منہ میں لے جانے کا اختیار بھی نہیں رکھتا۔ جبکہ یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ اور میں نے خود پر بھروسہ کیا۔ یہاں تو اللہ پر بھروسہ کرنا، اس کی تائید اور مدد چاہنا ازبس ضروری تھا۔ میں نے بڑا ظلم کیا اپنی جان پر۔ جو کچھ ہوا میرے فکر و عمل کا منطقی نتیجہ ہے۔''

''آہ......! کاش آدمی کے اختیار میں ہوتا کہ وقت میں پیچھے جا کر کسی لمحے کو لوٹا کر اس میں اپنی اصلاح کر سکتا......؟ لیکن اللہ نے اپنی رحمت سے اس کا متبادل عطا فرما دیا ہے۔ صدقِ دل سے توبہ کر کے وہ اپنے اس عمل کو مٹا سکتا ہے۔''

مگر توبہ سے پہلے تو شکر لازم تھا۔ اگر اللہ نے مدد اور رہنمائی نہ کی ہوتی تو یہ باتیں اتنی تفصیل کے ساتھ لفظ بہ لفظ اسے یاد آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ اور یاد آ بھی جاتیں تو اس کی سمجھ میں اصل بات نہ آتی۔

وہ دل کی گہرائی سے اللہ کا شکر ادا کرتی رہی۔ پھر وہ آہستگی سے اٹھی، عبدالحق بے خبر سو رہا تھا۔

وہ وضو کر کے باہر آئی، مصلیٰ بچھایا اور نمازِ استغفار پڑھنے لگی۔

اور اللہ کی رحمت اس کے ساتھ تھی۔ اسے ایسی کیفیت عطا ہوئی، جس میں آدمی کا وجود دھل جاتا ہے۔ سجدوں کے درمیان وہ اتنا روئی کہ **مصلیٰ بھی تر ہو گیا۔**

سلام پھیرنے اور استغفار کرنے کے بعد اس نے سر اٹھایا تو وہ پہلے کی طرح ہلکی پھلکی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا اور کتنا برا ہوا......؟ اس نے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ اپنے تئیں اپنی ایک تذلیل کا ازالہ کرنے کے لئے اس نے اللہ کو بیچ میں لائے بغیر اپنے طور پر کوشش کی تھی اور اس کے نتیجے میں ذِلت کا ایک اور داغ اس کی عزتِ نفس کے دامن پر لگ گیا تھا۔

یہی تو اللہ کی رحمت ہے کہ وہ رجوع کرنے پر بندے کی ہر برائی کو مٹا دیتا ہے۔ بلکہ اس کی یاد بھی مٹ جاتی ہے۔

❀❀❀

عبدالحق اپنے تمام معمولات کے ساتھ آفس جانے کے لئے تیار ہوا۔ رات کا واقعہ اسے یاد تھا۔ وہ تمام وقت ارجمند کو اور اس کے ہر انداز کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ لیکن اس کے چہرے پر نہ کوئی کھنچاؤ تھا نہ تکدر، وہ ہر طرح سے نارمل تھی۔ اس کے طرزِ عمل میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ لئے وہ اس کے سارے کام کر رہی تھی۔ وہی خوش مزاجی، وہی محبت چھلکاتی آنکھیں۔

اسے اس پر پیار بھی آیا اور کچھ اپنی طرف سے زیادتی کا احساس بھی ہوا۔ لیکن اس سے بڑھ کر اسے حیرت تھی۔ رات جو کچھ ہوا، وہ اس کے لئے خلافِ توقع تھا۔ مطالبہ کرنا تو دور کی بات، اس سے پہلے ارجمند نے کبھی پہل بھی نہیں کی تھی۔

''ایسا کیا ہو گیا......؟''

اس نے سر جھٹکا۔ وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ تو فطری بات تھی۔

ارجمند اس کے لئے چائے لے کر آئی تو اس نے آہستہ سے اس سے سوری کہا۔

''سوری......! کس بات پر......؟'' ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

''رات کی بات پر۔''

''کون سی بات آغا جی......؟ رات کو ایسا کیا ہوا کہ جس کے لئے آپ کو سوری کہنا پڑے......؟''

عبدالحق کے دل و دماغ پر جو تھوڑا بہت بوجھ تھا، وہ ہٹ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ارجمند اس وقت نیند میں تھی، اور اب اسے وہ بات یاد بھی نہیں ہے۔

''کچھ نہیں......! آدمی کو کبھی کبھی سوری کہتے رہنا چاہئے......!'' وہ بولا۔

''مجھ سے تو آپ یہ لفظ کبھی نہ کہیں......کبھی نہیں......!''

''کیوں بھئی......!''

''اس سے مجھے شرمندگی کے سوا کیا ملے گا......؟ یہاں بھی اور آخرت میں بھی۔''

''تم عجیب لڑکی ہو......!''

''جیسی بھی ہوں، اب آپ کی ہوں۔ برداشت کر لیا کریں اور معاف کر دیا کریں......!''

عبدالحق نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''ایسا نہ کہو ارجی......! تم میرے لئے دُنیا کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ہو، جو اللہ نے اپنی کریمی سے مجھے عطا فرمائی ہیں۔''

''آپ کا یہ کہنا میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں۔''

عبدالحق کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں ارجی......!'' اس نے بے حد سچائی سے کہا۔

''اور سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے محبت کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ...!''

''الحمد للہ......! یہ اللہ کا فضل، اس کی عنایت ہے مجھ پر...... اور یہ میرے لئے اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت، سب سے بڑا اعزاز ہے۔'' ارجمند نے کہا اور ہوا کے جھونکے کی طرح وہاں سے چلی گئی۔

عبدالحق چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے رات کے واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔

''ارجمند کیسی بے سدھ، بے خود تھی، خود سپردگی کی اس کیفت میں اس کا

حسن اور بڑھ گیا تھا۔"

اسے افسوس ہونے لگا۔ اگر وہ اسے قربت کے چند لمحے دے ہی دیتا تو کیا جاتا......؟

لیکن وہ افسوس فوراً ہی ختم ہو گیا۔ اوّل تو اس میں ارجمند کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ اسے تو یہ سب کچھ یاد ہی نہیں ہے۔ دوسرے اس نے اللہ کو گواہ بنا کر اپنے ہر حق کی دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ اب اسے اس سے کچھ مانگنے کا حق نہیں۔

یہ آخری بات سوچتے ہوئے اس کے دل میں تلخی تھی۔

❁❁❁

اس روز ارجمند بھی اس واقعے پر سوچتی اور غور کرتی رہی۔

بنیادی بات تو اس کی سمجھ میں رات کو ہی آ گئی تھی۔ انسان، جس کے ساتھ طاقتور نفس لگا ہے، جو کمزور، جلد باز اور ناشکرا ہے، خود پر جب بھی بھروسہ کرے گا، زعم کرے گا تو ٹھوکر کھائے گا اور ذِلت پائے گا۔ اس کی فلاح تو اللہ پر ہی بھروسہ کرنے میں ہے۔

اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا اور وہی تو اسے جانتا ہے۔ اس کی تمام نفسانی پیچیدگیوں سمیت۔ اس نے تو بتایا کہ وہ کمزور، جلد باز اور ناشکرا ہے۔ اب وہ اپنے عمل کا تجزیہ کرے تو یہ بات سمجھ سکتی ہے۔ اللہ کا تو ہر فرمان برحق ہے۔

جو جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ بھی کہہ دے، کچھ بھی کر دے، وہ کمزور تو ہوا نا...... چاہے وہ جذبات اعلیٰ وارفع ہی کیوں نہ ہوں......؟ اور اللہ نے عہد کی پاسداری کو اہم قرار دیا اور بدعہدی کو گناہ۔ گویا سمجھا دیا کہ جذبات کے زیرِ اثر کسی سے کوئی عہد و پیاں اور وعدہ وعہد مت کرو۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھو کہ وہ تمہارے لئے قابلِ عمل ہے بھی کہ نہیں......؟ تم اسے نبھا بھی سکو گے یا نہیں......؟

اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ کو اپنی زندگی کے ہر پل میں شامل رکھو۔ اس کا خیال کبھی تمہارے قلب و ذہن سے جدا نہیں ہونا چاہئے۔

مطلب یہ کہ عقل کی کسوٹی بھی ناکام ثابت ہو سکتی ہے۔ تمہاری اور تمہارے عہد و پیاں کی عزت رکھنے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔ وفورِ جذبات میں کوئی وعدہ

کرنے لگو تو اللہ سے مدد اور رہنمائی طلب کرو، نیک انجام کے لئے اس پر بھروسہ، اور اسی سے امید رکھو۔

اور انسان جلد باز ہے۔

اس نے جذباتی ہو کر عجلت میں خود پر بھروسہ کرتے ہوئے عبدالحق سے ایک بہت بڑا اور بہت مشکل وعدہ کر لیا۔ اسے سوچنا چاہئے تھا کہ نفس کے ہوتے ہوئے وہ یہ وعدہ کیسے کر سکتی ہے......؟ ہار جائے گی۔ لازم تھا کہ وہ اللہ سے اس کے لئے تائید اور مدد چاہتی، اس سے استقامت طلب کرتی۔ نہ تو اس کے جذبے میں کوئی خرابی تھی اور نہ ہی وعدے میں۔ وہ تو ایک بڑے مقام کے حصول کی کوشش میں اپنے شوہر کی بہت خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ مدد کرنا چاہتی تھی۔ جلد بازی میں وہ اس میں اللہ کو شامل کرنا بھول گئی۔ اور جس چیز میں اللہ کا نام شامل نہ ہو، اور جس کام میں اللہ کو کارساز نہ بنایا جائے، اس میں خیر نہیں ہوتی۔

اور انسان ناشکرا ہے۔

اللہ نے اس کی حماقت، جلد بازی اور خود انحصاری کے باوجود، جو ایک طرح سے تکبر تھا، اس پر رحمت فرمائی۔ اس پر کرم کیا اور اسے استقامت عطا فرمائی۔ اس کے لئے اس کے نفس کو مغلوب کر دیا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ عبدالحق سے محبت کے باوجود وہ اس کی قربت کی خواہش اور تقاضا نہ کرتی۔ اللہ نے اسے بچایا۔ مگر اس نے اللہ کی اس عنایت کو سمجھا ہی نہیں تو شکر کیسے ادا کرتی......؟ یوں وہ ناشکرے پن کی مرتکب ہوئی۔

اور اللہ کی مدد کے باوجود وہ عہد شکنی کر بیٹھی۔ کیسے......؟

اب وہ سمجھ سکتی تھی۔ نفس طاقت ور بھی ہوتا ہے اور چال باز بھی۔ وہ چیزوں کو دوسرے رُخ سے دکھاتا ہے۔ اس رات جو کچھ ہوا، نفس نے اسے اس کی توہین و تذلیل باور کرایا، اسے عزتِ نفس کا مسئلہ بنا دیا۔ جبکہ درحقیقت وہ اس کی نسوانی انا تھی، جو مجروح ہوئی۔ نفس نے اسے ٹھیک طور پر تجزیہ کرنے ہی نہیں دیا اور شکایت لاشعور میں پہنچ کر اور زیادہ طاقت ور ہو گیا۔ اس کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا۔

اسے سوچنا چاہئے تھا کہ اپنے حق سے وہ تو اپنی خوشی سے دست بردار ہوئی

ہے۔ لیکن عبدالحق تو نہیں ہوا۔ پھر وہ اس کی بیوی ہے۔ عبدالحق کا اس پر حق اپنی جگہ، اسے تو ویسے بھی اس کی خوشی اور اس کی بہتری کا خیال رکھنا ہے۔ اگر کسی پریشانی میں، کسی بہت بڑے دباؤ، کسی سنگین بحران میں اسے دیکھے تو اس کی دل جوئی اس کا فرض بھی ہے۔ تو اس رات کی کسی بات پر اسے شکایت تو نہیں ہونی چاہئے۔

''الحمدللہ......!'' اللہ نے اس کی رہنمائی فرمائی۔ اس کے لئے اپنی غلطی کو سمجھنا ممکن بنایا۔ اسے تو یہ نصیب فرمائی اور اس کے نتیجے میں طمانیت اور سکونِ قلب عطا فرمایا۔

''الحمدللہ......!''

اس نے فیصلہ کیا کہ اب انشاءاللہ وہ عبدالحق سے کئے ہوئے وعدے کو ہمیشہ یاد رکھنے کی کوشش کرے گی اور اس سلسلے میں اللہ سے تائید اور مدد طلب کرتی رہے گی۔

❁❁❁

پھر ایک بہت بڑی خوشی عبدالحق کی طرف آئی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہونے کا سامان ہوا۔ حج پر جانے والوں کی فہرست میں اللہ کی مہربانی سے اماں کا، اس کا اور ارجمند کا نام بھی شامل تھا۔

لاہور سے زبیر بھائی کا فون آیا تو اسے حیرت ہوئی۔ وہ تو فون کرنے کے قائل ہی نہیں تھے۔

''کیسے ہیں زبیر بھائی......؟'' اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''آپ نے فون کیا، خیریت تو ہے......؟''

''سب خیریت ہے کاکا......!'' زبیر کے لہجے میں ہیجان تھا۔

عبدالحق سمجھ گیا کہ وہ بہت خوش ہیں۔

''یہ بتائیں کاکا......! آپ لوگوں کے حج پر جانے کا کیا ہوا......؟''

''الحمدللہ......! سب کا نام آگیا ہے۔''

''مجھے اور رابعہ کو بھی اللہ نے عزت بخشی ہے۔'' زبیر نے کہا۔

''مبارک ہو......! بہت بہت مبارک ہو بھائی......!''

''خیر مبارک کاکا......! تو ساتھ ہی چلیں گے۔''

''انشاءاللہ تعالیٰ......!'' عبدالحق نے کہا۔

''اور ساجد......؟''

''وہ یہیں رہے گا لاہور میں...... معاملات سنبھالتا رہے گا۔''

''یہ سب کر لے گا وہ......؟'' عبدالحق کے لہجے میں شک تھا۔

''اصل میں تو کاکا......! اب وہی سب کچھ سنبھالتا ہے۔ اللہ کی مہربانی سے وہ بہت سمجھ دار ہے۔ تعلیم بھی ہے اس کے پاس۔ مجھ سے اچھا سوچتا ہے، مجھ سے اچھے فیصلے کرتا ہے اور ان پر عمل بھی کرتا ہے۔'' زبیر کے لہجے میں خوشی تھی۔

''الحمدللہ......!''

عبدالحق بہت خوش تھا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو بالآخر پوری ہو رہی تھی۔

پھر وقت آیا تو زبیر اور رابعہ بھی کراچی آ گئے۔

''مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے کاکا......!'' زبیر نے کہا۔

''ڈر......! کس بات سے......؟''

''اللہ کا گھر...... اس کا دربار...... مجھے وہاں کے آداب نہیں آتے۔ جانے کہاں کچھ غلط کر دوں......؟''

''ارے زبیر بھائی......! معلم ہو گا نا...... آپ کے ساتھ......!''

''ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم آپ کے ساتھ ہی جائیں۔ آپ نے مجھے سہارا رہے گا کاکا......!''

ان لوگوں کی روانگی الگ الگ تھی۔ عبدالحق وغیرہ کو پہلے روانہ ہونا تھا۔

''آپ کیسی بات کرتے ہیں زبیر بھائی......!'' عبدالحق نے کہا۔

''اللہ کے گھر جانے میں کسی آسرے کا کیا کام......؟ ارے......! وہ مالک میزبان ہے تو سب آسان کر دے گا۔''

''ٹھیک کہتے ہیں کاکا......!'' زبیر نے کمزور آواز میں کہا۔

لیکن ساری کی ساری تیاریاں دھری رہ گئیں۔

جس دن طبی معائنے کے لئے جانا تھا، اس رات کو عبدالحق کی طبیعت خراب

ہوگئی۔ بخار ہوا اور پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے دانے نمودار ہو گئے۔ اس کے باوجود وہ اماں اور ارجمند کو لے کر معائنے کے لئے گیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے......؟

جسم کے دانے اور بڑے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''آپ تو حج پر نہیں جاسکتے......؟''

عبدالحق کو خود بھی یہی اندازہ تھا۔ وہ مایوس گھر لوٹ آیا۔ اس کی وجہ سے اماں اور ارجمند بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ کیونکہ وہی ان کا واحد محرم تھا اور اکیلی وہ جا نہیں سکتی تھیں۔

زبیر بہت اُداس ہوا۔

''میری تو سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کاکا...... ! کہ آپ کو قرعہ اندازی میں نام دینے کی کیا ضرورت تھی......؟'' اس نے کہا۔

''تو اور کیا کرتا......؟''

''ہوائی جہاز سے جاتے۔ بحری جہاز میں تو بہت دن لگتے ہیں پہنچنے میں۔''

''کئی باتیں ہیں زبیر بھائی...... ! ایک تو اللہ کے دربار میں اس کے عام بندوں کی طرح جانا چاہتا تھا۔ میں خاص کیوں بنوں وہاں......؟ جہاں آقا اور غلام سب برابر ہوتے ہیں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کاکا...... ! کہ کوئی کیسے بھی جائے...... اس دربار میں تو عام بندہ ہی رہے گا۔ کون خاص ہے......؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔'' زبیر کے لہجے میں عاجزی تھی۔

عبدالحق حیران رہ گیا۔ زبیر نے کتنی سادگی سے کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ لیکن بہرحال اس کا بھی اپنا ایک نظریہ تھا۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے بھائی...... !'' اس نے کہا۔

''لیکن میں سوچتا ہوں کہ نماز کے لئے اٹھنے والے ہر قدم پر اجر ملتا ہے۔ تو بیت اللہ شریف کے سفر میں ہر لمحے کا کتنا اجر ملتا ہوگا......؟ تو سفر طویل ہی اچھا۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ ہر دشواری کے بعد آسانی ہے۔ یعنی دشواری دنیا کی اور آسانی آخرت

کی۔ تو اس سفر کی تکلیف بھی اللہ کی رحمت۔''

''واقعی کاکا...... ! یہ بھی ٹھیک ہے......!'' زبیر نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

''سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ کی منظوری اور اجازت کے بغیر کوئی وہاں کیسے جاسکتا ہے......؟'' عبدالحق نے اداسی سے کہا۔

''اور میرے لئے اس کا حکم نہیں تھا۔''

''دل چھوٹا نہ کرو کاکا...... ! انشاء اللہ...... ! آپ کی آرزو بھی پوری ہوگی۔''

''انشاء اللہ تعالیٰ......!''

ایک ہفتے بعد زبیر اور رابعہ حج کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہ سب انہیں رخصت کرنے کے لئے گئے۔ سب اداس بھی تھے اور خوش بھی۔ خوش زبیر اور رابعہ کو ملنے والی سعادت پر اور اداسی اپنی محرومی پر۔

لیکن عبدالحق زبیر کی بات پر غور کرتا رہا۔ زبیر نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ وہ اماں اور ارجمند کو ساتھ لے کر بھی ہوائی جہاز سے جا سکتا تھا۔

''کون جانے...... اللہ کو یہ بات پسند نہ آئی ہو۔ کون جانے......؟'' اس کی سوچ میں کوئی خرابی ہو، دل کی کوئی تنگی ہو۔ اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔

اس نے فضائی سفر کا ارادہ کر لیا۔ ہوائی جہاز سے زیادہ لوگ نہیں جاتے تھے۔ بغیر کسی دشواری کے اسے ٹکٹ بھی مل گئے اور اجازت نامے بھی۔

لیکن روانگی سے ایک دن پہلے پھر وہی سب کچھ ہوا۔ وہی بخار، وہی دانے، جیسے چیچک نکل رہی ہو۔

اس بار وہ ڈھیر ہو گیا۔ تنہائی میں چھپ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ایک بار پھر اسے احساس ہونے لگا کہ اس کا ربّ اس سے ناراض ہے۔ اسی لئے اس کے دربار میں حاضری کی اجازت نہیں مل رہی ہے۔

استغفار کے سوا وہ سب کچھ بھول گیا۔

اس بار ارجمند اس کی کیفیت کو پوری طرح سمجھ رہی تھی۔ اس نے اسے

سمجھانے کی کوشش کی۔

''اللہ کے ہاں ہر چیز کا وقت مقرر ہے آغا جی......!'' اس نے کہا۔

''وقت سے پہلے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور وقت آنے پر سب کچھ بغیر کسی امکان کے بھی ہو جاتا ہے۔''

عبدالحق نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اب اللہ کے حکم کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بندے کا کام تو خوش دلی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔''

''اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں......؟''

''مگر یہ خوش دلی تو نہیں...... آپ تو سراسر اداس اور غمگین ہیں۔''

''ہوں......! مگر اس محرومی پر نہیں...... جانتا ہوں کہ یہ شرف اس کی اجازت کے بغیر نہیں ملتا۔ دل میں اگلے سال کی امید روشن کر لی ہے۔''

''تو پھر یہ اداسی کیسی......؟''

''یہ اس لئے ہے کہ اللہ مجھ سے ناراض ہے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں......؟''

''میں جانتا ہوں نا...... اس لئے......!''

''بری بات آغا جی......! یہ گمان اچھا نہیں...... اللہ ایسی آسانی سے کسی سے ناراض نہیں ہوتا۔''

عبدالحق جھنجلا گیا۔

''جب تمہیں معلوم ہی نہیں تو کیسے سمجھ سکتی ہو یہ بات......؟''

''تو مجھے بتائیں......! میں آپ کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتی۔''

اور عبدالحق نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ اپنی پریشانی میں کسی کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ اور ارجمند سے بہتر کون اسے مل سکتا تھا۔ ورنہ اسے لگتا تھا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔

ارجمند سب سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

کچھ دیر ہوئی تو عبدالحق سے صبر نہ ہو سکا۔

''اب کچھ بولو نا......!''

''پوری طرح سے ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''سیدھی سی بات ہے۔ اللہ بندے کو بہت بڑی سعادت عطا فرمائے اور بندہ اس سے منہ موڑ لے تو اور کیا ہوگا......؟''

''لیکن عمل کا دارومدار نیت پر ہے...... اور اللہ نیت کا حال جانتا ہے۔''

''بے شک......! لیکن میں تو اپنی نیت کو درست طور پر نہیں سمجھ سکتا۔''

''آپ تو اپنے ایک غریب ماتحت کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔''

وہ مقدمے جیسی صورتِ حال بن گئی۔ عبدالحق اپنے خلاف استغاثہ پیش کر رہا تھا اور ارجمند اس کی وکیل صفائی تھی۔

''مگر وہ اللہ کا بلاوا تھا میرے لئے...... میں نے بے نیازی ظاہر کی، جو صرف اللہ کو سزاوار ہے۔ میں نے سوچا کہ میں تو اپنے طور پر بھی یہ سعادت حاصل کر سکتا ہوں۔ میں غلطی پر تھا، اور یہ بات اب ثابت ہو رہی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اللہ سب جانتا ہے۔ میں نے اپنے تئیں جسے ایثار سمجھا، وہ درحقیقت بے نیازی اور تکبر ہوگا، جو اللہ کے ہاں قطعی ناقابل قبول ہے۔ بڑائی اور بے نیازی تو اللہ کے وہ اوصاف ہیں، جو صرف اس کے لئے ہیں۔''

ارجمند بھی اس کے استدلال سے گھبرا گئی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ یہ اس کے محبوب شوہر کی فلاح کے لئے بہت اہم معاملہ تھا۔

''چلئے......! آپ نے ایسا کہا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن قصداً تو نہیں کیا...... سہواً کیا نا......!''

''اس سے کچھ فرق پڑتا ہے......؟'' عبدالحق نے اسے چیلنج کیا۔

''کیوں نہیں......؟ اللہ کی رحمت ایسی ہے کہ بندہ نیکی کا ارادہ کرے تو اس کے نامہ اعمال میں درج ہو جاتی ہے۔ اس پر عمل کی طرف قدم اٹھائے تو پھر درج کر لی جاتی ہے۔ تبھی تو ایک نیکی پر دس نیکیوں کا اجر ملتا ہے، وہ بھی کم سے کم۔ لیکن بندہ ہزار برائیوں کا قصد کرے تو اس کے نامہ اعمال میں نہیں لکھا جاتا، جب تک کہ وہ اپنے ارادے پر عمل نہ کرے۔ مواخذے پر نہیں، عمل پر ہوتا ہے۔''

"مگر میں نے تو عمل کیا نا......؟" عبدالحق نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

"لیکن وہ عمل برا کب تھا......؟"

"ارے......! بے نیازی اور تکبر سے بڑی کوئی برائی ہو سکتی ہے......؟" عبدالحق کی آواز رندھ گئی۔

"جس نیکی کے پیچھے یہ دو عوامل کارفرما ہوں، کیا اللہ اسے نیکی کے طور پر قبول فرمائے گا......؟ ہرگز نہیں......!"

"یہ آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہیں......؟"

"تم بھول رہی ہو کہ جسے میں نے اپنی جگہ حج پر بھیجنا چاہا، وہ حج پر نہیں جا سکا۔ تو میرا نام نہاد ایثار اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوا نا......؟ اس لئے کہ اس کے پیچھے بے نیازی اور تکبر تھا۔"

ارجمند کو محسوس ہوا کہ وہ ایک راؤنڈ ہار گئی ہے۔

"چلئے...... یہ بھی ٹھیک ہے۔ ویسے حقیقت صرف اللہ جانتا ہے۔ ہم تو صرف گمان اور قیاس پر بات کر رہے ہیں۔"

"ثبوت سامنے ہوں تو حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ کوئی بات گمان اور قیاس نہیں رہتی۔"

"ٹھیک ہے......! لیکن آپ کو احساس ہو گیا تو آپ دل سے شرمندہ ہوئے، آپ نے استغفار کیا، توبہ کی اور اللہ توبہ قبول فرمانے والا ہے۔"

"بے شک......! لیکن صرف سچی توبہ...... ہر توبہ تو قبول نہیں ہوتی۔"

"آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ آپ کی توبہ قبول نہیں ہوئی......؟ آپ نے تو نہایت شرمندگی کے ساتھ، سچے دل سے توبہ کی تھی۔"

"وہ میرا گمان تھا۔ میں یقین سے کیسے کہہ سکتا ہوں......؟"

"حالانکہ اس کے بعد اللہ نے آپ کو سکونِ قلب عطا فرما دیا تھا۔"

"وہ تو میں اپنے بیٹے کو نظر انداز کر کے ایک طرف اس کے حقوق سے غفلت برت رہا تھا اور دوسری طرف کفرانِ نعمت کر رہا تھا۔ اور دعویدار تھا اللہ کی محبت کا۔ وہ تو اس کی سزا تھی۔ اللہ نے تمہارے ذریعے رہنمائی فرمائی، میں نے بیٹے کو خوش کیا تو اللہ

نے سکون عطا فرما دیا۔"

"تو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی توبہ حج کے سلسلے میں قبول نہیں ہوئی......؟"

"قبول ہوئی ہوتی تو ہم اس وقت یہاں نہ ہوتے۔ مجھے حج سے روک نہ دیا گیا ہوتا......؟"

"میرے خیال میں آپ کی سوچ درست نہیں ہے آغا جی......!" ارجمند نے کہا۔

"جو لوگ اللہ پر بہتان باندھتے ہیں، اور شرک کرتے ہیں، اللہ ان پر حد درجہ غضب ناک ہوتا ہے۔ وہ بھی توبہ کریں، ایمان لے آئیں اور نیک اعمال کریں تو اللہ انہیں بخش دیتا ہے۔ آپ تو ایمان والے ہیں اور آپ نے بلاارادہ خطا بھی نہیں کی۔ میں نہیں سمجھتی کہ اللہ آپ کو معاف نہیں کریگا۔ بلکہ میں یہ بھی نہیں سمجھتی کہ آپ کو معاف نہیں کیا گیا ہے۔ آپ کا یا کسی کا بھی حج پر جانا یا نہ جانا اللہ کی مرضی سے ہے۔ جب اس کا حکم ہوگا، چلے جائیں گے۔ اور جب تک حکم نہیں ہوتا، کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"بے شک......! لیکن میں نے کہا نا کہ ہر توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اپنے بارے میں جو میں نہیں جانتا، اللہ جانتا ہے۔ اسے ہمارے سچ اور جھوٹ کا پتا ہے۔ تبھی تو ہر توبہ قبول نہیں ہوتی۔"

ارجمند کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اسے نہیں سمجھا سکے گی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ بندے اور اس کے ربّ کے درمیان معاملہ ہے۔ اسے خوشی ہوئی کہ عبدالحق اللہ سے اتنا ڈرتا ہے۔ یہ اس پر اللہ کی نوازش اور عنایت کا ثبوت تھا۔ تقویٰ بندے کے بس کی بات نہیں۔ وہ تو اللہ عطا فرماتا ہے۔ اس نے یہ بات عبدالحق کو بتائی بھی نہیں کہ ایسی باتیں جو صرف محسوس کی جا سکتی ہیں، جن کا آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا، بتائی نہیں جا سکتیں۔ ویسے بھی آدمی بہت آسانی سے غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور غرور ہر بھلائی کو کھا جاتا ہے۔

"کیا ہوا......؟ کوئی دلیل نہیں رہی تمہارے پاس......؟" عبدالحق کے لہجے میں خوف اور التجا کا امتزاج تھا۔ بظاہر وہ طنزیہ بات تھی۔ لیکن درحقیقت اس میں خوف چھپا تھا کہ جیسے امکان کا آخری دروازہ بھی بند ہو گیا ہو۔

"جی نہیں......!" ارجمند نے بہت اعتماد سے کہا۔

"میں اب اس لئے کچھ کہنا نہیں چاہتی کہ آپ اس سے اختلاف کریں گے، اسے رد کریں گے اوراس میں آپ کا نقصان ہوگا، جو مجھے گوارہ نہیں ہوگا۔"

"تم مجھے منجدھار میں چھوڑ رہی ہو ارجمند......!" عبدالحق نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

ارجمند تڑپ گئی۔

"پھر میں آخری بات کہوں گی۔ لیکن پہلے آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"بولو......!"

"آپ اس سے اختلاف نہیں کریں گے، بلکہ آپ اس پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ ہاں......! آپ اس پر غور کرتے رہیں گے۔"

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں......!"

"میں کچھ بھی نہیں جانتی، لیکن تقدیر پر میرا ایمان ہے۔ تقدیر اللہ کی قدرت اوراس کا فیصلہ ہے، جو روزِ ازل ہی لوحِ محفوظ پر لکھ دیا گیا۔ آپ اپنے حج کے معاملے کو اس کی روشنی میں دیکھیں اور قبول کریں۔ اور یاد رکھیں کہ اللہ قادرِ مطلق ہے۔ لہٰذا دعا سے تقدیر بھی بدل سکتی ہے۔"

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ کیسے بچوں کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔ اسے اس پر پیار آنے لگا۔ اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور مسکرانے لگا۔ کئی دن بعد وہ ایسے مسکرایا تھا۔

"تم بھی میرے لئے دُعا کروگی نا......؟" اس نے پوچھا۔

"ہمیشہ کرتی ہوں...... الحمدللہ......! لیکن اب اس کے لئے خاص طور پر دُعا کیا کروں گی۔"

"جزاک اللہ......!"

"اور دادی اماں سے بھی کہوں گی کہ وہ بھی یہ دُعا خاص طور پر کیا کریں۔"

"شکریہ ارجی......!"

"شکریے کی اس میں کیا بات آغا جی......؟ اس میں ہماری غرض بھی ہے۔ آپ کے ساتھ ہمیں بھی توجہ کی سعادت ملے گی انشاء اللہ......!"

❀❀❀

عبدالحق ارجمند کی بات پر غور کرتا رہا۔ علامہ اقبال نے کہا تھا...... نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں...... صرف نگاہ سے......! لیکن بندۂ مومن ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ بہت بڑا اعزاز ہے۔ تو عام اہلِ ایمان بلکہ مسلم کی دُعاؤں سے بھی تقدیر بدل سکتی ہے۔

اسے سورۂ حجرات کی آیت مبارکہ یاد آئی جس میں اللہ نے مومن اور مسلم کا فرق بتایا تھا۔ جن پر اللہ نے رحمت کی اور انہوں نے اسلام قبول کیا، وہ مسلم تھے۔ مومن تو بہت بعد کا مرحلہ ہے۔ دل میں ایمان داخل ہونا اور پھر اس کا بڑھتا جانا، آدمی زبان سے اور دل سے ایمان کا اعلان کرتا ہے لیکن دل میں ایمان ہوتا نہیں۔ وہ محض مسلم ہوتا ہے۔ فرمانبردار، جسے بتایا گیا اور اس نے مان لیا۔ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خود کو مومن سمجھ لے۔ یہ فیصلہ تو صرف اللہ ہی کرتا ہے کہ کون مومن ہے اور کون نہیں......؟

اللہ تعالیٰ نے دعا کی صورت بہت بڑی نعمت عطا فرمائی اپنے بندوں کو۔

اس نے پڑھا تھا کہ صدقہ موت کو دور کرتا ہے اور دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے۔ لیکن اہمیت وقت کی ہے۔ عمر بھر صدقہ نہ کرو اور آخر وقت میں صدقہ کرو تو اس کا اجر تو ہوگا۔ لیکن مدعا پورا نہیں ہوگا۔ جیسے توبہ کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ موت سے ایک گھنٹہ پہلے بھی توبہ نصیب ہو جائے تو گمراہی کی طویل زندگی بھی پاک ہو جائے۔ لیکن نزع کا وقت آجائے، آدمی کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے جائیں، حقیقت سامنے آجائے تو توبہ قبول نہیں ہوتی۔

اور بنیادی بات اللہ کا حکم اور اس کی قبولیت۔ اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔

اچانک اسے شفیق صاحب کا خیال آگیا۔ وہ جوتشی، جس نے اس کی پیدائش پر اس کا زائچہ بنایا تھا۔ پھر اللہ نے اس پر رحمت کی اور وہ مسلمان ہوگیا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے زائچے میں بیرونِ ملک سفر ہے ہی نہیں۔

کیا یہ تقدیر ہے......؟

اسے ایک اور بات یاد آئی۔ شفیق صاحب نے اس کی دوسری شادی کی پیش گوئی کی تھی، جبکہ اس کا نہ ایسا ارادہ تھا اور نہ ہی دور دور تک ایسا کوئی امکان۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اس کی ارجمند سے شادی ہوگئی۔ اور نور بانو، جو اس کے قریب عورت تو کیا، کسی بچے کا سایہ بھی برداشت نہیں کرتی تھی، اس نے خود اصرار اور خوشامد کر کے اسے اس شادی پر رضامند کیا تھا۔

''کیا وہ تقدیر تھی......؟''

شفیق صاحب نے بغیر دیکھے اور بغیر کسی حوالے کے اس کی پہلی بیوی کا جو نقشہ بیان کیا تھا، وہ بعینہ نور بانو کا تھا۔ اس میں ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ اور انہوں نے دوسری بیوی کا جو نقشہ بیان کیا تھا، ارجمند اس کے عین مطابق تھی۔ حالانکہ جس وقت کی وہ بات تھی، اس وقت یہ تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی شادی ارجمند سے ہو سکتی ہے۔ اس نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔

مگر شفیق صاحب کی آگے کی باتیں غلط ثابت ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ پہلی بیوی سے اسے اولاد نہیں مل سکے گی۔ جبکہ نور بانو دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اسے نورالحق کا تحفہ دے کر گئی تھی۔

اور انہوں نے کہا تھا کہ دوسری بیوی سے اس کے دو بیٹے ہوں گے۔ اور دوسرا بیٹا پہلے بیٹے کے دس سال بعد پیدا ہوگا۔ جبکہ یہاں ارجمند سے ابھی تک اس کے ہاں اولاد ہی نہیں ہوئی تھی۔

اس کے دل میں امید سی جاگی۔ شفیق صاحب کی ایک بات غلط ہو سکتی ہے تو دوسری کیوں نہیں ہو سکتی......؟ اور خود انہوں نے کہا تھا کہ علم تو سارے کا سارا اللہ کا ہے۔ اور بندے کے حساب میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اللہ کی رہنمائی اور حکم کے بغیر وہ کچھ بتا ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ اللہ سے رہنمائی طلب کرتے ہوئے ہی آغاز کرتے ہیں۔

بہر حال ارجمند سے بات کرنے اور شفیق صاحب کی پیش گوئیوں پر غور کرنے کے نتیجے میں اس کے دل کا بوجھ بڑی حد تک کم ہوگیا۔ دل کو کسی حد تک تسلی

ہوئی اور اس کا فرسٹریشن خاصا کم ہوگیا۔

لیکن اگلے چند روز میں اسے احساس ہوگیا کہ مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ پہلی بار اسے پتا چلا کہ ایمان کی طرح فرسٹریشن بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ وہ بالکل ختم ہوگیا ہے اور کبھی وہ انتہا کو پہنچ جاتا تھا۔

مگر ایک بات تھی۔ پچھلی بار کا سبق اس نے بہت اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ فرسٹریشن اور مایوسی کسی حد کو بھی جا پہنچے، وہ اسے اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا تھا۔ نورالحق کے معمولات میں کبھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ صدقہ و خیرات اپنی جگہ۔ کسی بھی شخص کی پریشانی سامنے آئے تو وہ سب کچھ بھول کر اس کی مدد کرتا۔ وہ سوچتا تھا کہ اسے دو پہلوؤں سے محنت کرنی ہے۔ ایک تو اللہ کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کرنی ہے، اور دوسرے اسے مزید ناراض کرنے سے بھی بچنا ہے۔ یہ دوسرا کام بھی کچھ کم اہم نہیں تھا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرسٹریشن صرف رات کی چیز بن کر رہ گیا۔ دن میں تو اس کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ البتہ رات کی تنہائی میں وہ سر اٹھاتا۔

اللہ سے محبت کا تصور تو خواب و خیال بن کر رہ گیا تھا۔ یہ خیال آتا تو وہ حقارت سے خود پر ہنستا۔

''اپنی اوقات میں رہو عبدالحق......!'' وہ خود سے کہتا۔

''محبت کرنے چلے ہو...... پہلے بندگی تو کر لو ڈھنگ سے...... وہ ناراض ہے...... اسے راضی تو کر کے دکھاؤ......!''

وہ کثرت سے درود پڑھتا، استغفار کرتا، اسم ذات کا ورد کرتا، اللہ کو اس کے ناموں سے پکارتا، گڑگڑاتا کہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔

اس پر بھی ارجمند سے کئی بار اس کی بات ہوئی۔

''یہ تو آپ کا مفروضہ ہے کہ اللہ آپ سے ناراض ہے۔'' وہ کہتی۔

''میرا دل مجھے بتاتا ہے۔'' وہ سادگی سے جواب دیتا۔

''اللہ ناراض ہوتا تو اس کی کوئی علامت آپ کے معاملات میں دکھائی دیتی۔''

"وہ تو انکار کرنے والوں کو بھی نوازتا ہے۔ میں تو پھر اس کا ماننے والا ہوں۔ دنیاوی پریشانیوں یا خوش دلی پر اس کی خوشنودی اور ناراضی کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔" عبدالحق دلیل دیتا۔

اور ارجمند لاجواب ہو جاتی۔ مگر اسے تو عبدالحق کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ کہتی۔

"دنیا میں اس کا ثبوت دل ہی تو ہے۔ وہ ناراض ہو تو دل رجوع کرنے والا نہیں رہتا، دنیا کی طرف راغب اور اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔"

عبدالحق چپ ہو جاتا۔

"بتائیے نا...... کیا آپ کا دل ایسا ہو گیا ہے......؟" ارجمند اصرار کرتی۔

"الحمدللہ......! ایسا تو نہیں ہے۔"

"تو پھر ثابت ہو گیا کہ وہ آپ سے ناراض نہیں ہے۔"

"لیکن دل ہی تو مجھے بتاتا ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہے۔"

"عجیب منطق ہے۔" ارجمند جھنجلائے بغیر کہتی۔

"غلط تو نہیں ہے نا......؟"

"مگر کوئی علامت تو نظر آئے......!"

"نظر آتی ہے...... صاف نظر آتی ہے۔"

"مجھے بھی بتائیں......!"

"جن سے اللہ راضی ہوا...... ان کے لئے فرمایا کہ نہ انہیں کوئی خوف ہو گا نہ غم......!"

"مطلب......؟"

"مجھ پر بغیر کسی ظاہری، دنیاوی وجہ کے خوف اور غم دونوں کا حملہ ہوتا ہے...... وہ بھی وقتاً فوقتاً......!"

"نہیں آغا جی......! یہ غلط بات ہے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ نے فرمایا کہ وہ آزمائش کریں گے جان و مال میں خسارے میں مبتلا کر کے، میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ خوف اور غم سے پاک ہونے والی بات آخرت کے لئے ہے، واللہ اعلم......!"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو......!" عبدالحق نے فوراً ہی مان لیا۔

"لیکن میرا حج پر نہ جا سکنا، مجھے اس بات کا یقین دلاتا ہے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا نا...... کہ......"

"میں کوشش کرتا ہوں ارجی......!" عبدالحق نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

ویسے یہ حقیقت تھی کہ وہ خود کو باور کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ اگر اللہ نے اس کے لئے حج کی سعادت نہیں لکھی تو اس میں کوئی تبدیلی صرف اللہ ہی لائے گا۔ کوئی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ بالکل سیدھی سی بات تھی۔ اگر سرکاری طور پر حج پر جانے کا وہ موقع اس نے نہ کھویا ہوتا تو وہ بلاتردد اس بات کو تسلیم کر لیتا۔ اور یہ اس کے لئے مسئلہ نہ رہتا۔ اس بات کی وجہ سے یہ اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ اللہ اس سے ناراض ہے اور اللہ نے اسے روک دیا ہے۔

اس نے اس بات پر بہت غور کیا۔ ظاہری طور پر تو اللہ کی ناراضی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اللہ کے فضل سے وہ اچھے کام بھی کر رہا تھا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھنے کی بساط بھر کوشش بھی کر رہا تھا، اور یہ اللہ کے فضل کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

لیکن اس کی ہر دلیل کا دل کے پاس ایک یہ جواب تھا۔ اس نے حج کے معاملے میں بے نیازی اور تکبر سے کام لے کر اللہ کو ناراض کر دیا۔ اب وہ کبھی وہاں نہیں جا سکے گا، کیونکہ اللہ اس سے ناراض ہے۔

تاہم ارجمند کی تقدیر والی بات اس کے لئے سہارا بن گئی۔ ورنہ وہ مایوسی اس کے لئے مستقل طور پر مصیبت بن جاتی۔ اب اس پر کبھی کبھی شدید مایوسی کے وقتی دورے ضرور پڑتے تھے۔ لیکن کچھ دیر بعد...... زیادہ سے زیادہ ایک دو دن کے بعد از خود ان سے نجات مل جاتی تھی۔ یہ الگ بات کہ وقتی مایوسی کے وہ دورے بہت اذیت ناک ہوتے تھے۔

اس شام اس پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی۔ اس کیفیت میں وہ گریہ سے محروم ہو جاتا تھا۔ جی چاہتا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے، خود کو ہلکان کر لے۔ لیکن آنکھوں

میں نمی بھی نہیں اترتی تھی۔

اس رات اس نے ایک اور فیصلہ کیا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اللہ سے محبت کرے۔ لیکن اتنی اس کی اوقات نہیں۔ ارے...... اس سے تو روٹھے ہوئے رب کو منایا بھی نہیں جاتا۔ اور دوسرے زاویے سے دیکھو تو...... ایں سعادت بزورِ بازو نیست...... اللہ ہی خوش ہو کر عطا کر دے تو الگ بات۔ ورنہ یہ بندے کے بس کی بات کہاں......؟ اور اس کے بس کی تو یہ بات ہے ہی نہیں۔

تو پھر وہ کیا کرے......؟ زندگی کا اب یہی ایک مقصد تھا۔

جواب بھی ذہن میں آ گیا۔ اسے تو بس پورے خلوص اور یکسوئی کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرنی ہے۔ الحمدللہ......! اللہ نے اسے ایمان کے دائرے میں داخل فرمایا، اسے نماز قرآن کی رغبت اور محبت عطا فرمائی۔ اب اسے نیک اعمال کی طرف توجہ دینی ہے۔ ہر کام اللہ کو خوش کرنے کی نیت سے کرنا ہے۔ اللہ کا ہر حکم ماننا ہے۔ اور اللہ نے فرمایا کہ رسول صلی اللہ علیو وسلم جو عطا فرمائے، خوشی سے لے لو اور جس چیز سے روکے، اس سے رُک جاؤ۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم ماننا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنی ہے۔ اگر اس کوشش میں خلوص ہوا اور اللہ کو پسند آیا تو بیڑہ پار ہے۔ اللہ چاہے تو اپنی محبت بھی عطا فرما دے گا۔

لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے لئے اللہ سے دعا کرنی ہوگی کہ اس کے اذن اور عطا کے بغیر وہ کسی خیر، کسی بھلائی، کسی نیکی تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس نے دو رکعت نماز قضائے حاجت کے لئے ادا کی اور دُعا مانگی۔ اور فوراً ہی جیسے دل و دماغ پر سے ہر بوجھ ہٹ گیا۔ گہری مایوسی مکمل طور پر چھٹ گئی۔

اب تک اس کا مایوسی کا کوئی دورہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے نہیں ٹلا تھا۔

وہ خواب گاہ میں آیا۔ اندھیرا کر کے وہ سونے سے پہلے کے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ سونے کے لئے لیٹتے ہوئے اس کی نظر ارجمند کے چہرے پر پڑی، جو چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ ترشے ہوئے نقوش، وہ سراپا۔ وہ بلاشبہ اللہ کی عطا کی ہوئی بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ سوچتا رہا۔

''اللہ کیسا مہربان...... فضل عظیم کا مالک ہے۔ کیسی کیسی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔''

یہ سوچتے ہوئے اس کے دل میں رغبت جاگی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور انگشت شہادت سے ارجمند کے چہرے کے ہر خط کو گویا ٹٹولنے لگا۔ ہونٹوں پر پہنچ کر اس کی انگلی میں لرزش پیدا ہو گئی۔ وجود میں جذبات اور خواہشیں سر اٹھا رہی تھیں۔

اس نے نورالحق کو مسہری کی دیوار کے ساتھ والے حصے میں منتقل کر دیا۔

ارجمند کسمسانے لگی۔ پھر اس کی آنکھیں نیم وا ہوئیں اور اس کے جسم میں حدتیں جاگنے لگیں۔ وہ کھسک کر اس کے اور قریب ہو گئی۔

ایک لمحے کو عبدالحق جھجکا۔

''سوری ارجی......! میں نے تمہاری نیند خراب کی۔'' اس نے کہا۔ لیکن جذبات سے بوجھل اس کی آواز لرز رہی تھی۔

ارجمند پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔

''کیسی بات کرتے ہیں آپ......؟'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''آپ کا مجھ سے سوری کہنے کا رشتہ نہیں...... مجھ پر ہر طرح کا حق ہے آپ کا......!''

''لیکن ارجی......!''

''میں آپ کے حق کی راہ میں بے دلی سے بھی کام لوں تو گناہ گار رہوں گی۔'' یہ کہہ کر ارجمند نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

اس کے بعد عبدالحق کو سوچنے اور سمجھنے کا یارا ہی نہیں رہا۔ وہ تو ایک خوب صورت خواب تھا۔

❀❀❀

ارجمند کے لئے بھی وہ بہت خوب صورت خواب تھا۔

عبدالحق محبت سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ ویسے تو پچھلی بار بھی اس نے سوتے ہوئے اسے جگایا تھا لیکن اس وقت بات بالکل مختلف تھی۔ شاید اپنی اس وقت کی کیفیت کو عبدالحق خود بھی نہیں سمجھ سکا ہوگا۔ ارجمند نے سمجھنے کی بہت کوشش کی تھی۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس وقت عبدالحق کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ وہ مایوسی کی انتہاء کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ شدید بے بسی اور احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ اپنا وجود اسے بے حقیقت اور بے مصرف لگ رہا ہوگا۔ وہ شاید اس کی طرف بڑھا تو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ کچھ اختیار رکھتا ہے، بہت کچھ کرسکتا ہے۔ اپنے جیسے کسی انسان کو تسخیر کر لینا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ وہ اپنی طاقت اور اقتدار کا مظاہرہ کر کے اپنا اعتماد بحال کرنا چاہتا ہوگا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوگا کہ جسے وہ تسخیر کرنے کے نام پر روند رہا ہے، وہ تو پہلے ہی سے مسخر ہے۔

اور ہوا کیا۔ اس نے اسے بھی زخمی کر دیا اور اپنا مقصد بھی حاصل نہیں کر سکا۔

لیکن اس بار کی بات اور تھی۔ اس نے بڑی نرمی اور محبت سے اسے چھوا تھا۔

پچھلی بار وہ بھڑک کر جاگی تھی اور ڈر گئی تھی، جیسے کسی طوفان کی لپیٹ میں آ گئی ہو۔ لیکن اس بار پوری طرح جاگنے سے پہلے ہی اس کے ذہن کو خوش گواریت کا احساس ہوا تھا۔ جسم میں مہکتی ہوئی حدت جاگ اٹھی تھی اور وہ جبلی طور پر اس کے اور نزدیک ہوگئی تھی۔

پھر پچھلی بار عبدالحق نے کبھی اس سے معذرت نہیں کی۔ شاید اسے بھی زیادتی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ لیکن اس بار تو اس نے اس کی نیند خراب کرنے پر معذرت کی۔

وہ ارجمند کے لئے دہری خوشی تھی۔

عبدالحق کی قربت، اس کا التفات اور اس کی محبت ویسے ہی اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ لیکن یہاں تو عزتِ نفس پر لگے پچھلی بار کے زخم کا مداوا ہو رہا تھا۔ وہ زخم، جس کی ٹیسیں اسے ستاتی رہی تھیں، جسے مندمل کرنے کی کوشش میں اس نے ایک اور زخم کھا لیا تھا، کچھ اور حقیر ہوگئی تھی۔ بلکہ عہد کی پاسداری نہ کرنے کا جرم بھی اس کے نامہ اعمال میں شامل ہوگیا تھا۔

اللہ نے اپنی عنایت سے اس رات سب کچھ دھو ڈالا۔ اس رات میں اسے کیا کیا کچھ حاصل ہوگیا...... کیف و انبساط، دل اور روح کی طمانیت، جسم کی آسودگی، ذہن کا سکون اور اپنے وجود اور عبدالحق سے اپنے تعلق کا اثبات۔ سبھی کچھ مل گیا تھا

اسے۔

عبدالحق تو بے سدھ ہو کر سو گیا۔ اس کے لئے تو سونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے تو ابھی اللہ کا شکر ادا کرنا تھا۔

اس نے غسل کیا اور شکر کے دو نفل ادا کئے۔ پھر اس نے وقت دیکھا۔ سردی کی راتیں لمبی ہوتی ہیں۔ اس کے پاس سونے کے لئے اچھا خاصا وقت تھا۔ تاہم احتیاطاً اس نے الارم لگایا اور سو گئی۔

لیکن ہمیشہ کی طرح الارم سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

تہجد کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے عبدالحق کے لئے گرم پانی کا اہتمام کیا اور پھر عبدالحق کو جگایا۔

عبدالحق نے اٹھتے ہی گھڑی دیکھی اور شکایتی لہجے میں بولا۔

”تم نے دیر سے کیوں اٹھایا مجھے......؟ میں تہجد سے محروم ہوگیا۔“

ارجمند کو خود پر حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق کا تہجد کا معمول بن گیا ہے۔ نہ جانے کیوں اسے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔

”مجھے معاف کر دیں آغا جی......! خیال ہی نہیں رہا بالکل......!“ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

عبدالحق باتھ روم میں چلا گیا۔ ارجمند فجر کی اذان کا انتظار کرنے لگی۔

اچانک عبدالحق نے چیخ کر اسے آواز دی۔ اس کی آواز بری طرح لرز رہی تھی اور لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

ارجمند باتھ روم کے دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ بند ہی تھا۔

”کیا ہوا آغا جی......؟“

”پانی بالکل ٹھنڈا ہے، جیسے پگھلی ہوئی برف......!“ عبدالحق نے دروازے کے پیچھے سے بمشکل کہا۔ لگتا تھا کہ اس کے دانت بج رہے ہیں۔

ارجمند کو حیرت ہوئی۔ عبدالحق عام طور پر پانی زیادہ گرم ہونے کی شکایت کرتا تھا اور اسے ٹھنڈا پانی ملانا پڑتا تھا۔ اور پھر وہ کہہ رہا تھا...... اتنا ٹھنڈا جیسے پگھلی ہوئی برف۔

"یہ کیسے ممکن ہے......؟"

پھر اس نے سوچا۔

ممکن ہے، اس سے بے دھیانی میں کوتاہی ہوئی ہو۔

"اور پانی گرم کر لاؤں......؟" اس نے پوچھا۔

لیکن جواب میں دروازہ ہی کھل گیا۔ عبدالحق کا گھبرایا ہوا چہرہ اس کے سامنے تھا۔

ارجمند کی حیرت بڑھ گئی۔ گرم پانی کی وجہ سے باتھ روم میں عام طور پر جو تمازت چھا جاتی ہے، وہ وہاں موجود تھی۔ گرم پانی کی بھانپ کی وجہ سے واں دھندلاہٹ بھی تھی اور عبدالحق کہہ رہا تھا کہ پانی پگھلی ہوئی برف جیسا ٹھنڈا ہے۔

"کیا بات ہے آغا جی......؟" اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"عجیب بات ہے......!" عبدالحق کی آواز میں اب بھی لرزش تھی۔

"پانی سے بھانپ بھی اٹھ رہی ہے۔ میں نے عادت کے مطابق پہلے ہاتھ ڈال کر چیک کیا۔ پانی زیادہ گرم لگا۔ میں نے ٹھنڈا پانی ملایا۔ جسم پر ڈالا تو تھرتھری چڑھ گئی۔ برف جیسا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

ارجمند نے خود پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی خاصا گرم تھا۔ اس نے سوچا۔

ممکن ہے، عبدالحق کو زیادہ سردی لگ رہی ہو۔

"آپ رکیں...... میں اور پانی گرم کر کے لاتی ہوں۔"

عبدالحق نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو جاتی ہوئی سردی ہے۔ پھر ایسا کیوں کہ پانی میں ہاتھ ڈالو تو گرم لگے اور جسم پر ڈالو تو اتنا ٹھنڈا...... وہ بہت غیر معمولی بات تھی۔

اس دوران فجر کی اذان بھی ہوگئی۔

ارجمند گرم پانی کا بڑا دیگچہ لے کر آئی۔

"اتنے گرم پانی کا کیا کرنا ہے مجھے......؟" عبدالحق نے کہا۔

"رکھ لیں...... اپنی ضرورت کے مطابق ملا لیجئے گا۔"

پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ وہ ناقابل برداشت ہونے کی حد تک گرم تھا۔ اس نے سوچا۔

"اب بھی میں غسل کرلوں تو مجھے نماز مل سکتی ہے۔"

اس بار اس نے گرم پانی کو اپنی ران پر آزمایا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ کھولتا ہوا پانی اس کے جسم کو چھوتا تو جیسے یخ بستہ ہو جاتا۔ صرف اس کے ہاتھ نارمل تھے۔

"آغا جی......! کیا ہوا......؟ خیریت ہے......؟" دروازے کے پیچھے سے ارجمند کی پریشان آواز سنائی دی۔

"آ رہا ہوں......!" عبدالحق نے جواب دیا۔

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور لحاف کی طرف لپکا۔ اس بار تھرتھری کچھ زیادہ ہی تھی۔

"کیا ہوا......؟" ارجمند نے پوچھا۔

"وہی صورتِ حال ہے۔ یہ کوئی نارمل بات تو نہیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے......؟" عبدالحق کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"پریشان نہ ہوں...... انشاءاللہ......! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ارجمند نے اسے تسلی دی۔

لیکن عبدالحق کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ پھر نورالحق اٹھ گیا۔ ارجمند کے گھر کے معمولات شروع ہوگئے۔ ارجمند کے لئے وہ پریشانی تھی۔ بچہ دودھ کا تقاضا کر رہا تھا، اور دودھ وہ اسے کمرے میں ہی پلاتی تھی۔ مگر اس وقت تو عبدالحق یوں لحاف میں چھپا بیٹھا تھا، جیسے اس کے باہر آنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔

ادھر نورالحق کے تقاضے اور اس کے اشارے اب واضح ہوتے جا رہے تھے۔

اس کے مضطرب ہاتھ اپنے ناشتے کی طرف مچل رہے تھے۔

"آپ دفتر کی تیاری کریں نا...... میں آپ کا ناشتہ لاتی ہوں۔"

"اب اس حال میں میں دفتر تو نہیں جا سکتا۔" عبدالحق نے دل گرفتگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے......!" عبدالحق نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

ارجمند نماز کے لئے کھڑی ہونے والی تھی، لیکن رک گئی۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ عبدالحق کو اس کی ضرورت پڑے گی۔

اور پھر ہوا بھی یہی۔ ذرا دیر بعد پھر عبدالحق کی چیخ سنائی دی۔ اس بار آواز میں گھبراہٹ کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔

ارجمند پھر دروازے کی طرف لپکی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں آغا جی......!"

دروازہ کھلا اور عبدالحق باہر نکل آیا۔ اس پر تھرتھری چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا اوپری جسم برہنہ تھا۔ قمیص پہننے کا بھی اسے خیال نہیں رہا تھا۔ وہ بیڈ کی طرف لپکا اور لحاف اوڑھ کر بیٹھ گیا۔

"ہوا کیا......؟" ارجمند نے پوچھا۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"نہایت گرم پانی بھی جسم پر نہایت ٹھنڈا اور ناقابل برداشت لگ رہا ہے۔ مجھے تو لگا کہ میری سانس رک جائے گی۔"

ارجمند الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے جسم کی تھرتھراہٹ دور ہو گئی تھی۔ آواز کی لرزش بھی بہت موہوم رہ گئی تھی۔

پھر اچانک عبدالحق نے سسکی سی لی اور کندھے کو سہلانے لگا۔

"کیا ہوا......؟" ارجمند نے پوچھا۔

"بڑی شدید جلن اور تکلیف ہو رہی ہے کندھے میں۔"

"مجھے دکھائیں......!"

عبدالحق نے کندھے سے لحاف سرکایا۔

ارجمند نے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

"یہ تو آبلے پڑ گئے ہیں۔"

"آبلے......؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"پانی تو ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا۔"

"پانی تو وہ کھولتا ہوا تھا آغا جی......!" ارجمند نے تصحیح کی۔

ارجمند کو کوئی متبادل بندوبست کرنا تھا۔ اس نے مچلتے ہوئے نورالحق کو گود میں اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"آپ اطمینان سے بیٹھیں...... میں ناشتہ لگاتی ہوں۔" اس نے جاتے ہوئے عبدالحق سے کہا۔

عبدالحق بستر پر دراز ہو گیا۔

ارجمند نورالحق کو گیسٹ روم میں لے گئی۔ بچے کو دودھ پلا کر اس نے بیڈ روم میں عبدالحق کے پاس چھوڑا، جہاں وہ عبدالحق سے کھیلنے لگا۔ اس کی وجہ سے عبدالحق کا جی بھی کسی حد تک بہل گیا۔

عبدالحق حیران تھا کہ نورالحق اپنے معمولات کا اتنا پکا ہے۔ وہ اس سے کھیلتا رہا۔ لیکن اس نے اس سے گود میں لینے کا تقاضا نہیں کیا۔ یہ تقاضا وہ ناشتے سے پہلے کبھی نہیں کرتا تھا۔

اس صبح عبدالحق سے ٹھیک سے ناشتہ نہیں کیا گیا۔

حمیدہ تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے پتر......؟ تو نے کچھ کھایا ہی نہیں......؟"

"کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے اماں......!" عبدالحق نے ظاہری بے پروائی سے کہا۔

"اور تو ابھی تک تیار بھی نہیں ہوا...... دفتر نہیں جانا ہے......؟"

"آج چھٹی کروں گا اماں......!"

حمیدہ اور پریشان ہو گئی۔ وہ کبھی بے وجہ چھٹی کرتا ہی نہیں تھا۔

"خیریت تو ہے پتر......؟"

"بس...... یونہی اماں......! کچھ تھکن سی ہے۔ آج آرام کروں گا۔" عبدالحق نے کہا اور مزید تفتیش سے بچنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ سردی کا احساس ابھی تک تھا۔ وہ پھر لحاف میں گھس کر بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ بعد ارجمند نورالحق کو لے کر آ گئی۔ لیکن اب نورالحق مچلا جا رہا تھا۔

عبدالحق اٹھا، اس نے نورالحق کو کندھے پر بٹھایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

"البتہ آپ کو وہ ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ جانے کیوں......؟" اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ اب تک میرے جسم میں تھرتھری ہے۔" عبدالحق کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"لیکن یہ آبلے اس کے نہایت گرم ہونے کا ثبوت ہیں۔" ارجمند نے کہا۔

پھر وہ چونکی۔

"کمال ہے......! آپ تکلیف میں ہیں اور میں اسے پر ایسے بحث کر رہی ہوں، جیسے یہ کوئی علمی موضوع ہو۔ آپ رکیں...... میں ابھی آئی......!"

عبدالحق اس کی بات پر غور کرنے لگا۔

"وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ دوسری بار تو پانی واقعی کھولتا ہوا تھا۔ اس وقت تو جسم پر پڑتے ہوئے وہ یخ بستہ لگا، لیکن بعد میں جسم پر آبلے پڑ گئے۔ کیونکہ درحقیقت تو وہ کھولتا ہوا پانی تھا۔"

"یہ معاملہ کیا ہے......؟" اسے خوف آنے لگا۔ ادھر کندھے کی جلن اور بڑھ گئی تھی۔ اور اس تکلیف میں بھی اسے یہ خیال آیا کہ اس ناپاکی کی وجہ سے وہ فجر کی نماز بھی نہیں پڑھ سکا ہے۔ اس کا دل غم سے بھر گیا۔

ارجمند واپس آئی۔ اس نے اس کے کندھے پر کچھ لیپا۔ چند منٹ تو جلن ویسی کی ویسی ہی رہی، مگر پھر ٹھنڈ پڑ گئی۔ وہ سکون محسوس کرنے لگا۔

"تم نماز پڑھ لو اب......!" اس نے ارجمند سے کہا۔

"ورنہ تمہاری نماز بھی نکل جائے گی۔"

ارجمند نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اپنے پسندیدہ کونے میں مصلّٰی بچھایا اور نماز کی نیت باندھ لی۔

عبدالحق اپنے پُراسرار معاملے پر غور کرنے لگا۔ کبھی وہ کڑھتا اور کبھی خوفزدہ ہو جاتا۔ نماز سے محروم ہونے کا خیال اسے بہت دکھ دے رہا تھا۔ بے چینی بڑھ گئی تو وہ دوبارہ باتھ روم میں چلا گیا۔

پانی اب بھی اتنا گرم تھا کہ باتھ روم میں دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے

"کیا بات ہے......؟ میں بار بار اللہ کو ناراض کرنے والے کام کرتا ہوں......؟"

پھر اسے یاد آیا کہ وہ محض غسل کی بات نہیں تھی۔ ارجمند نے اس سے ایک عہد کیا تھا۔ اللہ کو گواہ بنا کر اپنا ہر حق اس پر معاف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی طرف بڑھی تھی۔ اگر وہ اسے نہ روکتا تو وہ وعدہ خلافی معمول بن سکتی تھی۔

"نہیں......!" اس نے سوچا۔ اس پر اللہ ناراض نہیں ہوگا۔

"تو پھر......؟"

وہ سوچتا رہا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بالآخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو اسے یاد تھا کہ سوتے میں اس نے بڑی صاف اور واضح پکار سنی تھی۔ وہ خواب نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں نہ کوئی چہرہ تھا نہ کوئی منظر۔ بس وہ ایک آواز تھی۔ وہ اس آواز کو اس وقت بھی سن سکتا تھا۔

اس آواز نے کہا تھا۔

"اللہ فرماتا ہے کہ تم اس کے بندوں پر جس طرح کی نرمی کرو گے، میں تم پر اس طرح کی نرمی اس سے بڑھ کر کروں گا۔ تم میرے بندوں سے درگزر کرو گے، میں تم سے درگزر کروں گا۔ تم جس نعمت پر شکر ادا کرو گے، میں اسے تمہارے لئے اور بڑھا دوں گا۔ نعمت سے منہ موڑو گے تو نعمت تم سے دور ہو جائے گی۔ اور نعمت کو ٹھکراؤ تو نعمت تم سے چھینی بھی جا سکتی ہے۔"

عبدالحق جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"کیا یہ نعمت نماز ہے......؟ کیا وہ نماز سے محروم ہونے والا ہے......؟"

"ایسا کیوں ہوا......؟"

نفس کی وجہ سے...... رات نفس نے اسے ورغلایا اور رات کی قربت کے نتیجے میں وہ صبح کی نماز سے محروم ہوا۔

اسی وقت اس نے دو فیصلے کئے۔ ایک تو اس نے توبہ کی اور عہد کیا کہ اب نفس کو خود پر غالب نہیں آنے دے گا۔ دوسرے اس نے سوچ لیا کہ ابھی وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرے گا۔ وہ ہر حال میں پاک ہو کر رہے گا، چاہے سردی کی وجہ سے وہ

مر جائے۔ نماز سے محروم زندگی کے مقابلے میں یہ موت بہت بہتر ہوگی۔ نماز کے لئے کوشش کرتے ہوئے ہی تو مرے گا وہ۔

یہ فیصلہ کر کے اسے تقویت کا احساس ہوا۔ لیکن دوسری طرف ایک موہوم سی خلش اسے ستانے لگی۔ نہ جانے کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اصل بات وہ نہیں سمجھا ہے۔ بات کو سمجھنے میں اس نے کہیں غلطی کی ہے۔

وہ سوچتا رہا کہ آواز کا اشارہ کس نعمت کی طرف تھا......؟ جس صورتِ حال سے وہ دوچار تھا۔ اس میں تو وہ نعمت صرف اور صرف نماز ہی تھی۔ اسی سے تو محروم ہوا تھا وہ۔ اس معاملے میں اور کوئی نعمت تو نہیں تھی۔

لیکن اپنے یقین کے باوجود وہ خلش اسے ستاتی رہی۔

پھر اس نے اسے ذہن سے جھٹکا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ بارہ بجے تھے۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ ارجمند شاید کچن میں مصروف ہوگئی۔ وہ باتھ روم میں گیا۔ اس کے کپڑے صبح سے وہیں لٹکے ہوئے تھے۔ تولیہ بھی موجود تھا۔

وہ شاور کے نیچے کھڑا ہوا تو جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ وہ خوفزدہ ہوگیا۔ صبح کا تجربہ اسے یاد آنے لگا۔ کھولتا ہوا پانی اسے یخ بستہ لگ رہا تھا تو اب ٹھنڈا پانی اس کا کیا حشر کرے گا......؟

ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن پھر اپنا فیصلہ اسے یاد گیا۔ اسی فیصلے پر عمل کرنا ضروری ہے، خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے لٹو گھمایا۔ اس کا جسم سرد پانی کا جھٹکا برداشت کرنے کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا۔

لیکن پانی اس کے جسم پر گرا تو تازگی کا خوشگوار احساس اس پر چھا گیا۔ بہت ٹھنڈا کیا، وہ پانی تو بالکل بھی ٹھنڈا نہیں تھا۔ وہ تو تازہ پانی تھا، نہ گرم نہ ٹھنڈا۔ اسے سکون بخشنے والا۔

”هٰذا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ...... اَلْحَمْدُ لِلّٰه......!“ اس نے زیرِ لب کہا۔

باہر نکل کر اس نے فجر کی قضا پڑھی تو اس کا دل سکون سے بھر گیا۔ غفور الرحیم نے پھر اسے بخش دیا تھا۔

”ارے...... رے...... رے......!“ ارجمند اس کی طرف لپکی اور زبردستی نورالحق کو اپنی گود میں لے لیا، جو کسی طرح اس کے پاس آنے کو تیار نہیں تھا۔

نورالحق رونے لگا۔ وہ بار بار عبدالحق کی طرف بانہیں پھیلا رہا تھا۔

”بابا کے کندھے پر ہُو ہوگیا ہے بیٹے......! ہُو...... ہُو......“ ارجمند نے کہا۔ نورالحق کو کسی بھی ڈراؤنی اور خطرناک چیز کے بارے میں لفظ ”ہُو“ کہہ کر بتایا جاتا تھا۔

لیکن نورالحق اپنے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوا۔

”کوئی بات نہیں......!“ عبدالحق نے کہا۔

”اب ایسا بھی نہیں کہ اسے نہ اٹھا سکوں...... بس...... ذرا احتیاط کروں گا۔“

”جی نہیں......! بچے کو بتانا بھی تو ضروری ہے۔“

”ارے......! اتنا چھوٹا تو ہے...... یہ کیا سمجھے گا......؟“

”دیکھتے ہیں......!“ ارجمند نے کہا۔

”آپ ذرا اپنے کندھے پر سے قمیص ہٹائیے......!“

عبدالحق نے کندھے پر سے قمیص ہٹا دی۔

ارجمند نے نورالحق کو اس کے کندھے کے قریب کیا اور آبلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو بیٹے......! بابا کو ہُو ہوگیا ہے۔“

نورالحق چند لمحے آبلوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ ارجمند اسے روک پاتی، اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر آبلوں کو چھو لیا۔

عبدالحق کی چیخ نکل گئی۔

عبدالحق کی چیخ سن کر نورالحق کا چہرہ چٹخا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ بار بار وہ عبدالحق کے کندھے کی طرف ہاتھ بڑھاتا، گول سا منہ بنا کر ہُو کہتا اور ہاتھ کھینچ لیتا۔

پھر اس نے عبدالحق کی طرف دونوں ہاتھ پھیلائے اور مچل کر اس کی طرف لپکا۔ ارجمند کے لئے اسے سنبھالنا ممکن نہیں تھا۔ عبدالحق نے تیزی سے اسے گود میں نہ

لیا ہوتا تو شاید وہ گر جاتا۔

عبدالحق کی گود میں بیٹھ کر بچہ اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں بے پناہ محبت تھی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی نرمی سے باپ کے چہرے کو چھوا اور رونے لگا۔

یہ عمل وہ بار بار دہراتا رہا۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے سہلاتا اور روتا۔

''اسے پیار کیجئے نا......!'' ارجمند نے عبدالحق سے کہا۔

عبدالحق نے اسے پیار کیا اور اسے گود میں لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آج تو تمہیں گود میں لے کر ہی ٹہلنا پڑے گا۔''

اس نے گود میں لے کر روز کا معمول پورا کیا۔ پھر نورالحق کو ارجمند کے سپرد کر کے بیڈروم میں آ گیا۔

سردی کا احساس کچھ کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اس وقت وہ بہت دکھی ہو رہا تھا۔ یہ خیال اس کے لئے سوہانِ روح بنتا جا رہا تھا کہ وہ ابھی تک ناپاکی سے نجات نہیں پا سکا ہے۔ اس کی فجر کی نماز قضا ہو گئی ہے اور یہی نہیں، بلکہ اگلی نماز کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ صورتِ حال بہت عجیب ہے۔ کیا وہ اب کبھی نہیں نہا سکے گا......؟

وہ اس پر غور کرنے لگا کہ یہ ہوا کیا ہے......؟ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی، اور وہ یہ کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ بالکل اچانک ہی اس پر کسی عجیب و غریب بیماری کا حملہ ہو گیا ہو۔ یہ تو اللہ کی طرف سے ہے۔

اسے یاد آیا کہ ابھی کچھ دن پہلے، ارجمند زندگی میں پہلی بار خود اس کی طرف بڑھی تھی اور اس نے اسے جھڑک دیا تھا، اسے مایوس کر دیا تھا۔ صرف نماز کے خیال سے، سردی میں غسل کرنے کے خیال سے۔ اور آج اسے خواہش ہوئی تو اس نے کسی چیز کی پرواہ نہیں کی۔

تو کیا اس بات پر اللہ ناراض ہو گیا اس سے......؟

وہ بہت دیر سوچتا رہا اس پر۔

ایک شام اس کے پیروں کی مالش کرتے ہوئے حمیدہ نے کہا۔

''نورالحق......! تو بولے گا کب......؟''

نورالحق عادت کے مطابق اسے تکتا رہا۔

''بولتا کیوں نہیں......؟ جواب دے......!''

نورالحق پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

''کیا بڈھا ہو کر بولے گا......؟'' حمیدہ نے کچھ چڑ کر کہا۔

''تب تو شاید میں ہوں گی بھی نہیں......!''

اور نورالحق کا ردِعمل حیرت انگیز تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے صاف آواز میں کہا۔

''بابا......!''

کائنات جیسے ساکت ہو گئی۔ تماشائیوں نے جیسے سانسیں روک لیں۔ سب کو وہ اپنی اپنی سماعت کا وہم لگا تھا۔ سب بے یقینی سے دوچار تھے۔

سب سے پہلے حمیدہ ہی سنبھلی۔ اس نے چٹ چٹ نورالحق کو خوب پیار کیا۔ پھر بولی۔

''کیا کہا تو نے......؟ پھر سے بول......!''

اور نورالحق جیسے ہر بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے پھر دہرایا۔

''بابا......!''

''کون بابا......؟ کہاں ہیں بابا......؟''

نورالحق چند لمحے حمیدہ کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سر گھما کر اس طرف دیکھا، جہاں ارجمند اور عبدالحق بیٹھے تھے۔ پھر اس نے انگلی عبدالحق کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بابا......! بابا......!''

اور کمرے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ عبدالحق کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ارجمند کے چہرے پر فخر تھا۔ وہ زیرِ لب اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔

''هٰذا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ...... اَلْحَمْدُ لِلّٰه......!''

"ادھر دیکھو میری طرف......!" حمیدہ نے بناوٹی غصے سے نورالحق کو پکارا۔

نورالحق سب کو خوش دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ حمیدہ کی آواز سن کر اس کی طرف مڑا۔

"بہت مطلبی ہے تو......!" حمیدہ نے ویسے ہی غصے سے کہا۔

"ٹانگیں تو تیری میں دباتی ہوں اور تو پہلا نام لیتا ہے بابا کا......؟"

نورالحق نے بہت غور سے، پُرتشویش نظروں سے حمیدہ کو دیکھا۔ پھر جیسے وہ سمجھ گیا کہ وہ دکھاوے کا غصہ ہے۔ وہ ہنس ہنس کر تالیاں بجانے لگا۔

"مکار کہیں کا...... سب سمجھتا ہے۔" حمیدہ نے بڑے لاڈ سے کہا۔ پھر اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا بتا...... میں کون......؟"

نورالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"دادی......!"

"ذرا پھر سے کہہ......!"

"دادی......! دادی......! دادی......!" نورالحق نے کہا اور اٹھ کر حمیدہ سے لپٹ گیا۔

حمیدہ نے اسے جی بھر کر پیار کیا۔

"میری جان......! میرا لاڈلا......!" پھر وہ خوشی سے رونے لگی۔

"تیرا شکر ہے ربا......! تو نے یہ دن بھی دکھایا مجھے......!"

پھر حمیدہ نے ارجمند کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا بتا...... یہ کون......؟"

نورالحق نے جھٹ کہا۔

"امی......! امی......!"

"پتر......! تیرا بیٹا بڑا مکار ہے۔" حمیدہ نے عبدالحق سے کہا۔

"بہت گہرا ہے یہ...... جانے کب سے بولنا آتا ہوگا اسے، پر بولا نہیں...... ورنہ اتنا صاف کیسے بولتا......؟"

ارے......! وہ تو ہر لمحے ہماری نہ جانے کتنی خطائیں ہماری معذرت کے بغیر بھی معاف کرتا رہتا ہے۔

❁❁❁

جس دن نورالحق ایک سال کا ہوا، اس دن اس نے پہلی بار کھڑے ہو کر چلنا شروع کیا۔ عبدالحق کو وہ منظر اس قدر بھایا کہ اس کا بس چلتا تو بس وہ اسے چلتے ہوئے دیکھتا ہی رہتا۔

وہ منظر تھا ہی کچھ ایسا......!

جب نورالحق چلتا تو اس کے چہرے کے تاثرات اور انداز سے اس کے ہر جذبے کا صاف پتا چلتا۔ کچھ تھوڑی سی بے یقینی، جو اس کے قدموں کے ڈولنے سے عیاں ہوتی۔ کچھ خوف، گرنے کا خوف، جو اس کی آنکھوں میں چھلکتا۔ اس کے ساتھ ایک چیلنج کو قبول کرنے کی چمک بھی اس کی آنکھوں میں ہوتی۔ اور وہ چیلنج ہوتا دس بارہ قدم دور بانہیں پھیلائے بلاتا ہوا اس کا باپ۔

وہ بے یقینی سے اپنے ہدف کی طرف بڑھتا۔ اس کے قدم ڈگمگاتے۔ وہ ڈرتے ڈرتے قدم بڑھاتا۔ پھر جب وہ اپنے ہدف سے ایک دو قدم کے فاصلے پر رہ جاتا تو خوف اور ہیجان سے شل ہو کر وہ چلنا بھول کر عبدالحق کی طرف جست لگاتا اور اس کی بانہوں میں سما جاتا۔ اس وقت اس کے چہرے پر خوشی، ہونٹوں پر ہنسی اور آنکھوں میں فخر ہوتا۔ وہ خوش ہو کر عبدالحق کو پیار کرتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ درمیان میں ہی گر جاتا۔ اس لمحے اس کی نگاہوں سے مایوسی جھلکتی، وہ بسورنے لگتا...... لگتا کہ بس اب رویا اور جب رویا۔ یہ دیکھ کر عبدالحق اسے چمکارتا، پکارتا۔

"کوئی بات نہیں بیٹے......! اٹھ جاؤ شاباش...... اور جلدی سے آؤ میرے پاس......! گرنے سے ڈرتے نہیں......!"

یہ سن کر نورالحق مسکراتا اور دوبارہ کھڑا ہوتا۔

اس کے کھڑے ہونے کی ادا عبدالحق کو اور پیاری لگتی تھی۔ وہ ہلتا جلتا اٹھتا۔ ہر لمحے ایسا لگتا کہ وہ پھر گر جائے گا۔ اور کبھی وہ گر بھی جاتا۔ عبدالحق کو اسے پھر چمکارنا -

پڑتا۔

اور جب نورالحق کا اعتماد بڑھ گیا تو اسے چلنے کا ہوکا ہو گیا۔ وہ بس چلتے ہی رہنا چاہتا۔ جب تک جاگتا، چلتا رہتا۔ شام تک وہ تھک جاتا۔ پاؤں دکھنے لگتے۔ اس وقت وہ اپنے معمول کے مطابق حمیدہ کے پاس ہوتا تھا۔ وہ بڑی بے بسی اور معصومیت سے اپنے پاؤں اپنے ہاتھوں سے دباتا۔ اور حمیدہ تڑپ جاتی۔

''لا...... میں دبا دوں تیرے پاؤں......!''

اور وہ پاؤں دباتی تو نورالحق کے چہرے پر سکون چھا جاتا۔

''اتنا کیوں چلتا ہے......؟'' حمیدہ کہتی۔

''دیکھ تو...... پاؤں سوج گئے ہیں تیرے......!''

نورالحق ٹکر ٹکر اس کے چہرے کو دیکھتا رہتا۔ اس کی نگاہوں میں تشکر ہوتا، محبت ہوتی۔

عبدالحق اور ارجمند بھی وہیں موجود ہوتے اور رشیدہ اور آبیہ بھی۔ سب یہ تماشا دیکھ کر مسکرا رہے ہوتے۔

''آبیہ......! زیتون کا تیل تو دے ذرا......!'' حمیدہ پکارتی۔

پھر حمیدہ نورالحق کی ٹانگوں کی بہت اچھی طرح مالش کرتی۔

''اب دیکھنا...... سارا درد بھاگ جائے گا تیرا......!'' وہ نورالحق سے کہتی۔

اور کچھ دیر بعد نورالحق اٹھ کر بیٹھتا اور عبدالحق کی طرف ہاتھ پھیلاتا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ اب اس کے ساتھ والے معمول کا وقت شروع ہو گیا ہے۔

چلنے کا شوق اپنی جگہ، لیکن وہ اپنے معمول سے دست بردار نہیں ہوا تھا۔ سونا وہ عبدالحق کی گود میں ہی تھا۔ عبدالحق اسے لے کر ٹہلتا رہتا، یہاں تک کہ وہ سو جاتا۔

اور وقت کا وہ ایسا پابند تھا کہ دن چھوٹے بڑے ہونے سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب موسم بہار آ گیا تھا۔ دن بڑا ہونے لگا تھا۔ عشاء کا وقت بھی پیچھے چلا گیا تھا۔ اب وہ عشاء سے پہلے سوتا تھا۔

عام طور پر بچے بولتے پہلے ہیں اور چلتے بعد میں ہیں۔ نورالحق کا معاملہ الٹ تھا۔ وہ گھر بھر میں دوڑتا پھرتا تھا۔ لیکن بولا اب تک نہیں تھا۔

تھا۔ کندھوں میں جلن البتہ وہ رہی تھی، اور وہ بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے پاجامہ پہنا اور باہر نکل آیا۔ اس کا دل خوف اور غم سے بھرا ہوا تھا۔

باہر ارجمند موجود تھی۔ اس نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں تو دلاسہ دینے والے انداز میں بولی۔

''گھبرائیں نہیں...... میں نے پانی گرم کر لیا ہے۔ ابھی لائی......!'' یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے لئے پلٹی۔

''اس کی ضرورت نہیں ارجمند......!'' عبدالحق نے کہا۔

ارجمند نے پلٹ کر اسے تشویش سے دیکھا۔ عبدالحق کی آواز کی لرزش نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' اس نے پوچھا۔

''اس بار معاملہ برعکس ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''شاور کا پانی مجھے ناقابل برداشت حد تک گرم لگ رہا ہے...... کھولتا ہوا۔''

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ باتھ روم کی طرف چل دی۔ عبدالحق بھی اس کے پیچھے تھا۔

ارجمند نے شاور کی پھوار کی طرف ہاتھ بڑھایا اور چند لمحے وہیں رہنے دیا۔

''پانی تو نارمل ہے آغا جی......! بلکہ کچھ ٹھنڈا ہے۔''

عبدالحق نے بھی ہاتھ بڑھایا، لیکن اگلے ہی لمحے ہلکی سی چیخ کے ساتھ واپس کھینچ لیا۔

ارجمند استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میرے لئے تو یہ کھولتا ہوا پانی ہی ہے۔''

''تو اب......؟'' ارجمند کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تم میری فکر مت کرو......! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو......!''

''مطلب......؟''

''تم غسل کرو اور نماز پڑھو......!''

"لیکن......"

عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میرا تو نقصان ہو ہی گیا۔" عبدالحق نے بڑے دکھ سے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ اس کی فکر میں تم بھی اپنی تہجد، بلکہ فجر سے بھی محروم ہو جاؤ......!" یہ کہہ کر وہ باتھ روم سے نکل گیا۔

وہ دن بھی پچھلے دن جیسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پچھلی بار وہ لحاف میں لپٹ کر بیٹھ گیا تھا، جبکہ اس بار وہ لان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس بار اس کے اندر غم وغصہ بھرا تھا۔ بے بسی کا احساس الگ تھا۔ غصہ اسے خود پر آ رہا تھا۔ پچھلی بار کے تجربے کے بعد اسے یہ جرأت کرنی ہی نہیں چاہئے تھی۔

پچھلی بار کی طرح اس بار بھی اس نے دفتر سے چھٹی کی، اور اس بار بھی بارہ بجے کے بعد پانی اس کے لئے نارمل ہوگیا۔

❁❁❁

اس بار ارجمند بہت دکھی ہوئی۔ عبدالحق کی کوئی بھی محرومی اسے کب گوارہ تھی اور یہ تو بہت بڑی محرومی تھی۔ نماز پڑھنے والا کوئی شخص ایک نماز سے بھی محروم ہو جائے تو یہ اس کے لئے بہت بڑا غم ہوتا ہے۔ جبکہ یہاں تو تہجد بھی تھی۔ ارجمند عبدالحق کے دکھ کو محسوس کر سکتی تھی۔ ایک معمول اگر ٹوٹ جائے تو آدمی کو لگتا ہے کہ پچھلے کئے کرائے پر پانی پھر گیا ہے۔

وہ ہفتے کی رات تھی۔ معمول کے مطابق وہ دونوں قرآن فہمی کے لئے بیٹھے۔ لیکن دونوں ہی ارتکاز سے محروم تھے۔ دونوں ہی اس معاملے پر گفتگو سے گریزاں تھے اور دونوں یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس پر بات کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ بات شروع کون کرے اور بات کس طرح شروع کی جائے......؟

بالآخر ارجمند نے ہی بات شروع کی اور عبدالحق کی دل جوئی سے شروع کی۔

"آغا جی......! دل چھوٹا نہ کریں اور پریشان نہ ہوں۔" اس نے کہا۔

"ہاں اماں......! یہ تو ہے۔" عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس دن سے گھر کی رونق اور بڑھ گئی۔

❁❁❁

جس طرح کا معاملہ عبدالحق کے ساتھ غسل کے معاملے میں ہوا تھا، عام طور پر ایسے معاملات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ آدمی ان پر سوچنا کم کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے محض ایک واہمہ سمجھنے لگتا ہے اور بالآخر بھول جاتا ہے۔

لیکن عبدالحق کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اس کے لئے وہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا......؟

ہر رات سونے کے لئے لیٹتے وقت وہ اس واقعے کو یاد کرتا اور اس پر غور کرتا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا تھا......؟ اس میں تو اسے کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے تھا۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ کوئی انعام نہیں تھا، بلکہ تنبیہ تھی۔ سوچنا یہ تھا کہ کس بات پر تنبیہ کی گئی، تاکہ وہ آئندہ اس سے بچے۔

وہ اس پر بہت سوچتا۔ اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آتی تھی۔ نماز سے غفلت اور بے پرواہی۔ دوسری کوئی بات اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی۔ لیکن اس کا دل اس پر مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اور دل کہتا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

اس کے نتیجے میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ سوتی ہوئی ارجمند کو دیکھتا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کتنی حسین ہے۔ لیکن سوتے ہوئے وہ اور زیادہ حسین لگتی تھی۔ یا یوں تھا کہ وہ اسے بہت پرکشش لگنے لگی تھی۔

مگر پہلے وہ اسے اتنا اور اس طرح دیکھتا بھی تو نہیں تھا۔

سردی رخصت ہوگئی۔ موسم معتدل، بلکہ قدرے گرم ہوگیا۔

رُت بدلی تو اس کے سوچنے کا انداز بھی کچھ بدلا۔ کچھ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ارجمند کو دیکھ کر اس کے اندر خواہش سر اٹھانے لگتی تھیں۔ بہرحال اس نے سوچا کہ اب تو پانی کے ٹھنڈے گرم ہونے کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔

لیکن پچھلی بار کی ان ہونی کے نتیجے میں اس کی فجر کی نماز قضا ہوئی تھی۔ اس کا اسے اب تک غم بھی تھا اور اس کی وجہ سے وہ خوفزدہ بھی تھا۔ تجربہ کرنے کو جی چاہتا تھا، لیکن ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ کہیں اس بار بھی......

مگر ہر گزرتی رات کے ساتھ اس کی خواہش بڑھتی گئی۔ نفس سر اٹھانے لگا اور سر اٹھاتے اٹھاتے سرکشی پر اُتر آیا۔

اس رات اس نے بڑی نرمی اور محبت سے ارجمند کو جگا دیا۔

وہ رات صرف نفس کی، خواہش کی رات نہیں تھی۔ اس میں محبت بھی تھی۔ ایسی محبت کہ ارجمند کی روح تک سیراب ہوگئی۔ وہ رات ان دونوں کے لئے ایک خوب صورت خواب بن گئی۔

مگر جب آنکھ کھلی تو اس خواب کی خوف ناک تعبیر سامنے تھی۔

وہ دونوں ایک ہی وقت جاگے۔ دونوں کا ہی تہجد کا معمول تھا۔ عام طور پر ارجمند عبدالحق سے کوئی آدھا گھنٹہ پہلے بیدار ہوتی تھی۔ لیکن اس صبح عبدالحق بھی کچھ جلدی ہی جاگ گیا۔ وہ سو گیا تھا، یہ بھی اللہ کی رحمت تھی۔

''آپ رُکیں، میں گرم پانی لاتی ہوں۔''

موسم خاصا گرم تھا۔ خواب گاہ میں نسبتاً زیادہ گرمی تھی۔ وہ پنکھا چلا کر سوئے تھے۔ عبدالحق نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ارجمند......! اس وقت تو ٹھنڈا پانی اچھا لگے گا۔''

ارجمند نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کمرے سے نکلی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے عبدالحق کے کپڑے باتھ روم میں پہنچا دیئے۔

عبدالحق باتھ روم میں گیا تو بے حد پُر اعتماد تھا۔ وہ شاور کے نیچے کھڑا ہوا اور اس نے لٹو گھمایا۔

پانی کی پھوار جسم پر گری تو اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ گھبرا کر شاور سے دور ہٹا۔ بوکھلاہٹ ایسی تھی کہ اسے لٹو گھمانے کا خیال ہی نہیں رہا۔

چند لمحے وہ اپنے کندھوں کو سہلاتا رہا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے کندھوں پر آبلے نہیں پڑے تھے، حالانکہ جسم پر گرنے والا پانی اسے تو کھولتا ہوا ہی محسوس ہوا

''حالانکہ بات پریشانی ہی کی ہے۔''

''بے شک......! لیکن میں اور آپ......ہم اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تو پریشانی بیکار ہی ہوئی نا......؟''

''اب سوچوں پر کس کا اختیار ہے......؟ کوئی بچ سکتا ہے پریشان ہونے سے......؟''

''جی......! بچ سکتا ہے۔ اللہ کا ذکر، قرآن اور نماز اس سے بچاتی ہے۔''

''لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پریشانی کی وجہ سے نماز پڑھنا تک آسان نہیں رہتا آدمی کے لئے۔''

''جسے معلوم ہو کہ اس کے سوا کوئی پناہ نہیں، وہ بار بار کی ناکامی کے باوجود اسی طرف کوشش کرتا رہتا ہے۔ بالآخر اللہ خوش ہو کر اس کی پریشانی دور کر دیتا ہے، اور اسے یکسوئی عطا کر دیتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بندے کے پاس اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ بس اللہ سے رجوع کرتے رہنا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن اس مسئلے پر بھی تو غور کرنا چاہئے۔ یہ مسئلہ ہے کیا......؟''

''آپ کیا سمجھتے ہیں......؟''

''مجھے تو اس معاملے میں بھی اللہ کی ناراضی ہی نظر آتی ہے۔''

''آزمائشیں بھی ہوتی ہیں آغا جی......!''

''مگر شاید میں اس قابل نہیں...... میں تو ہمیشہ اللہ کو ناراض کرنے والے کام کرتا ہوں۔''

ارجمند نے اس پر بہت غور کیا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی، جو اللہ کی ناراضی کا سبب ہو۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے آغا جی......! آدمی کو ہر لمحہ، ہر معاملے میں اللہ سے ڈرنا چاہئے۔'' وہ بولی۔

''لیکن ناراضی کا سبب تلاش کرنا بھی ضروری ہے۔''

''سبب تو جب اللہ کی رحمت ہوگی تو سمجھ میں آئے گا۔ اس وقت تو ہمارے

سامنے سزا ہے۔ اس پر غور کر سکتے ہیں ہم......!''

''اور سزا کیا ہے......؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''تم نہیں سمجھیں......؟''

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

''سزا یہ ہے کہ میں تمہاری قربت سے محروم کر دیا گیا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اللہ مجھ سے بھی ناراض ہے......؟''

''یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم......؟''

''میں بھی آپ کی قربت سے محروم کر دی گئی نا......!''

عبدالحق نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ تمہاری محرومی کہاں ہے......؟'' اس کے لہجے میں بھی شکایت تھی۔

''تم تو پہلے ہی اس سے دست بردار ہو گئی تھیں۔ تمہارے لئے اس کی اہمیت ہی کہاں تھی......؟''

ارجمند اس کا جواب دینا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ تو اس محرومی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ خود ہی اللہ کی محبت کے نام پر دنیا ترک کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ورنہ اس نے تو صرف اس سے اپنے تعلق کو بچانے کے لئے ایثار کیا تھا۔ اب یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ وہ تو بس اسے خوش اور دنیا اور آخرت میں کامیاب دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر وہ اس کی محبت کو کہاں سمجھ سکا تھا......؟

وہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ جسے وہ اب اپنی محرومی اور اپنی سزا قرار دے رہا ہے، اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہی کب تھی......؟ دو سال کے عرصے میں اسے یہ نعمت اس نے دی ہی کتنی تھی......؟ ابتدائی عرصے کے بعد لمبی جدائی، پھر نور بانو کی موت کے نتیجے میں دوری، جسے پھوپھا جان کی محبت نے توڑا اور اسے دوسری سہاگ رات ملی۔ اس کے بعد عبدالحق کے فرسٹریشن کی اس رات کی قربت، جس نے اسے زخمی کر دیا تھا۔ پھر عزتِ نفس کی بحالی کے لئے اس کی کوشش، جس کے نتیجے میں اسے دھتکار دیا گیا۔ اور اس کے بعد وہ رات جب محبت سے عبدالحق اس کے قریب آیا، جو اس کے لئے اللہ کی رحمت تھی۔ جب اسے محبت بھی ملی اور عزتِ نفس بھی بحال ہوئی اور اسی

رات سے یہ سزا شروع ہوئی۔

مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی کسی بات سے عبدالحق کے شیشۂ دل پر بال آئے، یہ وہ کبھی گوارہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بڑی محبت سے عبدالحق کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''میں آپ سے محبت کرتی ہوں آغا جی......! میں آپ کی شریک حیات ہوں۔ آپ کے ہر دکھ درد میں آپ کی شریک۔ آپ کی تکلیف میری تکلیف۔ آپ کی محرومی میری محرومی۔ میں آپ سے کسی بھی طور الگ نہیں ہوں۔''

''لیکن یہ سزا تو صرف میری ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''کیسے......؟''

''غسل صرف میرے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ فجر سے صرف میں محروم ہوتا ہوں، تم نہیں......!''

ارجمند چونکی۔ واقعی...... اس طرف تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اس نے سوچا۔ جو کچھ آغا جی پر گزر رہی ہے، مجھ پر تو نہیں گزرتی۔ یہ کیا معاملہ ہے......؟ کیا بھید ہے......؟ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔

''چپ کیوں ہو گئیں......؟ بولو نا......!'' عبدالحق نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جی......! اس زاویے سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' ارجمند کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

عبدالحق نے پریشانی کے باوجود اس کی شرمندگی محسوس کر لی۔

''تم ایسی کیوں ہو رہی ہو......؟ جیسے شرمندہ ہو......؟''

''شرمندہ تو میں ہوں آغا جی......!''

''کس بات پر......؟''

''اس پر کہ آپ کے ہر دکھ درد میں شریک ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی، مگر ایسا ہے نہیں......!''

''اس میں تمہارا کیا قصور......؟'' عبدالحق نے اسے دلاسہ دیا۔

''یہ تو اللہ کے حکم سے ہے اور یہ طے ہو گیا کہ یہ سزا ہے۔ اب میرے جرم کی سزا مجھے ہی ملے گی، تمہیں تو نہیں......!''

''مگر جرم کیا ہے آپ کا......؟''

''یہ سمجھ میں آجائے تو بات ہی کیا ہے......؟ پھر تو توبہ کے دروازے کھلے ہیں نا......!''

''اب آپ کیا کریں گے......؟''

''اللہ سے دُعا کروں گا کہ جس عمل کی یہ سزا ہے، مجھے اس کی آگہی عطا فرما دے، تاکہ میں عملی طور پر اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں۔ اور اس کے علاوہ اپنے تمام معلوم نامعلوم گناہوں پر توبہ کروں گا، جس میں یہ نامعلوم گناہ بھی شامل ہوگا، جس کی یہ سزا ہے۔''

''میں بھی اللہ سے بہت دُعا کروں گی آپ کے لئے......!''

''جزاک اللہ......!'' عبدالحق خود کو کچھ ہلکا محسوس کرنے لگا۔

❀❀❀

وہ دونوں ہی اس پر سوچتے اور غور کرتے رہے۔

آدمی سوچتا ہے تو بہت کچھ سمجھ میں آتا ہے، چاہے اصل بات نہ سمجھ پائے۔ سوچنے اور غور کرنے کا فائدہ ضرور ہوتا ہے، کیونکہ وہ کوشش ہوتی ہے اور اس میں اخلاص ہوتا ہے۔

عبدالحق تو اپنے آغاز سے ہی سوچنے اور غور کرنے والا تھا۔ اور اللہ کی رحمت پر تو کبھی نہ کبھی ہر انسان غور کرتا ہے۔ دنیا کا نظام قائم ہی اس رحمت کے دم سے ہے۔ اللہ نے قرآن میں کئی مقامات پر بتایا کہ فرشتے اللہ کی حمد اور تسبیح ہر وقت کرتے ہیں اور زمین والوں کی طرف سے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ جس بڑے پیمانے پر شرک کیا جاتا ہے اور اللہ پر تہمت لگائی جاتی ہے، اس کی وجہ سے، اس کی شدت سے آسمان پھٹ پڑتا۔ اور یہ بھی طے ہے کہ فرشتے سب کچھ صرف اللہ کے حکم کی تعمیل میں کرتے ہیں۔ تو فرشتوں کا زمین والوں کے لئے استغفار اللہ کی رحمت ہی تو ہے۔

اور اللہ نے بتایا کہ جب اس کے بندے اس پر اولاد اور بیوی کا بہتانِ عظیم

لگائیں تو وہ اس پر سب گناہوں سے بڑھ کر غضب ناک ہوتا ہے۔ لیکن وہ قادرِ مطلق غضب ناک ہونے کے باوجود ایسے بندوں کو مٹا نہیں دیتا۔ وہ ایسوں کی سزا کو قیامت کے لئے موخر کر دیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اللہ سے بڑھ کر صبر کرنے والا کوئی نہیں۔ صبر تو اللہ کا وصف ہے، جس میں سے وہ پیغمبروں کو عطا فرماتا ہے یا اپنے بہت نیک بندوں کو۔ اور وہ بہتانِ عظیم لگانے والوں کو بھی متاعِ حیات سے محروم نہیں کرتا۔

عبدالحق ہمیشہ سے سوچتا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ صاف اور واضح نظر آنے والی چیز اللہ کی رحمت ہے اور اس کی وسعت ایسی ہے کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ بندہ سر توڑ کوشش کر لے، نہیں بیان کر سکتا اور خود اللہ نے نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا کہ اس کی رحمت بے پایاں ہے اور اس نے اس سے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اللہ کی رحمت بہت وسیع اور سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔ کیوں نہ ہو......؟ وہ اللہ کی رحمت ہے، اس اللہ کی جسے کوئی سمجھ اور جان نہیں سکتا۔ اس کی رحمت ہو تو بندہ اس پر غور کرے۔ وہ اس پر خوش ہو اور رحمت فرمائے تو وہ جستہ جستہ اللہ کے حکم کے مطابق اس بندے پر عیاں ہو، اسے نظر آئے اور سب کو ایک جیسا نظر نہیں آتا، ایک جیسا سمجھ میں نہیں آتا، یہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ ایک بندے کو ایک کام میں اللہ کی رحمت نظر آتی ہے تو سینکڑوں بندوں کو وہ محض اتفاق لگتا ہے۔ اور بہت سے تو اسے الٹا زحمت ہی سمجھ بیٹھتے ہیں۔

عبدالحق اللہ کی رحمت پر غور کرتا تو بے بسی کے احساس سے نڈھال ہو جاتا۔ دماغ شل ہو جاتا۔ اللہ کی رحمت میں شامل عناصر اتنے ہیں کہ بندہ انہیں کبھی سمجھ نہیں سکتا۔ اللہ کی تمام صفات اس میں شامل ہی۔ اور پھر نعمتیں۔ وہ بھی اس رحمت کا حصہ ہیں۔ اور اس حصے کو، ان نعمتوں کی کثرت ایسی ہے کہ شمار کرنا تو دور کی بات، بندہ ان کے عشرِ عشیر کے عشرِ عشیر کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ تو وہ رحمت کو کیا سمجھے گا۔

اس سے اس کی سمجھ میں ایک بات آتی تھی۔ اللہ نے یہ سب کچھ سمجھنے کے لئے انسان کو زمین پر نہیں بھیجا۔ کیونکہ یہ سب سمجھنے کے لئے تو ازل سے ابد تک کی عمر بھی ناکافی ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اللہ پر ایمان لانا ہے اور اس ـ

کی اطاعت کرنا ہے۔ اور ایمان بھی عقل سے نہیں، دل سے اور زبان سے۔ کیونکہ دل کا خمیر یقین ہے اور عقل کا شک۔

تو پھر غور کرنے کا حکم کیوں......؟

صرف اس لئے کہ غور کرو تو اللہ خوش ہو کر تمہیں سمجھائے۔ اور تم اللہ کو تھوڑا سا سمجھو گے تو اس کے کچھ قریب ہو گے۔ ایمان بڑھے گا۔ غور کرتے رہو گے تو اللہ تھوڑا تھوڑا تمہیں بڑھاتا رہے گا۔ سمجھو گے اور فلاح پاؤ گے۔

انسان کی اعلیٰ ترین کامیابی، اس کی معراج اللہ سے محبت ہے۔ لیکن محبت کیسے ہوگی......؟ اگر آپ اسے جانتے ہی نہیں، اور اگر آپ جان جائیں کہ وہ آپ کے لئے کیا کیا کر چکا ہے......؟ کیا کیا کرتا ہے......؟ اس کی نعمتیں اور اس کی عنایتیں کتنی ہیں......؟ تو آپ اس سے محبت کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

اسے مولوی مہر علی یاد آ گئے۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

''پتر عبدالحق......! کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اللہ معبودِ برحق ہے۔ کہیں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ واحد، احد اور یکتا ہے۔ نہ وہ کسی سے ہے اور نہ کوئی اس سے ہے۔ وہ مالک الملک ہے۔ سب کچھ اس کا ہے۔ جس نے یہ حقیقت سمجھ لی، وہ فلاح پا گیا۔ وہ جس نے ان باتوں کی گواہی دی اور مانا اور عمل کیا کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔''

''جی...... بے شک...... مولوی صاحب......!'' اس نے کہا تھا۔

''اور پتر......! جس نے اسے دل سے معبود مانا، وہ مخلوق میں سب سے افضل ہو گیا۔''

''اور جس نے ایمان اور بندگی کے ساتھ اس سے محبت بھی کی......؟'' عبدالحق نے سوال اٹھایا تھا۔

''اس کی کیا بات کرتے ہو پتر......؟ محبت کرنے والے کا تو درجہ ہی اور ہوتا ہے۔ اسے تو قرب عطا ہوتا ہے۔ اسے تو وہ دوست بنا لیتا ہے۔''

''مگر مولوی صاحب......! آسان تو بندگی بھی نہیں۔ محبت تو اور بڑی ہے۔''

''اس دنیا میں نہ کچھ آسان ہے پتر......! اور نہ ہی کچھ مشکل۔ جو وہ دے

دے، وہ آسان لگتا ہے، جو وہ نہ دے، وہ مشکل۔ اور وہی تو ہے، جو سب کچھ جانتا ہے، جانتا ہے کہ کس کو کیا دینا ہے......؟ اور کسے کس چیز سے محروم رہنا ہے......؟''

''تو وہ کبھی کسی کی محبت قبول نہیں بھی کرتا ہوگا......؟''

''نا پتر......! کیوں قبول نہیں کرے گا......؟ وہ تو بتاتا ہے کہ تم دنیا بھر میں محبت بانٹتے پھرتے ہو۔ جبکہ سب سے بڑھ کر تمہیں اس سے محبت کرنی چاہئے۔ وہ تو قدر دان ہے، حوصلہ افزائی کرنے والا ہے پتر......!''

''تو وہ جسے رد کر دے، وہ محبت نہیں ہوتی ہوگی......؟''

''بندوں سے تو بندہ جھوٹ بول سکتا ہے، اس کو سچ ثابت بھی کر سکتا ہے پتر......! پر اللہ سے تو کچھ چھپا نہیں ہوتا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس معاملے میں بندہ اللہ سے جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ وہ تو عاجز ہوتا ہے۔ جانتا ہے نا کہ جو کچھ وہ پیش کر رہا ہے، خام ہے۔''

''اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ ہے نا...... مولوی صاحب......!''

''ہاں پتر......!''

''تو پھر بندوں کی آزمائش کیوں......؟ ایمان کے معاملے میں بھی اور محبت کے معاملے میں بھی۔''

''وہ تو درجات کے تعین کے لئے ہوتی ہے پتر......! امتحان تو ہوگا۔ جانچ پڑتال تو ہوگی۔ نمبر تو دیئے جائیں گے۔ تبھی تو پتا چلے گا کہ کون کس درجے پر ہے......؟ کس نے کتنے نمبر لئے ہیں......؟''

''وہ سب کچھ جانتا ہے، اس کا فیصلہ حتمی ہے۔ اسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا...... پھر بھی......''

''ہاں......! پھر بھی...... کیونکہ وہ عادل ہے۔ کسی کو حجت کرنے سے نہیں روکتا۔ اعتراض سے نہیں روکتا۔ فیصلہ کرتا ہے تو حجت تمام کر کے۔''

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''اچھا......! تم میرے کچھ سوالوں کے جواب دو پتر......!''

''کوشش کروں گا مولوی صاحب......!''

"ہدایت دینے والا بھی اللہ ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کون ایمان لائے گا اور کون نہیں......؟"

"یہ تو خود اللہ نے بتایا ہے قرآن میں۔ پیغمبر کا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔"

"تو اللہ ازل سے جانتا ہے کہ کون ایمان لانے والا ہے......؟ اور کون کفر کرنے والا......؟"

"بے شک...... مولوی صاحب......!"

"تو پھر اللہ نے پیغمبر کیوں بھیجے......؟ کتابیں کیوں اتاریں......؟"

"اس کا جواب بھی اللہ نے قرآن میں دیا ہے۔ تاکہ قیامت کے دن کوئی یہ عذر پیش نہ کرے کہ اے اللہ......! مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ نہ تو نے مجھے بتایا اور نہ میرے پاس کسی سمجھانے والے کو بھیجا۔"

"کیوں......؟ اسی لئے نا کہ حجت تمام ہو جائے۔ اللہ ایسا منصف ہے کہ مجرم کو صفائی پیش کرنے کا ہر موقع فراہم کرتا ہے۔ ہر جرم کا گواہ بھی موجود اور ثبوت بھی۔ بندے کا تو وجود بھی، اس کے اعضا بھی گواہی دیں گے۔ اس دن صرف سچ کا بول بالا ہوگا۔ وہ یوم الحق ہوگا۔"

"لیکن مولوی صاحب......! بحث تو کافر اور مشرک کریں گے، ایمان والے اور محبت کرنے والے تو ایسا نہیں کریں گے۔"

"کریں یا نہ کریں...... یہ الگ بات...... پر کر تو سکتے ہیں۔ جو مجرموں کو یہ رعایت دے رہا ہے، وہ مسلموں کو نہیں دے گا۔"

"آزمائش کا سبب تو میری سمجھ میں اب بھی نہیں آیا۔"

"بات ہے درجہ بندی کی۔ درجات جہنم میں بھی ہیں اور جنت میں بھی۔ اور درجہ بندی اعمال سے ہوتی ہے۔ جس نے کفر کیا، جہنم میں جائے گا۔ سخت شرک کیا، جہنم کے اس سے نچلے درجے میں جائے گا۔ جس نے سرکشی کی، اور نیچے۔ جس نے بغاوت کی، اور نیچے۔ اور جو اللہ کے مقابلے میں دو بدو لڑنے کے لئے کھڑا ہوگیا، وہ سب سے نچلے درجے میں جائے گا۔ بدترین عذاب جھیلے گا۔"

"جی بالکل......!"

"تو درجے ہوئے نا...... اور درجے جنت میں بھی ہیں۔ اور درجے شرک کے بھی ہیں اور ایمان کے بھی۔ اور ویسے ہی محبت کے بھی۔ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ لیکن آزمائشوں کے ذریعے محبت تمام کر دیتا ہے۔ اور ایمان والوں اور محبت کرنے والوں پر مہربان اور نعمتوں اور عنایات سے راضی کرنے والا ہے۔ نہیں چاہتا کہ کسی کے دل کے شیشے پر بال بھی آئے۔ نہیں چاہتا کہ کوئی دل میں بھی سوچے کہ میرے ربّ نے میری آزمائش کی ہوتی تو میں اس، اپنے سے اوپر کے درجے والے سے بھی آگے نکل جاتا۔ تو آزمائشوں سے درجہ بندی ہوتی ہے پتر......!"

یہ سب یاد آیا تو عبدالحق کے دل کو تقویت سی ہوئی۔ اس نے سوچا۔

"سزا ہے یا آزمائش......؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اس کا کام تو بہرحال اسے قبول کرنا ہے اور اس میں راضی رہنا ہے۔ ربّ کی ناراضی کا خیال ہے تو اسے راضی کرنا، اسے منانا ہے۔ اور اس کا ایک ہی ذریعہ ہے...... توبہ اور استغفار۔"

بات پھر رحمت کی طرف آ گئی۔

اللہ کی رحمت کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ اس کی نعمتوں کا شمار ممکن نہیں۔ اس کی مغفرت بھی اس کی رحمت کا ہی حصہ ہے۔ اور اس کی مغفرت کا دامن اتنا وسیع ہے کہ روئے زمین پر قیامت تک پیدا ہونے، جینے اور مرنے والے تمام انسانوں کے گناہ وہ مغفرت ڈھانپ سکتی ہے۔ اللہ اللہ...... یعنی روئے زمین پر زندگی گزارنے والے اور گزار کر جانے والے اربوں انسانوں کے گناہ اللہ کی رحمت کے سامنے ترازو میں پاسنگ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

عبدالحق کا بے بسی کا احساس ایک پل میں ہوا ہوگیا۔ ایسی رحمت کے سامنے مایوسی کیسی......؟

پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ بندہ تو اپنے گناہوں کو بھی نہیں سمجھ پاتا، جو بے حد و بے حساب ہونے کے باوجود اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کی تعداد کے سامنے بالکل بے حیثیت ہوتے ہیں۔ اور اللہ کی رحمت کے سامنے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تو وہ جسے یہ احساس ہے کہ اللہ اس سے ناراض ہے، اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنے اس گناہ کو یاد نہیں کر پا رہا، جو اللہ کی ناراضی کا سبب ہے، تو وہ اللہ کی نعمتوں کو اور اس کی

رحمت کو کیسے سمجھ سکتا ہے......؟

اور اللہ کی رحمت اور مغفرت کیسی ہے۔ اسے پکارو...... اے گناہوں کو بخشنے والے......! توبہ کو قبول کرنے والے......! مہربان ربّ......! میں اپنے کھلے اور چھپے، صغیرہ اور کبیرہ، معلوم اور نامعلوم تمام گناہوں پر توبہ کرتا ہوں۔ مجھے بخش دے......! اور اگر تم سچے ہو تو ایک پل میں تمہارا رب تمہیں نوزائیدہ بچے کی طرح پاک اور معصوم کر دے گا۔

اللہ اللہ......! معلوم گناہ تو دس بیس ہی ہوں گے، اور نامعلوم گناہ تو سمندر کے جھاگوں سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں۔

یہ بات اس کے لئے خوشی اور طمانیت کا باعث تھی کہ اس بار وہ خوف اور غم سے نڈھال نہیں ہوا۔ وہ ہراساں بھی نہیں ہوا کہ اس کیفیت میں نہ کچھ سجھائی دیتا ہے، نہ دکھائی دیتا ہے۔ اس بار اللہ کی رحمت اس کے ساتھ تھی۔ وہ سکون سے سب کچھ سوچ اور سمجھ رہا تھا۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ ارجمند کی قربت اللہ کی طرف سے اس کے لئے ممنوعہ ٹھہری ہے۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ آزمائش ہو یا سزا، یہ اللہ جانتا ہے، اور اسے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اسے اس کو قبول کر لینا ہے۔ پیغام بالکل صاف اور واضح ہے۔

نفس آدمی کے ساتھ نہ لگا ہوتا تو دنیا میں اطاعت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ...... کہیں زیادہ ہوتی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ نے حکم دینے کے بعد اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں آدمی کو آزادی عطا کر دی ہے۔ اور آدمی عام طور پر نفس سے ہار جاتا ہے۔

اس معاملے پر غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اللہ نے اس معاملے میں آزادی تو اسے بھی دی ہے، مگر ذرا سختی کے ساتھ۔ وہ نہیں جانتا، وہ نفس سے ہار جاتا ہے تو غسل اس کے بس میں نہیں۔ اور اس کے نتیجے میں وہ تہجد اور فجر سے محروم ہو جاتا ہے۔

اب نفس سے ہار جانا تو بہت آسان ہے۔ البتہ نماز سے محرومی پر دکھ اور

پچھتاوا اللہ کی رحمت ہے۔ لیکن بار بار یہ سب کچھ ہونے کی صورت میں وہ دکھ اور پچھتاوا کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جائے گا۔ اور وہ اس محرومی کو قبول کر لے گا۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اس بے پروائی ہی کی وجہ سے تو وہ نفع سے نقصان کی طرف جاتا ہے۔

عبدالحق کا وجود تھرا گیا۔

''نہیں......! میں انشاء اللہ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے فیصلہ سمجھ لیا اور قبول کر لیا۔ لیکن میں کمزور ہوں، اس لئے اللہ سے استقامت کی دعا بھی کروں گا۔ اور اگر میں اپنے فیصلے پر قائم رہا تو یہ اللہ کی رحمت ہوگی۔''

''اور اگر میرے نفس نے مجھے زیر کر لیا...... میں اپنے نفس سے ہار گیا تو......؟'' اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

تو وہ خسارہ اٹھانے والوں میں شامل ہو جائے گا۔ اس کے اندر سے فوراً ہی جواب ابھرا۔ اور وہ خسارہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ ابھی تو وہ صرف فجر سے محروم ہوا ہے۔ بات اس سے آگے بھی جا سکتی ہے۔ ظہر بھی، پھر عصر بھی...... اور ممکن ہے کہ وہ پورے دن غسل سے محروم رہے۔

اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ اگر اللہ نے اسے غسل سے محروم ہی کر دیا تو......؟

''نہیں......! انشاء اللہ......! ایسا نہیں ہوگا'' اللہ نے اس پر رحمت فرمائی ہے۔ اپنے حکم کو سختی سے اس پر نافذ کیا ہے۔ یہ تو مقام شکر ہے۔ اللہ نے اس کے لئے اس سے بچنے کی راہ نہیں چھوڑی۔ اور اگر وہ اسے قبول نہیں کرتا تو پھر یہ عام خسارہ نہیں ہوگا۔ وہ تو راندۂ درگاہ ہو جائے گا۔

اس کا خوف دور ہو گیا۔ وہ اٹھا اور اس نے پہلے شکر کے دو نفل پڑھے کہ اللہ نے اس پر رحمت فرمائی۔ پھر اس نے قضائے حاجت کے لئے دو نفل پڑھے اور اللہ سے استقامت کی دعا کی۔

نماز پڑھ کر وہ اٹھا تو پرسکون تھا۔

❀❀❀

ارجمند بھی اس سلسلے میں غور کرتی رہی تھی۔

اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ معاملہ غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ پہلی بار جب عبدالحق نے پانی کے برف جیسا ٹھنڈا ہونے کی شکایت کی تھی تو اس کے خیال میں یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سردی کا موسم تھا اور ایسا ہو جاتا ہے۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تھا۔ اسے تو وہ کافی گرم لگا تھا۔ اتنا گرم کہ وہ خود نہاتی تو اس میں ٹھنڈا پانی ضرور ملاتی۔

لیکن وہ کوئی چونکانے والی بات نہیں تھی۔ ہر شخص کے جسم کی ضرورتیں دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ جو پانی اسے گرم لگ رہا تھا، وہ عبدالحق کو کم گرم لگ سکتا تھا، اور حمیدہ کو تو وہ ٹھنڈا ہی لگتا۔

مگر اس پر اسے تشویش ہوئی کہ عبدالحق کو وہ برف جیسا ٹھنڈا لگا۔ یہ بات تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

بہر حال ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی کسی کی جسمانی ضرورتیں تبدیل بھی ہو جاتی ہیں۔ سردی میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہانے والوں کو اچانک گرم پانی کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔

وہ اور گرم پانی لے کر آئی۔ اسے ملانے کے بعد تو وہ اس کے نزدیک کھولتا ہوا پانی تھا۔ وہ عبدالحق سے کہنا چاہتی تھی کہ اتنا گرم پانی تو جسم پر آبلے ڈال دے گا۔ لیکن اس نے کہا نہیں۔ بس دل میں اللہ سے عبدالحق کے لئے عافیت طلب کرتی رہی۔

اور پھر اسے عبدالحق کی چیخ سنائی دی تو اس نے یہی سمجھا کہ وہ گرم پانی کی وجہ سے چیخا ہے۔ لیکن عبدالحق نے بتایا کہ اسے وہ پانی بھی یخ بستہ لگا ہے تو وہ پریشان ہو گئی کہ معاملہ پُراسرار ہے۔ اور عبدالحق کو سردی چڑھ گئی تھی۔

بعد میں عبدالحق کے کندھوں پر آبلے دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ پانی کھولتا ہوا ہی تھا۔ لیکن عبدالحق کے جسم کو وہ یخ بستہ لگا تھا۔ اس کے باوجود آبلے پڑ گئے تھے، جن کا احساس عبدالحق کو بعد میں تکلیف کی وجہ سے ہوا۔

اس نے سوچا کہ خیال کی طرح یہ معاملہ بھی مشتبہ ہے...... اللہ کی طرف سے ہے یا شیطان کی طرف سے۔ پہلے تو یہ اسے شیطان کی کارروائی لگی کہ وہ میاں بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالنے کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا ہے۔ اس نے سوچا کہ اب

بلکہ عبدالحق اس کی طرف راغب ہو رہا ہے تو شیطان اسے دور کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ اور جب عبدالحق اس روز فجر سے محروم ہو گیا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ شیطان ہی ہے۔ وہ تو دوہرا کھیل تھا، جس کا انجام ہر طرح سے شیطان کو پسند آتا۔ یا تو اس کے اور عبدالحق کے درمیان جسمانی تعلق منقطع ہو جاتا یا عبدالحق نماز سے دور ہو جاتا۔

لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کا دل اس تجزیے کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

پھر اگلی بار اسے عبدالحق کی قربت نصیب ہوئی تو معاملہ برعکس تھا اور صورتِ حال وہی تھی۔ موسم بدل گیا تھا۔ عبدالحق نے اسے گرم پانی کو منع کر دیا تھا۔ لیکن اس بار شاور کا ٹھنڈا پانی عبدالحق کو کھولتا ہوا لگا۔ ارجمند نے اس پانی کے نیچے ہاتھ رکھا تو اسے وہ خوشگوار لگا۔ لیکن عبدالحق نے اس کے سامنے ہی چیخ مار کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

عبدالحق نے اسے اپنا کندھا دیکھنے کو کہا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں آبلے پڑ گئے ہوں گے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ بہر حال عبدالحق کے کندھوں میں جلن ہوتی رہی جو آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔

فجر کی نماز سے وہ اس بار بھی محروم ہو گیا۔

پہلی بار کو بمشکل سہی، بہر حال اتفاق سمجھا جا سکتا تھا۔ لیکن جب وہی کچھ دوبارہ ہوا تو احساس ہو گیا کہ صورتِ حال سنگین ہے۔ ارجمند کو بھی احساس ہو گیا کہ اس کا دل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اور اس کا تجزیہ غلط تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ دونوں بار عبدالحق کی فجر کی نماز قضا ہوئی تھی۔ لیکن ظہر سے پہلے اسے غسل کرنا نصیب ہو گیا تھا۔ اگر شیطان کے بس میں ہوتا تو وہ اسے ہمیشہ کے لئے غسل اور نماز دونوں سے محروم کر دیتا۔ کچھ نہیں تو وہ عبدالحق کو غسل کے معاملے میں اس قدر خوفزدہ کر دیتا کہ ناپاکی ہمیشہ کے لئے اس پر مسلط ہو جاتی۔

اس بار انہوں نے اس پر بات کی۔ عبدالحق بہت پریشان تھا اور وہ اس کی دلجوئی کی کوشش کر رہی تھی۔ عبدالحق کا خیال تھا کہ اللہ اس سے ناراض ہے اور یہ اس کے لئے سزا ہے۔ جبکہ اس کے خیال میں یہ آزمائش تھی۔

اس نے تنہائی میں عبدالحق کی بات پر بہت غور کیا۔ لیکن اسے ناراضی کا کوئی سبب سجھائی نہیں دیا۔ عبدالحق اس کی فہم کے مطابق اللہ کا اطاعت شعار بندہ تھا۔ اللہ

نے اپنی رحمت سے اسے اپنا خوف بھی عطا فرمایا تھا۔ تبھی تو اسے ہر بات میں اللہ کی ناراضی کا خیال ہوتا تھا۔ اپنے ایسے بندے سے، جس پر وہ اتنا فضل فرماتا ہو، ایسے کہاں خفا ہوتا ہے۔ وہ تو اپنے عام بندوں سے بھی اتنی آسانی سے خفا نہیں ہوتا۔ وہ تو بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس کا خیال تھا کہ یہ محرومی دونوں کے لئے ہے اور سزا بھی۔ لیکن عبدالحق نے ٹھیک کہا۔ وہ تو پہلے ہی اللہ کو گواہ بنا کر اپنے ہر حق سے دستبردار ہو چکی تھی۔ اب تو اس کا حق بھی اس کے حق میں اللہ کے لئے انعام تھا۔ اور آزمائش یا سزا، وہ جو بھی تھی، صرف عبدالحق کے لئے تھی۔ کیونکہ غسل اس کے لئے تو دشوار نہیں کیا گیا تھا، اور نہ ہی وہ نماز سے محروم ہوئی تھی۔

پھر اس پر اسے خیال آیا کہ وہ اپنے حق سے دستبردار کیوں ہوئی تھی.....؟ صرف اس کے لئے کہ عبدالحق نے اللہ کی محبت میں اسے ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''تو کیا اللہ اب عبدالحق کو یاد دلا رہا ہے۔ اپنی محبت کا دعویٰ اور اس کا ارادہ.....؟''

اس کے دل میں یقین ابھرا کہ بات یہی ہے۔

اور غور کرنے پر اس کی سمجھ میں آیا کہ عبدالحق نے کیا غلطی کی ہے۔ اللہ کو یہ دونوں باتیں بہت ناپسند ہیں کہ اس کے بندے اس کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو اپنے اوپر حلال کر لیں اور اس کی حلال قرار دی ہوئی کسی نعمت کو اپنے اوپر حرام کر لیں۔ اور عبدالحق نے یہی تو کیا تھا، خواہ اس کی نیت کتنی ہی اچھی رہی ہو۔ تو اللہ نے اس کی پاداش میں اسے عبدالحق سے خود دور کر دیا تھا۔

اس کا دل غم سے بھر گیا۔

عبدالحق اللہ کی ناراضی کا سبب جاننا چاہتا تھا اور وہ اسے بتا سکتی تھی۔ اس نے سوچا۔

''مجھے آغا جی کو یہ بات بتانی چاہئے۔'' لیکن وہ ڈر گئی۔ قوی امکان اس بات کا تھا کہ یہ جاننے کے بعد عبدالحق اسے آزمائش قرار دے کر اسے چھوڑ دے گا۔ اور وہ اس کے نام سے بھی محروم ہو جائے گی۔ یہ وہ گوارہ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے وہ

پنے لفظوں سے عبدالحق کو اپنے سامنے ہلکا اور شرمندہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

تاہم اس نے سمجھ لیا کہ اب یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ عبدالحق کو اس کے کمزور لمحوں میں بھی بھٹکنے نہ دے۔ اسے روک دے۔

اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

❁❁❁

عبدالحق کو کبھی اس سے انکار نہیں رہا تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں ارجمند سے خوب صورت اور حسین کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔ لیکن یہ بھی وہ پوری سچائی سے کہہ سکتا تھا کہ مرحومہ نور بانو سے زیادہ پرکشش اسے کبھی کوئی نہیں لگا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نور بانو حسین تو کیا، بمشکل قبول صورت تھی۔ کبھی وہ اس پر حیران بھی ہوتا۔ ارجمند کا بے پناہ حسن نگاہوں کے لئے دل نواز تھا۔ اس کو دیکھ کر جی نہیں للچاتا تھا، بلکہ پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔ دل میں اچھی سوچ ابھرتی تھی۔ وہ اللہ کی صناعی کو دل میں سبحان اللہ کہہ کر بے ساختہ داد دیتا۔ میر انیس کا شعر پہلی بار پوری طرح اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

لیکن نور بانو خوب صورت نہ ہونے کے باوجود اسے بھڑکاتی۔ وہ جیسے آگ تھا اور وہ تیل۔ اس کو دیکھ کر اس کے وجود میں نفسانی خواہشیں مچلنے لگتیں۔ اس کی دید میں سکون نہیں تھا، فتنے تھے۔ ارجمند کو دیکھ کر وجود میں روشنی اور ٹھنڈک پھیلتی اور نور بانو کو دیکھ کر آگ بھڑک اٹھتی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتا کہ وہ اس کی بیوی ہے، ورنہ بہت بڑی آزمائش، بلکہ فتنہ بن جاتی اس کے لئے۔

اللہ کی رحمت کہ وہ دونوں ہی اس کی بیویاں تھیں۔ اور وہ جانتا تھا کہ شروع ہی سے وہ حسن پرست ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ پھر حسین ترین ارجمند اس پر اثر انداز نہیں ہوتی، جبکہ واجبی شکل وصورت کی نور بانو اسے پاگل کر دیتی ہے۔ پھر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ کشش زیادہ بڑی چیز ہے، اور کشش اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔

مگر اب اچانک ایک بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ ارجمند میں اسے اس سے کہیں زیادہ کشش محسوس ہونے لگی، جتنی نور بانو میں محسوس ہوتی تھی۔ یہ بات اس کے لئے اتنی ناقابل فہم بھی نہیں تھی۔

اس نے ارجمند کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ تبدیل ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ خوب صورت ہوگئی تھی۔ اس نے پہلے والی ارجمند کا تصور کیا اور اس کا سامنے موجود ارجمند سے موازنہ کیا تو یہ بات واضح ہوگئی۔

اور وہ تبدیلی قدرتی بھی تھی اور فطری بھی۔

پہلے ارجمند لڑکی تھی، نودیدہ کلی جیسی، اور اب وہ ایک شگفتہ، مہکتا ہوا پھول بن چکی تھی۔

ارجمند اس وقت سو رہی تھی، اور وہ اسٹڈی میں اپنے معمولات سے نمٹ کر سونے کے لئے آیا تھا۔ لیکن ارجمند کو دیکھ کر وہ سونا بھول گیا۔

اس نے ارجمند کو بہت غور سے، بہت تفصیل سے دیکھا۔ اب وہ لڑکی نہیں تھی، لیکن اسے عورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس وقت وہ حسن و جمال کے اعتبار سے اپنے نکتہ عروج پر تھی۔ شاید عورت وہ اس لئے نہیں لگتی تھی کہ ابھی ماں نہیں بنی تھی۔

اس نے بے ساختہ ارجمند کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر فوراً ہی کھینچ لیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اسے اس نعمت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس نے گھبرا کر منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن وہ عجیب بے پناہ کشش تھی۔ وہ اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور سر گھما کر پھر اسے دیکھنے لگا۔

اس بار نفسانی خواہش اتنی شدید تھی کہ اسے پہلے کبھی اس کا تجربہ ہی نہیں ہوا تھا۔ ایسا تو کبھی نور بانو کے معاملے میں بھی نہیں ہوا تھا۔

کئی بار اس نے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اندر سے اٹھنے والی تنبیہی آواز بے حد توانا تھی۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

خواہش تند ہوتی گئی۔ ایسے میں آدمی ہار جاتا ہے۔ لیکن اس کے اندر ایک

مزاحمت موجود تھی، جو خواہش کی تندی کے ساتھ اس سے زیادہ بڑھ رہی تھی۔ اسے اپنی تہجد اور فجر کی پاسداری اور حفاظت کا خیال روک رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر تسبیح شروع کر دی۔ لیکن وہ اسے دیکھنے سے خود کو نہیں روک سکا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سو نہیں سکے گا اور بالآخر تہجد سے تو محروم ہو ہی جائے گا۔

لیکن اسے پتا بھی نہیں چلا اور اسے نیند آ گئی۔ کتنی دیر میں آئی......؟ یہ وہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بس وہ اللہ کی رحمت تھی۔

وہ تہجد کے لئے اٹھا۔ فجر بھی پڑھی۔ نماز میں ارتکاز اور حضوری کی کیفیت بھی تھی۔ لیکن اس کے بعد ارجمند اس کے سامنے آئی تو وہ بے خود ہوگیا۔ اس نے ارجمند کو ایسے دیکھا کہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ خوب صورت اور پاکیزہ چہرہ، وہ اس کی شفاف اور روشن آنکھیں، وہ معصوم محبت بھری نگاہ، وہ دمکتی ہوئی پیشانی، وہ پھولوں کی طرح شگفتہ لب و رُخسار، سبحان اللہ......!

پھر اس کی نگاہ نے نیچے کا سفر کیا اور وجود میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ دل سے اٹھتی سبحان اللہ کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی۔ سوچیں منتشر ہونے لگیں۔

پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ مکمل حسن کیا ہوتا ہے......؟ وہ صرف چہرہ نہیں تھا، سراپا تھا۔ وہ صرف پری چہرہ نہیں تھی، نہایت خوش بدن اور متناسب الاعضا بھی تھی۔ وہ ایک ایسے خوب صورت درخت کی طرح تھی، جو نہایت خوب صورت اور خوش رنگ پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا ہو۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی دیکھتی ہوئی نگاہوں کی حدت ارجمند تک نہ پہنچتی۔ کچھ یوں بھی کہ وہ اس کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ لیکن احساس ہونے کے باوجود اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔ عبدالحق کی آنکھوں میں مچلتی ہوئی خواہش تو بالکل واضح تھی۔ اور وہ تسلسل اور وارفتگی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس

کی نظریں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں۔ لیکن وہ اسے بہت اچھا بھی لگا۔

اس وقت کھانے کی میز پر حمیدہ نہیں تھی، اور یہ غنیمت تھا۔

''آغا جی......! ایسے کیسے دیکھ رہے ہیں مجھے؟'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''تو کیا ہوا......؟'' عبدالحق کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ کسی ٹرانس میں ہو۔ اس میں بے خودی تھی، جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے......؟

''آپ مجھے گھور رہے ہیں آغا جی......!'' ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی تنبیہ در آئی۔

''تو کیا......؟'' عبدالحق کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

''دادی اماں آنے ہی والی ہیں۔ وہ دیکھیں گی تو کیا سوچیں گی......؟''

''کیا سوچیں گی......؟''

''وہ جو بھی سوچیں گی، اس پر مجھے اتنی شرم آئے گی کہ شاید میں ان کے سامنے کبھی نظر نہ اٹھا سکوں۔'' ارجمند نے سرد لہجے میں کہا۔

''آپ کا مجھے پتا نہیں...... لیکن آپ شرمندہ نہ ہوئے تو اس پر مجھے حیرت ہو گی۔''

اس بار عبدالحق بری طرح چونکا۔ اس کی پلکیں جھپکیں اور اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس وقت حمیدہ آتی نظر آئی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''تو نے ناشتہ شروع نہیں کیا پتر......؟'' حمیدہ نے قریب آ کر کہا۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ کے بغیر کیسے کروں اماں......؟''

''چل...... اب تو میں آ گئی نا......!''

لیکن عبدالحق کو ناشتے میں کوئی رغبت نہیں تھی۔ بار بار اس کی نظریں ارجمند کی طرف اٹھتیں۔ مگر وہ فوراً ہی نظر نیچی کر لیتا۔

دفتر میں بھی عبدالحق کا یہی حال رہا۔ ارجمند کا سراپا اس کی نگاہوں سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔

❁❁❁

ارجمند کی سمجھ میں بھی صورتِ حال آ گئی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ یہ تو انسان کی فطرت ہے، ایسی فطرت کہ جب وہ ناسمجھ بچہ ہوتا ہے، تبھی سے وہ روبہ عمل ہوتی ہے۔ جس چیز کو ممنوعہ قرار دیا جائے، اس میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جتنی سختی سے منع کیا جائے، کشش بھی اتنی ہی زیادہ بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ اس سے لڑنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہی تو آزمائش ہے۔

آدمی زندگی کے مختلف ادوار سے گزر کر بڑھاپے کی حد میں پہنچ جاتا ہے، تب بھی ترغیبات اس کے سامنے رہتی ہیں اور ان سے اس کی جنگ جاری رہتی ہے۔ کبھی وہ ہارتا ہے، توبہ کرتا ہے، پھر ہارتا، پھر توبہ کرتا ہے، اور کبھی ایسے ہارتا ہے کہ ہتھیار ہی ڈال دیتا ہے۔

یہی زندگی ہے۔

اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ یہ آزمائش نہ اس کی ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے ہے۔ اس کے باوجود یہ عبدالحق سے بڑھ کر اس کے لئے آزمائش ہے۔ اللہ نے میاں اور بیوی کا رشتہ ایسا بنایا ہے، جیسے جسم اور لباس کا۔ جیسے وہ عبدالحق کی ذمہ داری تھی، ویسے ہی عبدالحق بھی اس کی ذمہ داری تھا۔ عبدالحق ایک بڑا مقام حاصل کرنا چاہتا تھا، تو اسے اس حصول کے لئے عبدالحق سے ہر طرح کا تعاون کرنا تھا، ہر طرح کی مدد کرنا تھی۔ اسے دیکھنا تھا کہ عبدالحق کو اس راستے میں کہیں ٹھوکر نہ لگے، وہ راستے سے نہ بھٹکے۔ وہ منزل پر پہنچے، کیونکہ عبدالحق کی کامیابی اس کی اپنی کامیابی تھی۔ صلہ تو اسے بھی ملنا تھا۔

اس صبح عبدالحق کی وارفتگی اور اس پر اپنے ردِعمل سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اب تک اللہ کی مہربانی اور اس کے فضل و کرم سے معاملات اس کے لئے نہایت آسان رہے تھے۔ بات اتنی تھی کہ اللہ کی رحمت سے اس نے خود کو عبدالحق کے تابع رکھا تھا۔ اس کا روّیہ اب تک یہ رہا تھا کہ جو کچھ مل جائے، اسے اللہ کی نعمت سمجھ کر لے لو اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ اور جو نہ ملے، اس کے بارے میں سوچو بھی نہیں۔ اور خود سے کوئی خواہش، کوئی مطالبہ نہ کرو۔ کوئی امید بھی نہ رکھو۔ امید تو صرف اللہ سے ہی رکھنی ہے۔

جب آدمی کو اللہ کے فضل سے یہ وصف مل جائے تو اسے کسی سے شکایت کبھی نہیں رہتی۔ اور شکایات میں ہی تو باہمی تعلقات کے لئے شر اور فساد ہے۔

اب وہ پہلے سے بہتر طور پر سوچنے اور سمجھنے کے قابل تھی۔

شجر ممنوعہ ہی کی وجہ سے تو آدم علیہ السلام اور اماں حوا جنت سے بے دخل ہوئے تھے۔ شیطان کا یہ سب سے کامیاب اور موثر حربہ تھا۔ وہ دلوں میں منع کی گئی چیزوں اور کاموں کی خواہش جگاتا تھا۔ اور آدمی تو ہے ہی خواہشوں کا غلام۔ اسی لئے تو وہ خسارے میں ہے۔

دشواری یہ ہے کہ آدمی جو کچھ سمجھتا ہے، اس کے بارے میں بھی شکوک و شبہات کا شکار رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ممکن ہے، اس نے غلط سمجھا ہو۔ ممکن ہے، یہ شیطان نے اسے سمجھایا ہو۔ ارجمند کی بھی یہی کیفیت تھی۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ نکاح کے ذریعے عبدالحق پر حلال کی گئی تھی، اور اسی طرح عبدالحق بھی اس پر حلال کیا گیا تھا۔ اور جو کچھ اللہ نے حلال کیا اور عطا فرمایا، وہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اور جس نے نعمت سے منہ موڑا تو ناشکری کی اور محرومی کو دعوت دی۔

عبدالحق کو اللہ سے محبت کی آرزو تھی۔ اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس آرزو کی شدت اور بے تابی میں وہ غلطی کر گیا۔ آدمی کو کوئی بھی بڑا کام کرتے وقت نظیر سامنے رکھنی چاہئے...... سب سے بڑی نظیر، یہ تو زندگی کے لئے بھی ہے، جو بنیادی نعمت ہے۔ تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نظیر سامنے نہیں رکھی۔

اللہ نے جو حکم دیا، آپ علیہ السلام بجا لائے۔ بغیر کسی جھجک کے۔ ہر آزمائش میں پورے اترے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہ خواہش کی، نہ ہی دعویٰ کیا۔ تو یہ بات واضح ہوگئی کہ محبت میں دعوے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت۔ محبت تو خود کو آپ ہی ثابت کر دیتی ہے۔ اور اللہ کی محبت میں تو اس کی گنجائش ہی نہیں۔ یہاں تو بس آدمی خواہش کرے تو اللہ سے دعا کرے۔ کیونکہ ملتا تو سبھی کچھ اسی کے حکم سے، اسی کے خزانوں سے ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم پر خدائی کا دعویٰ کرنے والے کے

سامنے اللہ کی دعوت پیش کی۔ اس سے بالکل نہیں ڈرے۔ اللہ پر بھروسہ ایسا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی مدد گوارہ نہیں تھی۔ ہنسی خوشی، انجام سے بے نیاز آگ میں کود گئے۔ محبوب بیٹے کو قربان کرنے کے لئے دل و جان سے راضی، اور عمل پیرا بھی ہوگئے۔

لیکن نکتہ یہ ہے کہ خود سے کچھ نہیں چھوڑا، جو چھوڑا، اللہ کے حکم پر چھوڑا۔ محبوب بیوی اور شیر خوار بچے کو سنسان مقام پر جہاں کھانے پینے کا بھی کوئی سامان نہیں تھا، چھوڑ کر رُخصت ہوئے تو اللہ کے حکم پر۔ اور بیوی کے پوچھنے پر کہ ہمیں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہیں......؟ بے جھجک جواب دیا۔ اللہ کے سہارے۔ اور فرمانبرداری ایسی کہ جاتے ہوئے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ کیسے کیسے دل چاہا ہوگا آپ علیہ السلام کا۔

تو محبت کا جزوِ اعظم فرمانبرداری اور اطاعت ہے

جب تو نے کہا مان گئے؟ مان گئے ہم

اور زندگی کی نظیر......!

وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر صفا کی پہاڑی سونے کی ہو جاتی۔ جو چاہتے، مل جاتا۔ لیکن مانگا کیا......؟ اللہ کی رضا......! اس کے بندوں کے لئے ہدایت...... اپنی امت کے لئے مغفرت...... فاقے بھی کیئے، پیٹ پر پتھر بھی باندھے۔ اچھا کھانا خوش ہو کر، اللہ کا شکر ادا کر کے کھایا، جو اللہ نے عطا کیا، اس پر رغبت کی، اس سے استفادہ فرمایا۔ کسی چیز سے منہ نہ موڑا، نہ تکلیف سے اور نہ ہی راحت سے۔ ازواج سے محبت فرمائی، نرمی برتی، انہیں خوش رکھا۔ صرف اپنے دور کے لوگوں کی نہیں، قیامت تک روئے زمین پر سانس لینے والے انسانوں کی فکر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف 63 سال کی زندگی میں صدیوں کی زندگی جیئے۔ یہ ہے وہ زندگی، جس کی پیروی کی جائے۔ ویسی زندگی جینا ممکن نہیں۔ لیکن اس کی کوشش بھی زندگی کے معیار کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتی ہے۔

ثابت ہوا کہ محبت رہبانیت میں نہیں۔ کامیابی بھی رہبانیت میں نہیں۔ اللہ کی محبت تو اللہ کی طرف سے ہے اور وہ اللہ کی اطاعت میں ہے۔ اللہ کہے، ترک کر دو تو ترک کر دو۔ اللہ اپنانے کو کہے تو اپنالو۔

وہ چونکی۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ یہ سب کیسے سوچ رہی ہے......؟ سمجھ میں آیا کہ یہ اللہ کا کرم ہے۔

اللہ کی رحمت تھی کہ وہ جانتی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ امتحانوں کی بہتر تیاری کے لئے ماڈل ٹیسٹ پیپر بنائے جاتے ہیں، تاکہ پتا چل جائے کہ سوال کس طرح کے ہوں گے اور جواب کیا ہونے چاہئیں......؟ اور زندگی بے شمار سیکشنز پر مشتمل ایک طویل مضمون ہے، امتحان ہے، جس کے نتیجے کا اعلان قیامت کے دن ہونا ہے۔ تو یہ ماڈل ٹیسٹ پیپر کی سہولت اللہ کی جاری کی ہوئی ہے۔ مردوں کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور عورتوں کے لئے امہات المومنین کی زندگی۔ اس پر نظر رکھو، اس سے رہنمائی حاصل کرو تو انشاء اللہ کامیابی ملے گی۔

محبت کی آرزو کے جوش میں عبدالحق نے غلط سمت میں قدم اٹھا لیا تھا۔ وہ ترکِ دنیا کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ اللہ کی خاطر اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے منہ موڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے قد سے بہت بڑا ارادہ کیا تھا اور شاید اللہ سے تائید طلب کئے بغیر کیا تھا۔ ایسے میں تو آزمائش بہت سخت ہوتی ہے۔

اور اب وہ اسے سزا سمجھ رہا تھا اور یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ کس جرم کی سزا ہے۔ سچ ہے، آدمی صرف اسی وقت کچھ سمجھتا ہے، جب اللہ کی مرضی ہو۔

اور وہ جانتی تھی کہ یہ آزمائش ہے۔ وہ وجہ سمجھ گئی تھی، لیکن اسے نہیں سمجھا سکتی تھی۔ وہ اس وضاحت اور تشریح کو اس کے نفس کا شاخسانہ سمجھ کر مسترد کر دیتا۔ وہ ہلکی بھی ہوتی اور عبدالحق کو اس سے فائدہ بھی نہ ہوتا۔ اس لئے اس نے چپ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن اب اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ بھی اللہ ہی کی طرف سے تھا۔ اور اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ آزمائش اس کے لئے بھی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ ایک کا عمل دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے، اچھا ہو یا برا۔

صبح عبدالحق کی دہکتی نظروں نے اس کے وجود میں سپردگی کے ساتھ خواہشات جگا دی تھیں۔ اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو صرف عبدالحق کی عملی پیش قدمی کے نتیجے میں اس کا ردِ عمل ابھرتا تھا۔

یہ بہت خطرناک بات تھی اور اس نے اس کی ذمہ داری اور بڑھا دی تھی۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اللہ نے اسے، اس کے وجود کو عبدالحق کی آزمائش بنایا ہے۔ اور اس کے اندر کی سپردگی نے اس آزمائش کو عبدالحق کے لئے اور سخت کر دیا ہے۔ اس کیفیت میں اگر وہ ایک بار بھی عبدالحق کی طرف لپکی تو عبدالحق سنبھل نہیں سکے گا۔ اور اس کے بعد بات آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔ ایک سے دو نماز، ایک دن سے ایک ہفتے تک، بلکہ اس سے آگے بھی معاملہ جا سکتا ہے۔

تو اسے خود کو بھی روکنا تھا اور عبدالحق کو بھی۔ ان میں سے ایک بھی بہت مشکل تھا۔ جبکہ یہاں تو دو دو تھے۔ اس روز اس نے خاص طور سے نمازِ حاجت پڑھ کر اللہ سے مدد چاہی۔

اس رات اسے احساس ہوا کہ اس کے وجود میں کچھ الارم نصب کر دیئے گئے ہیں۔ عبدالحق اس کی طرف دیکھتا تو الارم بجنے لگتے۔ وہ دوپٹہ ڈھنگ سے لیتی، لیکن اسے دوپٹے کے بہت مختصر ہونے کا احساس ستانے لگتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے وجود کو جو عبدالحق کے لئے بہت خطرناک ترغیب بن چکا ہے، کیسے چھپائے......؟

اس کے نتیجے میں اس نے فیصلہ کیا کہ عبدالحق کے سامنے کم سے کم آئے گی۔ یہ بھی آسان نہیں تھا۔ مگر کچھ نئی مصروفیات کے ذریعے وہ ایسا کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے گھر میں بھی ہر وقت چادر اوڑھنی شروع کر دی۔

وہ ہمیشہ عبدالحق سے پہلے سو جاتی تھی۔ اس رات اپنے اندر کے الارم کی وجہ سے گہری نیند کے باوجود اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جاگی، لیکن اس نے آنکھیں کھولنے کے بجائے آنکھوں میں جھری سی بنائی۔ نگاہ کو اندھیرے سے ہم آہنگ ہونے میں کچھ دیر لگی۔ پھر اس نے دیکھا کہ عبدالحق وارفتگی سے اس کے سراپا کو تک رہا ہے۔ پھر جیسے وہ چونکا اور اس نے کروٹ بدل لی۔

گرمی کے موسم میں وہ چادر اوڑھ کر نہیں سوتی تھی۔ چادر اسے بوجھ لگتی تھی۔ لیکن اب اس نے سوچ لیا کہ اگلے روز سے وہ خود کو بہت اچھی طرح چادر میں لپیٹ کر سویا کرے گی۔

عبدالحق نے پھر کروٹ بدلی اور پہلے کی طرح اسے تکنے لگا۔ وہ دل میں عبدالحق کے لئے صبر کی دعا کرتی رہی۔ پھر عبدالحق نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ قریب تھا کہ وہ بدن چرا کر پیچھے ہو جاتی۔ لیکن اس سے پہلے ہی عبدالحق نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ یقیناً ذکر کر رہا تھا۔

اگلے روز وہ دن بھر اس مسئلے پر غور کرتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ باتیں آئیں۔ بنیادی بات یہ تھی کہ اسے خود کو عبدالحق کے لئے پُرکشش ہونے سے روکنا تھا۔ جبکہ اللہ نے اسے نہایت خوب صورت اور پُرکشش بنایا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔

اسے ہنسی آ گئی۔ یہ اس کے ساتھ کیسا الٹا معاملہ ہوا ہے......؟ عورتیں اپنے شوہروں کے لئے سنگھار کرتی ہیں۔ اپنی کشش کو اُجاگر کرتی ہیں۔ اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر اسے اپنے شوہر کی فلاح کے لئے اس کے برعکس کرنا ہے۔ اسے اپنے شوہر کو خود پر ملتفت نہیں کرنا، بلکہ اسے بے زار کرنا ہے۔

اس نے سنجیدگی سے اس پر سوچا۔ چہرے کا تو وہ پہلے ہی کوئی خیال نہیں کرتی تھی۔ وہ تو کبھی لپ اسٹک بھی نہیں لگاتی تھی۔ لہٰذا وہ اتنا ہی کر سکتی تھی کہ بے ڈھنگا اور ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے۔ ان رنگوں کا انتخاب کرے، جو عبدالحق کو ناپسند ہیں۔ تیز خوشبو لگائے، جس سے عبدالحق بدکتا ہے۔

اور اس نے سوتے ہوئے چادر اوڑھنی شروع کر دی۔ اس کے الارم بدستور کام کر رہے تھے۔

لیکن ایسا لگا کہ کوئی تدبیر کام نہیں کرے گی۔ اس کی ہر کوشش ناکام رہی۔ ہر رات عبدالحق کی وہی کیفیت ہوتی۔ اور جب بھی ایسا ہوتا، ارجمند کی آنکھ کھل جاتی۔ مگر وہ عبدالحق پر یہ بات ظاہر نہ کرتی۔ وہ عبدالحق کی کشمکش دیکھتی۔ عبدالحق کی بے تاب خواہش اس کے اپنے اندر بھی فتنے جگا دیتی۔ اسے ہر پل یہ ذہن میں رکھنا ہوتا کہ اسے دوطرف جنگ لڑنی ہے۔ خود سے بھی اور عبدالحق سے بھی۔

عبدالحق اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور کھینچ لیتا۔ وہ خود کو ذکر میں مصروف کرتا، منہ پھیرتا، مگر پھر اس کی طرف دیکھتا۔ اور ہر گزرتی رات کے ساتھ عبدالحق کے

اس کی طرف ہاتھ بڑھانے میں تواتر آ رہا تھا۔

ارجمند نے سمجھ لیا کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں، جب عبدالحق اسے چھوئے گا اور اسے اس کو روکنا پڑے گا۔ وہ وقت ایک نہیں، کئی زاویوں سے اس کے لئے سخت ہوگا۔ وہ اللہ سے دعا کرتی کہ اللہ اس وقت کو ان دونوں سے دور رکھے اور اسے استقامت عطا فرمائے۔

اور پھر ایک رات وہ وقت آ ہی گیا۔

❁❁❁

ارجمند عبدالحق کے لئے بہت بڑی آزمائش بن گئی تھی۔

آزمائش تو انسان کے لئے ہوتی ہی سخت ہے۔ یا یوں کہیے کہ اللہ جب چاہے تو انسان کو کڑی سے کڑی آزمائش سے بچا لیتا ہے، اسے اپنے بندے کے لئے آسان کر دیتا ہے، اسے آسانی اور کامیابی کے ساتھ اس سے گزار دیتا ہے۔ اور جب چاہے، کسی آزمائش کو اس کے لئے سخت کر دیتا ہے۔

وہ آزمائش اس لئے زیادہ کڑی تھی کہ ارجمند اس کی بیوی تھی، اس کے تصرف میں تھی اور اللہ کی طرف سے اسے اس پر ہر طرح کا حق حاصل تھا۔ ایسے میں خود کو روکنا آسان نہیں ہوتا۔

بس یہ خیال اسے بچا لیتا تھا کہ وہ اپنی نماز کی حفاظت کی جنگ لڑ رہا ہے...... خود سے اور اپنے نفس سے۔

پھر اس نے ارجمند میں تبدیلیاں دیکھیں۔ پہلے ایسا ہوتا تو شاید اسے پتا بھی نہیں چلتا، کیونکہ وہ ارجمند کو غور سے کب دیکھتا تھا......؟ لیکن اب تو اس کا جی چاہتا تھا کہ ارجمند ہر وقت سامنے رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔ بلکہ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ......

اور تصور میں تو وہ ہر وقت رہتی تھی، دفتر کے اوقات میں بھی۔

استغفار، نوافل، قرآن اور ذِکر، شام سے رات سونے کے وقت تک وہ اور کچھ کرتا ہی نہیں تھا۔ بس ایک نورالحق کے معمول کے لئے وقفہ کرنا ہوتا تھا۔ اور سونے کے لئے وہ بیڈروم میں جاتا تو آزمائش شروع ہو جاتی۔ اسے تو لگتا تھا کہ وہ رات بھر

سو ہی نہیں سکے گا۔ لیکن یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت تھی کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی کشمکش کے بعد بالآخر اسے نیند آ جاتی تھی۔ وہ اس پر خاص طور پر اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔

ایک رات اس نے معمول کے مطابق سر گھما کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ارجمند پوری طرح چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ جھنجلا گیا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ گرمی کے موسم میں تو ارجمند کو چادر سے الجھن ہوتی تھی۔

تو کیا وہ اب اسے دیکھنے سے بھی محروم ہو جائے گا......؟ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چادر نوچ کر پھینک دے۔ لیکن یہ بڑی بدتہذیبی کی بات ہوتی۔ اس کے دل نے اس خیال پر اسے ملامت کی اور وہ شرمندہ ہو گیا۔

اس سے ایک تبدیلی بہر حال آئی۔ اس کی شدت میں تو کمی ہوئی، لیکن جھنجلاہٹ مستقل ہو گئی۔ پہلے اس کے اندر ارجمند کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ بڑھانے کی خواہش ابھرتی تھی، جبکہ اس رات وہ اس دشمنِ دید چادر کو نوچ پھینکنے کے لئے بار بار ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

بہر حال اللہ کی رحمت سے کچھ دیر بعد اسے نیند آئی۔ اس نیند کا یہ بہت بڑا کمال تھا کہ وہ بہت گہری اور بھر پور نیند ہوتی تھی۔ تازہ دم کر دینے والی۔

اس صبح اس نے دفتر کے لئے تیار ہوتے ہوئے ارجمند سے کہا۔

''رات تم چادر اوڑھ کر سو رہی تھیں......؟''

''جی آغا جی......!''

''خیریت تو ہے......؟ طبیعت تو ٹھیک تھی......؟'' اس نے لہجے میں تشویش سموتے ہوئے پوچھا۔

''جی......! بالکل ٹھیک تھی......!''

''تو پھر......؟ تمہیں تو چادر سے الجھن ہوتی تھی ہمیشہ......؟''

''جی......! کوئی تبدیلی آئی ہے مجھ میں......!'' ارجمند نے کہا۔

''اب چادر اوڑھے بغیر نیند ہی نہیں آتی کسی طرح......!''

اب عبدالحق اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایسا نہ کرو۔ اس کا نہ کوئی جواز تھا اور نہ یہ اس کا حق تھا۔ وہ چپ ہو گیا۔

اس بات کا تو اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ ارجمند اس کے سامنے آنے سے گریز کر رہی ہے، کیونکہ پہلے کبھی وہ اس پر دھیان ہی نہیں دیتا تھا۔ لیکن یہ اس کی سمجھ میں آیا کہ ارجمند میں واقعی کوئی بڑی تبدیلی آئی ہے۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔

اتوار کو وہ دونوں قرآن فہمی کے لئے بیٹھے تو اسے کچھ ناخوش گواریت کا احساس ہوا۔ غور کرنے پر اس کی سمجھ میں بھی آ گیا۔

''یہ اتنی تیز خوشبو لگائی ہوئی ہے تم نے......؟'' اس بار اس کے لہجے میں کھلا اعتراض تھا۔

''جی......! آپ کو بری لگ رہی ہے......؟''

''بری تو نہیں...... ناخوش گوار کہہ لو......!'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن تمہیں تو بہت ہلکی خوشبوئیں پسند تھیں......؟''

''میں نے کہا تھا نا کہ مجھ میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

''آپ منع کرتے ہیں تو نہیں لگاؤں گی۔''

''میں نے منع تو نہیں کیا۔'' عبدالحق نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''تمہیں اچھی لگتی ہے تو میں تمہیں کیوں روکوں......؟'' اسے امید تھی کہ اس کی ناپسندیدگی سمجھ کر ارجمند خود ہی تیز خوشبو سے پرہیز کرے گی۔

''شکریہ آغا جی......!''

عبدالحق کو اس سے مایوسی ہوئی۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

''لیکن باہر جاتے ہوئے ایسی خوشبو نہ لگانا۔''

''میں جانتی ہوں آغا جی......! اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ باہر جاتے ہوئے تو میں خوشبو لگاتی ہی نہیں۔''

پھر عبدالحق کو احساس ہوا کہ تبدیلی ارجمند کے لباس میں بھی آئی ہے۔ وہ گہرے رنگ کے بڑے پھولوں والے کپڑے پہننے لگی تھی، جو بہت گنوار لگتے تھے۔ اسے حیرت ہوئی، کیونکہ ارجمند کو اس نے ہر معاملے میں ہمیشہ خوش ذوق پایا تھا۔

اور یہی نہیں......اب وہ کپڑے بہت ڈھیلے ڈھالے پہن رہی تھی۔

اس نے اس پر اسے ٹوک دیا۔

''تنگ کپڑوں میں مجھے گھٹن محسوس ہوتی ہے آغا جی......!'' ارجمند نے جواب دیا۔

''مگر اتنے ڈھیلے کپڑے......؟''

''مجھے اچھے لگتے ہیں...... آرام ملتا ہے۔''

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

لیکن عبدالحق سوچتا ضرور رہا کہ ان سب چیزوں سے کتنا فرق پڑا ہے......؟ ارجمند جیسی حسین لڑکی بھی اوسط درجے کی لگنے لگی ہے۔ ڈھیلا لباس اس کی خوبصورتی کو چھپا لیتا تھا۔

اسے احساس ہوا کہ ارجمند کی اس تبدیلی سے اسے فائدہ ہوا ہے۔ اس کی آزمائش ہلکی ہوگئی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ جس طرح بھڑکتا تھا، وہ کیفیت ختم ہوگئی ہے۔ اب کم از کم اس کا تصور اسے نہیں ستاتا تھا۔ دفتر میں بھی وہ سکون سے کام کرنے لگا تھا۔

لیکن رات کا معاملہ ویسا ہی تھا۔ بلکہ اور سنگین ہوگیا تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد کم از کم ایک گھنٹے تک وہ حالت جنگ میں رہتا تھا...... اور جنگ بھی ایسی کہ ہر لمحہ اسے ڈر رہتا کہ وہ ہارنے والا ہے۔ اور وہ جانتا تھا کہ یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت اور کرم ہے کہ بالآخر اسے نیند آجاتی ہے۔ اور محض نیند نہیں، بہت گہری اور پرسکون نیند۔

مگر ایک اور بات وہ جانتا تھا۔ ہر رات خواہش کی شدت بڑھ رہی تھی۔ اور اسی لحاظ سے اس کی مدافعت کم ہو رہی تھی۔ اس کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی آرہی تھی۔ وہ منطق کا سہارا لے رہا تھا۔ اس کے اندر یہ سوچ ابھرتی تھی کہ غسل کے معاملے میں دوبارہ جو کچھ ہوا، وہ محض اتفاق تھا۔ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے۔

وہ جانتا تھا کہ یہ سوچ اس کی خواہش کا ہتھیار ہے۔ وہ اس سے لڑتا تھا۔ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ بالآخر اسے ہار جانا ہے۔ اور جب دل میں یہ خیال جڑ پکڑ لے تو آدمی ہار ہی جاتا ہے۔

اور وہ ہار گیا۔

اس نے ارجمند کو جگایا، جو پہلے ہی جاگ چکی تھی۔

''کیا بات ہے آغا جی......؟''

''مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''نہیں آغا جی......! یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' ارجمند نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''تم مجھے انکار کرسکتی ہو......؟'' عبدالحق بپھر گیا۔

''نہیں کرسکتی...... پھر بھی کر رہی ہوں۔''

''یہ کیسی منطق ہے......؟''

''منطق نہیں...... یہ حقیقت ہے آغا جی......! اور میں انکار اپنی وجہ سے نہیں...... آپ کی وجہ سے کر رہی ہوں۔''

''میں بچہ ہوں کہ تم میری فکر کرو......؟''

''دیکھیں آغا جی......! آپ کو ہر طرح کی خوشی اور آسودگی فراہم کرنا میرا فرض ہے۔ لیکن آپ کے اور اللہ کے تعلق کی حفاظت کی فکر کرنا بھی میرا فرض ہے۔ آپ جس بلند مقام کی خواہش کرتے ہیں، میں آپ کو اس سے بھی اوپر دیکھنا چاہتی ہوں، اور اس کے لئے کچھ بھی کرسکتی ہوں، کچھ بھی چھوڑ سکتی ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ اس وقت جو چاہتے ہیں، وہ میرے لئے اعزاز بھی ہے اور بہت بڑی خوشی بھی۔ میں عورت ہوں، میری حیا آپ کو یہ بتانے سے روکتی ہے، مگر آپ کی محبت مجھے آپ کو یہ بتانے پر مجبور کرتی ہے۔ تو میں آپ کو بتا دوں کہ ضبط صرف آپ نہیں کر رہے، میں بھی کر رہی ہوں۔''

''لیکن تم تو......''

ارجمند نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ کیا کہیں گے......؟ مگر میں آپ سے کہتی ہوں کہ جو کچھ ابھی میں نے کہا، اس پر اللہ میرا گواہ ہے۔ اب آپ چاہیں تو میری بات کو رد کر دیں۔''

عبدالحق جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس میں تو وہ کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ ارجمند ویسے بھی جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ اس پر اللہ کو گواہ بنانا، اور اس کی محبت سے تو وہ واقف ہی تھا۔

''اچھا......! ہم اس پر بات تو کر سکتے ہیں......؟'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ضرور......! میرا خیال ہے کہ ہمیں اس پر تفصیل سے بات کر لینی چاہئے۔'' ارجمند نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عبدالحق تو پہلے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''آپ مجھے بتائیں کہ آپ کیا سوچتے ہیں اس سلسلے میں......؟''

''پہلے تم بتاؤ...... کہ تم مجھے کیوں روکتی ہو......؟''

''آپ جانتے ہیں، پھر بھی مجھ سے پوچھ رہے ہیں......؟'' ارجمند کے لہجے میں شکایت تھی۔

''میں نہیں چاہتی کہ آپ کے ساتھ پھر وہی کچھ ہو۔ آپ نماز سے محروم ہوں۔ آپ کو پھر اسی ذہنی اور جسمانی اذیت سے گزرنا پڑے......؟''

''میں بھی یہ نہیں چاہتا۔'' عبدالحق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا، وہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''آپ نفسانی خواہش کے زیرِ اثر ایسا سوچ رہے ہیں۔ یہ شیطان کا طریق کار ہے۔ وہ اسی طرح آدمی کو گھیرتا اور اُکساتا ہے۔ توجیہہ و تاویل کے ذریعے، منطق کے ذریعے۔''

''یہ کیسی بات کی تم نے......؟'' عبدالحق بھڑک گیا۔

''شیطان تو اس رشتے، اس تعلق کا سب سے بڑا دشمن ہے۔''

''بے شک......! ایسا ہی ہے۔ لیکن شیطان کے ہر وار کے پیچھے ایک ہی مقصد ہوتا ہے...... انسان سے اللہ کی نافرمانی کرانا۔''

''لیکن اس میں اللہ کی نافرمانی ہے کب......؟ یہ تو اللہ کی حلال نعمت ہے۔''

''آپ بھول رہے ہیں۔'' ارجمند نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔

''پچھلی بار ہمارے درمیان اس پر بات ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی اس پر متفق تھے کہ وجہ کوئی بھی ہو، اللہ ہمیں اس سے روک رہا ہے۔ میں نے اسے آزمائش سمجھا تھا اور آپ نے اللہ کی ناراضی...... تو اس صورت میں یہ اللہ کا حکم ہی ہوا نا......؟''

عبدالحق لاجواب ہو گیا۔ اپنی کہی ہوئی بات سے وہ کیسے انکار کر سکتا تھا......؟

''اب مجھے لگتا ہے کہ وہ میری جذباتیت تھی۔ اب مجھے لگتا ہے کہ وہ محض اتفاق تھا۔''

''اور میں کہتی ہوں کہ یہ سوچ آپ کے نفس کا فریب ہے۔''

''اس بار بھی وہی کچھ ہوا تو میں اسے حقیقت تسلیم کر لوں گا۔''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔

''اور وہی کچھ ہوا تو اب پہلے سے زیادہ ڈپریشن ہو جائے گے۔ یہ میں نہیں چاہتی۔''

''جو بھی ہو...... میں ایک بار اور آزمانا چاہتا ہوں۔''

''دیکھیں آغا جی......! صبر میں عافیت ہے، اللہ کی رضا ہے۔'' ارجمند نے اسے سمجھایا۔

عبدالحق جھنجلا گیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھے کیوں روک رہی ہو......؟''

''اس لئے روک رہی ہوں کہ یہ سزا یا آزمائش جو کچھ بھی ہے، میں اسے آپ کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ یہ صرف آپ کے لئے ہے۔ غسل آپ کے لئے باعث اذیت بنتا ہے۔ نماز صرف آپ کی قضا ہوتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے روکتی ہوں کہ بعد میں ایک طرف تو میں آپ کی تکلیف اور دکھ پر کڑھوں گی تو دوسری طرف میرے ضمیر پر بوجھ ہوگا کہ میں نے خودغرضی کا مظاہرہ کیا۔''

''تم نے مجھے سمجھا لیا...... لیکن میں ماننے والا نہیں۔''

ارجمند پھر سوچ میں پڑ گئی۔ پھر چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا اور بولی۔

''اچھا......! تو میری ایک بات مان لیں......!''

''بولو......!''

''آج رہنے دیں، کل سہی......!'' یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں جھک گئیں۔

''چلو......ٹھیک ہے......!''

''بس......! اب آپ سو جائیں......!''

❁❁❁

اس روز دفتر میں عبدالحق اسی بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اللہ نے ارجمند کو دانش عطا فرمائی ہے۔ اس نے بڑی خوب صورتی سے اسے ٹال کر سوچنے اور سنبھلنے کا ایک موقع فراہم کیا ہے۔

اور وہ سوچ رہا تھا۔

اور فرق بہت بڑا تھا۔ رات کے مہربان، پردہ پوش اندھیرے میں اور خلوت اور ارجمند کی قربت میں سوچنا اور بات تھی اور دن کے اجالے میں، اپنے دفتر کی تنہائی میں اور بات...... اس وقت بھی اپنی تند خواہش کو ایک طرف ہٹا کر غیر جانبداری سے سوچنا آسان نہیں تھا۔ لیکن رات کو تو شاید یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ رات تو وہ خود ہی فرض تھا...... مدعی، نفس کا ہم لذا اور حلیف۔

ارجمند اسے ڈرا رہی تھی۔ اور دن کے اجالے میں اسے دل سے تسلیم کرنا پڑا کہ بجا طور پر ڈرا رہی تھی۔ اگر یہ آزمائش یا اللہ کی ناراضی ہے تو اس جسارت پر سزا بڑھ بھی سکتی ہے۔

دن بھر وہ سوچتا، ڈرتا اور الجھتا رہا۔ لیکن بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا کہ خطرے کو کم کیا جا سکتا ہے، اور اسے اس کی ترکیب بھی سوجھ گئی۔ اس سے اس کا دل بھی مطمئن ہو گیا۔

رات کو اس نے ارجمند کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

ارجمند نہ جانے کیوں سہم گئی۔

''کیا یہ مناسب ہوگا آغا جی......؟''

''کیوں......؟ اس میں قباحت کیا ہے......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''دن کی روشنی اور رات کے اندھیرے میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

یہ فرق تو اس روز عبدالحق کی سمجھ میں بھی آ گیا تھا۔ لیکن اب اس کی کیفیت

اس شخص کی سی تھی، جس کی ابھی شادی ہوئی ہو اور وہ پہلی بار اپنی بیوی کی صورت دیکھنے والا ہو۔ جسم میں لہو کے ساتھ ہیجان دوڑ رہا تھا۔

''اب ایسی روشنی بھی نہیں ہوتی ارجی......!'' اس نے بڑی محبت سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کم از کم میرے لئے آسان نہیں ہوگا۔''

''مگر تم اس کے فائدے کے بارے میں سوچو...... ! میری فجر کی نماز تو محفوظ ہو جائے گی۔''

''دیکھ لیں......!'' ارجمند کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔

''میں نے بہت سوچا ہے اس پر......تم فکر نہ کرو......!''

''جی......! بہت بہتر......!'' ارجمند نے کہا۔ لیکن وہ واضح طور پر فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔

''میں نے دفتر میں کہہ دیا ہے کہ کل چھٹی کروں گا۔'' عبدالحق نے کہا اور پھر اضافہ کیا۔

''محض احتیاطاً......!'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''میں آج اللہ سے بہت دُعا کروں گی۔''

''میں بھی......!''

اور کئی راتوں کے بعد وہ پہلی رات تھی کہ وہ دونوں ہی سکون سے سو گئے۔

لیکن عبدالحق نے دشواریوں کا اندازہ ہی نہیں لگایا تھا۔ آدمی جذبات میں گھرا ہو تو ڈھنگ سے سوچ ہی نہیں سکتا۔

فجر کی نماز کے بعد نورالحق اپنے معمول کے مطابق بیدار ہو گیا۔

''میں اسے دودھ پلا کر دادی اماں کے پاس چھوڑ کر آتی ہوں۔'' ارجمند نے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' عبدالحق کے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ تھی۔

''اسے رشیدہ یا دآبیہ کو دے دو......! وہ دودھ پلا دیں گی۔''

ارجمند نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ جانتے ہیں کہ آغا جی......! کہ یہ اپنے معمولات کا کتنا پکا ہے۔ اس وقت یہ کسی اور کے ہاتھ سے دودھ پیئے گا۔'' اس نے کہا۔

"اچھا......تو جاؤ......مگر جلدی آنا......!"

ارجمند چلی گئی۔

مگر بچے کو دودھ پلاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ ہر روز ناشتہ بھی تو وہی بناتی ہے۔ اب وہ کیا کرے......؟ اس نے دیر لگائی تو عبدالحق بہت خفا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ رشیدہ سے ناشتہ بنانے کو کہے......مگر رشیدہ کیا سوچے گی......؟

اسے شرم آنے لگی۔ رشیدہ وہی سوچے گی جو اسے سوچنا چاہئے۔ اور کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ مگر کوئی اور صورت بھی نہیں۔

نورالحق کو حمیدہ کے پاس چھوڑ کر وہ رشیدہ کی طرف گئی۔

"تمہیں ایک زحمت کرنی ہے رشیدہ......!" اس نے کہا۔

"حکم کریں بی بی صاحبہ......!"

"آج ناشتہ تم بنا دو......!" اس نے کہہ تو دیا مگر ڈری کہ روز کا معمول ٹوٹنے پر رشیدہ نے وجہ پوچھ لی تو کیا اسے جواب میں جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اگر اس نے پوچھا کہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے بی بی صاحبہ......! تو وہ کیا کہے گی......؟ یہ کہ آج طبیعت کچھ خراب ہے۔ اور کیا وہ اپنی شرمندگی چھپا سکے گی۔

لیکن رشیدہ نے کچھ نہیں پوچھا۔ بس سادگی سے کہا۔

"ضرور بی بی صاحبہ......! ورنہ میں تو کام کرنا ہی بھول جاؤں گی۔ کبھی کبھی مجھ سے کام لیتی رہا کریں۔ اب مجھے نہیں پتا کہ میں ناشتہ اچھا بھی بنا پاؤں گی یا نہیں؟"

ارجمند کے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں رشیدہ......! عورتیں یہ سب کہاں بھولتی ہیں......؟"

رشیدہ کچن کی طرف چلی گئی اور ارجمند بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔

❁❁❁

عبدالحق کے لئے وہ ایسا دن بن گیا جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

ارجمند چلی گئی تھی۔ وہ بستر پر دراز سوچتا رہا۔ وہ خوشی جو ہمیشہ ایک خوب صورت خواب جیسی، لیکن مکمل لگتی تھی، اجالے میں بڑی نامکمل لگی تھی۔ ایک طرف تشنگی

کا احساس تھا اور دوسری طرف زیاں کا۔ لیکن واضح کچھ بھی نہیں تھا۔

پھر وہ باتھ روم جانے کے لئے اٹھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ اس نے اس احساس کو جھٹکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔

اور چند لمحوں میں خوف اور احساسِ زیاں، سب کچھ واضح ہو گیا۔

پانی اس بار بھی اسے پاک کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

لیکن اس بار اس کے ردِعمل میں پہلے جیسی مایوسی نہیں تھی۔ ایک تو جو کچھ ہوا، وہ اس کے لئے یکسر خلافِ توقع نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار تھا۔ دوسرے اسے یقین تھا کہ دوپہر تک سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ مطمئن تھا کہ فجر تو وہ پڑھ ہی چکا ہے۔

وہ کمرے سے نکلا اور ڈائننگ روم کی طرف چل دیا۔

ناشتے کے بعد اس نے نورالحق کا قرض ادا کیا۔ اس کے بعد کہیں اسے اس صورتِ حال پر غور کرنے کی مہلت ملی۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔ لیکن ٹھنڈا پانی اس کے لئے کھولتا ہوا پانی تھا۔

ارجمند کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ تو عبدالحق کے چہرے پر لکھا تھا۔ وہ افسوس کے سوا کیا کر سکتی تھی......؟ اس سے بات کرتی تو وہ شرمندہ بھی ہوتا اور اس کا دکھ بھی بڑھ جاتا۔ وہ خاموشی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

عبدالحق اخبار بیڈ روم میں لے آیا۔ مگر اخبار پر نظر پڑتے ہی وہ وحشت زدہ ہو گیا۔ اسے اس بات کا خیال ہی نہیں تھا کہ وہ جمعہ کا دن ہے۔

"اب کیا ہوگا......؟" اس نے تشویش سے سوچا۔

"کوئی بات نہیں......! بارہ ساڑھے بارہ بجے تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔" دل نے اسے تسلی دی۔

"یہ تو جمعے کی نماز ہے۔" اس نے سوچا اور اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

بارہ بجے وہ اپنی کوشش میں پھر ناکام ہوا۔ اس کے بعد وہ تو ہر دس پندرہ منٹ میں باتھ روم کا چکر لگانے لگا۔ ہر ناکامی پر اس کی وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

جمعہ کا وقت ہو گیا تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔

''کیا میں جمعے کی نماز سے محروم رہ جاؤں گا......؟'' یہ تصور ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھا۔ اس نے اپنی دانست میں اپنی تہجد اور فجر کی حفاظت کر کے عقل مندی کی تھی۔ مگر اب اسے اس کی بہت بڑی سزا مل رہی تھی۔

اور جب جمعے کی نماز کا وقت نکل گیا تو اسے ایسا لگا کہ اس کے جسم سے جان نکل رہی ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ اندر سے اس کا وجود جیسے بالکل خالی ہو گیا۔ اس سے پہلے اس کے جسم کا رواں رواں اللہ سے دُعا کر رہا تھا کہ اسے بخش دیا جائے۔

وہ شرمندگی سے نڈھال ہو گیا۔ سب سے بڑی شرمندگی تو اللہ سے تھی۔ پھر اسے یہ فکر ستانے لگی کہ گھر میں سب لوگ سمجھ لیں گے کہ اس نے جمعے کی نماز نہیں پڑھی ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

پھر ارجمند کمرے میں آئی۔

''چلیں...... کھانا کھا لیں......!''

''مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے۔''

''دادی اماں کے خیال سے چلے چلئے......!''

''مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں جائے گا۔'' اس نے مظلومیت سے کہا۔

''ایسے ہی ہاتھ چلاتے رہئے گا......!'' ارجمند نے کہا۔

''ورنہ دادی اماں آپ کے لئے پریشان ہوں گی۔''

وہ ڈائننگ روم میں چلا آیا۔ کھانا اس سے بہر حال نہیں کھایا گیا۔ مشکل سے اس نے دو چار لقمے لئے۔ ارجمند نے بڑی عقل مندی سے اس کا پردہ رکھ لیا۔ اس نے حمیدہ کو باتوں میں لگائے رکھا۔ یوں حمیدہ کو پتا بھی نہ چلا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔

اس کے بعد پھر وہ تھا اور باتھ روم...... اور مسلسل ناکامی۔

ارجمند نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سزا میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ عصر سے بھی محروم ہو گیا۔ اور جب مغرب بھی نکل گئی تو اسے ایسا لگا کہ اسے کچھ ہو جائے گا۔ اور وہ اس میں خوش تھا۔ اس طرح جینا اسے قبول نہیں تھا۔ اس سے تو موت ہی بہتر تھی۔

ارجمند بھی پورے دن پریشان رہی۔ اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں

کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

اور عبدالحق پر تو اس خوف سے لرزہ چڑھا ہوا تھا کہ یہ سزا کہاں تک جائے گی......؟ اب تک اس کی تین نمازیں نکل چکی تھیں۔ ہر دس منٹ بعد وہ باتھ روم میں جاتا اور پانی کے نیچے ہاتھ رکھتا اور واپس کھینچ لیتا۔ احتیاط کے باوجود اس کا ہاتھ سرخ ہو گیا تھا اور اس میں جلن ہونے لگی تھی۔

اور جب عشاء سے پہلے ٹھنڈے پانی نے اس کے ہاتھ کو چھوا تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ زندگی میں اتنی بڑی خوشی اس سے پہلے اسے کوئی اور نہیں ملی تھی۔

وہ نہایا اور جی بھر کے نہایا۔ جیسے سمجھ رہا ہو کہ اس کا پاک ہونا آسان نہیں ہے۔

نماز پڑھ کر پہلی بار اس نے سکون کا سانس لیا۔ زندگی میں اتنا سخت اور اذیت ناک دن اس نے پہلے کبھی نہیں گزارا تھا۔

❁❁❁

بات اب بالکل واضح ہو گئی تھی۔

عبدالحق کے لئے یہ بات تشویش ناک تھی کہ اس پر ہر ردِعمل کے نتیجے میں اس کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اور دونوں کا ہدف ارجمند ہی تھی۔

سب سے پہلے تو اس کے اندر ارجمند کے لئے بہت شدید جھنجلاہٹ ابھری، جو دیکھتے ہی دیکھتے ناپسندیدگی تک جا پہنچی۔ اس نے اس پر خود سے بہت بحث کی۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا، اس کے نزدیک اس کا سبب ارجمند ہی تھی۔ لیکن سوچنے کے بعد وہ خود پر بھی جھنجلایا۔ وہ کیوں اس کے معاملے میں اتنا بے بس ہو گیا......؟ کیوں اس کی خواہش ایسی بے لگام ہو جاتی ہے۔ کیا وہ اپنے نفس سے لڑنے کی اہلیت ہی کھو بیٹھا ہے۔

بات پھر پلٹ کر وہیں آتی تھی۔ وہ صرف ارجمند ہی کے معاملے میں تو بے بس تھا۔

مگر اللہ نے عبدالحق کو بڑی خوبیوں میں یہ ایک بہت بڑی خوبی بھی عطا فرمائی تھی کہ وہ ہر معاملے میں اپنا محاسبہ ضرور کرتا تھا۔ اس معاملے میں بھی اس نے یہی کیا۔

اُسے دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ یہ اس کے لئے نئی بات نہیں۔ نور بانو کے معاملے میں بھی وہ ایسا ہی تھا...... بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ اس عرصے میں بھی وہ فجر

سے محروم ہوتا رہا تھا، جبکہ غسل کے معاملے میں وہ اس وقت جیسی صورتِ حال سے دوچار بھی نہیں تھا۔ اسے نماز کی محرومی پر تاسف تو ضرور ہوتا تھا۔ لیکن اگلے روز پھر وہی ہوتا تھا۔

اس اعتبار سے وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ اب اس پر اللہ کی رحمت پہلے سے زیادہ ہے۔ اس کی شخصیت کو ارتقا سے گزارا گیا ہے۔ اب اس کا ضمیر پہلے کے مقابلے میں زیادہ توانا ہے۔ اب تو وہ نماز سے محرومی پر تڑپ جاتا ہے۔

اس نے اس فرق کو بھی ٹٹولا۔ اس کے لئے اسے ارجمند اور مرحومہ نور بانو کا موازنہ بھی کرنا پڑا۔ نور بانو اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ اور عبدالحق اس کے طرزِ عمل پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن اس خیال نے کہ وہ ممکنہ طور پر ارجمند کے ساتھ بے انصافی کا مرتکب ہو رہا ہے، جبکہ اللہ بے انصافی کو بہت ناپسند فرماتا ہے، اسے اس موازنے پر مجبور کر دیا۔

موازنے پر ابتداء ہی میں ایک فرق تو واضح ہوگیا۔ نور بانو میں جو وہ کشش محسوس کرتا تھا، نور بانو اس سے پوری طرح فائدہ اٹھاتی تھی۔ بلکہ وہ اسے اور اکساتی اور بھڑکاتی تھی۔ اس نے خود تو قرآن پڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا اور نماز بھی ترک کر دی تھی۔ اب وہ یہ الزام تو اس پر نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ دانستہ اسے نماز سے دور کرتی تھی۔ یہ تو زیادتی ہوتی۔ وہ کوئی بچہ تو نہیں تھا۔ اللہ کے سامنے اپنی جواب دہی تو اسے ہی کرنی تھی۔

دوسری جانب ارجمند کے لئے تو اب وہ اس طرح پاگل ہوا تھا، جیسے نور بانو کے لئے تھا۔ اور یہ بھی شاید اللہ کی طرف سے اس کی آزمائش تھی۔ کیونکہ یہ تو وہ شروع سے ہی جانتا تھا کہ ارجمند نہایت حسین اور پرُکشش ہے۔ لیکن وہ کشش اس کے لئے کبھی آزمائش نہیں بنی تھی۔ اور جب ایسا ہوا تو ارجمند کا ردِعمل نور بانو کے برعکس تھا۔ ارجمند نے اکسانا بڑھکانا تو دور کی بات، الٹا اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ نہ صرف اپنی نماز کی حفاظت کرتی تھی، بلکہ اس کی نماز کی حفاظت کی بھی آخری حد تک کوشش کرتی تھی۔ وہ اس کی قرآن فہمی کی کوشش میں اس کی رفیق تھی۔

ایک فرق اور تھا۔ نور بانو ہمیشہ پہل کرتی تھی۔ اس کی طرف لپکتی تھی۔ وہ بے وقت بھی اسے مجبور کر دیتی تھی۔ اس کے برعکس ارجمند میں اتنی حیا تھی کہ اس نے ایک بار کے علاوہ کبھی پہل نہیں کی۔ اور اس موقع پر بھی اس نے اسے جھڑک دیا تھا اور

محروم رکھا تھا۔ ارجمند نہایت صابر تھی۔ اس نے کبھی اپنی خواہش اور ضرورت کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس ایک موقع کے سوا وہ کبھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ارجمند نے کبھی اشارے اور کنائے میں بھی اس کا اظہار کیا ہو۔

اور اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی وہ نور بانو پر جھنجلایا ہو۔ اس نے ہمیشہ نور بانو کی دلجوئی کی۔ کبھی اسے رد نہیں کیا، مایوس نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔

محبت تو اسے ارجمند سے بھی تھی، اور وہ تھی بھی محبت کے قابل۔ لیکن اس کی پہلی پیش قدمی پر ہی اس نے سخت ردِعمل ظاہر کیا۔ اسے مایوس کیا۔ جو یقیناً اس طرح نہیں تھی، گویا دونوں محبتوں میں بہت فرق تھا۔

اور اب وہ اس پر جھنجلا رہا تھا۔ اسے موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ یہ تو صریحاً بے انصافی تھی۔ اس میں ارجمند کا تو کوئی قصور تھا ہی نہیں۔

اب اس کی سمجھ میں آیا۔ ارجمند اور نور بانو میں ایک ہی قدر مشترک تھی۔ دونوں دنیا کے ہر رشتے اور ہر تعلق سے محروم ہونے کے بعد اسے ملی تھیں۔ اس کے علاوہ دونوں بالکل مختلف، بالکل برعکس تھیں۔ نور بانو کی فطرت قابضانہ تھی۔ وہ اسے اپنا اسیر بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ ارجمند خود اس کی اسیر رہنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی مطیع تھی اور اسے آزاد دیکھنا چاہتی تھی۔ نور بانو میں خودغرضی اور حسد تھا اور ارجمند میں ایثار اور محبت۔ نور بانو سب کچھ پا کر اللہ سے اور قرآن سے دور ہوگئی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے بھی دور کر دیتی۔ جبکہ ارجمند اسے پا کر اور مستحکم ہوگئی تھی۔ وہ قرآن کی محبت اور قرآن فہمی کی کوشش میں اس کی شریک تھی۔ بلکہ بہت کچھ اس نے اس کے ذریعے سمجھا تھا۔

اس کی سمجھ میں ایک نکتہ آ گیا۔ نااہل کو عزت دینے میں تو اللہ کے ہاں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اہل کو عزت نہ دینا بری بات ہے۔ اور یہی اس نے کہا تھا اور شاید موجودہ صورتِ حال اسی کی سزا تھی۔

ایک اور بات اس کی سمجھ میں آئی۔ نور بانو کے معاملے میں وہ بہت شکرگزار تھا۔ اس نے بغیر دیکھے اس سے محبت کی تھی، اور اسے پانے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ لیکن اللہ نے کرم فرمایا تھا اور وہ اسے مل گئی تھی۔ وہ اس پر شکر ادا کرتا تھا۔ اور اس پر بھی کہ اسے دیکھنے کے بعد اس کی محبت کم نہیں ہوئی تھی، بلکہ اور بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ وہ

خوب صورت نہیں تھی۔ لیکن اللہ نے اسے اس کے لئے پُرکشش بنا دیا تھا۔ وہ اسے دنیا کی حسین ترین عورت لگتی تھی۔ یہ محض اللہ کا کرم تھا۔

مگر اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ ارجمند کے معاملے میں اس نے بہت ناشکرا پن کیا۔ وہ کم عمر تھی، نہایت حسین و جمیل تھی، باطنی اعتبار سے بھی وہ بہت خوب صورت تھی اور اس سے محبت بھی کرتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اور وہ محبت غیر معمولی تھی۔ ایسی محبت تو بس اللہ ہی کسی کو عطا کرتا ہے۔ اور اسے اس کی محبت کی نہ پرواہ تھی نہ ضرورت۔ اس نے اس کے بارے میں کبھی اس انداز سے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے تو کبھی دوسری شادی کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ مگر نور بانو نے خود ارجمند سے اس کی شادی کرا دی۔ یہ تو اللہ ہی کی طرف سے تھا۔ اسے تو معجزہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ مگر اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ بلکہ اس نے تو ارجمند کو بھی اہمیت نہیں دی۔

ارجمند کے خداداد حسن پر اللہ کا شکر ادا کرنا تو دور کی بات، اس نے تو کبھی اسے سراہا بھی نہیں۔ ناشکرا پن تو یہ تھا ہی۔ مگر کیا یہ غرور بھی تھا۔ ایک حسن پرست آدمی حسن کو نہ سراہے تو یہ غیر معمولی بات ہوتی ہے۔ پھر وہ تو اسے نظر انداز کرتا رہا۔ اس نے تو کبھی ڈھنگ سے اس کا حق بھی ادا نہیں کیا۔ اسے ایک طرح سے نور بانو کی کنیز بنا کر رکھ دیا۔ بہت زیادتی کی اس کے ساتھ۔ شاید وہ غرور بھی تھا اور ناشکرا پن بھی۔

سمجھ میں آنے لگا کہ یہ سب کیا ہے......؟ بندہ ناشکرا پن کرے تو نعمتیں اس سے چھن جاتی ہیں۔ اس نے تو نعمت کو نعمت ہی نہیں سمجھا۔ نہ جانے کتنی بار اس نے ارجمند کی دل آزاری کی ہوگی۔ وہ تو صابر ہے، شکایت کرنے والی ہے ہی نہیں۔ اور ایسے لوگوں کا اللہ خود خیال رکھتا ہے۔

تو یہی ہوا ہے اس کے ساتھ۔ ارجمند کے معاملے میں اس کی نظروں کو شعور دے دیا گیا۔ خوب صورت تو وہ ہے ہی، اب ہوا یہ کہ وہ اسے خوب صورت نظر آنے لگی۔ اور جب ایسا ہوگا تو وجود میں نفسانی خواہشیں مچلیں گی۔ اور ایسے میں اللہ نے سزا سنا دی کہ وہ اس کا حق دار ہونے کے باوجود اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ ہاں......! چاہے تو نماز سے محرومی کے ساتھ اسے حاصل کر لے۔

یہ بات بالکل صاف اور واضح تھی۔ وہ اسے سزا سمجھتا تھا اور ارجمند آزمائش۔

یہاں پھر ایک شکر کا مقام اس کی سمجھ میں آ گیا۔ جس طرح سے ارجمند کے لئے اس کا دل مچلتا تھا، اس میں اس کے لئے یہ بہت آسان ہوتا کہ وہ اللہ سے، نماز سے دور ہو جاتا اور سامنے کی نعمت حاصل کر لیتا۔ اپنی کیفیت تو اس پر عیاں تھی۔ یہ صرف اللہ کی رحمت تھی، جس نے اسے بچا لیا۔ سچ ہے کہ بندے کے پاس جو کچھ بھی اچھا ہے، جس نوع کا بھی ہو...... اس کے وجود میں، رنگ روپ میں ہو، اس کے اعضا میں اور ان کی کارکردگی میں ہو، اس کی شخصیت، اس کی عادات، اطوار، اخلاق، گفتار، کردار میں ہو، اس کی ازواج، اولاد، اموال، املاک یا تصرفات میں ہو، وہ صرف اور صرف اللہ کی عطا اور اس کے فضل و کرم سے ہے۔

''بے شک اے اللہ......!'' وہ بڑبڑایا۔

''میرے پاس میرا اپنا میرے نفس کی دی ہوئی برائیوں، خطاؤں، لغزشوں اور گناہوں اور میری بداعمالیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔''

لیکن یہ سب کچھ اسٹڈی کی تنہائی میں بہت آسان تھا اور عملی زندگی میں بہت مشکل۔ آدمی پہلے اپنی سوچوں اور اپنے نظریات میں مستحکم ہوتا ہے۔ پھر جب اللہ کی رحمت سے وہ اس کی زندگی میں نافذ ہو جائیں، تب کہیں فلاح پاتا ہے۔

بیڈ روم میں اس کا نفس سرکشی پر آمادہ ہو جاتا۔ دیر تک وہ سو نہ پاتا۔ اور اب تو ارجمند بھی جاگ رہی ہوتی تھی، یہ الگ بات کہ اسے اس کا علم نہیں تھا۔

ایک رات وہ بار بار اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر واپس کھینچ رہا تھا کہ ارجمند اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آغا جی......! میں آپ کے لئے کیا کروں......؟ مجھے بتائیں......! میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں......؟'' اس نے تڑپ کر کہا۔

اس کی سچائی نے عبدالحق کے دل کو چھو لیا۔ کتنی فکر کرتی ہے وہ اس کی۔

''تم بس دعا کرو میرے لئے......!''

''وہ تو ہر وقت کرتی ہوں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ پریشانی میں ہوں اور میں آپ کے لئے دُعا نہیں کروں گی......؟'' اس کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

''بات یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں کوئی بھی میرے لئے دُعا کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔''

''میں ہر وقت سوچتی رہتی ہوں کہ کچھ تو کیا جا سکتا ہے.....؟''

''کچھ سمجھ میں بھی آیا.....؟''

''جی .....! عجیب عجیب خیالات آتے ہیں۔'' ارجمند نے کہا۔

''سوچتی ہو، کسی طرح سے خود کو بدصورت بنالوں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ خاموشی سے یہاں سے دور کہیں چلی جاؤں.....!''

عبدالحق اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیسی احمقانہ بات ہے.....؟'' اس نے غصے سے کہا۔

''دیکھیں نا..... میری خوب صورتی ہی تو آپ کی دشمن بن گئی ہے۔''

عبدالحق کو احساس ہوا کہ اس کا نقصان اب ارجمند کا نقصان بھی بن سکتا ہے۔ اس نے کہا۔

''یہ مت بھولو کہ تم اس وقت بھی خوب صورت تھیں، جب میں تمہیں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اور نوربانو حسین نہ ہونے کے باوجود میرے لئے آزمائش بن گئی تھی۔''

ارجمند نے کچھ نہیں کہا۔ وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''میں نے تمہارے معاملے میں ناشکرا پن کیا۔ تم اسے آزمائش کہہ لو..... یہ میرے نزدیک اس کی سزا ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور کہتے ہیں نا کہ آدمی محبت سے بنتا اور بگڑتا ہے، تو میرا ناشکرا پن اب تم تک پہنچ رہا ہے۔''

ارجمند نے جھرجھری سی لی۔

''وہ کیسے.....؟''

''تمہیں اللہ نے خوب صورت بنایا ہے۔ اب تم کسی بھی طرح اسے خراب کرنے کی کوشش کرو، اپنے وجود پر ظلم کرو تو کیا یہ ناشکرا پن نہیں ہوگا.....؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

''یہ میری صحبت کا اثر ہے۔'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔ پھر بولا۔

''ایک اور بات یہ کہ تمہارا ایسا کوئی عمل خیانت میں شمار ہوگا۔''

ارجمند پھر اسے وضاحت طلب نظروں سے تکتی رہی۔

''پہلے تو یہ سب کچھ اللہ کی امانت ہے اور وہ ہر عضو کا حساب لے گا۔ تو یہ خیانت ہوئی۔ پھر اللہ نے تمہیں خوب صورت بنایا میرے لئے، تو دنیا میں یہ میری امانت ہے۔''

ارجمند نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور محبت بھرے لہجے میں بولی۔

''اللہ نے آپ کو بہت اچھا بنایا ہے آغا جی.....!''

''جو کچھ اچھا ہے، اسی کا دیا ہوا ہے۔'' عبدالحق نے عاجزی سے کہا۔ پھر بولا۔

''اور کہیں جانے کی بات بھی ناشکرا پن ہے۔ بلکہ ایسا سوچنا بھی ناشکرا پن ہے۔ یہ مت بھولو کہ تم یہاں آنے سے پہلے کہاں تھیں.....؟ وہ تو اللہ نے اپنی رحمت سے تمہیں بچائے رکھا اور یہاں پہنچا دیا۔ پھر جو تم مانگتی تھیں، وہ بھی عطا فرما دیا۔ اب سوچو.....!''

ارجمند اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سب کچھ اسے یاد آ گیا تھا۔ اسے اس پر حیرت اور شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ اس سب کو بھولی کیسے.....؟ واقعی وہ بہت ناشکری ہے۔ وہ دل میں اللہ سے توبہ کر رہی تھی۔

عبدالحق اسے لپٹا کر اس کی دل جوئی کرنا چاہتا تھا۔ مگر دل پر پتھر رکھ کر بیٹھا رہا۔ جانتا تھا کہ اس کا ارجمند کو محض چھونا بھی تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

''اب روؤ نہیں ارجی.....!''

''آپ مجھے معاف کردیں آغا جی.....!'' ارجمند نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

''لیکن میں کیا کروں.....؟ آپ کو اس حال میں دیکھا نہیں جاتا۔ میں آپ کے لئے ہی نہیں، خود اپنے لئے بھی آزمائش بن گئی ہوں۔''

''بس.....! اللہ سے دعا کرتی رہو اور مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی باتیں کبھی نہیں سوچو گی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں آغا جی.....! ایک اور راستہ سمجھ میں آیا ہے۔ مگر میں اس پر بات کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔''

عبدالحق نے چند لمحے سوچا۔ اس لمحے ان کے درمیان پھر وہی رابطہ استوار

ہو گیا۔ عبدالحق نے جان لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے......؟

''نہیں ارجی......! یہ اس مسئلے کا حل نہیں...... یہ نامناسب ہوگا۔''

''آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں......؟''

''جس کے بارے میں تم نے اشارہ کیا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''ہم الگ الگ کمروں میں نہیں سو سکتے۔ اس سے بے معنی غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ گھر کی فضا خراب ہوگی۔ اماں کیا سوچیں گی......؟ نوکر کیا سوچیں گے......؟ یہی نا کہ ہمارے درمیان تعلقات میں کوئی خرابی ہے......؟ سب پریشان ہوں گے اس سے......اور ایسے گمان کریں گے، جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔''

ارجمند حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے میری بات کیسے سمجھ لی آغا جی......؟''

عبدالحق نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تو پھر کیا کریں......؟'' ارجمند کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''تمہاری بات نے ایک بات مجھے سجھائی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میں بیڈ کے بجائے نیچے قالین پر سویا کروں گا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے......؟ اچھا...... مجھے نیچے سونے دیں......!''

''نہیں ارجی......! یہ بات کرنے کے بعد اب مجھے خیال آیا ہے کہ یہ تو اللہ کی طرف سے رہنمائی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اللہ کے بندوں کو زمین سے قریب رہنا چاہئے۔''

عبدالحق کے لہجے میں قطعیت تھی۔ بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''اچھا......تو نیچے گدا بچھا دوں......؟''

''بالکل نہیں......! ایک تکیہ اور ایک چادر بہت ہے۔ اور میں تمہیں ایک حکم دے رہا ہوں۔ اس پر ہر حال میں عمل کرنا ہے۔ اس میں کوتاہی نہیں کرنا۔''

''کہئے آغا جی......!''

''اگر میں کبھی نفس سے مجبور ہو کر تمہاری طرف بڑھوں تو بہت سختی سے مجھے روک دینا۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔''

''بہت بہتر آغا جی......! اللہ میری استعانت فرمائے......!''

❁❁❁

سب کچھ سوچنے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے کے باوجود عبدالحق کا ارجمند کے ساتھ تعلق دہرا ہی رہا۔ دن میں جب بھی وہ سامنے آتی تو نفس کا اڑیل مینڈھا وجود پر ٹکریں مارتا۔ ایسے میں وہ ارجمند پر جھنجلاتا۔ وہ اسے بری لگتی۔ کبھی تو اسے اس سے شدید نفرت محسوس ہوتی۔ لیکن اس نفرت کے باوجود وہ اس میں بے پناہ کشش محسوس کرتا، اس کی طرف ایسے کھنچتا جیسے وہ کوئی مقناطیس ہو۔ اس کے نتیجے میں ایک تبدیلی آئی۔ وہ اس کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتا۔ بات بے بات اسے ڈانٹتا، اس کے ساتھ درشت روّیہ رکھتا۔ ایسے میں وہ اپنے معاملے میں اسے ہی قصوروار سمجھتا۔

لیکن وہ شکر ادا کرتا کہ اللہ کی رحمت اس کے ساتھ ہے۔ اللہ نے اسے ارجمند کے ساتھ قرآن پڑھنے اور سمجھنے سے محروم نہیں ہونے دیا۔ وہ ہفتہ اور اتوار کو معمول کے مطابق ساتھ بیٹھتے اور اس پر بات کرتے۔ آیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اور اس دوران عام طور پر اس کا نفس سویا رہتا۔ کبھی اس کے خلاف ہوتا تو وہ ارجمند سے کہتا۔

''سوری ارجی......! آج کیفیت نہیں ہے پڑھنے کی۔''

اور ارجمند سمجھ جاتی۔ لیکن تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہتی۔

''بے شک آغا جی......! یہ بہت بھاری کلام ہے۔ اسے تو دل و جان سے پڑھنا اور سمجھنا ہوتا ہے۔ زبردستی اچھی نہیں ہوتی۔ کل پڑھیں گے انشاء اللہ......!''

اور رات کو اپنے کمرے کی تنہائی میں وہ ارجمند کے لئے اپنے دل میں ایسی محبت محسوس کرتا کہ کبھی نور بانو کے لئے بھی نہیں کی تھی۔ وہ خواہش کا اسیر ہو کر جاگتا تو اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اس نے اسے ارجمند جیسی بیوی عطا فرمائی، جو اپنے ظاہر و باطن اور اپنے عمل اور روّیے میں اس کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ اس کے لئے تڑپتا اور دُعا کرتا کہ وہ آزمائش یا سزا جو کچھ بھی ہے، اللہ اسے مختصر کر دے، اسے معاف کر دے اور اپنی نعمتوں سے شکر گزاری کے ساتھ بہرہ مند ہونا نصیب فرمائے۔

کبھی وہ بے قابو ہو کر اس کی طرف بڑھ جاتا۔ ایسے میں ارجمند زبردست مزاحمت کرتی۔ وہ غصہ کرتا، مشتعل ہوتا، مگر وہ اس کی پرواہ نہ کرتی۔ اور جب بات

بہت بڑھ جاتی تو وہ طنزیہ لہجے میں کہتی۔

’’آپ تو اللہ کی محبت کے دعویدار ہیں آغا......!‘‘

اور یہ سن کر اسے لگتا کہ کسی نے اس پر سرد پانی کی بالٹی اُنڈیلا دی ہے۔ وہ پہلے شرمندہ ہوتا، پھر جھنجلاتا، پھر اپنے دل میں ارجمند کی نفرت لئے خاموشی سے پسپا ہو جاتا۔

صبح ارجمند شرمندہ ہوتی، اس سے نظریں چراتی، تب اسے اس پر شدت سے پیار آتا۔ اس پیار میں نفس کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ وہ بڑی محبت سے ارجمند کا ہاتھ تھام کر کہتا۔

’’میری طرف دیکھو ارجمند......!‘‘

اور ارجمند شرمندگی سے کہتی۔

’’میں آپ سے نظریں نہیں ملا سکتی۔ شرمندہ ہوتی ہوں اپنی بدتمیزی اور گستاخی پر۔‘‘

’’حالانکہ وہ مجھ پر تمہارا احسان ہوتا ہے۔ تم بہت اچھی ہو ارجی......!‘‘

’’یہ میرے لئے بہت بڑی آزمائش ہے آغا جی......!‘‘ یہ کہتے ہوئے ارجمند کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔

’’اللہ تمہیں اس کی جزائے عظیم عطا فرمائے گا انشاء اللہ......! تم تو میرا دفاعی حصار ہو، میری طاقت ہو۔‘‘

اور ایک گھنٹے بعد وہ پھر اس پر جھنجلا رہا ہوتا، اس سے نفرت کر رہا ہوتا۔

ایک بہت بڑا نقصان ہوا تھا اس کا۔ اس کی انفرادی عبادتیں خشوع و خضوع اور حضوری سے محروم ہو گئی تھیں۔ وہ نماز میں ہوتا یا ذکر میں، ارجمند کا سراپا اس کے وجود میں فتنے جگاتا، اسے ارتکاز سے محروم کر دیتا۔ وہ پاکی کے احساس سے بھی محروم ہو جاتا۔ لگتا، وہ ناپاکی کے حال میں اللہ کے روبرو ہے۔

ہر روز وہ سوچتا، شاید یہ اس کی سزا کا آخری دن ہے۔ ہر رات وہ اس کے لئے دُعا کرتا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ سزا یا آزمائش برسوں کے لئے ہے تو نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا......؟ شاید وہ ہار ہی جاتا۔ اللہ کریم نے رحمت فرمائی ہے کہ اپنے بندوں کو اس سے بے خبر رکھا ہے۔

❁❁❁

کتابِ ششم

شام

پربتوں کے پیٹوں پر شام کا بسیرا ہے
سرمئی اُجالا ہے، چمپئی اندھیرا ہے

وہ صبح کسی بھی اعتبار سے دوسری صبحوں سے مختلف نہیں تھی۔ بس ایک فرق تھا۔ دفتر کے لئے گھر سے نکلتے ہوئے عبدالحق نے ارجمند سے کہا تھا۔

"آج دفتر کھانا نہ بھیجنا......!"

ارجمند نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیوں آغا جی......؟"

"دوپہر کا کھانا میں گھر آ کر ہی کھاؤں گا۔"

"کوئی خاص بات......؟"

"نہیں......! کوئی خاص بات نہیں۔"

اسی وقت 6 سالہ نورالحق اپنا اسکول کا بیگ لٹکائے ہوئے چلا آیا۔

"چلیں بابا جان......!" اس نے کہا۔

عبدالحق نے اس کی اُنگلی تھام لی۔

"دادی کو سلام کرلیا بیٹے......؟"

"جی بابا جان......! ان سے اجازت بھی لے لی۔"

''شاباش ......! بہت اچھے بیٹے ہو۔ آؤ چلیں......!''

وہ دونوں چلے گئے۔ جانے سے پہلے ہر روز کی طرح نورالحق نے اس سے پیشانی پر پیار کروایا اور اسے سلام کیا تھا۔

''الحمدللہ......! اللہ کا فضل ہے۔ کتنا پیارا بیٹا عطا فرمایا ہے اس نے۔''

ارجمند نے روز کی طرح زیرِلب اللہ کا شکر ادا کیا۔

عبدالحق کے انداز میں تو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ دفتر جاتے ہوئے اس نے دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھانے کو کہا تھا۔ ارجمند بے چین سی ہوگئی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔

کچھ دیر وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سوچتی اور الجھتی رہی۔ بہت غور کرنے پر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پریشان کیوں ہے......؟ اسے تو خوش ہونا چاہئے کہ آج وہ سب کھانے پر ساتھ ہوں گے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ آج کھانے پر خصوصی اہتمام کیا جائے۔ نوریز آجائے تو اس سے سودا منگوائے گی۔

اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور سودے کی فہرست بنانے لگی۔ لیکن نہ جانے کیوں......اس کا دماغ اُڑا اُڑا سا تھا۔

وہاں سے وہ اٹھی اور ڈائننگ روم میں چلی آئی۔ عبدالحق کے جانے کے بعد وہ اخبار پڑھتی تھی۔

وہیں کرسی پر بیٹھ کر اس نے اخبار اٹھایا۔ اس سرخی نے فوراً ہی اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

''1300 بدعنوان اعلیٰ سرکاری افسران برطرف کر دیئے گئے۔''

اس کے نزدیک وہ کوئی بڑی خبر نہیں تھی۔ ابھی دو ڈھائی سال پہلے اسی طرح 303 سرکاری افسران بدعنوانی کے الزام کے تحت برطرف کئے گئے تھے۔ عبدالحق نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ انداز مناسب نہیں۔ برطرف کئے جانے والوں کو نہ کوئی چارج شیٹ دی گئی اور نہ ہی انہیں صفائی کا موقع دیا گیا۔

اور اب ایک دم 1300......

ارجمند ان معاملات کو زیادہ سمجھتی نہیں تھی۔ لیکن اتنا تو اس کی سمجھ میں بھی آ گیا کہ یہ ایک بہت بڑا اور تباہ کن انقلاب ہے۔ یہ طے تھا کہ ان میں بڑے بڑے، اہل اور لائق و فائق لوگ ہوں گے۔ اور ان کی کمی سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگا، جسے نچلے افسران کی ترقی سے پُر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور اس کے نتیجے میں بیورو کریسی نااہلی کا شکار ہوگی۔ اس کے مورال میں بھی منفی فرق پڑے گا اور کارکردگی میں بھی۔ اور خوشامد کے کلچر کو فروغ حاصل ہوگا۔ سرکاری افسران کو یہ پیغام پہنچا دیا گیا ہے کہ اب ان کا مفاد صرف اور صرف حکومت کو خوش کرنے میں ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس کو اچانک ایک بہت بڑا ذہنی جھٹکا لگا۔

اخبار میں خبر کے نیچے کچھ تصویریں بھی تھیں۔ اور ان میں عبدالحق کی تصویر بھی تھی۔

وہ عبدالحق کی تصویر کو دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عبدالحق کی تصویر کیوں چھپی ہے......؟ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

''عبدالحق، کلکٹر آف کسٹمز۔''

اور جب اس کی سمجھ میں آیا تو وہ صدمے سے شل ہو کر رہ گئی۔

وہاں اور تصویریں بھی تھیں، اور وہ سب بدعنوان سرکاری افسروں کی تھیں، جنہیں برطرف کیا گیا تھا۔ تصویریں صرف ان بہت بڑے افسروں کی دی گئی تھیں، جو بہت اہم عہدوں پر تھے۔

اخبار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی تکرار تھی۔

''عبدالحق اور بدعنوان......؟''

جانے کب تک وہ ایسے بیٹھی رہی۔ پھر رشیدہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''کیا ہوا بی بی صاحبہ......؟ خیریت تو ہے......؟'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''سب ٹھیک ہے......! تم مجھے پانی پلا دو......!''

رشیدہ نے اسے پانی لا کر دیا۔

"سنو......! نوریز جیسے ہی آئے، اسے میرے پاس بھیجنا......!"

"بہت بہتر بی بی صاحبہ......!"

وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ وہاں تنہائی میں بیٹھ کر وہ اس بارے میں سکون سے سوچنا چاہتی تھی۔

عبدالحق کے لئے تو یہ بہت بڑا صدمہ ہوگا۔ قوم کی خدمت کے لئے اتنے برس...... اور اس کا صلہ بددیانتی اور بدعنوانی کا داغ......؟ ایک اور آزمائش......! وہ تو اور زخمی ہو جائے گا۔

ایک آزمائش تو پچھلے پانچ برس سے جاری تھی۔ اور وہ آزمائش وہ خود تھی...... اس کا وجود۔ اس نے اسے آسان کرنے کے لئے خود کو بھدا اور بدنما بنا کر پیش کرنے کی جتنی کوشش کی، عبدالحق کو اس میں اتنی ہی زیادہ کشش محسوس ہونے لگی۔ آزمائش ایسی ہی تو ہوتی ہے۔ آخر تھک ہار کر اس نے ہر کوشش ترک کر دی کہ کہیں یہ اس کا ناشکرا پن نہ شمار ہو۔

ان پانچ برسوں میں عبدالحق نے ہر سال حج پر جانے کی کوشش کی اور ہر بار ناکام رہا۔ اور ہر ناکامی پر وہ شدت سے مایوس ہوتا اور جیسے کسی باطنی حصار میں قید ہو جاتا۔ ایک اعتبار سے وہ اس کے لئے اچھی بات ہوتی۔ کیونکہ جب تک وہ اس کے اثر میں ہوتا، اس کی طرف بالکل بھی راغب نہ ہوتا۔ بلکہ وہ سب کچھ ہی بھول جاتا۔ اس عرصے میں ارجمند کو اس کی عبادات اور اذکار میں ارتکاز نظر آتا، خشوع و خضوع محسوس ہوتا۔ اور جب وہ کیفیت ختم ہوتی تو وہ پھر اس کے وصل کی خواہش کا اسیر ہو جاتا۔

ارجمند اسے دیکھتی اور اس کی ہر کیفیت کو پوری طرح سمجھتی۔ کئی بار عبدالحق پر دیوانگی طاری ہو جاتی۔ ایسے میں اسے روکنا آسان نہ ہوتا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ دل سے وہ خود بھی اس کی قربت کی خواہاں ہوتی۔ مگر وہ بڑی سچائی اور دیانت داری کے ساتھ خود سے بھی لڑتی اور اسے بھی دھکیلتی۔ عبدالحق کی شدت کو روکنے کے لئے اسے بہت سخت ہو جانا پڑتا۔ بعد میں وہ اس پر شرمندہ ہوتی۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ سختی ناگزیر تھی۔

وہ شکر ادا کرتی کہ اللہ اس کی مدد کر رہا ہے، ورنہ وہ بھی ہار جاتی اور عبدالحق

بھی۔ اور اس کے نتیجے میں اس کی ہر نماز کا بوجھ اس پر بھی ہوتا۔ اور وہ ہر وقت عبدالحق کے لئے دعا کرتی۔ اس کی ہر سانس عبدالحق کے لئے دعا تھی۔

عبدالحق اتنا متلون مزاج ہو گیا تھا کہ وہ یہ نہ سمجھ پاتی کہ لمحہ موجود کی کیفیت اگلے لمحے برقرار رہے گی یا نہیں۔ وہ پل پل بدلتا۔ نہ صرف بدلتا، بلکہ یکسر مختلف ہو جاتا۔ ایک پل وہ اس سے محبت کرتا، اگلے ہی پل وہ اس پر جھنجلاتا اور پھر اچانک وہ اس سے شدید نفرت کر رہا ہوتا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ سب وقتی کیفیات ہیں، جو خواہش کی شدت کے نتیجے میں ابھرتی ڈوبتی ہیں۔ اسے اطمینان تھا کہ اصل میں وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ بلکہ اس آزمائش کے نتیجے میں اس کی محبت بڑھ گئی ہے۔ جب وہ اس کی شرمندگی پر اس کے سامنے اپنی احسان مندی اور محبت کا اظہار کرتا تو وہ بہت سچا ہوتا۔

وہ محبت اس کے لئے بہت بڑی نعمت تھی۔ مگر وہ اسے بہت بڑی محرومی اور آزمائش کے ساتھ ملی تھی۔ وہ یہ سوچتی تو فوراً ہی دل میں اپنی سوچ پر توبہ کرتی اور اللہ کا شکر ادا کرتی۔ نعمت تو نعمت ہی ہوتی ہے۔ جتنی بڑی نعمت، اتنی ہی بڑی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے آدمی کو۔ اور نعمت بھی محبت جیسی اور محبت بھی من چاہی اور ایسی کہ جس کے ملنے کی امید بھی نہ ہو۔ اس کے لئے تو جان بھی دے دو تو کم ہے۔

اس نے سوچا۔ اب عبدالحق پر نہ جانے کیا گزرے گی......؟ یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ عبدالحق جیسا نیک، خدا ترس اور دیانتدار آدمی، اور اخبار میں اس کا نام اور تصویر کی اس طرح اشاعت۔ یہ کیسی رُسوائی اور جگ ہنسائی ہے، جس کے لئے وہ بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتی ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے، تہمت ہے۔ تو عبدالحق پر کیا گزرے گی......؟ وہ کتنی توہین اور ذِلت محسوس کرے گا......؟

کیا ریاست کا انتظام چلانے والی حکومتیں اتنی غیر ذمہ دار ہو سکتی ہیں......؟ اور اگر ہو سکتی ہیں تو اس ریاست کا کیا حال ہوگا......؟ اور کیا مستقبل ہوگا......؟ اس نے سوچا۔ بڑے اور ذمہ دار عہدوں پر کام کرنے والے سرکاری افسران کے ساتھ یہ سلوک کسی اعتبار سے بھی جائز نہیں۔ اگر کوئی بددیانت اور بدعنوان ہے تو اس کے خلاف کارروائی کے ضابطے بھی تو موجود ہوں گے۔ شوکاز نوٹس، اس کا تسلی بخش جواب

نہ ملنے پر چارج شیٹ، اس کے جواب کے بعد انکوائری اور پھر برخواست کرنے کا فیصلہ۔ قاعدہ تو یہ ہے۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ الزام عائد کیا جائے اور ملزم کو صفائی کا موقع دیا جائے۔ اور یہ سب کچھ پریس تک نہیں پہنچتا۔ یہ تو محکمہ جاتی کارروائی ہوتی ہے۔ اس کی خبریں نہیں چھپتیں، معزز سرکاری ملازمین کی تصویریں اشتہاری مجرموں کی طرح اخبار میں شائع نہیں کی جاتیں۔

لیکن یہاں تو ایک نہ دو...... پانچ نہ دس...... پورے 1300 اعلیٰ سرکاری ملازمین کو الزام لگائے بغیر مجرم قرار دے کر بیک جنبش قلم فارغ کر دیا گیا۔ الزام پر مطلع کرنا تو دور کی بات، انہیں اخبار کے ذریعے مطلع کیا گیا۔ انہیں رسوا کیا گیا، ان کی تذلیل کی گئی۔ الزام لگائے اور ثابت کئے بغیر ان کے مجرم ہونے کی تشہیر کی گئی۔ ایسا تو دنیا میں کہیں بھی نہیں ہوتا۔ جبکہ یہ تو اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ اور اسلام تو عدل و انصاف کا درس دیتا ہے۔ ملزم کو صفائی کا پورا موقع دیا جاتا ہے، اور الزام ثابت نہ ہونے تک کسی کو مجرم نہیں ٹھہرایا جاتا۔

کیا کسی فردِ واحد کو یہ حق حاصل ہے......؟ کیا کسی فردِ واحد کو اتنے اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں......؟ ایسا تو آج تک کسی آمر نے بھی نہیں کیا۔ وہ اگر کسی کے خلاف نفرت یا بغض رکھتا ہے تو بھی محکمہ جاتی کارروائی بڑی خاموشی کے ساتھ کی جاتی ہے......؟ الزام ثابت ہوئے بغیر برطرف کر دیا جاتا ہے......؟ لیکن اس کی تشہیر نہیں کی جاتی۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا......؟ اور اتنے بڑے پیمانے پر کیوں ہوا......؟
بہت غور کرنے پر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ یہ کارروائی کسی بڑے ایجنڈے پر آسانی سے کام کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ مستقبل کے باقاعدہ حکمرانوں کو اپنی بے پناہ طاقت کا اظہار مقصود ہے۔ ان کے کچھ آمرانہ عزائم ہیں، جن کے راستے میں رکاوٹ بننے والوں کو نہ صرف راستے سے ہٹا دیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ مستقبل میں حکمران اپنے ہر جائز و ناجائز حکم کی تعمیل چاہتے ہیں۔ انہیں مشورے کی نہیں، صرف تائید کی ضرورت ہے۔ گویا وہ قومی مفادات کے بجائے اپنے مفادات کی فکر کرنا چاہتے ہیں۔

تو کیا اس ملک میں جمہوریت ان خطوط پر آگے بڑھے گی......؟ جمہوری حکمران بادشاہوں کی طرح فیصلے کریں گے......؟ کیا انہیں ان کے بدنیتی پر مبنی اور غلط اقدامات پر ٹوکنے اور روکنے والا کوئی نہیں ہوگا......؟

یہ تو مستقبل کا بڑا بھیانک نقشہ ہے۔ اس نے سوچا۔ مستقبل حال سے ہی بنتا ہے۔ حال کو درست کئے بغیر مستقبل اچھا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ابھی تو یہ دل شکستہ قوم ملک کے دولخت ہونے کے صدمے سے دوچار ہے۔ اس سے سنبھلنے میں بھی وقت لگے گا۔

لیکن جمہوریت تو عوام سے ہے۔ جیسے عوام ہوں گے، ویسی ہی حکومت ہوگی۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت ڈپریس ہوگئی ہے۔ اس نے سر جھٹکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر آکر اس نے رشیدہ سے نوریز کے بارے میں پوچھا۔ وہ ہر روز عبدالحق کو چھوڑ کر واپس آجاتا تھا۔ لیکن آج ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ عبدالحق کو ساتھ لے کر ہی آئے گا۔

❀❀❀

عبدالحق اپنے دفتر کے بیرونی کمرے میں داخل ہوا اور عادات کے مطابق بلند آواز میں السلام علیکم کہا۔

ہمیشہ کی طرح کسی نے آہستہ سے اور کسی نے بلند آواز میں سلام کا جواب دیا۔ وہ سب شرمندہ ہوئے تھے کہ وہ انہیں سلام میں پہل کرنے کا موقع کبھی نہیں دیتا۔ اور ہمیشہ کی طرح وہ سب اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔

''میں ہمیشہ کہتا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں۔'' عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن آج تو بالکل بھی نہیں ہے۔''

لیکن وہ سب کھڑے ہی رہے۔ ان کے چہروں پر اداسی اور آنکھوں میں نمی تھی۔

"چلو...... آج تم نے آخری بار یہ رسم پوری کر لی۔ اب تو بیٹھ جاؤ......!" عبدالحق نے خوش دلی سے کہا۔

لیکن وہ سب کھڑے رہے۔ کوئی کچھ بولا بھی نہیں۔

"بیٹھ جاؤ......! میں وہ نہیں رہا، جو تھا۔ تم پر میری رسمی تعظیم بھی واجب نہیں۔ حالانکہ میں اسے پسند نہیں کرتا تھا۔"

"اب آپ ہمارے لئے اور زیادہ قابل احترام ہوگئے ہیں۔" بالآخر پی اے نے لب کشائی کی۔

"وہ احترام بھی ہم دل سے کرتے تھے سر......! مجبوراً نہیں۔" چپڑاسی بولا۔

"اب یہ بتاؤ کہ میرے لئے کیا حکم ہے......؟" عبدالحق نے کہا۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں سر......!" پی اے نے کہا اور چپڑاسی تو باقاعدہ رونے لگا۔

"بھئی میرے لئے کوئی حکم تو آیا ہوگا اوپر سے......؟ میں اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"آپ اجازت دیں تو مجھے واش روم جانا ہے سر......!" پی اے نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"اب تمہیں میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے شمیم......!"

اور پی اے تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

عبدالحق اپنے اسٹینو کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے سلسلے میں کیا احکامات آئے ہیں......؟"

"مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں سر......!" اسٹینو نے معصومیت سے کہا۔

"میں اپنے کمرے میں جا سکتا ہوں۔" عبدالحق چپڑاسی کی طرف متوجہ ہوا جو اب اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

"آپ کو کون روک سکتا ہے سر......؟" چپڑاسی نے کہا اور آگے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھولا۔ عبدالحق اندر داخل ہوا۔

چپڑاسی دروازہ بند کرنے لگا تو عبدالحق نے اسے روک دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں بس ایک کام کے لئے آیا ہوں۔ وہ کر کے رخصت ہو جاؤں گا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر چوری کا الزام بھی لگے یا تم لوگوں پر کوئی عتاب آئے۔"

یہ سن کر چپڑاسی پھر رونے لگا۔

عبدالحق نے سائیڈ ریک پر رکھی اپنی جائے نماز اٹھائی اور مخصوص جگہ پر اسے بچھا کر شکر کے دو نفل کی نیت کر کے نماز پڑھنے لگا۔ نماز کے بعد اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے عزت اور عافیت کے ساتھ اس بھاری بوجھ سے چھٹکارا عطا فرمایا۔

نماز پڑھ کر اس نے جائے نماز دوبارہ وہیں رکھ دی اور کمرے سے نکل آیا۔

"اب میں اجازت چاہتا ہوں۔" اس نے سب سے پہلے مصافحے کے لئے چپڑاسی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"سر......! ایسے تو ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔" پی اے نے کہا۔

"کیا مطلب......؟"

"ہمارے ساتھ چائے پئیں گے آپ......؟"

"سرکاری چائے پر میرا حق نہیں رہا۔"

"یہ ہماری طرف سے ہوگی۔ کیفے سے منگائیں گے سر......!"

"اس خلوص کو تو میں رد نہیں کر سکتا۔" عبدالحق نے کہا اور وزٹرز کے لئے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

چپڑاسی چائے لینے کے لئے چلا گیا۔

عبدالحق خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ پچھلی بار جب اس نے اس ملازمت سے جان چھڑانے کا ارادہ کیا تھا تو اسے اس کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اور اب خود ہی نجات مل گئی تھی۔

چائے پینے کے دوران اس نے پی اے سے پوچھا۔

"تم نے بتایا نہیں شمیم کہ تمہیں کیا احکامات ملے تھے میرے سلسلے میں......؟"

پی اے نے ایک لیٹر اس کی طرف بڑھایا۔

"کہا گیا تھا کہ یہ حکم نامہ آپ کو دے دوں اور آپ کو آپ کے کمرے میں داخل نہ ہونے دوں۔" اس نے لہجے میں شرمندگی تھی۔

"تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں......؟"

"موقع ہی کہاں ملا سر......؟" پی اے نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"مجھے باتھ روم جانا تھا سر......!"

"یہ تو بری بات ہے۔"

"آپ نے ہمیشہ سکھایا کہ جھوٹ نہیں بولنا ہے۔ اس کا بھرم رکھ لیا سر......! مگر جانتا ہوں کہ اب جھوٹ ہی جھوٹ ہوگا۔" شمیم کی آواز بھرا گئی۔

"بہر حال تم گواہ ہو فضل کہ میں نے کمرے میں صرف نماز پڑھی اور کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اسی لئے میں نے تمہیں دروازہ بند نہیں کرنے دیا تھا۔" عبدالحق چپڑاسی کی طرف مڑا۔

"جی سر......! مگر جائے نماز تو لے لیں۔ وہ تو آپ کی اپنی ہے۔"

"آنے والے صاحب سے کہنا کہ وہ ان کے لئے میری طرف سے تحفہ ہے۔ اگر وہ اس سے استفادہ کریں گے تو میری عزت افزائی ہوگی۔"

چائے پی کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر کبھی دانستہ نادانستہ میں نے تم میں سے کسی کے ساتھ زیادتی، کسی کی دل آزاری کی ہو تو میں اس پر معافی چاہتا ہوں۔"

"ایسے نہ کہیں سر......! آپ سے ہمیں شفقت اور عزت کے سوا کچھ نہیں ملا۔" پی اے نے کہا۔

"آپ کے تو ہم پر بڑے احسان ہیں سر......!" چپڑاسی بولا۔

"ہم آپ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے سر......!" اسٹینو نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہم آپ کو کبھی بھول نہیں سکتے۔"

عبدالحق ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکلا تو حیران رہ گیا۔ باہر لوگ جمع تھے۔ سب اس سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ وہ ہاتھ ملاتا، ان کے درمیان جگہ بناتا زینے کی طرف بڑھا۔ لفٹ مین نے اس کے لئے لفٹ کا دروازہ کھول دیا۔

"اب اس پر میرا حق نہیں۔" عبدالحق نے کہا۔

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس کے پیچھے شاید پورا دفتر جمع ہو گیا تھا۔ گیٹ پر اس نے چوکیدار سے ہاتھ ملایا۔

"اپنا خیال رکھنا شیر خان......!"

"میں ہمیشہ آپ کا خادم ہوں صاحب......!" شیر خان نے کہا۔

باہر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ لیکن اسے گاڑی میں بیٹھنے میں بھی پندرہ منٹ لگے۔ کوئی بھی اس سے ہاتھ ملانے سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ کچھ لوگ تو اس کے ہاتھ چوم رہے تھے۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ ایک اخباری فوٹوگرافر بڑی تندہی سے تصویریں کھینچنے میں مصروف ہے۔ اس کے ساتھ کھڑا رپورٹر وہاں موجود کچھ لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔

بالآخر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ نوریز نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"گھر چلنا ہے نوریز......!" عبدالحق نے آہستہ سے کہا۔

❁❁❁

ارجمند لان میں ٹہل رہی تھی کہ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ وہ بے تابی سے گاڑی کی طرف لپکی۔ عبدالحق اپنی عادت کے مطابق دروازہ کھول کر خود ہی باہر آ گیا۔

"یہ کیا ہو گیا آغا جی......؟" ارجمند نے کہا۔

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

"ارے...... تمہیں کیا ہوا ارجی......؟"

"بات ہی ایسی ہے آغا جی......! یہ سب کیا ہوا......؟ کیوں ہوا......؟"

"کمال ہے......! میں خوش ہوں اور تم پریشان ہو......؟" عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب حیران ہونے کی باری ارجمند کی تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ عبدالحق اداس

ہوگا۔ لیکن اس کا چہرہ تو خوشی سے دمک رہا تھا۔

''آپ کو اس طرح رُسوا کر کے نکال دیا گیا......؟''

عبدالحق نے دروازہ کھولا اور گھر میں داخل ہوا۔

''آؤ نا...... کیا باہر ہی کھڑی رہو گی......؟'' اس نے ارجمند سے کہا۔

ارجمند اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''آپ کچھ بولتے کیوں نہیں......؟''

وہ حمیدہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''سب سے پہلے اماں کے پاس جانا ہے نا......!'' اس نے حمیدہ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''میں بھی آ سکتی ہوں......؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''کمال ہے......! تمہیں اجازت کی ضرورت ہے......؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''تم تو ہر چیز میں شریک ہو۔ ہر بات کا حق ہے تمہیں۔''

وہ دونوں کمرے میں چلے گئے۔

حمیدہ آرام کر رہی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ارے پتر......! تو اتنی جلدی آ گیا......؟''

''ہاں اماں......! آج مجھے آزادی مل گئی۔'' عبدالحق نے اس کے پیروں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ارجمند قریب ہی موجود کرسی پر ٹک گئی۔

''کیا مطلب پتر......؟''

''مجھے نوکری سے نکال دیا گیا اماں......!'' عبدالحق نے بہت خوش ہو کر کہا۔

حمیدہ حیرت اور صدمے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''یہ تو بے عزتی کی بات ہے پتر......! اور تو خوش ہو رہا ہے......؟''

''عزت اور ذِلت تو اللہ کی طرف سے ہے اماں......! اور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میں تو اس نوکری کی وجہ سے خود کو قیدی محسوس کرتا تھا۔ میرے لئے تو خوشی

کی ہی بات ہے اماں......! کہ رہائی مل گئی۔''

حمیدہ نے چند لمحے سوچا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''تو خوش ہے تو خوشی کی ہی بات ہو گی پتر......! پر یہ تو بتا...... انہوں نے تجھے نکالا کیوں......؟''

''اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے اماں......؟ اپنے لئے تو اچھا ہی ہوا۔''

اس پر ارجمند کھنکھاری۔ عبدالحق نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے میں اس کی اَن کہی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اور اس نے یہ جان لیا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اماں کو وجہ کسی اور کے ذریعے معلوم ہو گی تو انہیں دکھ زیادہ ہو گا۔

''انہوں نے مجھے بددیانتی اور بدعنوانی کے الزام میں نکالا ہے اماں......!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

اس بار حمیدہ کا صدمہ گہرا تھا۔

''یہ تو بہت بری بات ہے پتر......! تو ایسا تو نہیں ہے۔ پھر یہ کیوں ہوا......؟'' اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''میں نے کہا نا اماں......! کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔''

''پر پتر......! دنیا میں بے عزتی تو ہو گی نا...... جگ ہنسائی تو ہو گی۔''

''اس کی فکر کیوں کرتی ہو اماں......؟'' عبدالحق نے اس کا ہاتھ تھام کر دوسرے ہاتھ سے تھپتھپایا۔

''تمہیں یہ تو یقین ہے نا کہ میں ایسا نہیں ہوں......؟''

حمیدہ نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیا میں تجھے جانتی نہیں......؟ کیا مجھے پتا نہیں کہ تو تو قوم کی محبت میں قوم کی خدمت کرنے گیا تھا......؟ تجھے کوئی ضرورت تھی اس نوکری کی......؟ اور میں تو تجھے اس وقت بھی منع کرتی تھی۔''

''بس...... تو غم کیوں کرتی ہو......؟''

''عزت بڑی چیز ہوتی ہے پتر......!''

''یہاں کی عزت ذلت عارضی ہے اماں......! اللہ آخرت میں عزت رکھ

لے تو سب ٹھیک ہے۔ ورنہ سب بے کار۔''

''میں جھوٹ نہیں بولتا اماں......! مجھے تو خوشی ہوئی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

پھر ارجمند کی طرف مڑا۔

''آج تو دعوت کروا چھی سی اس خوشی میں۔''

''میں نے سوچا تو یہی تھا۔'' ارجمند نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جب آپ نے کہا کہ دوپہر کا کھانا گھر پر کھائیں گے تو یہی سوچا تھا میں نے۔ مگر جب اخبار میں آپ کی تصویر دیکھی تو خبر پڑھی تو پریشان ہوگئی۔'' یہ کہتے کہتے اسے احساس ہوگیا کہ اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی ہے۔

حمیدہ تو ہل کر رہ گئی تھی۔

''تو تیری تصویر اور تیرا نام اخبار میں بھی آیا ہے......؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''کچھ فرق نہیں پڑتا اماں......! اپنا ضمیر مطمئن ہونا چاہئے......!''

''یہ کیسی بات کرتا ہے تو......؟'' حمیدہ اب غصے سے بے حال تھی۔

''ایک ایماندار آدمی کو دنیا بھر میں اس طرح بدنام کرنا...... دیکھنا تو، جن لوگوں نے یہ کیا ہے، انشاء اللہ......! انہیں عزت کی موت بھی نصیب نہیں ہوگی۔ اللہ دنیا میں بھی حساب لیتا ہے۔'' اور وہ بددعائیں کرنے لگی۔

''ایسے بددعا نہیں کرتے کسی کے لئے اماں......!''

''دل دُکھتا ہے تو آدمی بددُعا ہی کرتا ہے۔ زبان سے نہیں کروں گی تو دل بددُعا دے گا انہیں۔ وہ اور برا ہوگا۔ کیسے بدنام کیا ہے تجھے انہوں نے۔''

''ایک میں ہی تو نہیں ہوں اماں......! ایک ہزار سے زیادہ افسر نکالے گئے ہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

حمیدہ کو ایک لمحے کے لئے اس بات سے تسلی ہوئی۔

''تو ان میں ہر طرح کے لوگ ہوں گے پتر......! تجھ جیسے ایماندار بھی ہوں گے اور سچ مچ کے بے ایمان بھی ہوں گے۔'' وہ بولی۔

''کسی کو کسی کا کیا پتا اماں......؟ اور میں نے تو صرف اپنا نام دیکھا تھا۔ اب

اخبار تفصیل سے پڑھوں گا جا کر۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اور ارجمند کمرے سے نکلے تو ارجمند نے شرمندگی سے کہا۔

''سوری آغا جی......!''

عبدالحق چونکا۔

''کس بات پر ارجی......؟''

''اخبار والی بات بلاارادہ منہ سے نکل گئی۔ میں نے دادی اماں کا دکھ اور بڑھا دیا۔''

''تم خواہ مخواہ شرمندہ ہوتی ہو۔ ایسی باتیں چھپتی کہاں ہیں......؟''

ارجمند کھانا پکانے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی اور عبدالحق اسٹڈی میں اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اب وہ بدعنوان افسروں کی اس فہرست کا جائزہ لے رہا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، اسے اس کا کوئی غم نہیں تھا۔ فہرست کا جائزہ لیتے ہوئے پہلی بار اسے دکھ ہوا۔ ان سب لوگوں کو تو وہ نہیں جانتا تھا، لیکن اس فہرست میں ایسے کئی لوگ تھے، جن کے خلوص اور ایمانداری کی وہ قسم کھا سکتا تھا۔ اور وہ اس کے نزدیک بہت بڑے لوگ تھے۔ سچ یہ ہے کہ خود اس کے پاس تو اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت موجود تھی۔ اسے تو تنخواہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ لوگ تھے، جن کے لئے اپنی تنخواہ میں گزر کرنا آسان نہیں تھا۔ اور آسائشات اور دولت ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی رہتی تھی۔ مگر انہوں نے کبھی اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ضرورت مند تھے، اور بہت بڑی ترغیبات کے سامنے استقامت کے ساتھ ڈٹے رہے تھے۔ صحیح معنوں میں انہیں اللہ نے بڑائی عطا فرمائی تھی، اور انہیں اس طرح حقیر اور رُسوا کیا گیا تھا۔

اس کا دل دُکھنے لگا۔ دیر تک وہ اداس بیٹھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو معاشرے اور قومیں اپنے اچھے اور بڑے لوگوں کی قدر کرنے کے بجائے انہیں ذلیل و رسوا کرتی ہیں، ان میں بڑی خرابیاں آتی ہیں۔ تاریخ یہی بتاتی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ اس معاشرے میں ایمانداری سے کام کرنے والے مایوس اور دل

برداشتہ ہوں گے اور بے ایمانی اور بدعنوان کو فروغ ہوگا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ برائی بہت تیزی سے پھیلتی ہے۔ جب لوگ یہ دیکھ لیں کہ ایمانداری کا یہ انجام ہے تو پھران کے لئے بے ایمانی کی ترغیب اور موثر ہو جائے گی اور ایمانداری جو ویسے ہی آسان نہیں ہوتی، اور مشکل ہو جائے گی۔

اگر سب کچھ انہی خطوط پر آگے بڑھا تو اگلے تیں پینتیس برسوں میں یہ معاشرہ کہاں کھڑا ہوگا اور اس ملک کا کیا حال ہوگا......؟ اس کا وہ تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اٹھا، بیڈروم میں گیا اور لباس تبدیل کیا۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے......؟ دفتر کی مصروفیات کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ اور اب مصروفیت نہیں تھی تو وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ گزر ہی نہیں رہا تھا۔

اس نے سوچا، اب اپنے لئے کوئی شیڈول ترتیب دینا ہوگا۔ وقت بڑی نعمت ہے۔ اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔

ارجمند کمرے میں آئی۔ لگتا تھا کہ کہیں جانے کی تیاری کر رہی ہے۔

''کہیں جارہی ہو......؟'' عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

''جی......! نورالحق کو اسکول سے لانے کے لئے جاتی ہوں نا......!''

''تم رہنے دو...... آج میں لے آؤں گا۔''

ارجمند خوش ہوگئی۔

''یہ تو بہت اچھا ہے۔ وہ خوش ہو جائے گا آپ کو دیکھ کر۔ کیسی پیاری سرپرائز ملے گی اسے۔''

عبدالحق باہر نکل آیا۔ نوریز گاڑی لئے کھڑا تھا۔

''آج آپ چلیں گے سرجی......؟''

''چلیں گے نہیں، آج میں اکیلا ہی جاؤں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''گاڑی کی چابی مجھے دے دو......!''

نوریز خوشی سے ہنس دیا۔

''چھوٹے صاحب بہت خوش ہوں گے۔'' اس نے کہا اور چابی عبدالحق کی

طرف بڑھا دی۔

❀❀❀

عبدالحق سچ مچ ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔

آزادی کا وہ احساس بہت عجیب تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے اس سے پہلے وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی تھا، جسے اب قید سے رہائی مل گئی ہے۔ اب وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، کہیں بھی جا سکتا ہے۔ سب کچھ جیسے بدل گیا تھا۔ وہی فضا تھی، وہی آسمان تھا، لیکن سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ وہی ہوا تھی، لیکن اب تازگی کا احساس دلا رہی تھی۔ جیسے اب تک وہ سانس ہی نہ لیتا رہا ہو۔ جیسے برسوں کے بعد وہ اب سانس لے رہا ہو۔

اس نے اسکول کے گیٹ کے قریب سائیڈ میں گاڑی پارک کر دی۔

چند منٹ بعد چھٹی کا گھنٹہ بجا اور اس کے ساتھ ہی فضا بچوں کی خوشیوں بھری آوازوں سے مرتعش ہوگئی۔ پھر بچوں کا پہلا ریلا گیٹ سے باہر آیا۔

وہ انہیں دیکھتا رہا۔ کچھ بچے پیدل ہی چل دیئے اور کچھ بس اسٹاپ کی طرف چلے گئے۔ پھر اسکول سے نکلنے والے بچوں کی بھیڑ کم ہوتی گئی۔ بالآخر اس نے نورالحق کو باہر آتے دیکھا۔

نورالحق نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر گاڑی کو پہچان کر اس کی طرف چلا آیا۔ عبدالحق کو اندازہ ہوا کہ شاید نوریز گاڑی سے اُتر کر کھڑا ہوتا ہوگا اور اس کے لئے دروازہ کھولتا ہوگا۔ اس لئے نورالحق کے چہرے پر حیرت تھی۔

عبدالحق جان بوجھ کر باہر نہیں آیا تھا۔ وہ نورالحق کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اور وہ پہلے ہی مرحلے میں کامیاب رہا تھا۔

نورالحق دروازے کی طرف آیا تو عبدالحق نے اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ نورالحق اسے دیکھ کر خوش ہوگیا۔

''بابا جان......!'' وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھا اور دروازہ بند کر کے عبدالحق کو پیار کیا۔

''بابا جان......! آپ......؟'' اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

''ہاں بیٹے......!'' آج میں تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں۔''

''لیکن آپ تو اس وقت دفتر میں ہوتے ہیں......؟''

عبدالحق نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔

''اب ہماری دفتر سے چھٹی ہوگئی۔''

نورالحق نے غور سے اسے دیکھا۔

''تو کیا اب آپ دفتر نہیں جایا کریں گے......؟''

''جی بیٹے......!''

نورالحق خوش ہوگیا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب میں آپ کے ساتھ ہی اسکول آؤں گا اور آپ ہی مجھے واپس لے کر جایا کریں گے۔''

عبدالحق کو ڈر تھا کہ وہ طرح طرح کے سوال کرے گا، جن کے سچے جواب اس کی کم عمری کے پیش نظر بہت پیچیدہ ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا پڑے۔ نورالحق کے ردِعمل پر اس نے سکون کی سانس لی۔

''ٹھیک ہے نا بابا جان......؟''

''ٹھیک ہے......!'' عبدالحق نے بے دھیانی سے کہا۔

''اور اب آپ میرے ساتھ کھیلا بھی کریں گے......؟''

''ضرور......!''

❁❁❁

اس پہلے ہی دن عبدالحق کو اندازہ ہوگیا کہ دفتری اوقات کے دوران نہ صرف وہ اپنے گھر اور گھر والوں کے لئے اجنبی ہے، بلکہ وہ بھی اس کے لئے اجنبی ہیں۔ اسے گھر کے معمولات کا کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ارجمند نے نورالحق سے کہا۔

''چلو بیٹے......! اب تم سو جاؤ تھوڑی دیر۔''

''نہیں امی......! آج میں سونا نہیں چاہتا۔'' نورالحق نے صاف انکار کر دیا۔

''کیوں بھئی......؟''

''مجھے بابا جان کے ساتھ رہنا ہے۔ ان کے ساتھ کھیلنا ہے۔''

''بابا جان روز گھر پر ہوں گے تو آپ روز یہی کریں گے......؟'' ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''جی امی جان......!'' نورالحق نے سادگی سے کہا۔

''یہ ممکن نہیں بیٹے......! آپ کو اپنے روز کے کام معمول کے مطابق کرنے ہیں۔ بابا کے ساتھ جو وقت آپ کو روز ملتا تھا، اب بھی وہی ملے گا۔''

''لیکن اب تو بابا گھر پر رہیں گے۔'' نورالحق نے اعتراض کیا۔

''تب بھی ان کی اپنی مصروفیات ہوں گی۔''

عبدالحق کا جی چاہا کہ کہے...... میری کوئی مصروفیت نہیں، لیکن اس نے مداخلت کو مناسب نہیں سمجھا۔

''سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کی اپنی مصروفیات ہیں نورالحق......!''

ارجمند کی بات جاری تھی۔ وہ بچے سے ایسے بات کر رہی تھی، جیسے وہ بڑا ہو۔

''کتنے سارے کام ہیں آپ کے۔ سو کر اٹھیں گے تو مجھ سے عربی پڑھنا ہے، قرآن پڑھنا ہے، پھر اسکول کا کام کرنا ہے...... ہے نا......؟''

''جی امی جان......! لیکن......''

''اور آپ جانتے ہیں کہ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر سونا صحت کے لئے اچھا ہوتا ہے۔''

''جی امی جان......! لیکن صرف آج......''

ارجمند نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آج جو کچھ کرو گے، کل بھی اس کا دل چاہے گا۔''

عبدالحق سے رہا نہیں گیا۔

''حرج ہی کیا ہے اس میں......؟'' اس نے کہا۔

''حرج ہے آغا جی......! یہ اس نیند کا عادی ہے۔ یہ نہ ملی تو بعد میں پڑھتے ہوئے دماغ سوتا رہے گا۔'' ارجمند نے کہا۔ پھر وہ نورالحق کی طرف مڑی۔

''چلو بیٹے......! میں تمہیں ایک رعایت دے رہی ہوں۔ تم بابا جان سے

لپٹ کر سو سکتے ہو۔''

''شکریہ امی جان......!''

''لیکن میں دیکھوں گی۔ اگر تم نہیں سوئے تو پھر آئندہ کبھی یہ رعایت نہیں ملے گی۔''

''ٹھیک ہے امی جان......! شکریہ......! چلیے بابا جان......!'' اس نے عبدالحق کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بیڈ روم میں چلے گئے۔ نورالحق باپ سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ عبدالحق محسوس کر رہا تھا کہ وہ بات کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ارجمند کے خوف سے بات نہیں کر رہا ہے۔ اس نے سوچا۔

''یہ ارجمند کچھ زیادہ ہی سختی کرتی ہے بچے پر۔''

''بات کرنے کو جی چاہتا ہے تو بات کرو......!'' عبدالحق نے کہا۔

''نہیں بابا جان......! امی نے کہا ہے کہ سونا ہے۔ بس...... میں آپ سے لپٹ کر سو جاؤں گا۔''

''تو کون سا امی دیکھ رہی ہیں بیٹے......؟''

''لیکن اللہ میاں تو دیکھ رہے ہیں بابا جان......!''

عبدالحق ہل کر رہ گیا۔ اتنے چھوٹے سے بچے کے منہ سے اتنی بڑی بات......؟ اسے دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ ارجمند جتنی اچھی بیوی ہے، اس سے کہیں زیادہ اچھی ماں ہے، جبکہ ابھی تک وہ خود ماں نہیں بنی۔ یہ اس کا بیٹا نہیں ہے تو وہ اس کی ایسی تربیت کر رہی ہے۔

''لیکن اگر تمہیں نیند ہی نہ آئے تو......؟'' اس نے کہا۔

''کوشش تو کرنی ہے بابا جان......!'' بچے نے معصومیت سے کہا۔

''کیوں......؟''

''امی سے وعدہ کیا ہے نا میں نے......!''

''اس سے کیا ہوتا ہے......؟'' عبدالحق نے بے پرواہی سے کہا۔

''کوئی وعدہ کرے اور جان بوجھ کر اسے پورا نہ کرے تو اللہ میاں ناراض

ہوتے ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتا یہ بات......؟''

''امی نے بتایا ہے۔''

''تمہیں کیسے یقین کہ صحیح بتایا ہے......؟''

''امی کبھی جھوٹ نہیں بولتیں بابا جان......!'' نورالحق نے کہا پھر بولا۔

''اب میں سونے کی کوشش کروں گا۔ باتیں بعد میں کریں گے۔'' اور یہ کہہ کر وہ اس سے لپٹ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

عبدالحق اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ تو ارجمند کا اس پر اتنا بڑا احسان تھا، جس کا وہ اسے کبھی صلہ نہیں دے سکتا تھا۔ نورالحق اس کا بیٹا تھا...... بن ماں کا بچہ اور وہ اس کی اتنی اچھی تربیت کر رہی تھی۔ چھ سال کا بچہ جس طرح اپنے دل کی خواہش سے لڑ رہا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑا ہوتے ہوتے نفس سے لڑنا اس کے لئے کتنا آسان ہو جائے گا۔ جبکہ وہ اب بھی اپنے نفس سے شکست کھاتا رہتا تھا۔ عاقل و بالغ ہونے، دین کا شعور رکھنے کے باوجود......!

اور یہ تصور اتنے سے بچے کے ذہن میں راسخ ہو جانا کہ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، کتنی بڑی بات تھی۔ اس کے ساتھ وہ بڑا ہوگا تو انشاء اللہ کتنا اچھا انسان بنے گا۔ ورنہ آدمی کو یہ خیال آتا ہی کب ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس پر ایمان ہو تو کوئی برائی کیسے کر سکتا ہے......؟

اس کے دل میں اپنے بیٹے کے لئے فخر کے جذبے نے سر اٹھایا۔ اس نے فوراً ہی لاحول پڑھ کر اسے ذہن سے جھٹکا۔

''ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ...... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ......!'' اس نے زیرلب کہا۔ اب اس کے دل میں شکر کی جگہ فخر تھا۔

اسے احساس ہوا کہ نورالحق سو چکا ہے۔ اس نے دیکھا۔ نورالحق کی سانسیں ہموار تھیں اور وہ واقعی سو چکا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ نرمی سے خود کو اس سے علیحدہ کر لے لیکن ڈر تھا کہ اس کی نیند نہ خراب ہو۔

وہ اسی طرح لیٹا رہا۔

اسے یاد تھا۔ نورالحق کے بارے میں اس کے اور ارجمند کے درمیان اختلافِ رائے ہوا تھا۔ وہ پہلا اور اب تک آخری موقع تھا کہ ارجمند نے اپنی بات منوانے پر اصرار کیا تھا۔ بلکہ اسے اپنی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ موقع نورالحق کی بسم اللہ کا تھا۔

❁❁❁

وہ سادہ سی گھریلو تقریب تھی، جس میں باہر سے صرف عارف، رضوانہ اور ان کے بچے شریک ہوئے تھے۔ تقریب ختم ہونے اور نورالحق کے سو جانے کے بعد وہ حمیدہ کے کمرے میں حمیدہ اور ارجمند سے بات کر رہا تھا۔

''اب تو اسے سکول میں داخل کرائے گا نا پتر......؟'' حمیدہ نے کہا۔

''نہیں اماں......! میرا ارادہ تو کچھ اور ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور میں اس سلسلے میں آپ دونوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ نورالحق پر آپ کا اور ارجمند کا مجھ سے زیادہ حق ہے۔''

''نا پتر...... ! باپ سے زیادہ حق تو کسی کا نہیں ہوتا۔ یہ تو تیری محبت اور سعادت مندی ہے۔''

''مگر میں دل سے اس بات پر یقین رکھتا ہوں، اور آپ کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔''

''پہلے یہ تو بتائیں کہ آپ نے اس سلسلے میں سوچا کیا ہے......؟'' ارجمند نے پہلی بار زبان کھولی۔

''میں چاہتا ہوں کہ پہلے اسے قرآن حفظ کرایا جائے اور اس کے بعد اسکول میں داخل کرایا جائے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے پتر......!'' حمیدہ کے لہجے میں خوشی تھی۔

عبدالحق نے ارجمند کے انداز میں ہچکچاہٹ محسوس کر لی۔

''تمہیں کچھ اختلاف ہے تو کہو......!'' وہ بولا۔

''میری رائے یہ ہے کہ نورالحق کو اسکول میں داخل کرایا جائے۔''

''تمہارے ذہن میں اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی......؟''

''جی...... وہ میں بتاتی ہوں۔'' ارجمند نے کہا۔

عبدالحق حیرت اور تجسس سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ارجمند کا ردِعمل اس کی توقع کے برعکس تھا۔ اسے تو یقین تھا کہ ارجمند اس کی تائید کرے گی۔

''دیکھیں...... بچوں کی ابتدائی تعلیم ہوتی ہی کیا ہے......؟'' ارجمند نے کہا۔

''حروفِ تہجی کی پہچان اور پھر انہیں جوڑ کر لفظ بنانا۔ ہندسوں کی پہچان، جمع نفی، ضرب، تقسیم اور پہاڑے یاد کرنا۔ اور تو کچھ نہیں......!''

''تم تو میری ہی بات کی تائید کر رہی ہو۔'' عبدالحق نے بےصبرے پن سے کہا۔

''تم بھی یہی ثابت کر رہی ہو کہ اسکول کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔''

''نہیں آغا جی......! میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ ابتدائی تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ تو گھر پر بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن اسکول کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔''

''میں سمجھا نہیں......! ابتدائی تعلیم کی اہمیت نہیں تو اسکول کیسے اہم ہوگیا......؟'' عبدالحق کے لہجے میں الجھن تھی۔

''دیکھیں...... نورالحق ماشاءاللہ چار سال کا ہو گیا ہے۔ ابھی اس کی دنیا بہت محدود ہے۔ ماں، باپ، دادی، گھر کے ملازمین اور پھوپھا جان کے گھر کے لوگ...... ان کے سوا کیا دیکھا ہے اس نے......؟ اور سبھی سے محبت ہی تو ملتی ہے اسے۔ کوئی ہم سن آج تک نہیں ملا اسے۔ جس سے محبت بھی ہو اور رقابت بھی، دوستی بھی ہو اور لڑائی بھی، کچھ لینا دینا بھی ہو اور چیزوں پر چھینا جھپٹی بھی۔ اسکول کی اہمیت یہ ہے کہ وہاں بچوں کا ذہنی افق بڑا ہوتا ہے۔ زندگی کا منظر پھیلتا ہے۔ بچہ نئے تعلقات اور نئے جذبوں سے روشناس ہوتا ہے۔ گھر میں اسے ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اسکول میں اسے زندگی کے چیلنجز کا پتا چلنا شروع ہوتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ وہ یہاں گھر کی طرح محفوظ نہیں۔ اسے اپنی چیزوں کا خود خیال رکھنا ہے۔ وہ اپنے ہم عمر بچوں کو اور ان کے تنوع کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ نیک بچے، شریر بچے، حاسد اور جھگڑالو بچے، قابضانہ فطرت والے بچے، وہ ان سے نمٹنا سیکھتا ہے۔ اسے اپنے لئے دوست منتخب کرنا آتا ہے۔ اپنے فیصلے خود کرنا آتا ہے۔ پھر فیصلے غلط ہوں تو ان سے سیکھتا ہے۔

دوست غلط بن جائیں تو انہیں چھوڑنا آتا ہے۔ بچوں کا پہلا اسکول ان کے لئے تعلیم کا مرکز نہیں، بلکہ زندگی کی عملی زندگی کی پہلی درس گاہ ہوتا ہے۔ آغا جی......! یہی اس کی اہمیت ہے اور یہ اس کا بنیادی حق ہے، جو اسے ہر حال میں ملنا چاہیئے۔"

عبدالحق اور حمیدہ دونوں حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"پر تو نے یہ سب کچھ کیسے سمجھ لیا نکی......؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"آدمی اپنی محرومی سے جو کچھ سیکھتا ہے، اپنی اولاد کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں خود اسکول سے محروم رہی۔ پھوپھی جان نے بہت کوشش کی، لیکن میرا اسکول جانا ممکن نہیں ہوا۔ میں کم سنی میں اپنے ہم سن بچوں کی صحبت سے محروم رہی۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرا بچپن ادھورا رہ گیا۔ آپ کا اور آغا جی کا احسان کہ مجھے اسکول جانا اور وہاں بہت کچھ سیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ ابتدا میں مجھے کتنی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مجھے تو گھلنا ملنا آتا ہی نہیں تھا۔ میں تو وہاں نکو بن کر اکیلی رہ جاتی۔ اللہ کے کرم سے کچھ لڑکیاں ایسی مل گئیں جو خود سے دوستی کرنے والی تھیں۔ پھر ان سے میں نے دوستی کرنا سیکھا۔"

عبدالحق کو پہلی بار احساس ہوا کہ یہ اس کے اور ارجمند کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ وہ بھی اسکول میں ابتدائی تعلیم سے محروم رہا تھا۔ وہ بھی دیر سے اسکول میں داخل ہوا تھا۔ لیکن ایک فرق وہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ ارجمند کے مقابلے میں بہت زیادہ پُراعتماد تھا۔ اس کا ایک فیملی بیک گراؤنڈ تھا، جو بہت مضبوط تھا۔ ارجمند بے چاری نے تو اچھا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔

"مگر میں اندر سے اتنی پُراعتماد نہیں، جتنی نظر آتی ہوں۔" ارجمند کہتی رہی۔

"میں سمجھتی ہوں، میری وہ ابتدائی کمی کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ بچے اسکول میں ساتھ ہوتے ہیں تو بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ انہیں درجہ بندی کرنی آجاتی ہے۔ کون دوست ہے......؟ کون بہت اچھا دوست ہے......؟ کس سے دور رہنا بہتر ہے......؟ کس کے ساتھ نرمی برتنی ہے......؟ کس کے لئے ایثار کرنا ہے......؟ کس کے سامنے ڈٹ جانا ہے......؟ کسے اپنی چیز دینی ہے......؟ کسے اپنی چیز لینے سے روکنا ہے......؟ بچہ اپنے حساب سے فیصلہ کرنا سیکھتا ہے کہ کون اچھا ہے اور کون برا۔ اسکول نہ ملے تو

بچہ زندگی کی تعلیم میں پیچھے رہ جاتا ہے۔"

حمیدہ بڑے فخر سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پر تو نے اسکول جائے بغیر یہ سب کچھ کیسے سیکھ لیا......؟ سب کچھ تو سمجھتی ہے تو......؟"

"سمجھتی تو ہوں، لیکن عمل نہیں کر پاتی۔ ہر بات مان جاتی ہوں۔ اپنی بات پر اصرار کرنے کا اعتماد نہیں ہے مجھ میں۔" ارجمند پہلی بار اپنے اندر کی باتیں کھول رہی تھی۔

"اب اصرار کر تو رہی ہو۔" عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اصرار کیسا......؟ قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"اور قائل کر بھی لیا۔ نورالحق کو پہلے اسکول میں داخل کرائیں گے ہم۔" عبدالحق نے کہا۔

"اور ساتھ ہی ہم اسے قرآن بھی حفظ کرائیں گے۔"

"مجھے اس سے بھی اختلاف ہے آغا جی......!" ارجمند نے کہا۔

حمیدہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ عبدالحق کو شاک لگا۔

"اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی......؟" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"جی آغا جی......! وجہ تو ہے...... یہ الگ بات کہ آپ اس سے اتفاق نہ کریں۔"

"تو نورالحق کو قرآن حفظ کرنے سے روکنے کی بات کر رہی ہے نکی......؟" حمیدہ کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

"وجہ تو سن لو اماں......!"

"حافظ کا بہت بڑا درجہ ہے آغا جی......! لیکن اس کی بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔" ارجمند نے کہا۔ وہ بہت محتاط تھی۔ جانتی تھی کہ جو کچھ وہ کہنے والی ہے، اسے سننے والے اس معاملے میں غیر جانبدار نہیں ہیں۔ ان کی ایک حتمی رائے ہے، جس سے وہ اختلاف کر رہی ہے۔

"اور ذمہ داری اس وقت ڈالی جانی چاہیئے، جب وہ اس کا اہل ہو جائے،

جس پر ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی ......؟" عبدالحق نے معاندانہ لہجے میں کہا۔

"میں آپ سے کہوں کہ نورالحق کی شادی کر دیجئے تو آپ کیا کہیں گے ......؟ کیا کریں گے ......؟" ارجمند نے کہا۔

"ہنسنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں ......؟" عبدالحق کے لہجے میں سنگینی تھی۔ اتنے سنجیدہ مسئلے پر ارجمند کا غیر سنجیدہ رویہ اسے اشتعال دلا رہا تھا۔

"کیوں ......؟"

"اس کیوں کا جواب بھی دینا ہوگا۔"

"جی ...... بالکل ......!"

حمیدہ ان دونوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ارجمند نے بہت سوچ سمجھ کر اختلاف کیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"بھئی ...... شادی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بچے کو اتنی سمجھ کہاں ہوتی ہے ......؟ پھر شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ یہ تو بہت عملی معاملہ ہے، اور بچہ عملی دنیا سے بہت دور ہوتا ہے۔" عبدالحق نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"قرآنِ حکیم تو اس کے مقابلے میں بہت بڑی ذمہ داری ہے آغا جی ......!"

"تم کیسے دونوں کو ملا رہی ہو ......؟" عبدالحق نے چڑ کر کہا۔

"حفظ تو بچوں کو ہی کرایا جاتا ہے، جب دماغ کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔"

"یوں تو بچپن میں شادیاں بھی کر دی جاتی ہیں۔"

"وہ تو جہالت تھی، جواب ختم ہوتی جا رہی ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"کتنے مسائل پیدا ہوئے اس جہالت سے ......؟ بڑا ہونے پر بعض اوقات لڑکا اور لڑکی دونوں ہی اس شادی کو قبول نہیں کرتے تھے۔"

"تو بچوں کے فیصلہ کرنے کے حق کو تسلیم کرتے ہیں آپ ......؟"

"کیوں نہیں ......؟"

"تو حفظ کرنے کے معاملے میں بھی یہ حق انہیں ملنا چاہئے ......؟"

"بالکل ملنا چاہئے ......! نورالحق سے پوچھ لینا کہ وہ حفظ کرنا چاہتا ہے یا نہیں ......؟"

"اور اگر میں پوچھوں کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے یا نہیں ......؟ اور وہ کہے کہ کرنا چاہتا ہے تو ......؟"

"کیسی جاہلانہ بات ہے ......؟" عبدالحق جھنجلا گیا۔

"ابھی وہ فیصلہ کیسے کر سکتا ہے ......؟ ابھی تو وہ سمجھدار نہیں ہے۔"

"تو قرآن حفظ کرنے کے سلسلے میں وہ کیسے فیصلہ کر سکتا ہے ......؟"

"یہ اور بات ہے ...... یہ تو تعلیم ہے اور قرآن تو فرض ہے مسلمان پر۔"

"بالکل ٹھیک آغا جی ......! اس سے میں متفق ہوں۔ قرآن پڑھنا فرض ہے اور اس کے بعد بھی قرآن کے تین فرض ہیں ...... مرحلہ وار۔"

"جانتا ہوں۔"

"تو بتا بھی دیں ......!"

"قرآن پڑھنا، اسے سمجھنا، اس پر عمل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا۔"

"اس میں حفظ کرنے کا تو ذکر نہیں کیا آپ نے ......؟"

عبدالحق زچ ہو گیا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو ......؟"

"یہی کہ قرآن حفظ کرنا فرض نہیں ہے۔ پڑھنا فرض ہے۔ اور فرض ہر چیز پر مقدم ہے۔"

"تمہاری بات منطقی اعتبار سے درست ہے۔" عبدالحق کا لہجہ پہلی بار دھیما ہوا۔

"مگر مجھے یہ بتاؤ کہ حفظ کرانے میں کیا حرج ہے ......؟"

"جس طرح میں سوچتی ہوں آغا جی ......! ممکن ہے، میں غلطی پر ہوں۔ لیکن بات اتنی اہم ہے کہ مجھے بتانا چاہئے۔ فیصلہ تو آپ کو اور دادی جان کو کرنا ہے۔" ارجمند نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بات شروع کی۔

"حفظ کرنا بڑی بات نہیں کہ وہ تو اللہ کی رحمت اور فضل سے ہو جاتا ہے۔

ورنہ اتنی ضخامت کی کوئی کتاب، اپنی مادری زبان میں بھی کوئی لفظ بہ لفظ یاد کرکے تو دکھائے۔ لیکن بعد کی ذمہ داری یاد کرنے والے پر ہوتی ہے۔ ہر روز باقاعدگی سے تازہ کرنا کہ کہیں بھول نہ جائے، بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ ہم نورالحق کو قرآن حفظ کرائیں گے تو اس سے پہلے یہ ہماری ذمہ داری ہوگی۔ کیونکہ وہ تو بچہ ہے اور یہ فیصلہ اس کا نہیں۔ اب مستقبل کا تو کسی کو پتا نہیں۔ کون جانے، وہ بڑا اور ذمہ دار آدمی بنے تو کیا حالات ہوں......؟ خدانخواستہ اس کی معاشی جدوجہد سخت ہو اور زندگی کے مسائل بہت زیادہ ہوں، جن کی وجہ سے اسے دہرانے، تازہ کرنے کی فرصت نہ ملے اسے اور وہ قرآن بھولنے لگے تو ذمہ داری میری اور آپ کی بھی ہوگی۔ بلکہ ہماری ہی ہوگی۔ کیونکہ اسے تو ابھی کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ اس کی طرف سے فیصلہ ہم ہی کر رہے ہیں۔"

"دوسرے طوطے کی طرح یاد کرنے کا کیا فائدہ کہ آدمی دن میں سو بار اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھے اور دوسروں کو سنائے، لیکن اسے خود معلوم ہی نہ ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس سے بڑی بات یہ کہ عمر بھر جو کچھ پڑھتا رہے، عمل اس کے برعکس کرے...... میرے نزدیک تو یہ بہت خوفناک بات ہے۔ قرآن میں ایک حکم، ایک تنبیہ پڑھنے کے بعد بھی آدمی وہی کچھ کرتا رہے تو اس کا کیا بنے گا......؟ میری بات شاید آپ کو ناگوار لگے، لیکن میں کہوں گی ضرور۔ بہت خوب صورت آواز میں خوش الحانی کے ساتھ قرأت کی جائے تو آدمی تو کیا، کائنات جھوم اٹھتی ہے۔ اسی لئے ہم اپنے بچوں کو حافظ اور قاری بناتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اللہ نے قرآن جھومنے کے لئے نازل نہیں فرمایا۔ اللہ نے تو بتایا کہ اگر اس ذاتِ پاک نے یہ قرآن پہاڑ پر نازل فرمایا ہوتا تو وہ اس کی ہیبت سے پاش پاش ہو جاتا۔ قرآن میں ہی بتایا کہ نصرانیوں میں علم رکھنے والے جب اس کلام کو سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور وہ سجدے میں گر جاتے ہیں۔ قرآن کی چند سورتوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا، وہ صاحب قرآن کی آگہی تھی، اور انہی سورتوں کی قرأت سن کر ہم سر دھنتے ہیں، کیا یہ ہماری جہالت نہیں......؟ قرآن انسانوں کو ان کے کفر، شرک اور برے اعمال کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے ملنے

والے عذاب سے ڈرانے اور ایمان لانے اور اچھے اعمال کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری سنانے کے لئے نازل کیا گیا۔ سننے، سر دھننے اور جھومنے کے لئے نہیں۔ قرآن انسان کو اللہ کا اچھا بندہ بننا سکھانے کے لئے نازل کیا گیا۔ اس کا احترام یہ ہے کہ اس کے چاروں حقوق ادا کئے جائیں اور اس پر عمل کر کے زندگی کو سنوارا جائے۔"

عبدالحق دم بخود بیٹھا تھا۔ ارجمند کے خاموش ہونے کے بعد بھی دیر تک اس سے بولا نہیں گیا۔ پھر وہ بولا تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"کیا ہم یہ چاروں حقوق ادا کر سکتے ہیں قرآن کے......؟" اس نے سوال اٹھایا۔

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"اصل میں سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے آغا جی......! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ اللہ توفیق عطا فرماتا ہے تو ہم پڑھتے ہیں۔ وہ سمجھ عطا فرماتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں۔ اور نفس کا غلام ہونے کے ناطے عمل ہمارے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ رحمت فرماتا ہے تو جتنا وہ چاہے، عمل عطا فرما دیتا ہے۔ اور دوسروں تک پہنچانا یعنی تبلیغ عالموں کے ذمے ہے، جنہوں نے عمر قرآن کے علم کے حصول میں گزاری ہو۔"

"تو چوتھا حق ہم ادا نہیں کر سکتے......؟"

"میرے خیال میں ہم عام لوگ عوام الناس تک پہنچانے کے اہل نہیں۔ لیکن اللہ نے محروم تو کسی کو بھی نہیں رہنے دیا۔ قرآن کا حق ہے کہ اللہ کی رحمت سے جو کچھ آپ نے قرآن سے سمجھا اور سیکھا، وہ اپنے بیوی بچوں تک پہنچا دیں، کیونکہ قیامت کے دن آپ سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

عبدالحق چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی ارجمند......! اب یہ بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے......؟ نورالحق کے لئے تم کیا چاہتی ہو......؟"

"میں نے کہا نا کہ فیصلہ کرنا آپ کا اور دادی اماں کا کام ہے۔ میں تو بس اپنی رائے دے سکتی ہوں۔"

"میں وہی پوچھ رہا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے......؟"

"قرآن سے آغاز کیا جائے، پھر اس میں عربی کو شامل کر لیا جائے۔" ارجمند نے کہا۔

"یہ کام آپ بھی کر سکتے ہیں اور میں بھی، ادھر اسکول اپنی جگہ۔ بچے پر بوجھ بھی نہیں ہوگا۔ قرآن مکمل ہوتے ہوتے عربی کا شعور بھی آ جائے گا اسے۔ اللہ کی رحمت سے قرآن فہمی بھی شروع ہو جائے گی۔"

حمیدہ نے جواب تک خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی، محبت سے ارجمند کو لپٹا لیا اور اسے پیار کرنے لگی۔

"تو بہت اچھی اور بہت عقل والی ہے نکی.....!" اس نے کہا۔

"یہ اللہ کا فضل ہے دادی اماں.....! وہی تو راہ دکھانے والا ہے۔"

❁❁❁

نورالحق کسمایا تو عبدالحق ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔ اس نے بڑی نرمی سے نورالحق کو خود سے علیحدہ کیا۔

وہ دو سال پرانی یاد تھی اور ان دو سالوں میں اللہ کے فضل سے نورالحق کتنا آگے چلا گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اللہ سب کچھ دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے، اس سے کچھ چھپا نہیں اور جب کسی کے ساتھ یہ آگہی ہر لحہ رہے تو سمجھو کہ اس نے تقویٰ کی راہ پر قدم رکھ دیا ہے اور نورالحق جانتا تھا کہ اللہ وعدے کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اور ایسی نہ جانے کتنی باتیں وہ جانتا ہوگا، جو ہم بڑے جانتے تو ہیں، لیکن یاد نہیں رکھتے، زندگی میں عمل کرنے کے موقع پر بھول جاتے ہیں۔

اس کی رو بدلی تو اسے اجنبیت کا احساس ہوا۔ کچھ دیر تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی یادداشت کھو گئی ہے۔

"یہ میں کہاں ہوں.....؟ یہ کون سی جگہ ہے.....؟" اور پھر اس نے سوچا کہ وہ یہاں کیوں ہے.....؟ اسے تو آفس میں ہونا تھا۔

پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس کی ایک بہت بڑی مصروفیت ختم ہو گئی ہے۔ اسے اپنے اندر ایک خالی پن کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ کیا کرے گا.....؟ یہ تو بے کاری ہے۔ یوں تو وہ ناکارہ ہو جائے گا۔

لیکن اسی وقت نورالحق بیدار ہو گیا۔

"بابا جان.....! میں آپ کے ساتھ تھوڑی دیر کھیل سکتا ہوں.....؟" اس نے اٹھتے ہی کہا۔

"کیوں نہیں.....؟ لیکن پہلے ہاتھ منہ دھو کر آؤ.....!"

نورالحق تیزی سے باتھ روم میں چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے عبدالحق سے کہا۔

"چلیں بابا.....!"

"آؤ.....!" عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

نورالحق نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ لیکن دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹکا۔

"لیکن بابا جان.....! امی....."

"فکر نہ کرو.....ہم چپکے سے نکل چلیں گے۔"

ہیجان اور مسرت سے نورالحق کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

ارجمند اس وقت حمیدہ کے کمرے میں تھی۔ وہ دونوں بغیر کسی رکاوٹ کے لان میں پہنچ گئے۔

"مگر بابا.....! ہم کھیلیں گے کیا.....؟" نورالحق نے سوال اٹھایا۔

فوری طور پر عبدالحق کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"چلو..... بیٹھ کر سکون سے سوچتے ہیں۔" اس نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

نورالحق بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"یہ بتاؤ.....! اسکول میں ہاف ٹائم میں تم کیا کرتے ہو.....؟" عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

"جھولا جھولتے ہیں بابا.....! مگر یہاں تو جھولے ہی نہیں ہیں۔"

"ہاں.....! یہاں تو نہیں ہیں۔ مگر لاہور میں جو اپنا گھر ہے، وہاں ایسے جھولے ہیں کہ تمہارے اسکول میں بھی نہیں ہوں گے۔"

"ہمارا اور گھر بھی ہے بابا.....؟"

''ہاں......! اللہ کے فضل سے کئی گھر ہیں ہمارے۔ گاؤں میں بھی ہے۔''
''لاہور کہاں ہے بابا......؟''
''یہاں سے بہت دور ہے بیٹے......!''
''تو ہم وہاں کیوں نہیں رہتے......؟''
''میں کام یہاں کرتا تھا نا بیٹے......!''
''اب تو نہیں کرتے۔ تو اب ہم لاہور چلیں گے......!''
عبدالحق کو لاہور کا گھر شدت سے یاد آیا۔ جی چاہا کہ اُڑ کر وہاں پہنچ جائے۔
''ہاں......! اب وہاں چلیں گے ہم......!''
''اور میرا اسکول......؟''
''اسکول تو وہاں بھی ہیں بیٹے......!''
''بس......تو ٹھیک ہے......!'' نورالحق نے کہا۔ پھر وہ چونکا۔
''ہم یہاں کھیلنے آئے تھے بابا......!''
''اسکول میں اور کیا کھیلتے ہو تم......؟''
''پکڑم پکڑی بھی کھیلتے ہیں۔''
''تو چلو......وہی سہی......!''
''مگر مجھے فٹ بال اچھی لگتی ہے بابا......!''
''آج لے آئیں گے فٹ بال بھی۔ اس وقت تو......''
مگر اسی وقت ارجمند آگئی۔ وہ بیڈ روم میں گئی تو وہ خالی تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ دونوں لان میں ہوں گے۔
''نورالحق......! چلئے میرے ساتھ......! آپ کا پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا۔
''ابھی تو ہمارا کھیل شروع بھی نہیں ہوا امی......!'' بچے نے احتجاج کیا۔
''یہ کھیل کا وقت ہے ہی نہیں......میں نے کہا تھا نا آپ سے......یہ پڑھنے کا وقت ہے۔ پھر اسکول سے ملنے والا ہوم کرنا ہوگا۔''
''کچھ دیر کی رعایت دے دو نا......؟'' عبدالحق نے کہا۔

''ذرا سی رعایت اور ڈسپلن ایسا ختم ہوگا آغا جی......! کہ کبھی بحال نہیں ہوگا۔'' ارجمند کے لہجے میں سختی تھی۔
عبدالحق نے بچے کے سامنے اصرار مناسب نہیں سمجھا۔ نورالحق بھی خاموشی سے ارجمند کے ساتھ چلا گیا۔

❀❀❀

وہ پہلا موقع تھا کہ پڑھائی کے وقت بھی نورالحق کا دھیان پڑھائی میں نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ پہلا پڑھا ہوا بھی بھول گیا ہے۔
ارجمند اس کی وجہ سمجھ گئی۔ اور وہ وجہ فطری تھی۔ وہی تو اس کے دنیا میں آنے سے پہلے اسے محبتیں سونپنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اور اس کی کوشش کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ اور اس کی پیدائش کے بعد بھی وہ ان محبتوں کی تبلیغ کرتی رہی تھی۔ مگر سب سے پہلے اس نے بچے کو اللہ سے روشناس کرایا تھا۔ اور وہ اس کی عمر اور سمجھ کے مطابق بڑی عقل مندی سے اللہ کے احکام اس تک پہنچاتی تھی۔ ساتھ ہی وہ اللہ کی ذاتِ پاک کا تصور بھی اس کے ذہن میں اجاگر کرتی تھی۔
مگر سب سے پہلے اس نے اسے محبت کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ کام آسان ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ محبت کرنے والے عبدالحق کا بیٹا تھا۔ اس کا تو خمیر ہی محبت سے اٹھا تھا۔ وہ ایسا بچہ تھا، جس نے ایک سال کا ہونے سے پہلے ہی پیار کرنا سیکھ لیا تھا۔
ابتدا میں وہ اس سے پوچھتی۔
''تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ محبت کس سے ہے......؟''
''آپ سے......بابا جان سے اور دادی سے......!'' وہ کہتا۔
''یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ اتنے لوگوں سے تم سے برابر کی محبت تو نہیں کر سکتے......کسی سے کم ہوگی، کسی سے زیادہ......!''
''مجھے تو برابر ہی لگتی ہے۔''
''تم سمجھ نہیں پاتے......مگر میں جانتی ہوں۔''
''تو مجھے بتائیں......!''

"تم سب سے زیادہ بابا جان سے محبت کرتے ہو۔ پھر دادی سے اور پھر مجھ سے......!"

نورالحق یوں سر جھکاتا، جیسے اپنے دل کو ٹٹول رہا ہو۔ پھر وہ بے بسی سے کہتا۔
"شاید ایسا ہی ہے۔ لیکن آپ کیسے جانتی ہیں......؟"
"اللہ نے ماؤں کو ان کے بچوں کے لئے خاص طور پر سمجھ دی ہے، تاکہ وہ انہیں، ان کی باتوں کو اور ان کی ضرورتوں کو سمجھ سکیں۔"
یوں اس نے بچے کو محبتوں کی وہ ترتیب سونپ دی تھی۔ وہ اس سے پوچھتی۔
"اچھا...... تم اپنے بابا جان سے سب سے زیادہ محبت کیوں کرتے ہو......؟"

"اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے۔" نورالحق کہتا۔ لیکن ساتھ ہی اعتراض کرتا۔
"لیکن امی......! اللہ نے تو ماں اور باپ دونوں سے محبت کا حکم دیا ہے۔ تبھی تو میں دونوں سے برابر کی محبت کرتا ہوں۔" غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ بڑوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ بہت ذہین بھی تھا۔ ایسے ایسے سوال کرتا کہ جواب دینا مشکل ہو جاتا۔

"بالکل ٹھیک......!" ارجمند اس کی تائید کرتی۔
"لیکن میں کہتی ہوں کہ تمہیں سب سے زیادہ بابا جان سے اور پھر دادی سے محبت کرنی ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے کیا حکم دیا ہے......؟"
"جی امی......! یہ کہ ماں باپ کا حکم مانو......!" نورالحق کہتا۔ پھر جلدی سے ٹکڑا لگاتا۔

"تو میں مانتا تو ہوں امی......!"
مگر اس کا ایک نظریہ وہ تبدیل نہ کرا سکی۔ اسے تو اس کا پتا بھی بہت دیر میں چلا تھا۔ اس روز نورالحق حمیدہ کے پاس بیٹھا تھا۔ حمیدہ نے یونہی اس سے پوچھ لیا۔
"پتر نورالحق......! یہ بتا...... دنیا میں سب سے اچھا تجھے کون لگتا ہے......؟"
اور نورالحق نے بے جھجک کہا۔
"امی جان......!"

ارجمند اسی وقت دروازے کے پاس سے گزر رہی تھی، یہ سن کر ٹھٹک گئی اور ان کی باتیں سننے لگی۔
"ہائے اللہ......! تو عبدالحق تجھے اچھا نہیں لگتا......؟"
"بابا بھی اچھے ہیں مگر امی سب سے اچھی ہیں۔"
"مجھ سے بھی اچھی......؟"
"جی دادی......! کہا نا...... دنیا میں سب سے اچھی میری امی ہیں۔" نورالحق نے کہا اور پھر حمیدہ سے لپٹ کر اسے پیار کرنے لگا۔
"آپ کو برا لگا دادی......! پر میں جھوٹ تو نہیں بول سکتا۔"
حمیدہ نے اسے اتنا پیار کیا کہ بھگو ڈالا۔ پھر وہ بولی۔
"میں بھی جھوٹ نہیں بولتی پتر......! میرا عبدالحق بہت...... بہت اچھا ہے۔ پر سچی بات یہ ہے کہ نکی اس سے بھی اچھی ہے۔"
ارجمند نے اس تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہ مناسب نہیں۔ بچپن میں اچھے امیج ٹوٹ جائیں تو شخصیت میں بہت فرق پڑتا ہے۔ بلکہ اب تو اس کی ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ اسے خود کو بہت اچھا رکھنا تھا۔
اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ نورالحق کا دل اس وقت عبدالحق میں اٹکا ہوا ہے تو پڑھائی میں خلل پڑ رہا ہے۔ اور ایسا روز ہوگا تو اس کا کوئی تدارک سوچنا چاہئے۔
اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔
"دیکھو بیٹے......! ایک کام کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔
"تمہیں رات کے بجائے دن کا یہ وقت بابا جان کے لئے دے دیتے ہیں۔ تم اس وقت ان کے ساتھ کھیل لیا کرو۔"
نورالحق خوش ہو گیا۔
"شکریہ امی......! یہ ٹھیک ہے......!"
"سوچ لو اچھی طرح...... پھر رات کو تمہیں سلایا میں کروں گی۔"
"جی امی......! یہ ٹھیک ہے......!"
"لیکن یہ ضروری ہے کہ تمہارے بابا جان بھی اسے منظور کر لیں۔ ان کی

منظوری کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔''

''جی امی ......! میں ابھی پوچھ لیتا ہوں بابا سے۔'' وہ اٹھا اور اس نے باہر کی طرف دوڑ لگانے کے لئے پر تولے۔

''نورالحق......! آپ کچھ بھول رہے ہیں۔'' ارجمند نے تنبیہی لہجے میں پکارا۔

نورالحق نے پلٹ کر دیکھا اور ایک لمحے میں بات سمجھ گیا۔ اس نے بکھری ہوئی کتابوں کو سمیٹا، انہیں لے جا کر ان کی جگہ پر رکھا۔ پھر عبدالحق سے اجازت لینے کے لئے چلا۔ لیکن اب اس کے انداز میں عجلت نہیں تھی۔ اور اس نے پلٹ کر کہا۔

''سوری امی......!''

❁❁❁

''سب کچھ اسی طرح ہو رہا ہے جیسا تم نے کہا تھا۔'' عارف نے عبدالحق سے کہا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

''مجھے افسوس ہے......!'' عبدالحق نے کہا۔

وہ دونوں عبدالحق کے گھر میں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ صبح عبدالحق نے اپنا نام اور تصویر اخبار میں دیکھنے کے بعد اخبار کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اور کچھ دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسے تو اب پتا چلا کہ اس فہرست میں عارف کا نام بھی تھا۔

''مجھے حیرت ہوئی......!'' عبدالحق نے تاسف سے کہا۔

عارف نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اگر تم کرپٹ اور بدعنوان ہو سکتے ہو تو پھر ایماندار کون رہ گیا......؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں......؟ مجھے تو خوشی ہے کہ مجھے رہائی مل گئی۔''

''اور دکھ کوئی نہیں ہے......؟''

''دکھ تو بہت ہیں۔ کس کس کی بات کروں......؟ ملک دو ٹکڑے ہوا، دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے گئے، اور وہ بھی اتنی بڑی تعداد میں کہ تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پوری قوم تڑپ کر رہ گئی۔''

''اور اب جو کچھ ہو رہا ہے......؟''

''سب سوچا سمجھا ہے۔''

''اس فہرست میں ایسے لوگوں کے نام ہیں عبدالحق......! جن کی ایمانداری کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔''

''یقیناً ہوں گے۔''

''لیکن کیوں......؟''

''بھٹو صاحب بہت ذہین اور عقل مند آدمی ہیں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اقتدار جس قیمت پر بھی ملا، انہیں مل گیا۔ اب انہیں اس کو مستحکم کرنا ہے۔ وہ طویل اقتدار کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔''

''اس طرح......! میری تو سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔''

''دیکھیں عارف بھائی......! اس ملک میں دو بڑی طاقتیں ہیں۔ ایک فوج اور دوسری بیوروکریسی، جو ان کے اقتدار کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد فوج کا مورال بہت نیچے آ گیا ہے۔ لیکن یہ عارضی ہے۔ اس لئے بھٹو صاحب نے اس عالم میں بھی فوج پر وار کیا۔ فوج کو عوام کی نظروں میں ذلیل کرنے کے لئے ہتھیار ڈالنے کی تقریب کی۔ وڈیو ٹی وی پر چلوا دی۔ دوسری طرف ڈان کے ادارے میں پاکستانی فوج کو Mercenaries لکھا گیا۔ یہ سب سوچا سمجھا تھا۔ پھر چیف آف آرمی اسٹاف کی تقرری میں سینیارٹی کو نظر انداز کر کے ایک بری روایت قائم کی گئی، جو ہمیشہ دہرائی جاتی رہے گی۔''

''لیکن بیوروکریسی پر عنایت کیوں......؟''

''یہ بہت اہم ہے عارف بھائی......! دیکھیں، ایک وزیر اپنی وزارت کے مختلف شعبوں اور معاملات کے بارے میں کیا جانتا ہے......؟ کچھ بھی نہیں...... اور جانتا نہیں تو فیصلے کیسے کر سکتا ہے......؟ مختلف افسران معلومات فراہم کرتے ہیں، جو ایک بڑے افسر کے پاس جمع ہوتی ہیں۔ اس کی روشنی میں تجاویز پیش کی جاتی ہیں، فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنے اپنے میدان میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ قانون کی اور خاص طور پر دفتری معاملات کی غیر معمولی سوجھ بوجھ رکھتے

ہیں۔ انہیں اس سے فائدہ اٹھانا بھی آتا ہے۔ ہر فیصلے پر عملدرآمد ان کے بغیر ممکن نہیں۔ نظامِ حکومت اور نظامِ ریاست درحقیقت یہی چلاتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو وزیروں کے سامنے بھی ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیوروکریسی پر وار کر کے بھٹو صاحب نے ایک سے زائد فائدے حاصل کئے۔ ایک طرف تو انہوں نے بیوروکریسی کو یہ پیغام دے دیا کہ اس کی اوقات نوکر سے زیادہ نہیں۔ دوسری طرف انہوں نے بڑی تعداد میں Vacancics نکال لیں، جن پر وہ اپنے من پسند لوگوں کو مقرر کریں گے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ نچلی سطح پر سرکاری ملازمین بھی ان کی مرضی کے مطابق رکھے جائیں گے۔''

''اس سے کیا ہوگا......؟''

''اس سے ان کی پارٹی عوامی سطح پر مضبوط ہوگی۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''وہ یہ کہہ سکیں گے کہ پہلی بار انہوں نے جمہوریت کے ثمرات عام آدمی تک پہنچائے ہیں۔''

''تو یہ بڑی بات ہے۔''

''جی ہاں...... مگر مجھے جو اس میں خرابی نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب آپ میرٹ کو خیرباد کہتے ہیں تو کرپشن کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور یہ دروازہ ایک بار کھل جائے تو پھر آسانی سے بند نہیں ہوتا۔ اور ایک بات جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اب شاید ہمیشہ ملک کی بڑی پارٹیوں میں رہے گی۔ یہ اگر خرابی سے آغاز کرے گی تو وہ خرابی دور ہونے والی نہیں ہوگی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ پیپلز پارٹی بہت آگے جائے گی......؟''

''بھٹو صاحب نے جو اسٹارٹ لیا ہے، وہ یہ بتاتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''سرکاری ملازمین کا نکالنا، اس کے بعد زرعی اصطلاحات، پھر صنعتوں کو فروغ دینا۔ یہ سب بہت پُرکشش ہے۔ اس سے ایک طرف مخالفین کچلے جائیں گے، دوسری طرف اپنے لوگ مضبوط ہوں گے، تیسری طرف پارٹی کے نچلی سطح کے کارکنوں کو بھی کچھ ملے گا۔ اور جنہیں ملے گا، وہ پارٹی کے لئے جان دینے کو بھی تیار رہیں

گے۔ بھٹو صاحب نے کارکنوں کی اہمیت سمجھ لی ہے۔ ان کی وجہ سے پارٹی کی جڑیں عوام میں رہیں گی اور پیپلز پارٹی اس لحاظ سے اس ملک کی اس نوعیت کی پہلی مقبول جماعت ہوگی۔''

''لیکن یہ تو گویا پنڈورا کا باکس کھولنا ہے......؟''

''پنڈورا کا باکس تو کھل چکا عارف بھائی......! سقوطِ ڈھاکہ اس کا نتیجہ ہے۔ لیکن چھوڑیں اس بات کو۔ میں اب بھٹو صاحب سے تکلیف اٹھا چکا ہوں۔ اس لئے ان کے معاملے میں غیر جانبداری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لئے مجھے ان پر بات بھی نہیں کرنی چاہئے۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ کوئی جاگیردار ایسی زرعی اصلاحات لاسکتا ہے، جس سے ہاری اور کسان زمیندار بن جائے۔ لیکن ایسا جاگیردار سب سے پہلے اپنی تمام زمین چھوڑ کر ایک مثال قائم کرے گا، تاکہ اصلاحات سے متاثر ہونے والوں کو اس کے خلوص اور سچائی پر یقین آجائے۔ حکمراں جماعت کے حامیوں کی صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا جائے، تاکہ کوئی مخالف یہ نہ کہے کہ اسے سیاسی طور پر نشانہ بنایا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کی ذمہ داری کو بھی سمجھا جائے۔ ضروری ہو کہ اس میں ترقی ہو، زوال نہ ہو۔ اور یہ آسان کام نہیں۔ کیونکہ ایک سیدھی سی بات ہے عارف بھائی......! اگر آپ دس کروڑ روپے سے کوئی مل لگاتے ہیں تو آپ کو پیداوار اور منافع دونوں کی فکر ہوگی۔ لیکن آپ کی مل چلانے کے لئے مجھے دے دی جائے اور میری تنخواہ مقرر کر دی جائے تو میں آپ کی طرح منافع اور ترقی کی فکر کبھی نہیں کر سکوں گا اور صنعت کا نقصان قومی نقصان ہے۔''

''مجھے تو بھئی...... اندھیرا ہی نظر آرہا ہے آگے۔'' عارف نے کہا۔

''ممکن ہے...... یہ اس لئے ہو کہ میں اور آپ متاثرین میں سے ہیں۔ میں اسی لئے کہتا ہوں کہ میں اب بھٹو صاحب کے بارے میں غیر جانبداری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ بھٹو صاحب دوستوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دشمن کما رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی یہ عمل ان کی پارٹی میں بھی جاری ہوگا۔''

''کیا مطلب......؟''

''پیپلز پارٹی میں کوئی ایسا آدمی نہیں رہ سکے گا، جو اپنے تئیں بھٹو صاحب

سے برابری کی بنیاد پر بات کرنے کا خود کو اہل سمجھتا ہو۔ بھٹو صاحب بائیں بازو والوں سے چھٹکارا پائیں گے، جنہوں نے انہیں روٹی کپڑا اور مکان کا جادوئی نعرہ دیا، جو پیپلز پارٹی کی کامیابی کی بنیاد ہے۔ وہ لوگ اپنی افادیت کھو چکے۔ پیپلز پارٹی کو آخر میں جاگیرداروں کی جماعت ہی بننا ہے۔ یہ وَن مین شو ہے اور رہے گا۔''

''یعنی پارٹی کو منشور دینے والے پارٹی سے باہر......! کیوں......؟''

''ایک تو یہ کہ منشور محض نعرہ ہے، عمل کرنے کے لئے نہیں۔ دوسرے عارف بھائی، جو کسی کی حد درجہ خوشامد کرتا رہا ہو۔'' وہ اپنا وقت آنے پر اپنی اس سے کہیں زیادہ خوشامد کرانا چاہے گا۔ خوشامد پسند لوگ ہی خوشامدی بھی ہوتے ہیں۔ بھٹو صاحب کے قریب خوشامدی لوگ ہی رہیں گے۔''

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جی ہاں......! دوسرے مصرع کو اقبال نے واضح نہیں کیا۔ بھٹو صاحب نے خود اس کی تشریح کر لی کہ ہر نقشِ کہن مٹانا ہے، اچھا ہو یا برا۔ ضروری ہو یا غیر ضروری۔ قائد اعظم کا پاکستان ختم، یہ نیا پاکستان ہے۔ یحییٰ خان اور بھٹو کا پاکستان۔ لیکن یہ فیصلہ کرنے والے یہ نہیں سمجھے کہ پاکستان صرف زمین کا نام نہیں، یہ ایک نظریہ ہے...... خداداد ریاست...... یہ انشاء اللہ قائم رہے گا۔''

''تم پاکستان کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو......؟''

''میں نے بہت کچھ دیکھا ہے عارف بھائی......! سقوطِ ڈھاکہ پر پہلا عوامی ردِعمل...... شراب کی دُکانیں تباہ کر دی گئیں۔ شراب کو پانی کی طرح سڑکوں پر بہا دیا گیا۔ اور اس کے بعد میں نے بولٹن مارکیٹ کی چور گلی میں عورتوں کی برہنہ تصویروں والے تاش، بلیو پرنٹس اور بلیو فلموں کا سیلاب آتے دیکھا، جو کھلے عام فٹ پاتھ پر رکھا اور بیچا جا رہا تھا۔''

''اس کا مطلب......؟''

''سوچیں تو ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے۔ جاگ جانے والی قوم کو پھر سے سلا دینا، اسے سیدھی راہ سے ہٹا دینا۔ اور جس طرح یہ ایک دم سے ہوا ہے تو یہ سرکار کی

منظوری کے بغیر ممکن نہیں تھا۔''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ عبدالحق نے فون ریسیو کیا۔ اسے حیرت ہوئی۔ زبیر تو فون کرنے سے گھبراتا تھا۔

''یہ سب کیا ہو گیا کاکا......؟''

''کوئی ایسی بات نہیں زبیر بھائی......! کیوں پریشان ہوتے ہیں......؟'' عبدالحق نے کہا۔

''آپ کو بدنام کیا جائے اور میں پریشان نہ ہوں......؟''

''اس سے کیا ہوتا ہے......؟ اللہ تو سب جانتا ہے نا......!''

''اپنی عزت کے لئے لڑنا تو ہو گا نا......؟''

''کس سے......؟ حکومت سے......!''

''کوئی بھی ہو......!'' زبیر نے جوش سے کہا۔ پھر بولا۔

''اب آپ وہاں کیا کر رہے ہیں کاکا......؟ یہاں آ جائیں نا......!''

''ہاں......! سوچا تو یہی ہے......!''

''میں کل ہی آپ کے پاس آ رہا ہوں۔''

ریسیور رکھنے کے بعد عبدالحق عارف کی طرف مڑا۔

''آپ نے کیا سوچا ہے عارف بھائی......؟''

''کچھ بھی نہیں...... میں تو بس یہ سوچتا رہا کہ اتنے برسوں کی خدمت کا یہ صلہ ملا......؟ عزت سے ریٹائر ہی کر دیتے مجھے...... ویسے بھی ریٹائرمنٹ کے قریب تھا میں۔''

''جو ہو گیا، اس کا غم چھوڑیں۔ آگے کی بات کریں۔ زندگی صرف موت پر رکتی ہے عارف بھائی......!''

''وہ تو ٹھیک ہے...... مگر میرے پاس سوچنے کو کیا ہے......؟''

''بس...... تو اجازت دیں۔ میں آپ کی طرف سے سوچ لیتا ہوں۔''

''اجازت کی کیا بات ہے......؟ اللہ کا شکر ہے کہ تم اس صورتِ حال میں بھی سوچنے کے قابل ہو۔''

''بس......تو سامان پیک کرنا شروع کر دیں۔ ہم لاہور چلیں گے۔''

''لیکن......''

''آپ فکر نہ کریں......سب مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''چلو......ٹھیک ہے......!''

❁❁❁

لیکن زبیر اگلے روز نہیں آ سکا۔

شام کو اس کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ بنگلے کو سیل کر دیا گیا ہے اور وہ سب لوگ فی الحال ایک ہوٹل میں ہیں۔

عبدالحق کو شاک لگا۔

''لیکن کیوں......؟''

''حکومت کے آرڈر ہیں۔ شام کو آئے تھے۔ کل میں عدالت سے اسٹے آرڈر لوں گا انشاء اللہ......!''

عبدالحق کو اس بار حیرت ہوئی۔

''زبیر بھائی......! آپ کو یہ سب کیسے پتا......؟''

''آپ کی مہربانی سے کاکا......! زمین کے معاملات آدمی کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ اب میں وہ پہلے والا زبیر تو نہیں ہوں۔''

عبدالحق کی حیرت اتنی شدید تھی کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔

''ہر سال جو اثاثوں کے گوشوارے آپ جمع کراتے ہیں، ان کی کاپیاں ہیں آپ کے پاس......؟'' زبیر نے پوچھا۔

''ہاں......! ہیں۔'' عبدالحق نے چونک کر کہا۔

''وہ مجھے بھجوا دیں آج ہی۔ وکیل کا کہنا ہے کہ کل ہی اسٹے مل جائے گا۔''

''مگر آج ہی کیسے بھیج سکتا ہوں......؟''

''پی آئی اے کا ایک پائلٹ ہے اپنی جان پہچان کا...... وہ آج رات کی فلائٹ لاہور لا رہا ہے۔ میں نے اسے آپ کا پتا دے دیا ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر بعد آپ کے پاس آئے گا۔ اسے دے دیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے زبیر بھائی......!''

''ہاں......ایک بات اور کاکا......! مجھے ڈر ہے کہ آپ کے اکاؤنٹ بھی فریز کر دیئے گئے ہوں گے۔ آپ کے پاس کیش کی کمی ہو تو بتا دیں۔ ویسے تو بنگلے میں واپسی کے فوراً بعد میں کراچی آ جاؤں گا۔''

''آپ فکر نہ کریں زبیر بھائی......! یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔''

فون رکھنے کے بعد عبدالحق نے اپنی فائلیں دیکھیں اور مطلوبہ فائل نکال لی۔

ایک گھنٹے بعد وہ پائلٹ آ گیا، جسے زبیر نے بھیجا تھا۔ عبدالحق نے وہ فائل اس کے سپرد کر دی۔ اس نے زبیر کے نام ایک رقعہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ ان تمام کاغذات کی کئی مصدقہ نقول بھی تیار کرا لے۔

رات کو اس نے کیش کے معاملات پر غور کیا اور بے فکر ہو گیا۔ حمیدہ کے پاس ہمیشہ کافی رقم رہتی تھی۔ خود اس کے پاس بھی خاصا کیش موجود تھا۔ پھر ارجمند کے اکاؤنٹ میں بھی معقول رقم موجود تھی۔

پھر اس نے زبیر کو فون کیا۔ اسے یہ بتانا تھا کہ کاغذات اس نے پائلٹ عادل کو دے دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات تھی۔

''زبیر بھائی......! ہمارے ساتھ عارف بھائی بھی لاہور شفٹ ہوں گے۔'' اس نے فون پر کہا۔

''یہاں آنے سے پہلے آپ کو ان کے لئے کسی معقول مکان کا بندوبست کرنا ہو گا۔ ہمارے قریب ہی ہو تو زیادہ اچھا ہے۔''

''تو کیا وہ بھی......''

''ہاں......! انہیں بھی فارغ کر دیا گیا ہے۔''

اگلے روز وہ خاص طور پر بینک گیا۔ پتا چلا کہ اس کا اکاؤنٹ واقعی فریز کر دیا گیا ہے۔ وہاں سے وہ عارف کی طرف گیا۔

''پیسوں کی ضرورت ہو تو بلاتکلف بتایئے گا عارف بھائی......!''

''کیوں بھئی......؟ اب ایسا بھی نہیں ہے۔''

''آپ کو نہیں معلوم...... اکاؤنٹ بھی فریز کر دیئے گئے ہیں ہمارے۔''

عارف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر بولا۔

''یہ تم پر خصوصی عنایت ہوئی ہے۔ میں تو آج ہی پوری رقم نکلوا لایا ہوں۔ سوچا، لاہور جانا ہے تو یہاں اکاؤنٹ رکھنے کا کیا فائدہ......؟''

''چلیں...... یہ اچھا ہوا...... اللہ کا شکر ہے......!''

''اب میں کہہ رہا ہوں کہ پیسوں کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہہ دینا۔''

''آپ سے میں تکلف کرتا ہی نہیں عارف بھائی......!''

❀❀❀

زبیر کو دیکھتے ہی نورالحق نے نعرہ لگایا۔

''تایا آ گئے......!'' اور وہ اس کی طرف لپکا۔

زبیر اکڑوں بیٹھ گیا اور اسے لپٹا لیا۔

''السلام علیکم تایا......!''

''وعلیکم السلام چھوٹے صاحب......!'' زبیر نے کہا۔ عبدالحق کے احتجاج کے باوجود وہ نورالحق کو چھوٹے صاحب ہی کہتا تھا۔

''نہ کاکا......!'' اس نے عبدالحق کے احتجاج کے جواب میں کہا تھا۔

''یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے۔ آپ اس میں نہ پڑیں۔''

نورالحق کے لئے وہ بڑے اہم رشتے تھے۔ عبدالحق نے اس کا خاص خیال رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ساجد اس کے بیٹے سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ کراچی ہی آ کر رہ جاتا۔ لیکن اس پر دہرا بوجھ تھا۔ ایک طرف اس کی تعلیم تھی اور دوسری طرف وہ کاروباری معاملات میں زبیر کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس لئے جب اس کی تعطیلات ہوتیں تو عبدالحق گھر کے لوگوں کو لاہور بھیج دیتا اور نورالحق واپس آتا تو وہاں کے سب لوگوں کو یاد کرتا رہتا...... خاص طور پر ساجد کو جو اس کے ساتھ ہم عمر بچوں کی طرح کھیلتا تھا۔

''کیسے ہیں چھوٹے صاحب......؟'' زبیر نے نورالحق کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے چھوٹے صاحب کیوں کہتے ہیں تایا......؟'' یہ پہلا موقع تھا کہ

نورالحق نے یہ سوال اٹھایا۔

''اس لئے کہ آپ ابھی چھوٹے ہیں۔'' زبیر نے سادگی سے کہا۔

''جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو......؟''

''تب میں آپ کو بڑے صاحب کہا کروں گا۔'' زبیر نے کہا۔ پھر بات کو وہیں روک دینے کے خیال سے بولا۔

''چھوڑیں ان باتوں کو۔ یہ بتائیں، میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں......؟''

''کچھ بھی لائے ہوں...... جو مجھے چاہئے، وہ تو نہیں لائے......!'' نورالحق نے شکایت کی۔

''اور آپ کو کیا چاہئے......؟''

''بھائی جان اور تائی اماں......!''

بے اختیار زبیر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! یہ غلطی تو ہو گئی چھوٹے صاحب......! پر اس کے بدلے میں بہت بڑا تحفہ لایا ہوں آپ کے لئے......!''

''بھائی جان سے بڑا کوئی تحفہ نہیں۔''

''دیکھ تو لیں......!'' زبیر نے اپنا بیگ کھول کر جہاز کے ٹکٹ نکالے اور لہرائے۔

نورالحق کے انداز میں پہلے ہی بے دلی تھی، ٹکٹ دیکھ کر وہ بہت مایوس ہوا۔

''یہ کیا ہے......؟''

''ٹکٹ ہیں لاہور کے۔ کل آپ جائیں گے اور پھر وہیں رہیں گے اپنے بھائی جان اور تائی اماں کے ساتھ...... یہاں نہیں آئیں گے۔''

نورالحق کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''سچ تایا......؟'' پھر اس نے تائید طلب نظروں سے عبدالحق کی طرف دیکھا۔

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب بولیں...... ہے نا یہ سب سے بڑا تحفہ......؟''

جواب میں نورالحق نے اسے پیار کرلیا۔

''شکریہ تایا......!''

''نورالحق......! آپ کیا محبت کرتے ہیں تایا سے......؟'' ارجمند نے مداخلت کی۔

''یہ اتنے تھکے ہوئے آئے ہیں اور آپ نے روک رکھا ہے انہیں یہاں......!''

نورالحق نے زبیر کا ہاتھ تھام لیا۔

''چلیں تایا......!'' اور وہ اسے حمیدہ کے کمرے میں لے گیا۔

وہاں وہ کچھ دیر بیٹھے۔ حمیدہ نے لاہور کی خیریت دریافت کی تو زبیر نے کہا۔

''اب آپ خود وہاں جارہی ہیں۔ خود ہی پوچھ لیجئے گا۔''

''مجھے تو بھئی بہت خوشی ہے اس بات کی۔'' حمیدہ نے کہا۔

''مجھے تو بھئی اپنا گاؤں بھی بہت یاد آتا ہے۔''

''اب تو وہ شہر بن گیا ہے اماں......!''

''مجھے تو شہر میں بھی اپنا گاؤں ہی نظر آئے گا پتر......!''

''اب وہ گاؤں کہاں......؟'' زبیر نے سرد آہ بھر کے کہا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

''ایسا کیا ہوگیا پتر زبیر......؟'' حمیدہ نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''میں نے عجیب بات دیکھی اماں......! خوش حالی آتی ہے تو لوگ بدل جاتے ہیں۔''

''قدرتی بات ہے زبیر......!''

''آپ میری بات نہیں سمجھی اماں......! خوش حالی کے ساتھ زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ اچھائی کی جگہ برائیاں آجاتی ہیں۔ لوگ احسان فراموش اور خودغرض ہوجاتے ہیں۔ ادب آداب اور لحاظ اٹھ جاتا ہے۔ عزت کرانے کا شوق ہوتا ہے اور لوگ عزت کرنا بھول جاتے ہیں۔''

حمیدہ نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

''یہ کون سی بڑی بات ہے پتر زبیر......؟ اللہ دے کر بھی آزماتا ہے اپنے بندوں کو اور واپس لے کر بھی آزماتا ہے۔ اور بندے تو آزمائش پر کم ہی پورے اترتے ہیں۔''

''پر دل تو دُکھتا ہے نا اماں......! یہ سب دیکھ کر۔''

''بڑی بات زبیر......!'' حمیدہ نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''یہ دکھ اور مایوسی اچھی چیز نہیں۔ سب ہی تو نہیں بدل جاتے۔ کچھ لوگوں کی عاجزی اور بڑھ جاتی ہے۔''

''پر وہ بہت تھوڑے ہوتے ہیں اماں......!''

''ہاں......! یہ تو اللہ کا قانون ہے۔ نیکی تھوڑی ہوتی ہے، پر وزن میں زیادہ۔ اور بدی بہت زیادہ ہوتی ہے، پر وزن میں ہلکی۔ تو آدمی کو اچھائی پر نظر رکھنی چاہئے۔ اس سے حوصلہ رہتا ہے۔''

''واقعی اماں......! آپ نے ٹھیک کہا۔'' زبیر نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ اس کے لہجے میں تشکر تھا۔

اتنی دیر میں ارجمند چائے لے آئی۔ ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔

''اور دیکھو زبیر......! گاؤں اور شہر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' حمیدہ کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھیں ایسے لگتا تھا، جیسے بہت دور دیکھ رہی ہوں۔

''تو نے ٹھاکروں کی گڑھی کا آخر نہیں دیکھا......؟ اور میں کبھی بھول نہیں سکتی۔''

''ہم وہاں تھے نہیں نا...... اماں......!''

''ہاں......! بڑے ٹھاکر نے وہاں کس پر احسان نہیں کیا تھا......؟ کون تھا ایسا جس پر انہوں نے مہربانی نہ کی ہو......؟'' حمیدہ کے لہجے میں اداسی تھی۔

''پر جب آزمائش کا وقت آیا تو جان اور مال کے خوف نے زیادہ تر بے وفا نکلے۔ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ وفادار تھوڑے تھے، جنہوں نے ٹھاکر بھائی

کے آگے کھڑے ہو کر جان دے دی۔ پر کسی کا کچھ بھی تو نہیں بچا...... نہ مال نہ جان...... گھر میں عافیت تلاش کرنے والے بھی مر گئے۔ انہیں پتا ہوتا تو وفاداری ہی نبھا لیتے۔ پتر زبیر......! شہر ہو یا گاؤں، لوگ ایک سے ہوتے ہیں۔ خیر چھوڑ ان باتوں کو۔ یہ بتا...... ساجد کی پڑھائی مکمل ہوئی......؟''

ماحول سوگوار ہو گیا تھا۔ زبیر نے بے دلی سے کہا۔

''اس سال بی اے کر لے گا انشاء اللہ......! اور کام تو وہ پہلے ہی سے سنبھال رہا ہے اماں......!''

''اور رابعہ کیسی ہے......؟''

''میرے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں اماں......!'' زبیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ دیکھے بغیر نہیں سمجھ سکتیں۔''

''کیا مطلب......؟ خیر تو ہے......؟'' حمیدہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''خیر ہی خیر ہے اماں......! بس وہ بہت موٹی ہو گئی ہے۔ کام نہ کرنے کی وجہ سے۔''

''تو نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔'' حمیدہ نے سکون کی سانس لی۔

''اسے ساتھ کیوں نہیں لایا تو......؟''

''وہ تو ساتھ آنا چاہتی تھی اماں......! پھر خود ہی خیال آ گیا کہ اب تو آپ سب ہی وہاں آنے والے ہیں۔ آپ کے استقبال کے خیال سے رک گئی۔''

کچھ دیر بعد زبیر نے شرمندگی سے کہا۔

''اماں......! اجازت دیں تو کاکا سے کچھ بات کر لوں......؟''

''کیوں نہیں پتر......؟''

عبدالحق زبیر کو اسٹڈی میں لے گیا۔

❁❁❁

زبیر نے ایک کاغذ عبدالحق کی طرف بڑھایا۔

''اس پر دستخط کر دیں کاکا......!''

''یہ کیا ہے......؟''

''وکالت نامہ ہے کاکا......!''

''لیکن کیوں......؟''

''آپ کے خلاف جو حکومت نے اقدام کیا ہے، اسے عدالت میں چیلنج کریں گے۔''

''مگر میں ایسا نہیں چاہتا زبیر بھائی......! میں اس میں خوش ہوں۔ میرا نکتہ نظر تو یہ ہے کہ اللہ نے مجھے ایک قید سے رہائی دی ہے۔''

''وہ اپنی جگہ کاکا......! لیکن بے انصافی اور زیادتی کے خلاف لڑنا ضروری ہے۔''

''اپنی حکومت سے......!''

''کوئی بھی ہو۔ میری بات سنیں کاکا......! اپنے وکیل نے جب آپ کے گوشوارے دیکھے تو وہ تو پاگل ہو گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ کیس تو حکومت لڑ ہی نہیں سکتی۔ جو اثاثے آپ نے پہلے سے ظاہر کئے، اور ان کی آپ سے وضاحت بھی طلب نہیں کی گئی، وہ جائز اور قانونی ہیں، اور انہیں ضبط کیا ہی نہیں جا سکتا۔ انہیں تو معافی بھی مانگنی ہوگی اور ہرجانہ بھی دینا ہوگا۔ اور انہیں آپ کی برطرفی کا حکم بھی واپس لینا ہوگا۔''

''مگر میں یہ نہیں چاہتا زبیر بھائی......!''

''آپ بس اس پر دستخط کر دیں کاکا......!'' زبیر پہلی بار کسی بات پر اصرار کر رہا تھا۔

لیکن عبدالحق کا ہاتھ قلم کی طرف نہیں بڑھا۔

''میں کیوں لڑوں یہ کیس......؟'' اس نے کہا۔

''اثاثے کون سے اپنے تھے۔ اللہ کی امانت تھے۔''

''عزت کے لئے کاکا......! عزت کے لئے...... آپ کی رسوائی ہوئی، جگ ہنسائی ہوئی۔''

''عزت اور ذلت بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کی طرف سے ہے۔''

''میں اس سے انکار کیسے کر سکتا ہوں کاکا......! دین کی مجھے اتنی سمجھ بھی

نہیں۔ پر ایک بات بتائیں مجھے...... ہر چیز اللہ کی دی ہوئی ہے، مگر اللہ کی دی ہوئی کوئی چیز کوئی ڈاکو آپ سے طاقت کے زور پر چھینے تو اس کے خلاف مزاحمت کو اللہ نے منع کیا ہے کیا......؟ مسلمان کے لئے تو غیرت بہت بڑی چیز ہے، اسے تو کمزور ہوتے ہوئے طاقتور سے لڑنے کو کہا گیا ہے۔ اللہ نے جو کچھ دیا، اس کی حفاظت کرنا بندے کی ذمہ داری نہیں......؟''

عبدالحق نے دل میں تسلیم کیا کہ ان برسوں میں زبیر بہت بدلا ہے، اور آگے گیا ہے۔ اس کی سمجھ بوجھ بھی بڑھی ہے، اور اسے اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی آگیا ہے۔ اس کی عزت کرتے ہوئے وہ اس سے بحث بھی کرسکتا ہے اور اپنی بات ثابت بھی کرسکتا ہے۔

تاہم اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

زبیر چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بولا۔

''بات اتنی سی ہے نا کاکا......! کہ آپ اپنی ملازمت پر بحال نہیں ہونا چاہتے......؟''

عبدالحق نے اثبات میں سرہلا دیا۔

''آپ عقل والے ہیں کاکا......! میں تو آپ کا ناسمجھ نوکر ہوں۔ آپ کی بے عزتی......''

''ایسا نہ کہیں زبیر بھائی......!'' عبدالحق نے احتجاج کیا۔

''...... برداشت نہیں کرسکتا۔ اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ مر جاؤں......!''

''ایسی بات نہ کریں زبیر بھائی......!''

''آپ اجازت دیں تو ایک بات کہوں...... ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات......!''

''کہہ تو رہے ہیں آپ......!''

''یہ تو آپ ناراض ہو کر کہہ رہے ہیں۔ اب میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔''

عبدالحق کو احساس ہوا کہ اس نے زبیر کا دل دکھایا ہے۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔

''یہ بات نہیں زبیر بھائی......! آپ کہیں، میں سن رہا ہوں۔''

زبیر نے ایک گہری سانس لی۔

''دیکھیں کاکا......! بندے کے پاس تو جو کچھ ہے، اللہ کا ہی دیا ہوا ہے، اور امانت ہے، جب چاہے واپس لے لے۔ لیکن کوئی اور ڈاکہ مارے اور آپ سے چھین لے تو آپ کو اس سے لڑنا چاہئے۔ لڑ کر اس سے واپس لیں۔ پھر چاہیں تو اللہ کی راہ میں لٹا دیں۔ اس کا تو اجر ملے گا اللہ کے ہاں...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں کاکا......؟'' اچانک ہی وہ ننھے بچے کی طرح سہم گیا، بے یقینی میں مبتلا ہو گیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں زبیر بھائی......! لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ شاید یہ بھی اللہ کی ہی طرف سے ہے۔''

''ہوسکتا ہے کاکا......! بالکل ہوسکتا ہے۔'' زبیر نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

''لیکن اللہ اپنے بندوں سے کلام تو نہیں کرتا۔ وہ بتاتا تو نہیں کہ یہ میں نے کیا ہے۔''

''تو میرا یہ سمجھنا غلط تو نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ بندہ اللہ سے مدد مانگ کر اپنے حق کے لئے لڑے۔ اور یہاں تلوار سے تو لڑنا نہیں ہے کاکا......! عدالت میں جانا ہے۔ کیس لڑنا ہے۔ تو آپ کیس لڑیں۔ ہار جائیں تو مان لیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر یہ سوچیں کہ ہم سے کون کون سی غلطیاں ہوئیں اس معاملے میں اور ان کی اصلاح کریں۔''

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ عبدالحق نے خاموشی سے قلم اٹھایا اور وکالت نامے پر دستخط کر دیئے۔

''بہت شکریہ کاکا......!''

''یہ تو مجھے کہنا تھا، مگر میں نے کہا نہیں......!''

''میں جانتا ہوں کاکا......! کہ آپ نوکری کرنا نہیں چاہتے۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اللہ کی رحمت سے آپ بحال ہو جائیں تو عزت کے ساتھ استعفیٰ دے دیں۔ وہ اور بات ہوگی۔''

''بہت شکریہ زبیر بھائی......!'' عبدالحق نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''مجھے شرمندہ نہ کریں کاکا......!'' زبیر شرمسار ہو گیا۔ پھر بولا۔

''اور میں چاہتا ہوں کا کا......! کہ آپ لوگ کل ہی لاہور چلے چلیں۔''

''کل......؟ ابھی تو سامان بھی پوری طرح پیک نہیں ہوا ہے۔''

''اس کی فکر نہ کریں۔ میں اسی لئے تو آیا ہوں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ بس......نوریز کو یہاں چھوڑ جائیں۔''

''اور عارف بھائی......؟''

''وہ بھی......ان کے لئے بندوبست کر آیا ہوں میں۔ گل برگ میں ہے ایک بنگلہ......!''

''یہ بہت اچھا کیا......!''

زبیر نے اچانک اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لئے۔

''آپ دور ہوئے کا کا......! تو آپ سے پوچھے بغیر خود فیصلے کرنے کی بری عادت پڑ گئی ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیں گے نا......؟''

''آپ بھول رہے ہیں زبیر بھائی......!'' عبدالحق نے اس کے ہاتھ علیحدہ کر دیئے۔

''میں نے سارے معاملات آپ کو سونپے تو آپ کو ہر اختیار دے دیا تھا۔ فیصلے کرنے کا بھی۔''

''پھر بھی کا کا......! میں آپ سے پوچھ سکتا تھا۔ لیکن میں نے خود ہی کچھ فیصلے کئے اور عمل بھی کر لیا۔ اب آپ کو بتاتے ہوئے شرمندہ ہو رہا ہوں۔''

''ایسی کیا بات ہے زبیر بھائی......؟ اختیار نہ ہو تو معاملات کیسے سنبھالیں گے آپ......اور ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ زمین اور کاروبار کے معاملات میں آپ ہی درست فیصلے کر سکتے ہیں۔ میں تو بالکل کورا ہوں ان معاملات میں۔''

زبیر دونوں ہاتھوں سے اپنے رُخسار پیٹنے لگا۔

''اچھا......بتائیں تو......بات کیا ہے......؟'' عبدالحق نے کہا۔

زبیر نے نظریں جھکا لیں۔

''وہ کا کا......! عارف صاحب کے لئے میں نے وہ بنگلہ خرید لیا ہے......ان کے اپنے نام سے۔''

عبدالحق کے لئے یہ بات اتنی خلافِ توقع تھی کہ وہ سناٹے میں آ گیا۔

''ہو گئی نا غلطی مجھ سے......؟'' زبیر نے شرمساری سے کہا۔

''نہیں......! غلطی تو مجھ سے ہوئی تھی زبیر بھائی......! ویسے یہ بتائیں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا......؟''

''یہ ایک اور بڑا فیصلہ......ایک اور غلطی۔''

''کچھ بتائیں گے بھی آپ......یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہیں گے......؟''

اس بار عبدالحق جھنجلا گیا۔

زبیر اور نروس ہو گیا۔

''بس غلطی ہو گئی کا کا......!''

''ہوا کیا......؟'' عبدالحق نے کوشش کر کے اپنا لہجہ نرم کیا۔

''آپ کا کاروبار پھیل رہا ہے نا کا کا......! تو لائق اور محنتی لوگوں کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ آپ سے بات ہوئی تو میں نے سوچا کہ عارف صاحب ایک نعمت ہیں ہمارے لئے۔ جو آپ کا ایکسپورٹ کا کام ہے، اسے وہ بہت اچھی طرح سنبھال سکیں گے۔ ہمارا ہی فائدہ ہے اس میں۔ اس لئے میں نے ان کے لئے بنگلہ خرید لیا۔ چاہیں تو وہ اپنی تنخواہ میں سے تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرتے رہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے آنے سے کاروبار اور منافع بڑھے گا۔'' زبیر نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔

اس بار عبدالحق نے اس کے ہاتھ چوم لئے اور زبیر سناٹے میں آ گیا۔

''الحمدللہ......! آپ نے تو وہ کام کیا، جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ آپ سے کہنا چاہئے تھا۔ مگر مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ آپ نے حق ادا کر دیا میرا......جزاک اللہ......!''

زبیر بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''مگر ایک مسئلہ ہے اس میں......!'' عبدالحق نے کہا۔

''عارف بھائی بڑے خوددار آدمی ہیں۔ انہیں رضامند کرنا آسان نہیں ہو گا۔''

''انشاء اللہ......! سب ہو جائے گا کا کا......! ابھی چلتے ہیں عارف صاحب

کے پاس۔''

''ایک بات بتائیں زبیر بھائی......! آپ کو تو میں نے دنیا کے کاروبار میں الجھا دیا تھا۔ ابھی آپ نے جو میری اصلاح کی اپنے حق کے لئے لڑنے کے معاملے میں، اس نے مجھے حیران کر دیا۔ آپ بلاشبہ درست تھے اور میں غلطی پر تھا۔ یہ بتائیں...... یہ اتنی سمجھ کیسے آئی آپ کو......؟''

''سب اللہ کی رحمت ہے کاکا......!'' زبیر نے عاجزی سے کہا۔

''ہفتے میں ایک دن سارے کام چھوڑ چھاڑ کر مولوی صاحب کے ساتھ گزارتا ہوں۔ اللہ والوں کی صحبت سے بھی بہت کچھ ملتا ہے کاکا......!''

''بے شک......!'' عبدالحق نے کہا۔ اس لمحے اسے مولوی مہر علی بڑی شدت سے یاد آئے۔

''کیسے ہیں مولوی صاحب......؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں۔ لیکن اللہ کے فضل سے نماز اسی شان سے پڑھاتے ہیں۔

عبدالحق کا دل مولوی صاحب سے ملنے کا تڑپ اٹھا۔

❁❁❁

عارف کا ردِعمل عبدالحق کی توقع کے عین مطابق تھا۔

''نہ یہ احسان ہے عارف بھائی......! اور نہ ہی محبت۔'' عبدالحق نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

''بلکہ اس میں تو میرا کوئی دخل ہی نہیں۔''

''تو پھر......؟''

''میں نے تو بس زبیر بھائی سے آپ کے لئے لاہور میں مکان کا بندوست کرنے کو کہا تھا۔ وہ بھی خریدنے کا نہیں کہا تھا۔ مجھے تو خود یہ سب کچھ ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی معلوم ہوا ہے۔''

عارف نے کڑی نظروں سے زبیر کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں استفسار تھا۔

''میں کاکا کی طرح نہیں ہوں عارف صاحب......! میں کاروباری آدمی ہوں اور پہلے اپنا نفع دیکھتا ہوں۔'' زبیر نے نہایت اعتماد سے کہا۔

''اس میں نفع کیا نظر آیا آپ کو......؟''

''درحقیقت آپ کو ہماری ضرورت نہیں عارف صاحب......! ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔''

''وہ کیسے......؟''

''کاروبار بہت پھیلا ہوا ہے ہمارا......اور سنبھالنے والا ایک میں ہوں یا میرا بیٹا......جو ساتھ ہی تعلیم بھی حاصل کر رہا ہے۔ ہم پر بہت بوجھ ہے۔''

''مگر ملازمین کی تو کمی نہیں......؟''

''ٹھیک کہا آپ نے ملازم بہت، منیجر بھی بہت۔ لیکن ایک اہل، محنتی اور ایماندار منتظم بہت بڑی نعمت ہے۔ اور وہ آپ ہیں۔ آپ ہمیں مل گئے تو جو منافع ادھر ادھر نکل جاتا ہے، ہمارے پاس آئے گا۔ یعنی منافع بڑھے گا۔''

''مگر آپ مجھے جانتے ہی کتنا ہیں۔ ایک بار ملاقات ہوئی، وہ بھی سرسری سی۔ آپ نے مجھے اہل، محنتی اور ایماندار کیسے سمجھ لیا......؟''

''آپ کاکا کے دوست ہیں۔ کاکا آپ سے محبت کرتے ہیں۔ اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے......؟''

عارف نے عبدالحق کی طرف دیکھا۔

عبدالحق نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم...... عارف بھائی......! یہ سب کچھ زبیر بھائی نے خود ہی سوچا، خود ہی فیصلہ کیا۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں۔''

عارف نے اس سے پہلے عبدالحق کو قسم کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کا تناؤ دور ہو گیا اور نرمی چھا گئی۔ وہ زبیر کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ کی یہ پیشکش میرے لئے باعث عزت اور اسے قبول کرنا میرے لئے نعمت ہے زبیر صاحب......! لیکن آپ نے میرے نام سے مکان خرید کر میرے حق میں بہت برا کیا۔ آپ مجھ سے پوچھ تو لیتے......!''

"تو اس میں برائی کیا ہے.....؟" زبیر نے سادگی سے پوچھا۔

"آپ خود سوچیں۔ جس روز مجھے کرپشن اور بدعنوانی کے الزام میں برطرف کیا گیا، اس کے چند روز بعد ہی میں لاہور کے ایک پوش علاقے میں بنگلا خریدتا ہوں۔ یہ تو میرے جرم کا ثبوت بن گیا نا.....؟"

"ایسا نہیں ہے عارف صاحب.....!" زبیر نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ اس لئے ہر کام میں پہلے اپنے وکیل سے مشورہ کرتا ہوں۔ اللہ کی مہربانی سے مجھے وکیل بہت اچھا ملا ہے۔ اس نے اس پہلو کو خود سمجھا اور پھر سلیقے سے کام کیا۔ بنگلہ آپ کے نام سے ضرور خریدا گیا ہے لیکن اس کی ادائیگی ہماری کمپنی کی طرف سے کی گئی ہے۔"

اس نے اپنا بیگ کھول کر کچھ کاغذات نکالے اور عارف کی طرف بڑھائے۔

"ہمارے اور آپ کے درمیان جو معاہدہ ہو رہا ہے، اس میں یہ لکھا ہے کہ کمپنی آپ کی خدمات کے عوض آپ کو یہ بنگلہ خرید کر دے رہی ہے، جو آپ سے کبھی واپس نہیں لیا جائے گا۔ لیکن آپ کم از کم پانچ سال ہمارے لئے کام کرنے کے پابند ہوں گے۔ اس کے بعد آپ کی مرضی.....!"

عارف نے معاہدے کو بڑے غور سے پڑھا۔ پھر زبیر کو دیکھ کر مسکرایا۔

"آپ یقیناً پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ آپ تو پڑھے لکھے لوگوں سے بڑھ کر ہیں زبیر صاحب.....!" اس بار اس کے لہجے میں احترام تھا۔

عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ زبیر نے تو اسے بھی حیران کر دیا تھا۔ اس سوجھ بوجھ اور فراست پر اسے رشک آ رہا تھا۔

"اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں عارف صاحب.....؟"

"میں تو صرف شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں آپ کا.....!"

"اس کے بجائے آپ اس معاہدے پر دستخط کر دیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ اور ہاں.....! دستخط کے نیچے 17 تاریخ ڈال لیجئے گا، کیونکہ مکان 18 تاریخ کو خریدا گیا ہے۔"

عارف نے دستخط کر دیئے۔

❁❁❁

شہر بدل گیا، فضا بدل گئی، گرد و پیش اور ماحول بدل گیا، آب و ہوا بدل گئی اور لوگ بدل گئے۔ مگر اس تبدیلی سے ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں متاثر ہوا۔ اثر صرف کراچی سے لاہور آنے والوں پر نہیں پڑا۔ اس سے لاہور میں موجود لوگ بھی متاثر ہوئے۔

مجموعی تاثر بہرحال خوشی کا تھا۔

رابعہ کی خوشی کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ عبدالحق اور حمیدہ کے بغیر تو اس کی زندگی مکمل ہی نہیں تھی۔ پھر ارجمند بھی اس میں شامل ہو گئی اور کراچی جاتے جاتے ننھا نورالحق بھی اس میں شامل ہو گیا۔ اسے تو ان لوگوں کے بغیر لاہور اُجاڑ اور ویران لگتا تھا۔ اس کے لئے تو سال بھر میں بس وہی خوشی کے دن ہوتے تھے، جب وہ لوگ لاہور آتے تھے۔ اور جب وہ واپس جاتے تو اس کے لئے لاہور کی ویرانی اور بڑھ جاتی۔

ساجد بھی بہت خوش تھا۔ عبدالحق کی محبت تو گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ پھر اس میں نورالحق بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے ایک پل بھی دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اور اب وہ اس کے پاس ہی آ گئے تھے۔

گھر کے نوکر بھی بہت خوش تھے۔ نسیمہ تو ہمیشہ ہی ارجمند کو یاد کرتی تھی۔ یعقوب عبدالحق کے بغیر خود کو پردیس میں محسوس کرتا تھا۔ اس سے دوری کے نتیجے میں اس کا انگریزی بولنے کا شوق ختم ہو گیا تھا۔ یہاں ایسا کون تھا جس سے وہ انگریزی بولتا.....؟

کراچی سے آنے والوں میں سب سے خوش نورالحق تھا۔ لاہور والا گھر ویسے ہی اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کا لان اسے بہت پسند تھا۔ پھر محبتیں.....! محبتوں کی تو اسے وہاں بھی کمی نہیں تھی۔ انا، آپی اور ماموں، سب اس سے محبت کرتے تھے۔ مگر یہاں رونق بھی بہت زیادہ تھی۔ تائی کا بس چلتا تو وہ اسے نظر سے اوجھل ہی نہ ہونے دیتیں۔ اور سب سے بڑھ کر ساجد، جسے وہ بھائی جان کہتا تھا، وہ بہت مصروف

ہوتا تھا۔ لیکن اس کی کوئی بات کبھی ٹالتا ہی نہیں تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ کھیلتا بھی تھا۔

اور یعقوب سے بات کرنے میں اسے بہت لطف آتا تھا۔ اس کی بولی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اسے انگریزی بولنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اسے اسمال ماسٹر کہتا تھا۔

وہ جب لان میں اکیلا ہوتا تو یعقوب اس کے پاس آجاتا۔

"آپ مجھے اسمال ماسٹر کیوں کہتے ہیں......؟" پچھلے سال نورالحق نے اس سے پوچھا تھا۔

یعقوب بڑے فخر سے مسکرایا تھا۔

"یور فادر مائی بگ ماسٹر......! یو مائی اسمال ماسٹر......!"

نورالحق کو ہنسی آنے لگی۔ مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"میری سمجھ میں آپ کی پوری باتیں نہیں آتیں۔"

"ابھی اسمال ہیں نا...... بڑے ہوں گے تو سمجھ آنے لگیں گی۔" یعقوب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"آپ اسکول جاتے ہیں......؟"

"جی ہاں......!"

"انگلش پڑھتے ہیں......؟"

"جی ہاں......!"

"سیکھنے میں ٹائم لگے گا۔ پر میں آپ کو سکھاؤں گا۔"

"آپ کیسے سکھائیں گے......؟"

"مائی انگلش ویری ویری گڈ......! میں انگریزوں کے ساتھ انگلش اسپیکنگ کرتا تھا۔"

"انگریز کون ہوتے ہیں......؟"

یعقوب سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات کیسے سمجھائے......؟

"جو انگریز اسپیکنگ کرتے ہیں۔" اس نے بری طرح ہاتھ ہلائے اور چہرے پر زور دیا۔ جب کوئی بات سمجھانے میں دشواری ہوتی تو وہ ایسے ہی کرتا تھا۔

"آپ بھی انگلش بولتے ہیں...... تو آپ انگریز ہیں......؟"

"نو نو...... نو......!" یعقوب نے بری طرح ہاتھ ہلائے۔

"می بلیک انگریز...... دے وائٹ انگریز...... دے ان انگلینڈ...... می ان پاکستان......!"

نورالحق کو اس کی صورت وقت گزاری کا ذریعہ مل گیا۔ ساجد گھر میں نہیں ہوتا تو وہ یعقوب کے کوارٹر میں چلا جاتا۔

اس بار یعقوب لان میں اس کے پاس آیا تو بڑی حیرت اور خوشی سے اسے دیکھا اور بولا۔

"ہیلو......! کوارٹر بگ ماسٹر......!"

نورالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس کا مطلب......؟"

"کچھ لمبے ہوگئے ہیں آپ......! نو اسمال، سم بگ، کوارٹر بگ۔"

"اور بڑا ہوں گا تو......؟"

"پھر ہاف بگ......!"

"اور اس کے بعد......؟"

"تھری کوارٹر بگ......!"

"اور اس کے بعد......؟"

"فور...... فائیو...... سکس...... گنتی آتی ہے نا آپ کو......؟"

"ہاں......! آتی ہے۔" نورالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یوں تو میں کبھی بگ نہیں ہوں گا......؟"

اس پر یعقوب سوچنے لگا۔ بالآخر اس نے کہا۔

"آپ بگ ہوں گے...... جب میں نہیں ہوں گا۔"

اور اسی وقت عبدالحق آگیا۔ یعقوب نے جلدی سے فوجیوں کی طرح اسے سلیوٹ کیا۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں......؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"کچھ نہیں سر......! کوارٹر بگ ماسٹر کو انگریزی سکھا رہا تھا۔"

"یہ کوارٹر بگ ماسٹر کیا ہوتا ہے......؟"

یعقوب چہرے اور ہاتھوں پر زور دے کر اس کی وضاحت کرنے لگا۔

"غضب خدا کا...... ارے......! ابھی تو یہ صرف اے بی سی ڈی سیکھ رہا ہے......اور چھوٹے چھوٹے لفظ......!"

یعقوب کا سینہ تن گیا۔

"مجھے پتا ہے بگ ماسٹر......!" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"اسی لئے تو فل انگلش نہیں بولتا ہوں۔"

"رحم کرو اس بے چارے پر......!" عبدالحق نے بیٹے کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اس کی انگریزی تو سیکھنے سے پہلے ہی تباہ ہو جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہے سر......! میں ہاتھ ہلکا رکھوں گا۔"

"تمہیں ہاتھ رکھنے کی ضرورت ہی نہیں......!" عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

"اب اگر میں نے تمہیں اس سے انگلش بولتے سنا تو میں تمہاری انگلش پر پابندی لگا دوں گا۔"

"او کے بگ ماسٹر......!" یعقوب نے مری مری آواز میں کہا اور سلیوٹ مارا۔

❀❀❀

حمیدہ کے لئے تو حق نگر کے علاوہ ہر جگہ پردیس ہی تھا۔ کیا کراچی اور کیا لاہور......؟ بس یہ ہے کہ کراچی میں تنہائی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ لاہور میں زبیر، رابعہ اور ساجد کے علاوہ نوکر بھی تھے۔ نسیمہ تو خاص طور پر اس سے بہت زیادہ قریب تھی۔ بلکہ ایک معاملہ میں تو وہ اس کی محرم راز تھی۔ اسی کے ساتھ تو وہ عبدالحق کے لئے اولاد کی دعا کرانے درگاہوں پر جایا کرتی تھی۔ اس لئے لاہور اسے کراچی کے مقابلے میں زیادہ اچھا لگا۔

ارجمند کے لئے اہمیت صرف عبدالحق کی تھی۔ وہ چاند تھی اور عبدالحق اس

کے لئے زمین کی طرح تھا۔ چاند کا کام ہی کیا ہے......؟ ہر وقت زمین کے گرد چکر لگانا۔ وہ زمین کو پورا نظر آئے یا نہ آئے، یا بے شک نظر ہی نہ آئے، وہ تو ہر پل زمین کو تکتا رہتا ہے۔ اسے تو روشنی ہی زمین سے ملتی ہے۔

تو جہاں عبدالحق اس کے ساتھ، اس کی نگاہوں کے سامنے تھا، وہی اس کی جنت تھی۔ باہر کی دنیا سے تو اس کا تعلق برائے نام ہی تھا، اور اسے اس میں کچھ ایسی دلچسپی بھی نہیں تھا۔

پھر بھی کچھ حوالے ہوتے ہیں، جو آدمی کے لئے کسی جگہ کو پسندیدہ اور کسی کو ناپسندیدہ بنا دیتے ہیں۔ کراچی ارجمند کو ناپسند نہیں تھا۔ لیکن لاہور اس کے لئے پسندیدہ تھا۔ حالانکہ ابتداء میں لاہور اس کے لئے ایک قفس کی طرح تھا۔ وہاں اس نے بہت سخت وقت گزارا تھا۔ مگر پھر عبدالحق کو بھی تو اس نے وہیں دیکھا تھا۔ وہیں اسے محبت کی نعمت عطا ہوئی تھی۔ پھر اسے ایک گھر ملا تھا اور گھر بھی عبدالحق کا۔ وہیں اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اور وہیں اس کی دلی آرزو پوری ہوئی تھی......عبدالحق سے اس کی شادی۔

لاہور اس کے لئے پسندیدہ تھا۔ مگر لاہور کے اس بنگلے سے تو اسے عشق تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد یہ اس کی پہلی پناہ گاہ تھا......اس کے تحفظ کا قلعہ۔ اس گھر کے چپے چپے سے اس کی خوب صورت یادیں وابستہ تھیں۔ اسٹڈی میں عبدالحق سے پڑھنا، وہ قربت کی آزمائش، جس میں اللہ نے اپنی مدد سے سرخ رو کر کے اسے پاکیزہ قربت بنا دیا تھا۔ دادی اماں کا کمرہ، جہاں صبح وہ عبدالحق سے ملتی تھی، کبھی کبھی اسے سورۂ ملک سناتی تھی۔ کچن، جہاں وہ عبدالحق کے آفس بھیجنے کے لئے کھانا پکاتی اور ٹفن میں رکھتی۔ لان، جہاں وہ جھولا جھولتی، بینچ پر بیٹھ کر اس کی خوب صورتی کو سراہتی، جہاں ساجد چپکے چپکے محبت سے اسے چھوٹی چاچی کہتا۔

اس گھر میں اس کی خوشیوں کے بیش بہا خزانے تھے۔

اور حق نگر میں اس نے زیادہ وقت نہیں گزارا تھا۔ مگر اسے حق نگر سے محبت تھی۔ اس لئے کہ اس کا نام عبدالحق کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس لئے بھی کہ حق نگر سے عبدالحق کو محبت تھی۔ اور جو عبدالحق کو محبوب تھا، وہ اسے بھی محبوب تھا۔ اور اس لئے بھی

کہ جب عبدالحق کا کراچی تبادلہ ہوا تھا تو دادی اماں اپنے کمرے میں اسے عبدالحق کی کہانی سناتی تھیں، جو اسے حقیقت سے زیادہ افسانہ لگتی تھی۔ اسے سن کر ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔

دادی اماں نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ اسے ان کی بات پر پورا یقین نہیں ہے۔

''نکی......! تو اسے کہانی سمجھتی ہے نا......؟'' ایک دن انہوں نے کہا۔

''نہیں دادی اماں......! سچ سمجھتی ہوں۔ پر کہیں کہیں یقین نہیں آتا۔'' اس نے سچائی سے کام لیا۔

''پر سچ یہ ہے نکی......! کہ میں پورا نہیں بتا پاتی۔'' دادی اماں نے کہا۔

''پورا نہیں بتا پاتیں......؟'' ارجمند نے حیرت سے کہا۔

''تو اور بھی بہت کچھ ہے کیا......؟''

''تو اور کیا......؟ بڑے ٹھاکر کس طرح مسلمان ہوئے......؟ مجھے نہیں معلوم۔ کھدائی کے بعد پرانی حویلی کے تہ خانے سے ان کی دو ڈائریاں ملی تھیں۔ وہ نور بانو نے پڑھی تھیں اور پھر عبدالحق کو دی تھیں۔ اس کے بعد ہی تو عبدالحق نے مجھے بتایا تھا کہ ٹھاکر ویرجی مسلمان ہو گئے تھے۔ کیسے......؟ یہ مجھے کبھی پتا نہیں چلا۔''

وہ دونوں ڈائریاں ارجمند نے بھی دیکھی تھیں۔ وہ نور بانو کے پاس تھیں۔ اس نے اس سے ان کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ نور بانو نے اسے سرسری طور پر بتایا بھی تھا۔ لیکن یہ بھی جتا دیا تھا کہ عبدالحق کی اجازت کے بغیر وہ اسے نہیں دے سکتی۔ ارجمند خود بھی ان باتوں کا خیال رکھتی تھی۔ تجسس کے باوجود اس نے عبدالحق سے اجازت لی، نہ نور بانو سے اصرار کیا۔

''آپی سے کہتیں تو وہ آپ کو پڑھ کر سنا دیتیں۔'' اس نے کہا۔

''کئی بار کہا، پر وہ ٹالتی رہی۔ اور پھر وہ دور چلی گئی تو بات ہی ختم ہو گئی۔''

ارجمند اس پر سوچتی رہی۔ واقعی......! اس کہانی کے تین راوی تھے...... عبدالحق کے والد، حمیدہ اور خود عبدالحق۔ عبدالحق کی یادداشت کے آغاز سے قبل جو کچھ ہوا، وہ صرف اس کے والد اور حمیدہ ہی جانتے تھے۔ تینوں کے بیان ملنے پر ہی مکمل

کہانی سامنے آ سکتی تھی۔ عبدالحق خود کچھ بتانے والا نہیں تھا۔ حمیدہ سب کچھ بتا چکی تھی۔ اب والد مرحوم کی ڈائریاں ہی کہانی کو مکمل کر سکتی تھیں۔

حمیدہ پر اسے رشک آتا تھا۔ اسے اللہ نے وقت کے ساتھ چلنے کی زبردست صلاحیت دی تھی۔ وہ نئے دور کی اجنبی چیزوں کو بھی آسانی سے قبول کر لیتی تھی۔ اتنے برسوں میں اس نے اس کی زبان میں ہی بڑی تبدیلی دیکھی تھی۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ پہلے کیسے بولتی ہوگی۔ پھر نور بانو کے ذریعے اور عبدالحق کے ذریعے بھی اسے نئے الفاظ ملے اور اس نے وہ اپنا لئے۔

''نکی......! میری بات سن......!''

ارجمند نے چونک کر اسے دیکھا۔ حمیدہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''جی دادی اماں......!''

''تجھے پتا ہے ان ڈائریوں کا......؟''

''جی دادی اماں......! آغا جی کی میز کی دراز میں رکھی ہیں۔''

''کس نے رکھیں......؟''

''میں نے......!''

''میں سمجھی، عبدالحق نے رکھی ہوں گی۔''

''انہیں تو شاید اب وہ یاد بھی نہیں......!'' ارجمند نے کہا۔

''آپی کے انتقال کے بعد میں نے انہیں سنبھال کر رکھ دیا تھا۔''

حمیدہ کو ایک خیال نے چونکا دیا۔

''اور تو نے کبھی انہیں کھول کر بھی نہیں دیکھا۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''نہیں دادی اماں......!''

''تو کیسی ہے نکی......! تیرا کبھی دل بھی نہیں چاہا......؟''

''دل تو بہت چاہتا تھا دادی اماں......! لیکن آغا جی کی امانت...... آغا جی کی اجازت کے بغیر میں کیسے پڑھ سکتی ہوں انہیں......؟''

''لے...... میاں بیوی میں کون سا پردہ ہوتا ہے......؟''

''پھر بھی دادی اماں......! کچھ چیزیں بہت ذاتی ہوتی ہیں۔ اللہ نے منع کیا

ہے اس بات سے۔''

''ارے پگلی......! اس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔ عبدالحق کے لئے تو وہ عزت اور فخر کی بات ہے۔ پتا ہے...... اس کے بعد ہی تو اس نے اپنے ہر سائی فیکٹ پر ٹھاکر جی کا نام تبدیل کرایا تھا۔ کہتا تھا، میرے والد بھی مسلمان تھے الحمدللہ......!''

''بے شک اماں......! بات تو عزت اور فخر کی ہے۔ لیکن آغا جی کی اجازت کے بغیر تو میں انہیں کھول کر بھی نہ دیکھوں۔''

''پر اب میں تجھ سے کہتی ہوں کہ وہ مجھے پڑھ کر سنا......!''

''میں آپ سے بھی یہی کہوں گی دادی اماں......! کہ پہلے آغا جی سے اجازت لے لیں۔''

''آپ کا ہی بھلا ہے اس میں...... اللہ کا حکم ہے نا...... دادی اماں......!''

''ارے......! میرا عبدالحق پر حق نہیں ہے کیا......؟'' حمیدہ جھنجلا گئی۔

''اور وہ مجھے منع کر دے گا کیا......؟''

''دیکھیں اماں......! آپ خود پڑھ لیں تو شاید یہ آپ کا حق ہے۔'' ارجمند کے لہجے میں عاجزی تھی۔

''لیکن آپ کسی اور سے پڑھوائیں تو یہ دوسری بات ہے۔ بلاوجہ میں بھی گناہگار اور آپ بھی۔ اور پوچھ لینا کوئی بری بات تو نہیں۔ آپ کا مرتبہ تو کم نہیں ہوگا۔''

بات حمیدہ کی سمجھ میں آگئی۔

''تو نے ٹھیک کہا نکی......! میں عبدالحق سے پوچھ لوں گی۔''

❁❁❁

عبدالحق کے لئے لاہور میں بس یہی ایک خوبی تھی کہ یہاں زبیر بھائی، رابعہ اور ساجدہ اسے مل گئے تھے۔ دوسری یہ کہ پابندی کی زنجیریں کٹ گئی تھیں۔ وہ آزاد تھا۔ کب سے وہ حق نگر نہیں جا سکا تھا۔ اب جا سکتا تھا۔ مولوی مہر علی کی وہ بہت کمی محسوس کرتا تھا۔

باقی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔

کچھ دن تو وہ الجھنوں میں پھنسا رہا۔ پھر تبدیلی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا ہوئی تو پرانے مسائل سر اٹھانے لگے۔ بلکہ وہ اور بڑھ گئے۔ کراچی میں وہ روز آفس جاتا تھا۔ شام تک ارجمند سے دور رہتا، دفتری کاموں میں الجھا رہتا تو مسئلہ صرف تصور تک محدود تھا۔ اب وہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھی۔ اور وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ پرُکشش لگنے لگی تھی۔

بیڈ روم کا معمول ان کا وہی کراچی والا رہا۔ بلکہ اب تو اسے نیچے سونے میں لطف آنے لگا تھا۔

یہاں وہ ایک اور آزمائش سے گزرا۔ جب خواہش نے شدت سے سر اٹھایا تو اس کے اندر ایک نئی سوچ ابھری۔ اس نے سوچا کہ غسل کے معاملے میں جو کچھ ہوا، ممکن ہے اس کا سبب کراچی کی آب و ہوا ہو۔ لہٰذا کیوں نہ یہاں تجربہ کر کے دیکھا جائے......؟

لیکن اب وہ بہت چوکنا تھا۔ اپنی آخری کوشش کے نتیجے میں وہ جمعہ کی نماز سے محروم ہوا تھا۔ وہ اس کے لئے ایک ایسا نقصان تھا، جسے وہ زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ اس دن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس سلسلے میں کوئی تجربہ نہیں کرے گا۔

یہاں بھی وہ فوراً ہی سمجھ گیا کہ یہ اس پر شیطان کا حملہ ہے۔ اس نے اس خیال کا وہی گلا گھونٹ دیا۔

اس نے اس مسئلے پر قرآنِ حکیم سے رہنمائی حاصل کرنے کے بارے میں سوچا۔ اس کا ایمان تھا کہ دنیا کے ہر مسئلے کا حل قرآن، سنت اور سیرتِ طیبہؐ میں موجود ہے۔

لیکن اس کا مسئلہ تو بالکل ہی انوکھا تھا۔ ایسی کوئی نظیر بھی اس کے سامنے نہیں تھی۔ لیکن اس کا ایمان پختہ تھا۔ وہ اس پر سوچتا رہا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

یہ اللہ کی رحمت تھی اس پر کہ وہ یہ سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوا کہ اس کے مسئلے کا حل موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس نے عاجزی سے سوچا کہ اللہ کا کلام تو ایسا ہے کہ قیامت تک لوگ اسے سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے، لیکن پوری طرح کبھی نہیں سمجھ پائیں گے اور وہ تو وہ لوگ ہوں گے، جنہوں نے باقاعدہ اس

علم کو حاصل کیا ہوگا اور اللہ نے اپنی جناب سے بھی انہیں نوازا ہوگا۔ جبکہ اس کی تو اوقات ہی کیا ہے۔ وہ تو بس قرآن پڑھ لیتا ہے، اور اللہ کی رحمت ہو تو کسی آیت کا ظاہری، سامنے کا مفہوم سمجھ لیتا ہے۔

پھر قرآن تو آخری کتاب ہے۔ قیامت تک کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ یہ ہر دور، ہر عہد کے لئے کافی و شافی ہے۔ اس میں کتنی پیشین گوئیاں ہیں، جو بعد میں پوری ہوئیں، اور کتنی ہیں جو قیامت تک پوری ہوتی رہیں گی۔ یہ تو آفاقی کلام ہے۔

اب اسے گہرائی میں سمجھنا بندے کے بس کی بات نہیں۔ البتہ اللہ جسے چاہے، نواز دے اور جتنا چاہے نواز دے۔

اس کوشش کے بعد وہ بس اللہ سے ہی رجوع کر سکتا تھا۔ اور بالآخر اللہ نے ہی اس کی رہنمائی فرمائی۔ اور اس کے ایمان کے مطابق قرآن ہی کے ذریعے رہنمائی فرمائی۔

پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ کسی صاحب علم کے سامنے اپنا مسئلہ رکھ کر اس سے مشورہ لے۔ مگر یہ ناممکن تھا۔ اس کے مزاج میں شرم و حیا اتنی تھی کہ اس کی زبان ہی نہ کھلتی۔ وہ تو شاید یہ مسئلہ مولوی مہر علی کے سامنے بھی بیان نہیں کر سکتا تھا۔

اللہ اپنے بندوں کا پردہ بھی رکھتا ہے اور ان کی مدد بھی فرماتا ہے۔ اس نے رحمت فرمائی اور بغیر کسی وسیلے کے اس کا مسئلہ حل فرما دیا۔

اس روز سورۂ بقرہ کی تلاوت کرتے ہوئے وہ پینتالیسویں آیت مبارکہ پر ٹھٹک گیا۔ اس نے اسے کئی بار پڑھا۔

''اور مدد لو صبر سے اور نماز سے، اور بے شک یہ بہت گراں ہے، سوائے ان بندوں کے، جن کے دلوں میں ڈر اور عاجزی ہے۔''

اس نے اور پیچھے سے پڑھ کر غور کیا۔ اس میں اہل کتاب کے لئے وعید تھی، جو دوسروں کو عمل کرنے کا کہتے تھے، اور خود عمل نہیں کرتے تھے۔ لیکن اسے یہ حکم عمومی لگا۔

''اور مدد لو صبر سے اور نماز سے......''

اس نے تفسیر میں اس آیت مبارکہ کو دیکھا۔ قرآن کو سمجھنے والوں میں سے کسی کا قول تھا کہ صبر سے مراد روزہ ہے، اسی لئے رمضان المبارک کو ماہِ صبر کہا جاتا ہے۔

اسے لگا کہ اللہ اسے راہ دکھا رہا ہے۔

روزہ اور نماز......!

اسے یاد آیا کہ سورۂ نور میں ان لوگوں کے بارے میں ایک آیت ہے، جو شادی کے لئے مالی استطاعت نہیں رکھتے۔

اس نے تفسیر کی وہ جلد کھولی، جس میں سورۂ نور تھی۔ بالآخر اسے وہ آیت نظر آ گئی۔ وہ تینتیسویں آیت تھی۔ اس میں ان لوگوں کو جو آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے، لونڈی سے نکاح کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کرنے کو اس پر ترجیح دی تھی، کیونکہ اس سے نکاح کی صورت میں اولاد غلام ہوگی۔ اور صبر کی صورت میں بشارت تھی کہ اللہ ایسے شخص کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

پھر اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نظر آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جس کی شادی کی استطاعت نہ ہو، وہ روزے رکھے، کیونکہ یہ شہوت کو توڑنے والی ہیں۔

اس کے دل کو قرار آ گیا۔ اس کا دل امید سے بھر گیا۔

بے شک...... اس کا مسئلہ نکاح نہیں تھا۔ وہ تو شادی شدہ تھا۔ لیکن اس کا مسئلہ نفس سے لڑنے کا تھا۔ اور اس کا حل اسے مل گیا تھا۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ روزہ کتنی بڑی عبادت ہے، اور اس کے کتنے فائدے ہیں۔

اس نے سوچ لیا کہ ہفتے میں تین روزے رکھنے کا معمول اپنائے گا۔

روزے کے لئے سحری ضروری تھی۔ لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ تہجد کے لئے وہ بھی اٹھتا تھا اور ارجمند بھی۔

اس نے اس سلسلے میں ارجمند سے بات کی۔

ارجمند خوش ہوگئی۔

''جزاک اللہ آغا جی......! آپ کے ساتھ میں بھی روزہ رکھ لوں گی۔

افسوس......! مجھے کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔''

وہ ارجمند سے نظریں چرا رہا تھا۔لیکن ارجمند نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

❁❁❁

''کیا بات ہے پتر......؟ تو ناشتہ نہیں کر رہا ہے......؟'' حمیدہ نے عبدالحق کو ٹوکا۔

''میرا روزہ ہے اماں......!'' عبدالحق کو شرمندگی ہونے لگی کہ معاملہ دکھاوے کی طرف جا رہا ہے۔لیکن وہ کیا کرتا......؟ گھر میں تو یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی اور دل کا حال اللہ جانتا ہے۔''

''خیر تو ہے پتر......؟'' حمیدہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''روزہ تو خیر ہی ہوتا ہے اماں......!'' عبدالحق نے عاجزی سے کہا۔

''بس...... اللہ کی رحمت سے دل میں خیال آیا اور میں نے سوچا کہ عمل کر لوں۔ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھا کروں گا، انشاء اللہ......!''

''تو پتر......! ناشتے کی میز پر آنے کی کیا ضرورت ہے......؟'' حمیدہ نے محبت سے کہا۔

''آپ کی خاطر آ گیا تھا اماں......! آپ رخصت دے دیں تو......''

''میری طرف سے اجازت ہے پتر......!'' حمیدہ نے کہا۔پھر ارجمند کی طرف مڑی۔

''اور تو نکی......؟''

''جی اماں......! میں کیوں محروم رہوں سعادت سے......؟'' ارجمند نے کہا۔

''ٹھیک ہے نکی......!''

''ایک بات کہوں اماں......!''

''ہاں پتر......! بول......!''

''یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو تو اچھا ہے۔''

''کیوں پتر......؟'' حمیدہ نے حیرت سے کہا۔

''یوں دکھاوا ہو جائے گا نا......! یہ اچھا نہیں......!''

''میں کسی سے نہیں کہوں گی۔بس اب تو جا......! ابھی رابعہ آئے گی تو بات کھل جائے گی۔''

خوش قسمتی سے زبیر، رابعہ اور ساجد اس وقت موجود نہیں تھے۔

عبدالحق جانے لگا تو حمیدہ نے اسے پکارا۔

''کچھ دیر بعد آنا میرے پاس پتر......! تجھ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''جی اماں......!'' عبدالحق نے کہا اور چلا گیا۔

وہ تینوں ناشتے کے لئے آئے تو زبیر نے پوچھا۔

''کا کا نہیں آئے......؟''

''کہتا ہے، اپنے کمرے میں ناشتہ کرے گا۔''

زبیر پریشان ہو گیا کہ کہیں عبدالحق کسی بات پر ناراض تو نہیں ہو گیا۔وہ ڈھنگ سے ناشتہ بھی نہیں کر سکا۔

ناشتے کی میز سے اٹھ کر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔اس نے سوچا، آج وہ کام بھی کر لے، جو کئی دن سے ٹلتا آ رہا ہے۔اسے عبدالحق کو کچھ دینا تھا۔اور اسے ڈر تھا کہ عبدالحق اس پر خفا نہ ہو۔مگر اب جبکہ لگتا تھا کہ عبدالحق ویسے ہی اس سے ناراض ہو گیا ہے تو یہ کام بھی کر ہی لیا جائے۔پھر معافی مانگ کر منا بھی لے گا۔

وہ کرسی پر بیٹھا اور سامنے رکھی فائلوں کو ٹٹولنے لگا۔اسے یاد تھا کہ چیک بک اسی میز کی دراز میں رکھی ہے۔

اپنی میز کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا۔پانچ سال پہلے وہ یہ میز خرید کر لایا تھا اپنے لئے۔اور یہ راہ اسے ساجد نے دکھائی تھی۔

اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ ساجد کی شکل میں اس نے اسے بہت بڑی نعمت عطا فرمائی۔ورنہ وہ خود تو پڑھا لکھا تھا نہیں۔اسے تو کاروبار کی سمجھ بوجھ بھی نہیں تھی۔عبدالحق نے اس پر ذمہ داری ڈالی تو اس کی محبت میں اس نے خود کو کھپا دیا۔اس نے اس سلسلے میں بھی اللہ سے مدد طلب کی تھی، اور اللہ نے اسے بہت نوازا تھا۔

کارندے اسے بہت اچھے مل گئے تھے..... محنتی اور ایماندار۔

مگر سب سے بڑھ کر اسے ساجد سے مدد ملی تھی۔ ساجد کی مدد سے اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ یہ سب کچھ عبدالحق کے تو علم میں بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے کراچی جانے کے بعد ہوا تھا۔ ساجد پہلے تو اسے خود پڑھاتا رہا۔ پھر اسی کے اصرار پر زبیر نے نائٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ وہاں سے پچھلے سال اس نے میٹرک کیا۔

''کیسا کیسا فضل فرمایا میرے ربّ نے.....!'' اس نے سوچا اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ پچھلی زندگی تو اب اسے دھندلا سا خواب لگتی تھی۔ بلکہ وہ جیسے وہ نہیں، کوئی اور تھا، جس نے وہ زندگی گزاری تھی۔ پھر اللہ نے اسے گمراہی سے نکالا، ہدایت سے نوازا، اولاد عطا فرمائی، کاروبار کی سوجھ بوجھ عطا فرمائی۔ دنیا میں وہ مقام اور مرتبہ عطا فرمایا، جس کی اس نے خواہش بھی نہیں کی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے غرور اور بدماغی سے محفوظ رکھا۔ اس کی عاجزی سلامت رہی۔ دنیا کی نظروں میں کچھ بھی ہو، وہ خود تو پہلے بھی نوکر تھا۔ اور اب بھی نوکر ہی ہے۔ اس نوکری میں ہی اس کی عزت ہے۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ شکر کے آنسو۔ احساس ہوا تو اس نے چونک کر انہیں پونچھا۔ پھر اس نے مطلوبہ فائل اٹھائی، دراز سے چیک بک اور پاس بکس نکالیں اور انہیں ایک لفافے میں رکھ لیا۔

عبدالحق کا خیال آیا تو وہ پھر پریشان ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے ایسی کیا غلطی ہوگئی، جس نے اسے ناراض کر دیا.....؟

وہ فائل اور لفافہ لے کر اٹھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

❀❀❀

اپنے کمرے میں عبدالحق کو خیال آیا کہ ناشتے پر اس کی اور ارجمند کی غیر موجودگی زبیر اور رابعہ کو بہت غیر معمولی لگے گی۔ نہ جانے وہ کیسے کیسے گمان کریں گے.....؟ اور سچ ہے کہ اصل بات معلوم نہ ہونے کی صورت میں تو انہیں اس میں نظر انداز کئے جانے کا، توہین کا احساس ہوگا۔

اس خیال نے اسے بے چین کر دیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس سلسلے میں

اسے ان سے معذرت کرنا ہوگی..... اور وہ بھی فوری طور پر۔ اسے زبیر کے جانے سے پہلے ہی اس سے ملنا تھا۔

پھر اسے یاد آیا کہ حمیدہ نے بھی اسے بلایا تھا، اور اس کے لہجے میں تاکید تھی۔ نہ جانے کیا بات ہوگی.....؟

کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا اور حمیدہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

زبیر کے لئے ناشتے پر عدم موجودگی کا اتنی دیر میں اس نے عذر تلاش کر لیا تھا۔

حمیدہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ عبدالحق اس کے پاس جا بیٹھا۔

''تم نے مجھے بلایا تھا اماں.....!''

حمیدہ کو یاد ہی نہیں رہا تھا۔

''میں نے.....؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''پر کیوں.....؟''

عبدالحق ہنسنے لگا۔

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں اماں.....؟''

حمیدہ چند لمحے ذہن پر زور دیتی رہی۔ بالآخر اسے یاد آ گیا۔

''ہاں پتر.....! یاد آ گیا۔''

''کیا بات ہے اماں.....؟''

''وہ ٹھاکر ویر جی کی ڈائریاں تھیں نا..... ان کے بارے میں پوچھنا تھا۔''

عبدالحق کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''کیا پوچھنا تھا اماں.....؟''

''یہی کہ وہ کہاں ہیں.....؟''

''میری میز کی دراز میں ہیں اماں.....!''

''میں سمجھی تھی کہ تجھے یاد بھی نہیں ہوں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو اماں.....! انہیں میں بھول سکتا ہوں بھلا.....؟'' عبدالحق نے کہا۔

''وہ تو میری نسلوں کی امانت ہیں۔ نورالحق بڑا ہوگا تو اسے پڑھواؤں گا۔

جب پریشانی ہوتا ہوں تو انہیں پڑھتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔''

حمیدہ کو یہ سن کر خوشی ہوئی۔

''چل...... تیرے بیٹے کی تو وہ امانت ہے۔ بیوی کو بھی پڑھائی تو نے......؟''

''ارجمند ہی کے پاس تھیں وہ اماں......! اور اس نے میری دراز میں رکھیں۔''

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے وہ پڑھی بھی ہوں گی......؟''

''کیسی باتیں کرتی ہو اماں......! بھئی...... اس کے پاس ہی تھیں۔''

''لیکن اس نے نہیں پڑھیں۔''

''آپ نے پوچھا تھا اس سے......؟''

''ہاں......! بولی، یہ بہت ذاتی چیز ہوتی ہے۔ بغیر اجازت کے نہیں پڑھ سکتی۔''

''تو اجازت لے لیتی......!''

''تو جانتا ہے اسے...... کتراتی ہے وہ۔''

''اس کے لئے تو یہ پڑھنا مجھ سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ وہی تو نورالحق تک یہ سب پہنچائے گی۔ وہی تو اللہ کے حکم سے یہ فیض آگے بڑھائے گی۔''

''اور میں......؟'' حمیدہ نے کچھ چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

عبدالحق نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور ہونٹوں سے لگا لئے۔

''برا مان گئیں اماں......؟''

''نا پتر......! برا کیوں مانوں گی بھلا......؟''

''...... کہ ارجمند کو تم سے زیادہ سمجھا......؟''

''اس پر کبھی برا نہیں مانوں گی۔ یہ تو میں خود چاہتی ہوں۔ پر تو اسے اتنا نہیں سمجھتا، جتنا حق ہے اس کا۔''

عبدالحق چونکا۔

''ارجمند نے کوئی شکایت کی ہے تم سے......؟''

''توبہ کر پتر......! توبہ......! وہ کوئی شکایت کرنے والی ہے......؟ یہ تو میں خود سمجھتی ہوں، پر تجھے کبھی ٹوکا نہیں۔''

''سمجھتی تھیں تو ٹوکا کیوں نہیں......؟''

''اچھا نہیں لگتا پتر......! تو کوئی بچہ تو نہیں کہ راہ دکھاؤں تجھے......؟ پر آج ٹوک رہی ہوں۔ وہ نور بانو تھی، جو اپنے حق سے زیادہ زبردستی بھی لے سکتی تھی۔ اور یہ ارجی ہے پتر......! جو اپنا حق بھی کبھی نہ مانگے۔ تو وے دے تو اللہ کا شکر بھی ادا کرے اور تیرا شکریہ بھی۔ ایسے بندے کے ساتھ بے انصافی بہت بری ہوتی ہے پتر......!''

''میں اپنے طور پر کوشش تو کرتا ہوں اماں......!''

حمیدہ کو احساس ہوا کہ بات بہت دور نکل گئی۔

''میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں بھی نورالحق کو بہت کچھ بتا سکتی ہوں، اور بتاتی بھی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تم سے زیادہ بتانے والا کون ہوگا اماں......؟ تم نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''ہاں پتر......! پر ٹھاکر ویر جی کا مجھے نہیں پتا۔ اسی لئے ڈائریوں کا پوچھ رہی تھی۔''

''تو اماں......! ارجمند سے کہو، وہ پڑھ کر سنا دے گی کسی دن......!''

''کہا تھا اس سے...... کہنے لگی۔ پہلے آغا جی سے اجازت لیں......!''

عبدالحق کو ارجمند پر پیار آ گیا۔

''عجیب لڑکی ہے۔ نہ اپنا حق سمجھتی ہے نہ کسی اور کا۔''

''تو پتر......! تو اسے ڈائریاں پڑھنے کی اجازت دے دینا۔''

''نہیں اماں......! وہ مجھ سے اجازت مانگے گی تو دوں گا۔ بغیر مانگے نہیں......!''

''بچوں جیسی بات......''

''ہاں...... تم اسے کہہ دینا کہ میں نے اجازت دے دی ہے۔ وہ تمہیں پڑھ

کر سنا سکتی ہے۔ اور چاہے تو خود بھی پڑھ سکتی ہے، جب جی چاہے، اور جتنی بار جی چاہے۔ اس سے کہنا، نورالحق اس کا بیٹا نہیں، لیکن پال تو وہی رہی ہے اسے۔ اسے مناسب وقت پر یہ سب بتانا...... اللہ نے ہم پر جو فضل فرمایا، رحمت کی، اس سے آگاہ کرنا اس کا فرض ہے۔''

حمیدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''بری بات پتر......! مجھ سے تو یہ بات کہہ دی تو نے...... پر اس سے کبھی نہ کہنا۔ بہت دل دُکھے گا اس کا۔''

''کون سی بات اماں......؟'' عبدالحق جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

''یہی کہ وہ نورالحق کی ماں نہیں۔''

''اب حقیقت تو حقیقت ہے نا...... اماں......! وہ تو نہیں بدل سکتی۔''

''بدل جاتی ہے پتر......! اور بندے کو پتا بھی نہیں چلتا۔'' حمیدہ کے لہجے میں بے رخی تھی۔

''بے خبر آدمی کو حقیقت کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ تو کیا جانے......؟ تجھے کیا معلوم......؟''

اتنے شدید ردِعمل پر عبدالحق دم بخود رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی کون سی...... بہت بری بات کہہ دی اس نے، جو حمیدہ کے تیوریوں بدل گئے۔

''کیا مطلب اماں......! تم ایسے خفا کیوں ہوگئیں......؟''

حمیدہ کو بھی خیال آ گیا کہ ایک لمحے میں راز فاش ہو جائے گا۔ اس نے تیزی سے بات بنائی۔ مگر اس کے لہجے میں اب بھی تندہی تھی۔

''نکی نورالحق کی ماں نہیں تو میں کب تیری ماں ہوں......؟ تو مجھے ماں کیوں کہتا......؟ کیوں سمجھتا ہے......؟''

وہ اور بات ہے اماں......! مجھے تو تم نے......''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اگر آگے کبھی ایسی بات کی تو پھر مجھے پھر مجھے اماں نہ کہنا۔''

عبدالحق نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر حمیدہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک

دیا۔ اس کے چہرے پر جو درشتی تھی، اسے دیکھ کر عبدالحق سہم گیا۔ حمیدہ نے کبھی اس سے اتنے سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

''بس...... اب آگے سے ایک لفظ نہیں کہنا ہے۔''

عبدالحق بے تابی سے اس کے دونوں ہاتھ چومنے لگا۔

''معاف کر دو اماں......! اب ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

ایک لمحے تو ایسا لگا کہ حمیدہ اس سے ہاتھ چھڑانے والی ہے۔ مگر پھر وہ مسکرائی۔

''جا تجھے نکی کی خاطر معاف کیا...... ورنہ کبھی بھی بات نہ کرتی تجھ سے۔''

''شکریہ اماں......!''

''شکریہ تو نکی کا ادا کر...... کہا نا...... اس کی خاطر معاف کیا ہے تجھے......!''

''اب میں جاؤں اماں......؟'' عبدالحق کو وہاں سے نکل بھاگنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

''جا...... پر میری بات یاد رکھنا ہمیشہ......!''

''جی اماں......!''

عبدالحق باہر نکلا اور زبیر کے کمرے کی طرف چل دیا۔ برسوں کے بعد وہ اس کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دی پھر چند لمحوں کے دروازہ دھکیلا۔

❀❀❀

دروازہ کھلا تو زبیر کو عبدالحق کی صورت نظر آئی۔ لفافہ اور فائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

''کاکا......! آپ......؟'' اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

عبدالحق کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں وہ کمرہ اسے بہت تنگ، بہت چھوٹا لگا۔

''میں اندر آ سکتا ہوں زبیر بھائی......؟'' اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا۔

''کیا بات کرتے ہیں کا کا......؟'' زبیر نے کہا اور اس کی طرف لپکا۔

''آپ کا گھر ہے۔''

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں...... اور اس کا دکھ بھی ہوا ہے مجھے......!''

زبیر اس کے لہجے کی ناراضی سے اور بوکھلا گیا۔

''آئیں نا......!'' اس نے عبدالحق کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

عبدالحق اس کے ساتھ اندر آیا۔ لیکن اس کی کرسی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

''یہ تو آپ کی کرسی ہے۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

زبیر کھڑا رہا۔

''مجھے بلوا لیتے کا کا......! آپ خود چلے آئے......؟'' اس نے کہا۔

''اور میں تو خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔''

زبیر ہمیشہ کی طرح کھسیا گیا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں کا کا......؟'' اس نے کہا۔

''ایسی کیا بات ہے......؟''

''آپ اپنی کرسی پر بیٹھیں تو بات کروں......!'' عبدالحق اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ورنہ چلا جاتا ہوں۔''

زبیر بوکھلا کر بیٹھ گیا۔

''بتائیں تو بات کیا ہے......؟''

''آیا تو آپ سے معذرت کرنے کو تھا...... لیکن......''

''معذرت کیسی کا کا......؟''

''ہم ناشتے پر ساتھ نہیں تھے نا...... اس کے لئے......''

زبیر کی جان میں جان آئی۔

''میں تو سمجھا تھا کہ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی اور آپ ناراض ہو گئے......؟''

''بات یہ ہے بھائی......! کہ اب نوکری کی پابندی تو ہے نہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''فجر پڑھ کر سو جاتا ہوں۔ ناشتے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس پر معذرت کرنی تھی اور یہ کہنا تھا کہ وقت پر آ جاؤں تو آپ کا ساتھ دوں گا۔ ورنہ آپ ناشتہ کر لیں۔ رات کا کھانا تو ہم اکٹھا ہی کھائیں گے انشاء اللہ......!''

''یہ کون سی بڑی بات ہے کا کا......! میں تو ڈر ہی گیا تھا۔''

''مگر اب مجھے آپ سے ناراضی ہے۔ یوں کہیں کہ شکایت ہے۔''

زبیر پھر پریشان ہو گیا۔

''کیا ہو گیا کا کا......؟''

''ابھی آپ نے کچھ کہا، اور وہی کہا جو آپ سمجھتے ہیں۔ اور وہ آپ کے کمرے کو دیکھ کر ثابت بھی ہو گیا۔''

''بات کیا ہے کا کا......؟''

''آپ نے کہا کہ یہ میرا گھر ہے، جیسے آپ کا نہیں...... اور یہ ثابت بھی ہو گیا۔''

''کیسی بات کرتے ہیں کا کا......! میں تو آپ کا ہی ہوں۔ آپ کا گھر ہمیشہ سے میرا ٹھکانہ ہے۔ کبھی اور کہیں رہا ہیں......؟''

''اب بھی ٹھکانہ کہہ رہے ہیں......؟'' عبدالحق کے لہجے کی شکایت بڑھ گئی۔

''گھر کیوں نہیں کہتے......؟ میری ہر چیز میں آپ شریک ہیں۔ میرا ہر گھر آپ کا بھی ہے۔ آپ اسے اپنا گھر نہ سمجھیں تو مجھے شکایت تو ہو گی......؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں کا کا......!''

''غلط بات زبیر بھائی......!'' عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ یہاں ایسے رہ رہے ہیں، جیسے اس کمرے سے باہر کسی چیز پر آپ کا کوئی حق نہیں۔ حالانکہ سب آپ کا ہے۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کا کا......!''

''اس چھوٹے سے کمرے میں آپ نے یہ میز لا کر ڈال لی۔ جبکہ گھر میں اتنی بڑی اسٹڈی موجود ہے۔ وہاں دو میزیں بھی ہیں، اور جگہ اتنی ہے کہ دو اور میزیں بھی ڈال لیں تو تنگی کا احساس نہ ہو۔''

''یہ تو میری سستی کی وجہ سے ہے۔'' زبیر نے جلدی سے کہا۔

''سوچا...... یہ کام نمٹاؤں اور یہیں سو جاؤں۔''

''اور ڈبل بیڈ نکال کر آپ نے یہاں تین سنگل بیڈ ڈال لئے...... اس کے بارے میں کیا فرمائیں گے آپ......؟''

''ساجد بڑا ہو گیا ہے نا کاکا......! اب ہمارے ساتھ تو نہیں سو سکتا۔''

''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔'' عبدالحق کے لہجے میں تلخی تھی۔

''دو فاضل بیڈ روم بھی ہیں یہاں۔ ساجد کو الگ کمرہ ملنا چاہئے تھا۔ آپ نے اپنے ساتھ بھی زیادتی کی اور ساجد کے ساتھ بھی۔''

زبیر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''انجانے میں غلطی ہو گئی کاکا......!''

''خیر...... اب میں خود اس معاملے کو دیکھوں گا۔ ساجد سے بھی بات کروں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''آپ یہ بتائیں کہ میرے پاس کیوں آ رہے تھے......؟''

زبیر نے میز پر گرا ہوا لفافہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

عبدالحق نے لفافے میں موجود چیزیں باہر نکالیں اور ان کا جائزہ لیا۔ ان میں چار پاس بکس تھیں۔ ایک چیک بک تھی، جس میں تمام کے تمام چیک موجود تھے۔ اس نے دیکھا، وہ اکاؤنٹ حق انٹرپرائزز کے نام سے تھا۔

''یہ کیا ہے زبیر بھائی......؟''

''آپ کے اکاؤنٹ فریز ہیں۔ مگر انشاء اللہ جلد ہی کھل جائیں گے۔'' زبیر نے کہا۔

''یہ آپ کی امانت تھی میرے پاس۔ میں نے سوچا، یہ اچھا موقع ہے کہ آپ کو سونپ دوں۔''

''مجھے کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں۔ مگر یہ تو فرم کا اکاؤنٹ ہے۔''

''بظاہر فرم کا اکاؤنٹ ہے کاکا......! لیکن درحقیقت یہ آپ کا ذاتی اکاؤنٹ ہے فرم کے نام سے۔ یہ میرے پاس آپ کی امانت تھی۔''

عبدالحق کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ اس نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''فرم کا اکاؤنٹ ذاتی کیسے ہو سکتا ہے زبیر بھائی......؟ فرم کے اکاؤنٹ میں تو کاروباری سرمایہ ہوتا ہے نا...... جس میں سے کاروبار کے لئے رقم نکالی جاتی ہے۔''

''فرم کا وہ اکاؤنٹ الگ ہے کاکا......!''

''تو یہ اکاؤنٹ کھولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی آپ کو......؟'' عبدالحق نے کہا۔

''میرے حصے کا منافع تو آپ میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتے ہیں۔''

''آپ کو شاید یاد نہیں کاکا......! میں نے آپ کو بتایا تھا۔ اس اکاؤنٹ میں آپ کا پورا منافع نہیں، میں صرف بیس فیصد جمع کراتا رہا ہوں۔''

عبدالحق کو یاد تھا، اور جب زبیر نے اسے یہ بات بتائی تھی تو ایک لمحے کو اسے حیرت ہوئی تھی۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ سرمائے اور محنت کی شراکت میں محنت کا حق ساٹھ فیصد اور سرمایہ لگانے والے کا منافع چالیس فیصد ہونا چاہئے۔ بہرحال زبیر نے اس کا منافع بیس فیصد مقرر کیا تو اس میں بھی اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ساری محنت بھی تو زبیر اکیلا کرتا ہے۔

''مجھے یاد ہے۔'' اس نے کہا۔

''اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں کہ یہ اکاؤنٹ کیسا ہے......؟''

''میں منافع کا پچھتر فیصد اس اکاؤنٹ میں جمع کراتا رہا ہوں۔''

''تو یہ ہمارا مشترکہ اکاؤنٹ ہوا......؟'' عبدالحق نے کہا۔

''آپ کا اور میرا مشترکہ اکاؤنٹ......!''

''نہیں کاکا......! یہ آپ کا ذاتی اکاؤنٹ ہے۔ میرا اکاؤنٹ الگ ہے۔''

عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

''یعنی آپ کا منافع صرف پانچ فیصد......؟''

''میرے لئے بہت ہے کاکا......! اتنا ہوتا ہے کہ خرچ نہیں کیا جاتا۔''

عبدالحق جھنجلا گیا۔

''اس پر بعد میں بات کریں گے۔'' اس کے لہجے میں برہمی تھی۔

''پہلے یہ بتائیں کہ اس اکاؤنٹ کی ضرورت کیوں پیش آئی آپ کو......؟''

''آپ ناراض نہ ہوں کا کا......!'' زبیر نے عاجزی سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ پیسے کو بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ اس لئے میں نے آپ کے پیسے کو اس اکاؤنٹ میں محفوظ کرنے کا سوچا۔ یہ جواب ہوا، یہ تو ذہن میں بھی نہیں تھا۔ مگر دیکھ لیں، اب یہ اکاؤنٹ کام آئے گا۔''

''فرم کا اکاؤنٹ ہے۔ ایک دستخط والا تو نہیں ہوگا۔''

''دو دستخط دیئے گئے ہیں۔ آپ کے اور میرے۔ لیکن ہم میں سے کسی ایک کے دستخط سے بھی رقم نکلوائی جا سکتی ہے۔''

''اور رقم اس سے اب تک نکلوائی ہی نہیں گئی......؟''

زبیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور میرے دستخط......؟''

''آپ سے ہی لئے تھے...... اسی دن...... جب منافع کی اس تقسیم کی بات ہوئی تھی۔'' زبیر نے جواب دیا اور پھر مسکرایا۔

''آپ ہمیشہ مجھے سمجھاتے تھے کہ عبارت پڑھے بغیر کبھی دستخط نہیں کرنے چاہئیں۔ پر آپ خود خیال نہیں رکھتے اس بات کا۔''

عبدالحق بھی اپنی مسکراہٹ روک نہ سکا۔

''میرا واسطہ آپ سے پڑتا ہے نا......'' اس نے کہا۔ پھر وہ سنجیدہ ہوگیا۔

''لیکن زبیر بھائی......! میں آپ سے خوش نہیں ہوں، بلکہ ناراض ہوں۔ آپ ساجد کی فکر نہیں کرتے۔ اس کے مستقبل کا نہیں سوچا آپ نے......؟''

''کیوں نہیں سوچا......؟ وہ بھی آپ کا خادم ہے۔ انشاء اللہ مجھ سے زیادہ اچھا ثابت ہوگا۔ چھوٹے صاحب کی امانت کو مجھ سے بہتر طور پر سنبھالے گا۔ اور کا کا......! میں تو اسے اپنے سے زیادہ آپ کا سمجھتا ہوں۔''

''وہ تو ہے۔ لیکن زبیر بھائی......! میں آپ سے بہت ناراض ہوں۔''

''آپ مجھ سے چھوٹے ہیں کا کا......! مجھ سے ناراض کیسے ہو سکتے

ہیں......؟'' زبیر نے بناوٹی غصے سے کہا۔

''یہ حق بڑا ہونے کے ناطے میرا تو ہے، آپ کا نہیں۔''

''آپ سچ مچ ایسا سمجھتے ہیں اور ثابت کرتے تو مجھے کبھی اتنی جرأت نہ ہوتی۔ میں اب بھی آپ سے ناراض ہوں۔''

''کا کا......! یہ تو میں ہی سمجھتا ہوں اور اللہ ہی جانتا ہے کہ آپ سے مجھے کتنا کچھ ملا ہے......؟ اللہ کا فضل اور آپ کی عنایت۔ اب ایک چیز دکھاتا ہوں آپ کو۔ شاید اسے دیکھ کر آپ کی ناراضی دور ہو جائے۔''

''کوشش کر لیں......!'' عبدالحق نے بے رُخی سے کہا۔

زبیر نے میز کی دراز کھولی اور براؤن رنگ کا ایک بڑا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ آپ مجھے اور ناراض کرنے والے ہیں۔''

''دیکھو تو لیں......!''

لفافہ میں موجود چیز کو دیکھ کر عبدالحق کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ میٹرک کا سرٹیفکیٹ تھا اور اس پر محمد زبیر ولد کبیر داس کا نام درج تھا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ زبیر نے دو سال پہلے میٹرک کیا ہے۔

عبدالحق تیزی سے اٹھا اور اس نے زبیر کو گرم جوشی سے لپٹا لیا۔

''سچ ہے زبیر بھائی......! آپ نے میری ناراضی دور کر دی۔ مجھے خوش کر دیا آپ نے۔'' اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ اس نے بہت نوازا ہے آپ کو۔''

زبیر کی آنکھیں بھر آئیں۔

عبدالحق نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ ''میرے لئے، ہمارے لئے آپ نے جو کچھ کیا ہے، میں اس کا صلہ نہیں دے سکتا آپ کو۔ اللہ ہی صلہ دینے والا ہے۔''

''نہیں کا کا......! یہ بات تو مجھے کہنی ہے۔''

زبیر نے کہا۔

''آپ نے مجھے اللہ سے ملایا۔ اس کا صلہ اللہ کے سوا کون دے سکتا

ہے......؟''

❁❁❁

عبدالحق کو دو دن کی ایک مصروفیت اور مل گئی۔ اس نے ایک گیسٹ روم کو بڑی طبیعت سے از سرِ نو آراستہ کیا۔ پھر اس شام کو وہ ساجد کا ہاتھ تھام کر اسے وہاں لے آیا۔

ساجد حیران تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے چاچا......؟''

عبدالحق نے چابی اس کی طرف بڑھائی۔

''بسم اللہ پڑھ کر یہ چابی لو اور دروازہ کھولو......!'' اس نے کہا۔

''ساجد نے چابی لی اور چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا۔

''اب بسم اللہ پڑھ کر کمرے میں داخل ہو جاؤ......!''

ساجد نے تعمیل کی۔ عبدالحق اس کے بعد کمرے میں داخل ہوا۔

''یہ اب تمہارا کمرہ ہے ساجد......!'' اس نے کہا۔

ساجد کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔ اس نے کئی بار کمرے کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، لیکن کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ شیلف دیکھ کر وہ اور حیران ہوا اور شیلف کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ چھوٹا سا شیلف تھا۔ اس میں اس کی تمام کتابیں موجود تھیں۔

''اپنی الماری کھول کر دیکھو......!'' عبدالحق نے کہا۔

ساجد نے بڑھ کر الماری کھولی۔ اندر اس کے کپڑے اور استعمال کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ یہ سب کچھ عبدالحق نے دن میں، اس کی غیر موجودگی میں زبیر کے کمرے سے یہاں منتقل کرا لیا تھا۔

ساجد کی حیرت اور خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ آنکھوں میں ایسی کیفیت تھی، جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

پھر وہ کھڑکی کے سامنے رکھی میز کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کھڑکی کھولی اور باہر لان کا جائزہ لینے لگا۔

''کیا بات ہے......؟ اچھا نہیں لگا تمہیں......؟'' عبدالحق نے کہا۔

ساجد نے پلٹ کر اسے یوں دیکھا، جیسے اب تک اس کی موجودگی سے بے خبر رہا ہو۔

''کچھ بولتے کیوں نہیں......؟''

ساجد کے ہونٹ لرزے، پھر وہ عبدالحق سے لپٹ گیا۔ اس کے جسم کی لرزش سے عبدالحق کو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔

''ارے...... یہ کیا بچپنا ہے......؟'' عبدالحق نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

ساجد خاموش تھا۔ مگر اس کا جسم اب بھی ہل رہا تھا۔

عبدالحق نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔

بالآخر ساجد اس سے علیحدہ ہوا۔ اس نے پُرتشکر نظروں سے عبدالحق کو دیکھا۔

''سوری چاچو......!'' اس کے لہجے میں محبت تھی۔

''سوری کیوں......؟''

''میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔''

اس کے اس ردِ عمل پر عبدالحق کو بھی حیرت تھی۔

''لیکن کیوں......؟''

''پہلے یہ بتائیں کہ اس سلسلے میں بابا نے تو آپ سے کچھ نہیں کہا......؟''

''ہرگز نہیں......! اتنے برسوں بعد میں واپس آیا تو مجھے اس کمی کا احساس ہوا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''بلکہ میں تو اس پر زبیر بھائی سے خفا ہوا۔ وہ کہاں مجھ سے کچھ کہنے والے ہیں......؟ یہ تو میری طرف سے تمہارے لئے تحفہ ہے میرے بیٹے......!''

''بہت بڑا تحفہ ہے چاچو......! یہ تو میرا خواب تھا۔ کتنی بار بابا سے کہا کہ مجھے اپنا الگ کمرہ چاہئے۔ انہوں نے ہر بار منع کر دیا۔''

''اب مجھے تم سے بھی ناراض ہونا پڑے گا۔''

''کیوں چاچا......؟''

''تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا...... ؟''

''بس چاچا......! کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ اور آپ اتنے دور تھے۔''

''دیکھو بیٹے......! زبیر بھائی تو میرے علاوہ کسی کے لئے کچھ سوچتے ہی نہیں۔ تمہارا خیال تو مجھے ہی رکھنا ہے۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ تم میرے لئے نورالحق سے کم نہیں۔ جو ضرورت ہو، مجھ سے کہا کرو۔ اپنے بابا سے نہیں......!''

''ٹھیک ہے چاچا......! اب اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

''تو چلو......! اس وعدے پر معاف کیا تمہیں......!''

''لیکن چاچو......! اس کمرے میں ایک کمی ہے۔''

''مجھے بتاؤ......! انشاءاللہ پوری ہو جائے گی، وہ بھی۔''

''یہاں نورالحق کی کمی ہے چاچو......!''

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''ابھی تو وہ چھوٹا ہے۔ جب تمہاری چاچی وقت آنے پر اس کا بستر الگ کرے گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ خود ہی یہاں چلا آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

''شکریہ چاچا......!''

عبدالحق نے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا۔

''چاچا کے ساتھ شکریے کا کوئی معاملہ نہیں ہوتا بیٹے......! اب تم اپنے کمرے کو دیکھو اور انجوائے کرو۔ کوئی کمی محسوس ہو تو مجھے بتا دینا۔''

اور عبدالحق کمرے سے نکل آیا۔

❁❁❁

عبدالحق کی دونوں محرومیاں اپنی جگہ تھیں۔ جنہیں وہ سزا بھی سمجھتا تھا اور آزمائش بھی۔

لیکن روزے کی برکت سے ایک آزمائش اتنی سخت نہیں رہی تھی۔ نفس کا غلبہ بہت بڑی حد تک دور ہو گیا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ خود کو بہت بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ خیالات کی یلغار اب ہر وقت کا معمول نہیں رہی تھی۔ بے شک نفس وقتاً فوقتاً، بالکل اچانک سر اٹھاتا۔ لیکن وہ اس طرف سے چوکنا تھا۔ اسے اس کو زیر کرنے میں

زیادہ دشواری نہیں ہوتی تھی۔

مگر کبھی کبھی یہ خیال اسے بے چین کر دیتا کہ ارجمند بلاوجہ، صرف اس کی وجہ سے آزمائش میں پڑ گئی ہے۔ انسان تو وہ بھی تھی، اور اس کے حقوق بھی تھے۔ وہ اس کی محبت میں اپنے حق سے دستبردار ہو گئی تھی۔ لیکن نفس کے تقاضے اسے بھی ستاتے تو ہوں گے۔ اس اعتبار سے وہ ایک ناکام شوہر ثابت ہوتا تھا۔

لیکن ارجمند سے اب اس پر بات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی حتمی بات کر چکی تھی۔

دوسری محرومی اس کے لئے بہت بڑی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ بیت اللہ شریف کی زیارت اس کے نصیب میں ہے ہی نہیں۔ مگر پھر وہ سوچتا، یہ اللہ کی باتیں ہیں، اللہ جانے...... ! اللہ کا حکم ہے کہ ہر صاحب استطاعت پر ایک بار حج کرنا فرض ہے۔ اب منظوری تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ لیکن ہر سال بڑی سچی تڑپ اور خلوص کے ساتھ کوشش کرنا تو اس پر فرض ہے۔ اگر کسی سال اس نے کوشش نہیں کی تو اسے لگتا تھا کہ وہ زندگی کے سب سے بڑے خسارے سے دوچار ہو جائے گا۔

کراچی میں دو بار اس نے عمرے کی کوشش بھی کی۔ لیکن نتیجہ اس کا بھی وہی نکلا۔ پھر اس نے سوچ لیا کہ انشاءاللہ...... رب کی منظوری ہوئی تو حج ہی کرے گا۔ پھر اس نے عمرے کے لئے کوشش نہیں کی۔

اب لاہور آئے ہوئے اسے کافی دن ہو گئے تھے۔ سب لوگ یوں سیٹل ہو گئے تھے، جیسے کوئی بڑی تبدیلی آئی ہی نہ ہو۔ نورالحق کو یہاں سکول میں داخلہ دلا دیا گیا تھا۔

لاہور آتے ہی عبدالحق نے سب سے پہلے مسعود صاحب سے ملاقات کی تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے بہت حیرت اور افسوس ہوا تھا۔ ریٹائر تو وہ بہت پہلے ہو چکے تھے۔ مگر عبدالحق نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ریٹائر ہوتے ہی بڑھاپا ان پر اس تیزی سے حملہ آور ہو گا۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔

''آپ تو بہت کمزور ہو گئے چچا جان......!'' عبدالحق نے تاسف سے کہا۔

مسعود صاحب ہنسنے لگے۔

''کمزوری نہیں بیٹے......! یہ ضعیفی ہے۔''

''عمر تو آپ کی ضعیفی کی نہیں ہے۔''

''عمر کی اہمیت نہیں۔ یہ سب تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اصل میں ساری زندگی مصروفیت میں گزری۔ اب ایک دم سے مصروفیت ختم ہوئی تو بے کاری کے احساس نے جیسے طاقت ہی ختم کر دی۔ بچوں کے بچے نہ ہوتے تو شاید زندگی کی رغبت ہی نہ رہتی۔''

''تو یہ ہے زندگی......!'' عبدالحق نے سوچا۔

''کیسے شروع ہوتی ہے...... ناطاقتی اور دوسروں کی محتاجی کے ساتھ۔ پھر اللہ آدمی کو جوانی اور طاقت عطا فرماتا ہے۔ آدمی ایسا ہوتا ہے کہ پہاڑ بھی ادھر سے اٹھا کر ادھر رکھ دے۔ اور پھر زوال شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ اپنی اسی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ اور ایک دن اسے احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ آسانی سے کرتا رہا ہے، اب دشواری سے بھی نہیں کر سکتا۔''

''تم میرے لئے افسردہ نہ ہو بیٹے......!'' مسعود صاحب نے اسے چونکا دیا۔

''مجھے تو بہت کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب موقع ملا تو میں نے جان لیا کہ زندگی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اب میں اس پر شکر ادا کرتا ہوں اور اللہ سے طویل زندگی مانگتا ہوں۔''

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ ان کے لہجے میں سچائی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے حج کی سعادت نصیب فرمائی۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

''وہاں جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا، اس نے زندگی ہی بدل دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے راہ دکھائی۔ مجھے احساس ہوا کہ اتنی عمر میں نے ضائع کر دی۔ بے مقصد زندگی گزارتا رہا اور سمجھتا رہا کہ اس میں مقصدیت ہے۔ اللہ کا شکر کہ اس نے میری اصلاح فرمائی۔''

عبدالحق کی حیرت اور بڑھ گئی۔ وہ دہری تبدیلی تھی۔ ظاہر کمزور ہوا تھا، مگر

باطن طاقتور ہوا تھا اور یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

''قرآن میں جو کچھ ہے، حق ہے۔'' مسعود صاحب کا لہجہ عقیدت میں بھیگا ہوا تھا۔

''اللہ نے ادائل عمری کے بارے میں جو فرمایا، حق ہے۔ آدمی اپنی پرانی حالت کو لوٹ جاتا ہے۔ لیکن مسلمان کے لئے بڑی عمر بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ اس کے لئے مہلت ہے، پچھلے برے اعمال پر توبہ استغفار اور ان کی تلافی کے لئے۔ اور اسے نیک اعمال کا موقع ملتا ہے۔ اللہ غفور الرحیم ہے۔ بندہ خلوص سے توبہ کرے تو زمین بھر گناہ معاف فرما دیتا ہے۔''

''بے شک......!'' عبدالحق نے کہا۔ پھر بھولا۔

''چچا جان......! آپ تو بہت بدل گئے......؟''

''خود کو بدلنا بندے کے بس کی بات نہیں۔ اللہ رحمت فرماتا ہے۔ اور جتنا میں بدلنا چاہتا ہوں، اتنا نہیں بدل سکا ہوں۔ ہاں...... اللہ سے دعا کرتا ہوں اس کے لئے۔''

''فکر نہ کریں چچا جان......! اللہ کی رحمت تو جاری و ساری ہے۔''

''بے شک......! بدنصیب وہی تو ہیں، جو اس کی رحمت پر ایمان نہیں رکھتے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

''دیکھو بیٹے......! تم پر اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ تمہیں اس نے ابتداء ہی میں اپنا راستہ دکھا دیا۔ اب میں ایک بات کہوں...... ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات......!''

''یہ کیسی شرمندہ کرنے والی بات آپ نے کر دی چچا جان......؟'' عبدالحق نے احتجاج کیا۔

''جو آپ جانتے ہیں، اس میں سے بہت کچھ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا، سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے۔''

''لیکن تم مجھ سے بہت زیادہ جانتے ہو، یہ مجھے علم ہے۔ اور میں تمہارے لئے اس میں اضافے کی دُعا کرتا ہوں۔''

''یہ تو آپ کا گمان ہے۔ اور چچا جان......! عمر کا ایڈوانٹیج اپنی جگہ......

زندگی کے تجربات بڑی چیز ہوتے ہیں۔''

''اس بات سے تو خیر میں اتفاق کروں گا۔''

''آپ مجھے کچھ بتا رہے تھے۔'' عبدالحق نے انہیں یاد دلایا۔

''ہاں......! میں بڑی عمر کے متعلق بتا رہا تھا۔'' مسعود صاحب نے کہا اور چند لمحے کچھ سوچتے رہے۔

''مگر پہلے مجھے ایک بات بتاؤ......! قرآن میں، اس کی آیات پر غور و فکر کرنا نقصان دہ تو نہیں......؟''

''یہ خیال کیوں آیا آپ کو......؟''

''دیکھو...... میں تو عمر ضائع کر کے بیٹھا ہوں۔ نہ عربی زبان سے واقف ہوں، نہ ہی عالم ہوں۔ کسی آیت سے غلط مطلب اخذ کر بیٹھا تو یہ تباہ کن ہو سکتا ہے۔''

''میں بھی آپ کی طرح قرآن کا طالب علم ہوں۔ مگر مجھے کبھی یہ ڈر نہیں لگا۔''

''مگر قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ اس سے وہ ہدایت بھی دیتا ہے اور گمراہ بھی کرتا ہے۔''

''یہ بھی تو بتا دیا کہ گمراہی صرف فاسقوں کے لئے ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میرے خیال میں ایمان اور اخلاص بہت کافی ہے ہدایت کے لئے۔ اگر آپ قرآن کو خلوص سے، اسے سمجھنے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے کے لئے پڑھتے ہیں تو اللہ آپ کی رہنمائی فرمائے گا۔ اور اگر کوئی اسے دوسروں کو مرعوب کرنے، اپنی علمیت بگھارنے اور آیات سے دوسروں کو نشانہ بنانے کے لئے پڑھے گا تو پھر اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ اللہ جانے اور وہ جانے......!''

مسعود صاحب نے جھرجھری سی لی۔

''اس کے باوجود کبھی میں غلط بھی سمجھ سکتا ہوں۔''

''خدانخواستہ ایسا ہوا تو اللہ اس کی اصلاح بھی فرما دے گا۔ بس ہم جیسے ناکام بندوں کو ایک احتیاط کرنی چاہئے۔ پہلے تو یہ سوچ خالص ہو کہ ہم اپنی بہتری اور فلاح اور رہنمائی کے لئے پڑھ رہے ہیں۔ پھر پڑھنے سے پہلے شیطان کے شر سے اللہ

کی پناہ مانگیں اور اللہ سے رہنمائی چاہیں۔''

''یہ تو میں کرتا ہوں، اور اس کے باوجود ڈرتا ہوں۔''

''اللہ ڈرنے والوں کو بے حد پسند فرماتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب بتائیں......! آپ کیا کہنے والے تھے......؟''

مسعود صاحب چند لمحے خاموش رہ کر جیسے اپنی سوچوں کو ترتیب دیتے رہے۔ پھر بولے۔

''بڑھاپے کا ایک بہت بڑا عنصر احساسِ زیاں ہوتا ہے۔ جب تک آدمی طاقت ور ہوتا ہے، متحرک رہتا ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ سوچنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ بھی بہت زیادہ نہیں سوچتے۔ اور جب بڑھاپا آتا اور ناطاقتی لاتا ہے، تب سوچتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں تو اپنی کوششیں، اپنی کامیابیاں اور جو کچھ کمایا، وہ ناکافی لگتا ہے۔ سوچتے ہیں، فلاں وقت میں یوں نہیں یوں کر لیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ سو احساسِ زیاں ان کا مستقل رفیق ہوتا ہے۔''

عبدالحق کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ سوچتا بھی کیسے کہ عمر کے اس حصے میں ابھی پہنچا ہی نہیں تھا۔ اسے احساس ہوا کہ مسعود صاحب اس کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کر رہے ہیں۔

''جنہیں اللہ بڑی عمر دیتا ہے اور ان پر بڑھاپا آتا ہے، ان میں کئی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بیشتر وہ ہوتے ہیں جن کا اللہ سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا ہوتا۔ اور جن کا رہا ہو، وہ برائے نام ہوتا ہے۔ یہ میں ان خوش نصیبوں کی بات نہیں کر رہا ہوں، جو شروع ہی سے اللہ سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان دنیادار لوگوں میں کچھ وہ ہوتے ہیں، جو دنیاوی اعتبار سے کامیاب رہے۔ جنہوں نے بہت مال کمایا۔ ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں، جو اپنی دولت کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ اس دولت سے ان کا ذاتی استفادہ کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سب کچھ میسر ہوتے ہوئے وہ اپنی مرضی کا ایک وقت کا پرتعیش کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی اولاد بھی ان سے محبت نہیں کرتی۔ سب صرف مال کے طلبگار ہیں ان سے۔ ان کا قرب حاصل کرنے کے لئے گھر میں سازشیں ہوتی

ہیں۔ ان کے بچے ان کی دولت کے لالچ میں ایک دوسرے سے بھی محبت نہیں کرتے، بلکہ باہمی رقابت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ گھر میں امن، سکون اور محبت نام کی کوئی چیز نہیں۔ انہیں اولاد سے جھوٹی محبت بھی صرف اس وقت ملتی ہے جب کسی کو ان سے کچھ لینا ہو۔ پھر انہیں احساس ہوتا ہے کہ بچے دولت کی خاطر ان کی موت کی آرزو کرتے ہیں۔ پھر ان کی موت کی دُعاؤں تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت ان کے کسی کام کی نہیں۔ یہ وہ ایسے ہی چھوڑ کر جائیں گے، اور ان کے بعد اس دولت کے لئے ان کی اولاد میں فساد ہوگا۔ وہ بہت بڑا احساسِ زیاں ہوتا ہے۔ اور وہ بہت مہیب تنہائی ہوتی ہے، جس سے صرف موت انہیں چھٹکارا دلا سکتی ہے۔''

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بہت بھیانک تصویر تھی۔

''اور کوئی اپنی دولت اپنی زندگی میں ہی اولاد میں تقسیم کر دے تو اگر وہ خوش نصیب نہ ہو تو اولاد اسے ایک کونے میں ڈال کر بھول جاتی ہے۔''

عبدالحق کو اپنے دہلی والے ماسٹر جی کانتی پرشاد یاد آ گئے۔ ان بیچارے کے پاس تو دولت بھی نہیں تھی۔ اور کیسا سخت آخری وقت انہوں نے گزارا تھا......؟ اور کتنا طویل......؟ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''......ورنہ وہ بیچارہ فقیر کے کاسے کی طرح گردش میں رہتا ہے۔ کبھی اس کے گھر تو کبھی اس کے گھر۔'' مسعود صاحب اس کی کیفیت سے بے خبر کہے جا رہے تھے۔

''چند روز سے زیادہ کوئی بھی اسے برداشت نہیں کرتا۔ کیسا احساسِ زیاں ہوتا ہوگا انہیں کہ انہوں نے کچھ بھی نہیں کمایا۔ اللہ، اللہ کے دیئے ہوئے محبت کے رشتے بھی گنوا دیئے۔ زندگی سے فطری محبت کے باوجود ایسے لوگ موت سے پہلے موت کا رستہ دیکھنے لگتے ہیں۔''

''آپ تو بہت ڈیپریس لگ رہے ہیں۔'' عبدالحق نے تاسف سے کہا۔

''نہیں بیٹے......! بالکل بھی نہیں......!'' مسعود صاحب نے بڑی محبت سے کہا۔

''مجھ پر تو اللہ نے عنایت کی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں تو

الحمدللہ......! عافیت اور سکون میں ہوں۔ میں تو اللہ سے نیک اعمال، ایمان اور نیک انجام کے ساتھ بہت طویل عمر کی دُعا کرتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے احساس ہے کہ میں نے بہت زیادہ وقت ضائع کیا۔ اس کی تلافی کے لئے مجھے جتنی مہلت مل جائے بہتر ہے۔''

''تو یہ ہے آپ کا احساسِ زیاں......؟''

''نہیں...... ہرگز نہیں......!'' مسعود صاحب نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''جب میں نے استغفار اور توبہ کے بارے میں پڑھا تو میرا دل سکون سے بھر گیا۔ آدمی توبہ کرے اور اللہ سے رجوع کر لے تو اس پر امن و عافیت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اصلاحِ عمل کر لے تو پچھلے اعمال بخش دیئے جائیں۔ اللہ سے تعلق جڑ جائے تو آدمی مایوس ہو ہی نہیں سکتا۔ تو بیٹے......! ہر احساسِ زیاں مٹ گیا۔ لیکن قرآن کی ایک آیت مبارکہ پڑھنے کے بعد زیاں کا ایسا احساس جاگا کہ مٹتا ہی نہیں۔ اسے پڑھ کر احساس ہوا کہ تیس سال کا وہ نقصان پورا ہونے والا نہیں۔''

عبدالحق اُلجھ گیا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں چچا جان......!''

''اللہ کی ہدایت اور رحمت کے لئے وقت اور عمر کی کوئی شرط نہیں ہے نا بیٹے......!''

''جی...... بے شک......!''

''لیکن جہاں اللہ نے خاص طور پر وقت اور عمر کا تعین کر کے کچھ عطا فرمایا ہو، تو وہ تو......''

''میں سمجھ گیا۔ آپ سورۂ احقاف کی پندرہویں آیت کی بات کر رہے ہیں، جس میں اللہ نے ایک بہت بڑی دُعا عطا فرمائی ہے۔''

''ہاں......! وہی، جس میں والدین سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا۔ پھر اللہ نے بچے کی پیدائش اور پرورش کے سلسلے میں ماں کی مشقت کا ذکر فرمایا۔ اب مجھے الفاظ تو یاد نہیں۔ البتہ دُعا میں نے یاد کر لی ہے۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی

وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ٥ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ٥"

"بے شک چچا جان......! یہ بہت بڑی دُعا ہے۔ اور اللہ کی بہت بڑی نعمت۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ صحیح یا غلط، بہر حال جیسے یہ آیت میری سمجھ میں آئی، وہ یہ ہے۔" اب مسعود صاحب کا لہجہ اعتماد سے محروم تھا۔

"ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی زندگی کے اہم ترین اسٹیج کے بارے میں بتایا۔" وہ رکے اور عبدالحق کی طرف مڑے۔

"اس دعا سے پہلے کے الفاظ تمہیں یاد ہیں......؟"

"جی......! اللہ نے فرمایا...... یہاں تک کہ وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہوگیا تو اس نے یہ دُعا کی۔"

"ہاں......! اب اس سے میری سمجھ میں یہ آیا کہ چالیس سال کی عمر ہر لحاظ سے آدمی کے شباب کا نکتہ عروج ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں یہ غلط تصور ہے کہ وہاں سے ادھیڑ عمری شروع ہوتی ہے۔ ہے نا......؟"

"جو بات اللہ خود بتا رہا ہے، اس میں کوئی شبہ تو نہیں ہو سکتا۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ یہ صرف ان لوگوں پر اپلائی ہوتا ہے، جنہوں نے زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق گزاری ہو۔ واللہ اعلم......!"

"ہاں......! میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ جو شخص نماز نہیں پڑھتا، وہ تو ویسے ہی جسمانی فٹنس سے دور ہوتا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ شراب بھی پیئے اور بدکاری بھی کرے تو صحت اور خراب ہوگی۔ تو میں نے سوچا کہ بات یوں ہے کہ ہر شخص 40 سال کی عمر میں اپنے طرزِ زندگی کے حساب سے اپنے نکتہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ سب کا الگ الگ ہوتا ہے...... انفرادی۔ کیونکہ اللہ نے اس میں تخصیص نہیں فرمائی۔ استثنیٰ نہیں رکھا۔"

"جی چچا جان......! میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔"

"پھر میری سمجھ میں یہ آیا کہ چالیس سال کی عمر کو پہنچنا اللہ کی طرف سے بہت بڑا انعام ہے۔ ورنہ کوئی جوانی میں، کوئی لڑکپن میں اور کوئی بچپن میں ہی مر جاتا ہے۔ اللہ نے خاص طور پر 40 سال کی عمر کا حوالہ دیا۔ مجھے لگا کہ یہ اپنے بندوں کے لئے اللہ کی طرف سے یاد دہانی ہے کہ تو نے اب تک عمر مجھ سے دوری میں گزاری ہے تو اب وقت آ گیا ہے کہ مجھ سے رجوع کر لے۔ میں نے تجھے جسم، عقل و شعور اور فہم، ہر اعتبار سے، تیری کوتاہیوں کو غفلتوں کے باوجود تیرے عروج پر پہنچا دیا ہے۔"

"ماشاءاللہ......!" عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

"اللہ نے آپ کو یہ فہم عطا فرمائی، یہ اس کا کرم ہے۔ واقعی، یہ یاد دہانی ہی ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے......!" مسعود صاحب کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"اور اس یاد دہانی کے ساتھ اللہ نے اسے ایک بہت بڑی نعمت عطا فرمائی۔ یہ دُعا کہ اے میرے رب، تو مجھے توفیق دے کہ میں شکر ادا کرتا رہوں۔ تیری ان نعمتوں کا جو تو نے عطا فرمائی ہیں مجھے اور میرے والدین کو۔ اور توفیق دے کہ کروں میں نیک عمل، جن سے تو راضی ہو۔ اور صالح بنا دے میری اولاد کو۔ میں توبہ کرتا ہوں تیرے حضور اور بلاشبہ میں ہوں فرمانبرداروں میں سے۔ یعنی نعمتوں پر شکر کی توفیق مانگنے کو کہا۔ اپنے لئے بھی اور والدین کے لئے بھی۔ شاید اس میں والدین کو شامل کرنے میں والدین کے ساتھ اس حسن سلوک کا حصہ ہے، جس کی آیت مبارکہ کے آغاز میں تلقین فرمائی ہے۔ یہ دعا میں شامل ہے، تو والدین کے زندہ نہ ہونے کی صورت میں بھی یہ ان کا حق اور اس حسن سلوک کا حصہ ہے۔"

عبدالحق حیران تھا۔ اللہ کیسے کیسے اپنے بندوں کی رہنمائی فرماتا ہے......؟ کہاں سے اٹھا کر کہاں لے آتا ہے......؟ وہ دل میں سبحان اللہ کہہ رہا تھا۔

"پھر اللہ نے اپنی رضا مانگنے کو کہا، جس کا ذریعہ نیک اعمال ہیں، اور ان کی توفیق اور ان کے لئے وسائل اور قوت بھی وہی عطا فرماتا ہے۔ پھر اولاد کے لئے دعا عطا فرمائی کہ وہ صالح عمل کریں گے تو ان کا اجر مرنے کے بعد بھی اسے پہنچے گا۔ اور پچھلے اعمال پر توبہ کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا اعلان...... یعنی بندگی اور عاجزی پر دعا کا

اختتام، جو دعا کی قبولیت کے لئے اکسیر ہے۔''

''سبحان اللہ چچا جان......! بلاشبہ اللہ نے آپ پر فضل عظیم فرمایا۔''

''اللہ کا کرم ہے بیٹے......!'' مسعود صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

''دوسروں کے بارے میں تو میں کہہ نہیں سکتا۔ البتہ اپنا تجربہ بتا سکتا ہوں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ سلسلہ چالیس سال کی عمر سے ہی شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت نے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اللہ ہر ہر طرح سے اپنے بندوں کو راہِ ہدایت کی طرف بلاتا ہے۔ اور توفیق سے شاید آدمی اس وقت تک محروم نہیں ہوتا، جب تک اس کے دل پر مہر نہ لگ جائے۔'' انہوں نے جھرجھری سی لی۔ لیکن چالیس سال کی عمر کی بہرحال اہمیت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چالیس سال کا ہوا تو میرے باطن میں ایک انقلاب نے کروٹ لی۔ میں نماز کی طرف راغب ہوا۔ وہ اللہ کا کرم تھا۔ وہ عرصہ تھا تحریک پاکستان کا۔ عجیب جوش اور ولولہ تھا۔ سو میں تسلسل سے استفادہ نہیں کر پایا۔ پھر پاکستان بنا تو ہم اس کی تعمیر اور بقا کی فکر میں لگ گئے۔ یہ کوئی عذر نہیں۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ پاکستان اللہ کے حکم سے بنا اور قائم رہنے کے لئے بنا، انشاء اللہ......! اس کی بقا اور اس کی تعمیر بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اب تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ میں نے وقت ضائع کیا، اپنا نقصان کیا۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے مجھے پھر موقع عطا فرمایا۔''

''آدمی سچے دل سے اللہ سے رجوع کر لے اور دین کو خالص کر کے نیک اعمال کرے اور اللہ کا فرمانبردار بن کر رہے تو اللہ چاہے تو اس کے ہر ضایع ہر نقصان کی تلافی کر دیتا ہے۔''

''بے شک......! اور یہ سب کچھ بھی اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ اس کی عطا ہوتی ہے۔''

''تو پھر احساسِ زیاں کیسا......؟''

مسعود صاحب نے گہری سانس لی۔

''جب میں نے یہ آیت مبارکہ پڑھی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ اللہ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ہے۔ اور یہ اللہ نے ہر مسلمان کو چالیس سال کی عمر میں عطا

فرمائی۔ میں نے سوچا، میں کتنا بدنصیب ہوں کہ میں تیس سال اس دعا سے محروم اور بے خبر رہا۔ صرف اس لئے کہ میں قرآن سے دور رہا۔ ہماری اجتماعی بدنصیبی ہے کہ ہم نے خیر و برکت کا ظاہری مظہر بنا کر قرآن کو طاق میں سجا دیا، بڑے احترام سے الماری میں سب سے اوپر رکھ دیا۔ کبھی پڑھا تو یہ سمجھے بغیر پڑھا کہ کس آیت میں کیا کہا جا رہا ہے......؟''

''جی چچا جان......! یہ ہمارا بہت بڑا المیہ ہے۔''

''یہ محرومی میرا احساسِ زیاں ہے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

''اب تو آپ نے اس دعا کو اپنا معمول بنا لیا نا......؟'' عبدالحق نے ان سے پوچھا۔

مسعود صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو آپ کو زیاں سے نجات مل گئی۔ پھر احساسِ زیاں کیسا......؟''

''کم تو ہوا، لیکن ختم نہیں ہوا۔'' مسعود صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اللہ کی عنایت کہ جب میں نے اس آیت مبارکہ کو پڑھا اور سمجھا، اس وقت میرا بیٹا چالیس سال کا ہونے ہی والا تھا۔ میں نے اسے نہایت تاکید کے ساتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور الحمدللہ......! وہ ہر روز اللہ سے یہ دُعا کرتا ہے۔''

''نُورٌ عَلٰی نُورٌ...... یہ تو گویا آپ کے لئے جاری ہو گئی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''مگر میری سمجھ میں آپ کا احساسِ زیاں اب بھی نہیں آیا۔''

''اب میں یہ سوچ کر کڑھتا ہوں کہ نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے، جو دنیا سے رخصت ہو جاتے ہوں گے اور اس آیت مبارکہ کا، اس خوش خبری کا انہیں علم ہی نہیں ہوتا ہوگا۔ اور یہ سوچتا ہوں کہ کتنی بڑی تعداد میں لوگ ہوں گے، جو اس آیت سے، اس دعا سے بے خبر ہوں گے۔ ان کی محرومی پر مجھے احساسِ زیاں ہوتا ہے۔''

''آپ خوش نصیب ہیں چچا جان......! یہ تو اہل ایمان کی نشانی ہے کہ انہیں کچھ اچھا مل جائے تو وہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے تمام دینی بھائیوں کو بھی مل جائے۔ اور اس کے برعکس ہو تو وہ کڑھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر حیران ہوتے تھے کہ قرآنِ پاک کی تین آیات، واضح خوش خبریوں اور نہایت شدید تنبیہات کے

باوجود لوگ شرک اور کفر پر کیوں ڈٹے ہوئے ہیں......؟ آپ اس پر اپنی جان گھلاتے تھے کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے......؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی تو اس میں تھی کہ روئے زمین پر موجود تمام لوگ ایمان لے آئیں اور ان کی نسلیں بھی قیامت تک ایمان پر رہیں۔ اسی لئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ اللعالمین ہیں۔ آپ کا جذبہ تھا بھلائی، بلاتفریق سب کے لئے۔''

''میرا جی چاہتا ہے بیٹے......! کہ یہ آیت، یہ دعا تمام مسلمانوں تک پہنچ جائے۔''

''تو پہنچاتے رہیئے......!''

''دیکھو...... میں کوئی عالم تو نہیں۔ قرآن کے معاملے میں میں ایسا کوئی حق بھی نہیں رکھتا۔ چنانچہ میں نے مسجد کے امام صاحب سے اس سلسلے میں بات کی۔ انہوں نے بڑی توجہ سے سنی اور وعدہ کیا کہ جمعہ کے دن وہ منبر پر اس حوالے سے وعظ دیں گے۔ مگر وہ جمعہ اب تک نہیں آیا۔ نہ جانے کیوں......؟''

''تو آپ کا ان سے کہنا تو اللہ کے ہاں قبول اور شمار ہوگا انشاء اللہ......!''

''مگر عملاً تو کچھ نہیں ہوا۔ کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔''

''آپ زبانی طور پر، جس سے ملیں، اسے بتا دیا کریں۔''

''میں تو ضائع کئے ہوئے برسوں کی تلافی کی کوشش میں لگا ہوں۔ گوشہ نشیں ہوں۔ پھر صاحب علم نہیں تو میری بات میں تاثیر کہاں......؟''

''علم بھی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔''

''مگر جس نے تحصیل علم کے لئے کوشش اور عمل کیا ہو۔''

''بے شک......! اور تاثیر بھی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے...... اور آدمی کے اندر کے اخلاف اور سچائی کی نسبت اور اللہ کے کرم سے ملتی ہے۔''

''ایک بات بتاؤ......!'' مسعود صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم چالیس سال کے ہوگئے......؟''

''جی...... الحمدللہ......!'' عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور اللہ کے فضل سے اسی دن سے یہ دُعا میرا معمول بن گئی۔''

''یہ دعا واقعی اتنی اہم ہے، جتنا مجھے لگا......؟''

عبدالحق نے گہری سانس لی۔

''دیکھئے چچا جان......! میں کوئی عالم قرآن نہیں ہوں۔ بس میرا ایمان ہے کہ قرآن سے ہدایت اور رہنمائی اللہ ہی عطا فرماتا ہے۔ یہی سوچ کر، اللہ سے لو لگا کر قرآن پڑھتا ہوں۔ اور جو سمجھ میں آئے، سمجھتا ہوں کہ وہ میرے لئے ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ مجھے وہ دوسروں کو پڑھانے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے میں اس بارے میں کوئی حتمی رائے دینے کا خود کو اہل نہیں سمجھتا۔ آپ سے بات کرنا البتہ مختلف معاملہ ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ آدمی کو فطری طور پر بعض سورتوں اور بعض آیات سے خصوصی نسبت ہوتی ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن صرف آپ سے بات کرنے کی حد تک یہ کہوں گا کہ میرے خیال میں میری نظر سے کوئی ایسی آیت نہیں گزری، جو اس لحاظ سے اس آیت سے مشابہ ہو کہ اس میں عمر کے کسی خاص حصے، کسی خاص برس کی شرط عائد کی گئی ہو، اور وہ تمام لوگوں کے لئے بھی ہو، جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں چالیس سال کی عمر کی بات کی گئی ہے۔ دوسری بات اس سے اگلی آیتِ مبشرہ کے بارے میں ہے۔ قرآن میں اللہ نے کئی جگہ فرمایا کہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ یہ بات زور دے کر کہی گئی۔ حالانکہ کوئی مسلمان یہ سوچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مگر یہ دوسری آیت مجھے اس لحاظ سے منفرد لگتی ہے کہ اس میں اللہ نے زور دے کر فرمایا۔

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِيْ أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ O وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ O

''یہ وہ لوگ ہیں کہ قبول فرمالیتے ہیں ہم ان کے وہ اچھے اعمال جو انہوں نے کئے اور درگزر کرتے ہیں ان کی برائیوں سے۔ شامل ہوں گے یہ اہل جنت میں۔ یہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جارہا ہے۔''

تو یہاں فرمایا، یہ سچا وعدہ ہے۔ کم از کم میری نظر سے ایسی کوئی اور

آیت نہیں گزری۔ واللہ اعلم۔ اب یہ تو علمائے قرآن ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ دونوں آیات منفرد ہیں یا نہیں۔ یہ البتہ میری سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بہت بڑی اور حتمی خوش خبری ہے، جو پچھلی آیت میں اللہ کی عطا کی ہوئی دعا کے کرنے والے کو دی گئی ہے۔ فرمایا ہے کہ شامل ہوں گے یہ اہل جنت میں۔ یہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جارہا ہے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ یہ آیت، یہ دعا ہر اس شخص تک پہنچ جائے، جو چالیس سال کا ہو چکا ہو یا ہونے والا ہو۔ اس طرح تو شاید میرا احساسِ زیاں ختم ہو جائے۔''

''تو پہنچا دیجئے......! پہنچا سکتے ہیں آپ......!''

''کیسے......؟'' مسعود صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اس سلسلے میں جو کچھ آپ کے ذہن میں ہے، سب لکھ دیجئے......! میں اسے کتابچے کی شکل میں چھپوا دوں گا۔ آخر میں یہ لکھ دیا جائے گا پڑھنے والوں کے لئے کہ اس خوش خبری کو دوسرے مسلمان بھائیوں تک پہنچا دیں تو انشاء اللہ......! اللہ انہیں اجر عطا فرمائے گا۔ پھر اس کتابچے کو تقسیم کروا دیں گے۔''

مسعود صاحب خوش ہو گئے۔

''ایسا ہو سکتا ہے......؟''

''ایسا ہوتا ہے چچا جان......!'' عبدالحق نے کہا۔

''اللہ کی منظوری ہو تو ایسی نیکی خوب پھلتی پھولتی ہے۔ دوسرے لوگ اس کتابچے کو اپنے طور پر چھپوا کر تقسیم کرتے رہیں گے۔ پھر ایسے پبلشرز بھی ہیں جو ایسے کارِ خیر میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یوں یہ ثوابِ جاریہ بن جاتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔'' مسعود صاحب مسکرائے۔ لیکن اگلے ہی لمحے بجھ سے گئے۔

''لیکن بیٹے......! میں کوئی عالم تو نہیں کہ مجھے یہ سب کچھ لکھنے کا حق ہو......؟''

''کمال کرتے ہیں آپ......!'' عبدالحق نے کہا۔

''میں اور آپ آیات کی تفسیر نہیں کر سکتے۔ لیکن جو کھلی آیات ہیں، صاف

اور واضح، ان کو ذرا تفصیل سے بیان کر سکتے ہیں۔ بلکہ مسلمان اللہ کی طرف سے جو اچھی بات سمجھے، اسے دوسروں تک پہنچانا اس کا فرض ہوتا ہے۔ مثلاً اس آیت مبارک کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ میرے اور آپ کے لئے اتنا کہہ دینا یا لکھ دینا ہی کافی ہے۔ حسن سلوک کی تفصیل ہم اس وقت تک بیان نہیں کر سکتے، جب تک قرآن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تمام آیات جمع نہ کر لیں۔ آگے اللہ نے ماں کی اولاد کے لئے مشقت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وہ بھی ویسے ہی بیان کر دیا۔ پھر چالیس سال کی عمر میں دعا کی بات آتی ہے۔ تو یہ طے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے 40 سال کی عمر کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس کی اہمیت پر غور کرنا اور سمجھنے کی کوشش کرنا سب پر فرض ہے۔ اور رہا دعا کا معاملہ تو اس کا ایک حصہ غیر عملی ہے، یعنی بندہ اللہ سے اپنے اور اپنے والدین کی طرف سے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں پر شکر کی، اور اللہ کو راضی کرنے والے نیک اعمال کی توفیق مانگیں۔ اور دعا کا دوسرا حصہ عملی ہے۔ اس نے اپنی اولاد کی اصلاح کے لئے دعا کی تو اس کے لئے اسے خود عملی کوشش بھی کرنی ہوگی۔ ان کو دین کی طرف راغب کرنا، نماز اور روزے کی تلقین کرنا، ان تک اللہ کے احکامات پہنچانا اور ان کی اچھی تربیت کرنا۔ پھر دُعا کے آخر میں اپنے سابقہ برے اعمال پر توبہ کرنا اور عاجزی کے ساتھ اللہ سے مدد چاہتے ہوئے یہ کہنا کہ اے اللہ......! میں تیرا فرمانبردار ہوں۔ اب بندہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ لیکن اسے عملاً اللہ کے احکامات پر عمل کرنا چاہئے بساط بھر، تبھی وہ یہ بات کہنے کا حق رکھتا ہے۔ اب یہ سب کچھ لکھنے میں کوئی خرابی، کوئی نقصان نہیں۔ آپ دوسروں تک ایک بھلی بات پہنچا رہے ہیں۔ جب بندہ اس دُعا کے ساتھ عمل بھی کرے گا تو اگلی آیت میں خوشخبری ہے، اور اللہ کا سچا وعدہ ہے۔''

''یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ تم نے بہت اچھی طرح سمجھایا ہے مجھے۔''

عبدالحق کو ایک خیال نے چونکا دیا۔

''ایک بات بتائیں چچا جان......! آپ دُعا کے ساتھ اس کے بعد والی آیت تو نہیں پڑھتے۔''

''پڑھتا ہوں......!'' مسعود صاحب نے جواب دیا۔

"چھوڑ دیں...... ہمارے لئے صرف دعا ہے۔ اللہ کو وعدہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں تو یہ گستاخی ہوگی۔"

مسعود صاحب جھرجھری سی لے کر رہ گئے۔

"واقعی......! ٹھیک کہا تم نے...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"بس......! آپ یہ لکھ کر مجھے دے دیجئے گا۔"

مسعود صاحب جھجکنے لگے۔

"میری بات سنو......! یہ کام تم ہی کر لو نا......!"

"آپ کی نیکی ہے، یہ اللہ کی عطا سے، اور آپ ہی کا اجر ہے۔ شائع کرا کے میں بھی حصہ دار بن جاؤں گا۔ جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا، اس سے آپ کا گریز ناشکرا پن ہوگا۔"

"ٹھیک ہے......! میں لکھ دوں گا۔ لیکن تم تصحیح کر دینا اس کی۔"

"جی بہت بہتر......!" عبدالحق نے کہا۔

"آپ مجھے بڑی عمر کے نعمت ہونے کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"ہاں......! نماز کے لئے مسجد جانے لگا تو وہاں بہت کچھ دیکھا اور سمجھا۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"الحمدللہ......! وہاں ہر عمر کے لوگ ہوتے ہیں، بچے بھی، جوان بھی اور ادھیڑ عمر بھی۔ لیکن بوڑھے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ ان میں بھی کئی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک بزرگ ہیں، جن کی عمر 90 سے متجاوز ہے۔ دبلے پتلے، کمر بالکل سیدھی۔ ضعیف ہیں، لیکن ہر طرح سے چاق و چوبند ہیں، کبھی بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا انہیں۔ وجہ نماز پڑھنے کی عمر سے نماز کے پابند ہیں۔ کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی۔ کچھ بوڑھے لوگ ایسے ہیں، جن کے گھٹنوں میں تکلیف ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ نماز کے لئے مسجد آنا ان کے لئے بہت بڑی مشقت ہے۔ لیکن الحمدللہ......! پانچوں نمازوں کے لئے مسجد آتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، ان کے لئے کتنا اجر ہوگا اللہ کے ہاں۔ میں نے ایک بات سمجھ لی۔ نماز کا اجر اور روحانی فوائد اپنی جگہ، لیکن نماز پڑھنے والوں کو جسمانی فٹنس کی نعمت بھی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے ان لوگوں پر

ترس آتا ہے، جو دنیا کے تمام کاموں سے نمٹ چکے، لیکن اب بھی دنیا ان سے چمٹی ہوئی ہے اور وہ دنیا سے۔ اور دنیا بھر کی، اپنے بچوں کی بے رخی اور ناقدری سہتے ہیں۔ بھیانک تنہائی کا شکار ہیں۔ جبکہ تنہائی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے اللہ کی قربت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس کے در تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے کہ میری غفلت، کوتاہی اور گناہوں کے باوجود اس نے مجھے اپنا راستہ دکھایا۔"

"جی چچا جان......! بے شک......! یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے۔"

اس کے بعد مسعود صاحب نے وہ سب کچھ لکھا بھی، اور عبدالحق نے کتابچہ چھپوایا بھی اور وہ تقسیم بھی ہوا۔ اس روز مسعود صاحب کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

عبدالحق کو پتا چلا کہ مسعود صاحب زندگی خاص معمولات کے تحت گزار رہے ہیں۔ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو وہ بہت خوشی سے وقت دیتے، بیٹے سے رات کے کھانے پر ملاقات ہوتی۔ ان کی خواب گاہ میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ اور وہ خواب گاہ نہیں، درحقیقت ان کا عبادت کا کمرہ تھا۔

اسے اس بات کا پتا یوں چلا کہ انہوں نے صرف اس کے لئے رعایت دی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کا اسے علم نہیں تھا۔

ایک دن وہ گیا تو چچی جان نے کہا۔ "تم بیٹھو بیٹے......! میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔"

عبدالحق نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"چچا جان کہاں ہیں......؟" یہ غیر معمولی بات تھی کہ مسعود صاحب نظر نہیں آ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نماز کے علاوہ گھر سے کہیں جاتے ہی نہیں ہیں۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔"

"تو میں چلتا ہوں، پھر آ جاؤں گا۔" عبدالحق اٹھنے لگا۔

"ارے نہیں......! انہیں پتا چلا تو ہماری تو شامت ہی آ جائے گی۔" سلطانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

عبدالحق کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ وہ مستفسرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھتا

رہا۔

''ایک تمہیں ہی تو مستثنیٰ کر رکھا ہے انہوں نے۔'' سلطانہ بیگم نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں چچی جان......!''

''ان کے کمرے میں ہم میں سے کوئی نہیں جا سکتا۔ بہت ضروری ہو تو ہم دروازے پر بس ایک دستک دے کر پلٹ آتے ہیں۔ وہ خود باہر آ کر پوچھ لیتے ہیں کہ کیا بات ہے......؟ نماز پڑھ رہے ہوں تو سلام پھیرنے کے بعد آ جاتے ہیں۔ لیکن تمہارے لاہور واپس آنے کے بعد سے انہوں نے کہہ دیا ہے کہ تم آؤ تو تمہیں ان کے کمرے میں بھیج دیا جائے۔''

عبدالحق کو شرمندگی ہونے لگی۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

''میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت تو نہیں چچی جان......!''

''ارے واہ......! ہمارا کوئی حق نہیں تم پر......؟''

وہ چلی گئیں اور عبدالحق بیٹھا اس کمرے کے بارے میں سوچتا رہا۔ کمرہ کیا، وہ تو ایک بہت بڑے باطنی انقلاب کا مظہر تھا۔

چچی جان کی چائے کے ساتھ ہمیشہ اور بھی کچھ ہوتا تھا۔ اس روز بسکٹ بھی تھے اور سوجی کا حلوہ بھی۔ اور وہ اصرار کر کے کھلاتی تھیں۔ درمیان میں وہ سب لوگوں کی خیریت پوچھتی رہیں۔ آپا کیسی ہیں......؟ ارجمند کا کیا حال ہے......؟ نورالحق کا دل لگ گیا یہاں......؟ وغیرہ وغیرہ...... ویسے دونوں گھرانوں کا آپس میں ملنا جلنا رہتا تھا۔

اس نے چائے ختم کی تو سلطانہ بیگم نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ......!''

وہ ان کے ساتھ چل دیا۔

''تمہیں دستک دینے کی ضرورت بھی نہیں۔ دروازہ کھولو اور اندر چلے جاؤ......! یہ انہوں نے تاکید سے کہا ہے...... بار بار......''

عبدالحق کا ذہن الجھنے لگا۔

''لیکن کیوں......؟''

سلطانہ بیگم مسکرائیں۔

''انہوں نے بتایا تو نہیں...... لیکن میں سمجھ سکتی ہوں۔ بہت ہی ضروری ہو تو ہم دستک دیتے ہیں۔ لیکن اس میں بہرحال انہیں فرق پڑتا ہے۔ ان کی یکسوئی میں خلل پڑتا ہے۔ لیکن دروازہ کھلے گا تو وہ جان لیں گے کہ یہ تم ہو۔ وہ اپنی مصروفیت مکمل ارتکاز کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے۔''

عبدالحق نے دل میں ان کی سمجھداری پر داد دی۔ اتنے برسوں کے ساتھ کے بعد اللہ کی رحمت سے میاں بیوی ایک دوسرے کو ایسے سمجھنے لگتے ہیں کہ لفظوں کی، کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

سلطانہ بیگم نے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور خود واپسی کے لئے پلٹ گئیں۔

دروازے پر پہنچ کر عبدالحق کا ہاتھ بے ساختہ دستک کے لئے بڑھا۔ عمر بھر کی عادت تھی، بند دروازہ دستک کے بغیر اس نے کھولا ہی نہیں تھا کہ یہ آداب کے منافی ہے۔ لیکن مسعود صاحب کا اصرار اور سلطانہ بیگم کی وضاحت یاد آئی تو اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ وضاحت اس کے دل کو بھی لگی تھی۔

عبدالحق نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

سب سے پہلے اس کی نظر مسعود صاحب پر پڑی۔ جو نماز پڑھ رہے تھے۔ اسے بہت شدت سے مخل ہونے کا احساس ہوا۔ جی چاہا کہ واپس لوٹ جائے۔ لیکن مسعود صاحب نے اسے خود اعزاز عطا کیا تھا، وہ اس سے منہ کیسے پھیرتا......؟ اور یہ خدشہ الگ تھا کہ اس کا واپس جانا ان کے ارتکاز میں خلل ڈالے گا۔

اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس سے زیادہ سادہ کمرہ اس نے زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ پورے کمرے میں قالین بچھا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک گدا بچھا تھا۔ سرہانے ایک تکیہ تھا اور پیروں کی طرف ایک رضائی اور ایک چادر سلیقے سے تہہ کی ہوئی رکھی تھی۔ سرہانے کی طرف جو دیوار تھی، اس کے ساتھ ایک شیلف لگا تھا۔ ایک سرسری نظر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ اس میں صرف دینی کتب ہیں۔ دوسری دو دیواروں

کے ساتھ دو دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔

وہ دو گاؤ تکیوں کے درمیان، ان سے ذرا ہٹ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور مسعود صاحب کو دیکھنے لگا۔

انہیں نماز پڑھتے دیکھ کر اسے رشک آنے لگا۔ وہ اسی طرح کھڑے تھے، جیسے کوئی بے جان چیز۔ جسم میں کہیں جنبش نہیں تھی۔ بس سانسوں کا ہلکا سا تموج بہت غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا۔ ان کے جسم کا ہر ہر عنصر پرسکون اور ساکت تھا۔

چند منٹ وہ بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اسے خالی پن کا احساس ستانے لگا۔ وہ اٹھ کر شیلف کی طرف جا کھڑا ہوا اور کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں قرآنِ پاک کے کئی نسخے تھے۔ مختلف علمائے کرام کے ترجموں کے ساتھ۔ پھر تفاسیر تھیں۔ اس کے علاوہ تاریخ ابن خلدون اور تفسیر ابن کثیر کی تمام جلدیں تھیں۔ سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً ہر قابل ذکر کتاب وہاں موجود تھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ایک چھوٹی سی، لیکن ہر اعتبار سے مکمل لائبریری تھی...... دینی لائبریری۔

عبدالحق ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ باوضو تھا۔ اس کا جی چاہا کہ کوئی کتاب نکالے اور پڑھنے لگے۔ لیکن بغیر اجازت کے اس طرح کی جسارت اس کی فطرت میں نہیں تھی۔

وہ پھر اسی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسعود صاحب کو دیکھتا رہا۔ اور ہر لمحے اس کا رشک بڑھتا گیا۔

''اللہ نے چچا جان کو کیسی خوب صورت نماز عطا فرمائی ہے۔'' اس نے سوچا۔

''رکوع، سجدہ، قعدہ...... ہر رکن کیسا خوب صورت ہے۔ اور پھر جسم کا سکوت باطنی سکون اور یکسوئی کا مظہر ہے۔''

''بے شک...... ! اللہ جب چاہے، کسی کو کچھ بھی عطا فرما دے۔ وہی تو جانتا ہے کہ کون کس قابل ہے......؟'' اسے مولوی مہر علی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی۔

''ظاہری نماز کی پہچان نماز کے دوران جسم کا ساکت ہونا اور نمازی کا

پرسکون ہونا ہے۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''نماز اور اضطراب کا کوئی میل نہیں۔ نماز کے دورن جسم کی بے چینی اچھی نہیں ہوتی۔ اور رہا اندر کا حال تو وہ تو نمازی بھی نہیں جانتا۔ وہ تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔''

اور مسعود صاحب کی نماز مولوی مہر علی کی بیان کی ہوئی تعریف کے عین مطابق تھی۔

مسعود صاحب نے سلام پھیرنے کے بعد اس کی طرف دیکھا بھی نہیں، اور دوبارہ نیت باندھ لی۔

عبدالحق کے لئے خالی بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ذکر میں مصروف ہو گیا۔

اس بار مسعود صاحب نے سلام پھیرنے کے بعد دعا کی اور پھر اس کی طرف رُخ کیا۔

''السلام علیکم بیٹے...... !''

''وعلیکم السلام چچا جان...... !'' عبدالحق نے کہا۔ پھر بولا۔

''مجھے شرمندگی ہے کہ میں مخل ہوا۔''

''کیسی بات کرتے ہو......؟ تمہارے لئے تو میں نے خاص طور پر کہہ رکھا ہے۔ میرے نزدیک تو تمہارے آنے سے میرے کمرے کی شان بڑھی۔''

''آپ اور شرمندہ کر رہے ہیں مجھے...... !''

''دل کی بات بتا رہا ہوں۔''

''مجھے تو یہ خلوت میں مخل ہونا لگا۔''

''خلوت کیسی یہاں......؟ یہ تو تنہائی ہے۔ بس...... ایک حضوری کے احساس کی جستجو کرتا ہوں۔ اللہ نواز دے تو بہت بڑی دولت ہے۔ اس کے لئے بھی دعا کرتا ہوں۔''

''اللہ بہت نوازنے والا ہے۔ آپ کو اندازہ بھی نہیں کہ اللہ نے آپ کو کتنا نوازا ہے......؟''

''اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے بیٹے......؟'' مسعود صاحب کے لہجے میں

چیلنج تھا۔

''خود زندگی ہی بہت بڑی عطا ہے۔ اور وہ تو پیدائش سے پہلے سے ہی نوازنا شروع کر دیتا ہے بندے کو۔''

''جی...... بے شک......!''

''تم جسے خلوت سمجھ رہے ہو، یہ تو ایک گوشۂ تنہائی آباد کیا ہے میں نے...... صرف حضوری کے ایک لمحے کی آرزو کے لئے۔ اور المیہ یہ ہے کہ شیطان یہاں گھس آتا ہے۔''

''شیطان کو تو اللہ نے مہلت بھی دی ہے اور رسائی بھی۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم......! اور شیطان کے حربے بھی بے شمار ہیں۔ آدمی کس کس سے بچے......؟ اور سچ تو یہ ہے کہ آدمی تو بچ ہی نہیں سکتا۔ بس...... جسے اللہ بچالے، وہی خوش نصیب۔ میرے لئے تو میرا یہ کمرہ ہی آزمائش بن گیا ہے۔ جب اللہ نے مجھ پر کرم فرمایا اور مجھے راستہ دکھایا تو میرے ذہن میں اس کمرے کا خاکہ سا ابھرا۔ وجہ یہ تھی کہ میں دنیادار تھا اور ہوں۔ مجھے اپنے بچوں سے اور بچوں کے بچوں سے بہت محبت ہے۔ بچے بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ دن بھر وہ مجھ میں ہی گھسے رہتے۔ رضوانہ اور شاہانہ کے بچے آجاتے تو اور رونق ہو جاتی۔ اوّل تو میرے معمولات میں خلل پڑتا۔ اور یکسوئی تو بالکل ہی نہ ہوتی۔ پھر میں نے قرآن میں یکسوئی کی اہمیت کے بارے میں پڑھا تو میں نے اس کمرے کے بارے میں فیصلہ کر لیا۔ مگر یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ اس پر عملدرآمد کے لئے سختی کی ضرورت تھی۔ اور سختی بھی بچوں کے ساتھ۔ جیسے تیسے بچوں کو پیار سے سمجھا بجھا کر رضامند کیا۔ ان کے لئے ایک وقت مقرر کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے یہ سب آسان کر دیا۔ بچوں کی تو بات چھوڑو، خود میرے لئے بھی یہ آسان نہیں تھا۔ مجھے تو خود بچوں کی قربت اچھی لگتی تھی۔ بہرحال اللہ نے کرم فرمایا۔''

''اور جب یہ کمرہ مجھے مل گیا اور میں اس میں خوش اور مطمئن وقت گزارنے لگا تو ایک دن میرے اندر کسی نے کہا۔ کیسی زبردست ریاکاری کر رہا ہے تو......؟ گھر کے لوگ تو تجھے ولی اللہ سمجھنے لگے ہوں گے......؟ میں دہل گیا۔ بے شک...... آدمی تو

خود کو بھی نہیں جانتا۔ میں پوری سچائی کے ساتھ، وثوق کے ساتھ اس کی تردید نہیں کر سکتا تھا۔ اور جانتا تھا کہ ریاکاری اللہ کو بہت ناپسند ہے۔''

''آپ کو راہ سے ہٹانے کے لئے شیطان کا دل میں ڈالا ہوا وسوسہ......؟'' عبدالحق نے تبصرہ کیا۔

''دل میں آنے والا کون سا خیال اللہ کی طرف سے تنبیہ، بشارت یا ہدایت ہے اور کون سا شیطانی وسوسہ......؟ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مجھ جیسے عام آدمی کے لئے کہاں ممکن ہے......؟'' مسعود صاحب نے بے بسی سے کہا۔

''بہرحال میں کشمکش میں پڑا رہا۔ میں نے سوچا کہ اب اتنی مشکل سے بچوں کو سمجھایا، راضی کیا ہے۔ پھر سے پرانی صورتِ حال میں جانے کے بعد دوبارہ اس مقام پر آنا اور مشکل ہوگا۔ کچھ یہ کہ میرا دل بھی لگنے لگا تھا۔ میں نے اللہ سے رہنمائی کی دعا کی اور بار بار ابھرنے والے اس خیال کے جواب میں استغفار کرتا رہا۔''

''یہ تو بلاشبہ اللہ کی طرف سے رہنمائی تھی۔''

''الحمدللہ......! مگر مجھے اس پر ایسا یقین نہیں تھا۔ ایک خلش مجھے ستاتی رہتی تھی۔ اس کے نتیجے میں یکسوئی اور ارتکاز تو خواب بن کر رہ گیا۔ مگر میں ڈٹا رہا۔ پھر بتدریج یکسوئی حاصل ہونے لگی۔'' مسعود صاحب نے ایک گہری سانس لی، کچھ دیر سوچتے رہے، پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

''اس کے بعد اچانک ایک دن ضمیر پر ایک بوجھ سا آ گیا۔ یہ خیال کہ بچوں نے میری محبت میں اس نظام کو قبول کر لیا ہے۔ مگر وہ اس سے خوش نہیں ہیں۔ اور میں حقوق العباد کے معاملے میں غفلت کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ یہی نہیں، بلکہ میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کی طرف جا رہا ہوں، جبکہ رہبانیت کو اللہ نے ناپسند فرمایا ہے۔''

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ خود اس کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا تھا۔

''میں نے سوچا، یہ تو واقعی سوچنے کی بات ہے۔ اللہ نے دنیا آخرت کے لئے بنائی ہے، لیکن آزمائش تو دنیا ہی ہے۔ دنیا میں رہ کر ہی تو آخرت کی فکر کرنی ہے۔ اور حقوق العباد تو اللہ معاف بھی نہیں کرے گا۔''

''میں اس پر سوچتا رہا۔ لیکن اس کمرے سے دستبردار ہونے پر دل کسی طور

آمادہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا۔ عمر بھر میں دنیا میں، بیوی بچوں میں لگا رہا۔ گویا غفلت میں زندگی گزاری۔ اب اس کی تلافی کا موقع ملا ہے۔ تو یہ تو میرا حق ہے، اور فرض بھی۔'' وہ مسکرائے۔

''لمبی چھٹیوں کے بعد تو دفتر میں بھی دفتری اوقات سے زیادہ کام کرنا ہوتا ہے، اور وہ بھی اوور ٹائم کے بغیر۔ اور الحمدللہ......! میں نے بیوی بچوں کے اور پھر بچوں کے بچوں کے حقوق پورے کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نے سوچا، بس مجھے ایک ترمیم کرنا ہوگی اور کچھ نرمی سے کام لینا ہوگا۔''

''تمہیں پتا ہے کہ گھر میں الحمدللہ...... نوکر بھی ہیں، گاڑی اور ڈرائیور بھی ہے۔ ناشتے پر میں سب کے ساتھ ہوتا ہوں۔ منصور میاں سے بات بھی ہوتی ہے۔ فجر کے بعد ہم لان میں چہل قدمی کرتے ہیں۔ اب ناشتے کے بعد میں نے تمہاری چچی جان سے کہا کہ جو سودا منگانا ہے، اس کی فہرست مجھے دے دو۔ وہ حیران ہوئیں کیونکہ سودا روز نوکر لاتا تھا۔ انہوں نے منع بھی کیا۔ مگر میں نے کہا، یہ میری ذمہ داری ہے۔ سو میں نے روز کا یہ معمول بنا لیا۔ اور یہ کام میں گاڑی کے بغیر کرتا تھا۔ اللہ نے مہربانی کر کے رہنمائی فرمائی تو اس دوران ذکر نصیب ہو گیا۔ میں بھی خوش ہو گیا کہ واہ واہ...... دنیا کے ساتھ بھی تو دین چلتا ہے۔ اور دین سے دنیا کا بھی فائدہ کہ میں نے واضح طور پر خریداری میں بہتری اور برکت محسوس کی۔ پھر زیاں کا احساس ہوا کہ کاش، یہ بات پہلے سمجھ لی ہوتی کہ سفر میں ذکر کتنا آسان اور برکت والا ہوتا ہے۔''

''اور دستک کے معاملے میں میں نے زیادہ ذمہ داری اپنا لی۔ نماز میں مصروف ہوں تو سلام پھیرتے ہی باہر جا کر پوچھتا ہوں کہ کیا بات ہے......؟ اور مطالعے یا ذکر میں مصروف ہوں تو فوراً باہر آ جاتا ہوں۔ اس طرح سے ضمیر مطمئن ہو گیا۔''

''منصور کے حصے میں صرف صبح کا وقت آتا ہے......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''نہیں......! عشاء کے بعد بھی کافی وقت اسے، تمہاری چچی جان کو اور اپنی بہو کو دیتا ہوں۔'' وہ پھر مسکرائے۔

''بے فکری ہوتی ہے نا کہ رات تو اپنی ہی ہے۔ بچوں کی چھٹی کے دن اور

گرمی کی چھٹیوں کے دوران انہیں زیادہ وقت دیتا ہوں۔ باہر گھمانے کے لئے، تفریح کے لئے بھی لے جاتا ہوں۔ الحمدللہ......! کوئی خلش نہیں رہی۔ تمہاری چچی بہت اچھی ہیں۔ اس دروازے پر غیر ضروری دستک ہوتی ہی نہیں۔ کبھی کسی بچے کو چوٹ لگ گئی تو اور بات ہے۔ وہ بھی میں جانتا ہوں کہ میرے ہی لئے دستک دیتی ہیں کہ بعد میں شکایت کروں گا کہ اتنی بڑی بات ہوگئی اور مجھے بتایا ہی نہیں......؟''

''اللہ کا شکر ہے......! اس نے بہت نوازا ہے آپ کو......!''

''الحمدللہ......! ابھی کچھ دن پہلے ایک نئی بات ہوئی۔ تسبیح پڑھتے ہوئے اچانک میرے اندر کسی نے کہا...... واہ بھئی واہ......! تم تو کامیاب ہو گئے۔ زندگی بھی سنور گئی تمہاری اور عاقبت بھی۔ اللہ کی قربت بھی حاصل ہو گئی تمہیں۔ ایک لمحے کو تو میں پھولا اور خوش ہوا۔ مگر اگلے ہی لمحے اللہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے زور سے لاحول پڑھی کہ یہ شیطان کا سب سے کارگر وار ہے۔ اس کے لئے تو میں اللہ سے روز دعا کرتا ہوں۔ کہاں، کسی کتاب میں پڑھا تھا، یہ تو یاد نہیں، لیکن کہیں پڑھا تھا کہ غرور شیطانی وصف ہے کہ اس کی وجہ سے وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور بندے کا وصف عاجزی ہے، جو اسے توبہ کی طرف لے جاتی ہے۔ آدم علیہ السلام کو توبہ کرنی نہیں آتی تھی۔ لیکن وہ اپنے گناہ پر نادم تھے، ان کے اندر عاجزی اور پشیمانی تھی تو اللہ نے انہیں لفظ عطا فرمائے، توبہ سکھائی۔ یہی فرق ہے انسان اور شیطان میں۔ تو غرور تو آدمی کو شیطان سے ملا دیتا ہے۔ اور شیطان کا یقینی اور ابدی ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور میں نے پڑھا تھا کہ بدترین غرور علم اور عبادت کا ہے کہ اس سے علم نافع ہونے کے بجائے تباہ کن ہو جاتا ہے اور عبادت اور ریاضت اکارت ہو جاتی ہے۔ میں ہر وقت اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھے شیطان کے شر اور فتنے سے بچائے رکھے۔ اور میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا عاجز اور حقیر بندہ بنائے، جو کہ میں ہوں، اور مجھے غرور سے بچائے رکھے۔ سو اللہ نے اس روز مجھے بچا لیا۔''

''واقعی......!'' عبدالحق نے کہا۔

''شیطان یہ حربہ اللہ کے ولیوں تک پر آزماتا ہے۔'' اسے احساس ہو رہا تھا کہ مسعود صاحب نے اپنے باطنی انقلاب کے بعد سے کسی سے اس بارے میں بات

نہیں کی۔ اسی لئے وہ اندر سے اتنے بھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ پہلا آدمی ہے، جس سے وہ بات کر رہے ہیں۔ اور وہ اس سے ایسے بات کرتے ہیں، جیسے وہ ان سے بڑا ہو۔ یہ اللہ کی عطا کی ہوئی عاجزی ہے ان کے پاس، جو بہت بڑی نعمت ہے۔

مسعود صاحب کسی بہت گہری سوچ میں تھے، جیسے ذہن پر زور دے رہے ہوں، کوئی بھولی ہوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے جھرجھری سی لی۔

''میں اس سے پہلے کی کوئی اہم بات بھول گیا ہوں۔'' ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

''یاد آتے آتے رہ جاتی ہے۔''

عبدالحق غور سے انہیں دیکھتا رہا۔

''ہاں...... یاد آیا......!'' مسعود صاحب نے اچانک کہا۔

''اس غرور والی بات سے پہلے ایک دن اچانک میرے اندر ایک سوچ ابھری، جو کوڑے کی طرح میری روح پر لگی۔ وہ بہت بڑا طعنہ تھا۔ یہ کہ اتنا بڑا مکان ہے تیرا، دولت ہے، گاڑیاں ہیں، نوکر چاکر ہیں، دنیا کی تمام نعمتیں میسر ہیں، جن پر اتراتا ہے۔ اس زور پر اس کمرے میں ڈیڑھ اینٹ کی یہ مسجد بنائے بیٹھا ہے، اور سمجھتا ہے کہ یہ اللہ کا گھر ہے......؟ سب لوگوں پر اس کا دروازہ بند کر کے کیا ظاہر کر رہا ہے......؟ خود نمائی......؟ غرور......؟ تکبر......؟ کبھی دنیا پر بھی غور کیا......؟ کتنے لوگ ایسے ہیں جو دو کمروں کے مکان میں رہتے ہیں، جہاں کوئی معاشرتی پردہ نہیں، ازدواجی زندگی کے لئے کوئی آڑ نہیں۔ اور لوگ وہاں بھی عبادت کرتے ہیں، تجھ سے زیادہ اور تجھ سے کہیں بہتر۔ اور وہ نہ صرف گھر میں ایک دوسرے کے، بلکہ باہر بھی دوسروں کے دکھ درد بانٹتے ہیں۔ دنیا کی ذمہ داریاں اور بوجھ سے بھی فراغت نہیں ہوتی انہیں۔ تو اپنے اس کمرے میں بیٹھ کر، دنیا سے کنارہ کر کے لیکن دنیا کو جتاتے ہوئے تسبیح گھماتا رہتا ہے، سجدوں کے نام پر ماتھا رگڑتا رہتا ہے۔ کبھی سوچا کہ اللہ کو تیری عبادت پسند آئے گی یا ان لوگوں کی......؟''

''یہ تو واقعی بہت بڑا حملہ تھا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''ارے......! میں تو ہل کر رہ گیا۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ اس کمرے کا دروازہ توڑ دوں اور باہر نکل جاؤں۔ گھر سے باہر جا کر دنیا دیکھوں۔ واقعی...... لوگ کس کس حال میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ میں یہ کیا کر رہا ہوں......؟ لیکن سول سروس نے ایک بات مجھے سکھائی ہے۔ کسی بھی معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے، خاص طور پر فیصلہ کرنے میں۔ اور ہر ہر نکتے پر بہت اچھی طرح غور کر کے، تجزیہ کر کے فیصلہ کرنا چاہئے۔

''سو میں نے کچھ دیر کے لئے ذہن کو خالی چھوڑ دیا۔ پھر میں نے غور کرنا شروع کیا۔ پہلا نکتہ۔ مال و دولت اور نعمتیں۔ تو یہ اللہ کا فضل ہے۔ بظاہر تو یہ میرے ابا جان سے مجھے ملی ہے۔ لیکن یہ ان پر بھی اللہ کا فضل تھا، مجھ پر بھی ہے اور میرے بچوں پر بھی۔ اور قرآن میں اللہ نے کئی جگہ فرمایا کہ وہ جسے چاہے، بے حساب عطا فرماتا ہے اور جسے چاہے، نپا تلا دیتا ہے۔ اور وہ عالم الغیب ہی یہ جانتا ہے کہ کسے کیا دینا ہے......؟ اور یہ بھی ہے کہ وہ جب چاہے واپس لے لے۔ اب رہی اترانے کی بات تو میں اپنی حد تک پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اسے اللہ کا فضل ہی سمجھا۔ اور بے شک اللہ مجھے جانتا ہے۔ مجھ سے زیادہ۔ ممکن ہے، اپنی بے خبری میں اترا رہا ہوں۔ تو انشاء اللہ اس پر وہ درگزر فرمائے گا اور چاہے گا تو میری اصلاح فرما دے گا۔''

''اب دوسرا نکتہ اس کمرے کو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کا۔ تو میں نے قرآن کی تفسیر میں پڑھا ہے کہ اللہ جس پر فضل فرمائے تو اس کی ظاہری حالت سے اس کا اظہار بھی ہونا چاہئے۔ اللہ نے فضل فرمایا ہے تو آدمی اچھا لباس پہنے، اچھا کھائے۔ اب مجھے اللہ نے بڑا گھر عطا فرمایا تو یہ اس کا فضل ہے۔ اس میں آراستہ ڈرائنگ روم ہے۔ کوئی مہمان قیام کے لئے آ جائے تو الحمدللہ......! اس کے لئے ہر آسائش اور پُرتکلف گیسٹ روم ہے۔ اسے کوئی چاہے تو بے شک دکھاوا کہہ دے، اترانا قرار دے دے۔ کیا اتنے بڑے گھر میں میرا یہ حق نہیں کہ اس میں میرا ایک اپنا کمرہ ہو......؟ اور کیا میرا یہ حق نہیں کہ میں اس میں عبادت کروں......؟ جبکہ اس کمرے میں میں نے آسائش کی فکر نہیں کی۔ میں نے اسے آراستہ و پیراستہ نہیں کیا۔ اسے سادگی سے اپنے

ذوق کے مطابق سجایا۔ اور یہاں میں کسی کو لاتا بھی نہیں کہ ظاہرداری کہلائے۔ اور میں اسے مسجد کا درجہ تو نہیں دیتا کہ جو اللہ کا گھر ہوتی ہے۔ پانچ وقت نماز پڑھنے تو میں اللہ کے گھر......یعنی مسجد جاتا ہوں باقاعدگی سے۔ اور میں نے تفسیر میں یہ بھی پڑھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو جو اللہ نے خصوصی اعزاز عطا فرمائے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ ان کے لئے پوری زمین مسجد ہے۔ سفر میں ہوں تو جہاں نماز کا وقت ہو، وہیں نماز پڑھ لیں۔ اور سب کچھ درحقیقت اللہ کا ہے، تو یہ گھر، یہ کمرہ بھی اللہ کا ہے۔ اس کا کرم کہ اس نے مجھے عطا فرمایا۔ مگر ایک دن یہ سب کچھ یہی چھوڑ کر مجھے رخصت ہو جانا ہے۔''

''اور اگلا نکتہ، اس کمرے کا دروازہ سب پر بند کرنا میری خودنمائی، غرور اور تکبر ہے۔ تو میرے اندر کھوٹ ہے تو الگ بات کہ میں اس سے بے خبر ہوں، اور اللہ سے کچھ چھپا نہیں۔ مگر میں پوری سچائی کے ساتھ سمجھتا اور کہتا ہوں کہ یہ تو میرا اظہارِ عجز ہے۔ میں دنیا سے اور دنیا مجھ سے ایسے چھٹی ہوئی ہے کہ تنہائی میں نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ میرے دماغ میں گھس جاتی ہے۔ میں اسے دھکیل کر باہر نکالنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں، اور نماز کے دوران ایسی بے بسی طاری ہوتی ہے اس ناکامی پر کہ میرا جی چاہتا ہے کہ چیخ چیخ کر رو دوں۔'' مسعود صاحب کی آواز بھرا گئی۔

''ارے...... میں تو ارتکاز کو ترستا ہوں۔ میں تو حضوری کے ایک لمحے...... بس ایک لمحے کی آرزو کرتا ہوں اور اس آرزو میں جی رہا ہوں۔ میں غرور کیا کروں گا اور کس بات پر کروں گا کہ مجھے تو ان لوگوں پر رشک آتا ہے، جو نماز کی نیت کرتے ہیں اور اس کے بعد دنیا و مافیھا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ میرے بس میں ہو اور ممکن ہو تو میں اپنا سب کچھ انہیں دے کر وہ ارتکاز لے لوں۔''

''اور رہی بات فرصت کی تو وہ بھی اللہ کی دی ہوئی ہے۔ اور اس سے پہلے کی مصروفیت بھی اللہ کی عنایت تھی۔ ایک طرح سے اللہ نے اقتدار دیا تھا مجھے، اور اقتدار بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ میری بے خبری میں، انجانے میں مجھ سے زیادتی ہوئی ہو لوگوں کے ساتھ تو اللہ جاننے اور معاف کرنے والا ہے۔ لیکن میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے خود کو قوم کا خادم سمجھا۔ اپنا کام جاں فشانی اور سچائی کے

ساتھ کرنے کی کوشش کی۔ ماتحتوں کو کمزور انسان سمجھ کر ان کے مفادات کا خیال رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے فرائض کے معاملے میں ان پر سختی بھی کی...... انہی کی بہتری کے لئے۔ انہیں احساس دلاتا رہا کہ ہم سب درحقیقت عام لوگوں کے حاکم نہیں، خادم ہیں۔ اور الحمدللہ...... ! حق بات کے لئے میں ہمیشہ اپنے سے مقتدر اور بڑے لوگوں کے سامنے بھی ڈٹ گیا۔ یہ سب اللہ کا کرم تھا مجھ پر۔ اس وقت تو میں جانتا بھی نہیں تھا، پھر بھی یہ سمجھتا تھا کہ جو چپڑاسی ہے، وہ بھی اللہ کے حکم سے ہے، جو کلرک ہے، وہ بھی اللہ کے حکم سے ہے اور جو افسر ہے، اسے بھی اللہ نے ہی مقرر کیا ہے۔ سورۂ زخرف کی وہ آیت مبارکہ تو میں نے اب پڑھی، جس میں اللہ نے فرمایا کہ وہی لوگوں کے درمیان روزی تقسیم کرتا ہے اس دنیاوی زندگی میں اور کچھ لوگوں کو کچھ لوگوں پر درجات یعنی مرتبے کے اعتبار سے فوقیت عطا فرماتا ہے، تاکہ کچھ لوگ خدمت لینے والے ہوں اور کچھ لوگ خدمت گار۔ تو یہ تو اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے۔ اگر سب کو برابری کا درجہ ملتا تو دنیا کا کاروبار کیسے چلتا......؟''

عبدالحق حیران رہ گیا۔ برسوں پہلے وہ بھی اس آیت مبارکہ پر غور کر چکا تھا۔

''تو کسی کو آسانی سے روزی ملتی ہے اور کسی کو مشقت سے۔ اور یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن پانچ وقت کی نماز اور روزے سب پر فرض ہیں۔ کون جانے، اللہ مشقت والے کو کم عبادت کا بہت زیادہ اجر عطا فرمائے آخرت میں۔ میں تو آسانی کے باوجود اللہ کے حقوق پورے نہیں کر سکا۔ اب اس نے فرصت عطا فرمائی اور راہ دکھائی تو بڑھ چڑھ کر اوورٹائم کیوں نہ کروں......؟ گزرے وقت کا زیاں تو میں پورا نہیں کر سکتا۔ اللہ کو خوش کرنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔ جو چاہے تو کرم فرمائے اور اس زیاں کو مٹا دے۔''

''کسی کو نہیں معلوم کہ اللہ کس کی عبادت کو پسند اور قبول کرتا ہے۔ بندے کو تو اس سے غرض ہونی بھی نہیں چاہئے۔ میں تو بس اللہ سے امید رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ میری خام کوشش کو قبول فرما لے۔''

''تو میں نے اس آواز کو بھی جھٹک دیا۔ میں اس کمرے سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔''

کمرے میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ عبدالحق مسعود صاحب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اللہ نے بہت کم وقت میں انہیں بہت زیادہ نوازا تھا۔ ان کی قرآن فہمی پر اسے رشک آ رہا تھا۔

''استغفراللہ.....! کتنا بولا ہوں میں.....؟'' اچانک مسعود صاحب نے کہا۔ ان کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''کان کھا لئے تمہارے.....!''

''مجھے شرمندہ نہ کریں چچا جان.....! میں پہلے بھی بہت کچھ سیکھتا رہا ہوں آپ سے..... مگر آج جو کچھ ملا..... وہ بہت قیمتی ہے۔''

''ارے نہیں میاں.....! تم تو شروع سے ہی راہِ حق کے مسافر ہو۔''

''آدمی تو خطا کا پتلا ہے چچا جان.....! اللہ کی رہنمائی کے باوجود بھٹکتا ہے۔ اور اللہ کریم بار بار اسے سیدھی راہ پر لے آتا ہے۔ ایمان تو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے چچا جان.....! بس اللہ ہم سب کو ایمان سے محروم ہونے سے بچائے رکھے.....!''

''آمین.....!''

''ایک بات پوچھ سکتا ہوں چچا جان.....!''

''ضرور پوچھو بیٹے.....!''

''آپ قرآنِ حکیم کی طرف کیسے آئے تھے.....؟''

''ریٹائرمنٹ کے بعد اللہ کی مہربانی سے نماز تو باقاعدگی سے شروع کر دی تھی۔ لیکن سارا دن گھر میں بولایا بولایا پھرتا تھا۔ بے کاری کا احساس جان لیوا تھا۔ سو ایک دن اللہ نے دل میں قرآن پڑھنے کا خیال ڈال دیا۔ میں نے وضو کیا اور قرآن پڑھنے بیٹھا۔ ہمیشہ کی طرح بے دھیانی کی سی کیفیت میں آغاز کیا۔ پہلی آیت کے بعد آگے پڑھنے ہی والا تھا کہ اللہ کی رحمت ہو گئی۔ میرے اندر ایک ملامت ابھری۔''

''پہلے تو تیرے پاس وقت نہیں تھا۔ اب تو بولایا بولایا پھر رہا ہے۔ فرصت ہی فرصت ہے۔ کیا اب بھی پہلے کی طرح پڑھے گا.....؟ بھاگتے دوڑتے، رک کر یہ نہیں سوچے گا کہ تیرا رب تجھ سے کیا فرما رہا ہے.....؟ کیا سمجھا رہا ہے.....؟ کیا حکم دے رہا ہے.....؟ تجھے یہ گستاخی نہیں لگتی.....؟ وہ بھی کائنات کے شہنشاہ کے

ساتھ.....؟ اور سمجھے گا نہیں تو فائدہ کیا.....؟ ''الف'' سے ''ے'' تک سب پڑھ جائے گا اور جانے گا کچھ بھی نہیں تو بدلے گا کیا خود کو.....؟ ارے.....! یہ تو انقلاب لانے والی کتاب ہے۔''

''اور میں دہل گیا۔ ندامت سے پانی پانی ہو گیا۔ اس لمحے سے آج تک میری وہ ندامت مٹ نہیں سکی ہے۔''

''الحمدللہ.....!'' عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

مسعود صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں نے دل میں اللہ سے رجوع کیا، بخشش مانگی، ہدایت کے لئے دعا کی اور..... اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ..... پر رک گیا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے ایک چھوٹا سا رنگین نقطہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اس میں منظر ابھر رہا ہے، اور پھر وہ منظر وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ میری عقل دنگ رہ گئی ہے، اس منظر کو، اس کی نمایاں ترین جزئیات کو سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ جیسے میں گھپ اندھیرے سے اچانک بہت زیادہ روشنی میں آ گیا ہوں۔ آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''میں خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اللہ کو پکارا، اور یکدم دل کو جیسے قرار آ گیا۔ نگاہ جیسے ٹھہر گئی۔ ہر تعریف اللہ کے لئے ہے، جو رب ہے سب جہانوں کا۔ اور نظر نے وہاں سے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ہر تعریف اللہ کے لئے ہے..... ہر تعریف..... ہر تعریف.....''

''ہر تعریف..... کوئی بھی تعریف..... صرف اللہ کے لئے ہے..... صرف اللہ کے لئے۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی تعریف، کوئی توصیف کوئی ثنا اللہ کے سوا کسی کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ حتمی بات ہے..... کبھی نہ تبدیل ہونے والی، ازل سے ابد تک۔''

''اور ہم دن میں ہزاروں بار مختلف چیزوں، مختلف لوگوں کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ ہر تعریف صرف اللہ کے لئے ہے۔ اور قرآن برحق ہے۔ اللہ کا سچا اور ناقابلِ تردید کلام۔ تو ہم دن میں ہزاروں بار جہالت سے کام لیتے ہیں۔

استغفر اللہ……! اور یہ تو محض ایک معاملہ ہے۔ میں نے قرآن کو کبھی سمجھنے کے لئے پڑھا ہی نہیں، تو مجھے پتہ معلوم بھی نہیں۔ میں دن میں کروڑوں بار جہالت کرتا رہوں گا۔ اور یہ سب لکھا جا رہا ہے اللہ کے ہاں۔ تو میں کتنا بوجہل ہو چکا ہوں……؟''

''میں تھرا کر رہ گیا۔ خوف سے…… دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر اچانک جیسے کسی نے میرے لرزتے کانپتے دل پر شفقت کا ہاتھ رکھ دیا۔ میرے خوف کی جگہ سکون نے لے لی۔ دل نے کہا، بندہ شرمندہ ہو تو وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔ بندہ دہشت زدہ ہو تو وہ اسے امان دینے والا ہے۔ ڈرو نہیں، اب تو تم سیدھے راستے پر ہو۔''

''میں نے سوچا، غور تو کرو اس بات پر۔ مجھے ایک تصویر اچھی لگتی ہے، میں اس کی تعریف کرتا ہوں……کیسی خوب صورت تصویر ہے۔ اب اصل میں میں تصویر بنانے والے کی تعریف کر رہا ہوں، جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ تو ہم جس چیز کی بھی تعریف کرتے ہیں، اصل میں اللہ کی تعریف کرتے ہیں، کیونکہ سب کچھ اسی نے بنایا ہے۔ تو چاہے ایمان والا کرے یا کافر، تعریف تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ اگر ایمان والا حقیقی تعریف کرے کہ اللہ نے یہ چیز کتنی خوب صورت بنائی ہے تو اس کے لئے اجر بھی ہو گا۔ نہیں تو اللہ تو بے نیاز ہے۔ اور یہ طے ہے کہ ہر تعریف اللہ کے لئے ہے۔''

''بس بیٹے……! اس لمحے جو سرشاری کی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی، اس کا بیان ممکن نہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں نے ایک بہت خوب صورت، اور اس دنیا سے بہت بڑی ایک دنیا میں قدم رکھ دیا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں نے کوئی بہت بڑا راز دریافت کر لیا ہے۔ میری خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اور وہ خوب صورت وسیع و عریض دنیا اشارے سے مجھے بلا رہی تھی کہ آؤ، مجھ میں چھپے حسین رازوں کو دریافت کرو۔ لیکن تیز مت چلنا۔''

''تو بیٹے عبدالحق……! شاید دس دن تک میں اس پہلی آیت میں کھویا رہا۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اس کے بعد بس میں نے قرآنِ پاک کو اپنا رفیق بنا لیا۔''

''سبحان اللہ……!'' عبدالحق نے کہا۔

''آپ کو شاید یہ اندازہ نہیں کہ بہت کم وقت میں اللہ نے آپ کو بہت نوازا ہے۔''

''بے شک……! اپنی اوقات کو دیکھوں تو وہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن اپنی عمر اور قرآن کی وسیع دنیا کو دیکھوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں بہت پیچھے ہوں۔ لیکن یہ احساس بھی ہے کہ اس دنیا میں دوڑنا نہیں، رک کر، ٹھہر کر مشاہدہ کرنا اور پھر غور کرنا ہے۔ دوڑنے کی صورت میں تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

وہ کہتے کہتے رکے۔

''اور بیٹے……! مجھے تم سے بھی معذرت کرنی ہے۔''

''معذرت……؟ مجھ سے……؟'' عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

''کس بات پر……؟ عنایات کے سوا آپ نے میرے لئے اور کچھ کیا ہی نہیں……!''

''میں تمہیں گھسیٹ کر سول سروس میں لے گیا۔ تمہارا راستہ بھی کھوٹا کیا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں نے کتنا وقت ضائع کر دیا تو مجھے تمہارا خیال آیا اور تمہارے بارے میں مجھے اس سے بھی زیادہ افسوس ہوا کہ میں نے تمہارا بھی وقت ضائع کیا۔''

''آپ کو ایسا نہیں سوچنا چاہئے چچا جان……! وہاں سے مجھے بہت کچھ ملا۔ عملی زندگی کے تجربات، بہت کچھ سیکھا میں نے، اور پھر دیکھیں کہ جب اللہ کا حکم ہوا تو مجھے نجات بھی مل گئی اس سے۔''

''مجھے اس کا بھی دکھ ہے کہ اتنے ایثار کے بعد تمہیں عزت کے بجائے رسوائی ملی۔''

''عزت ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے چچا جان……!''

''مگر میں خود کو اس کا قصوروار سمجھتا ہوں۔ اللہ سے بہت دعا کی ہے کہ وہ میرے ذریعے ہی اس کا ازالہ کرائے۔''

''آپ اس کی اتنی پروانہ کریں۔ مجھے اس پر ذرا سا بھی ملال نہیں۔''

''ارے ہاں……!'' مسعود صاحب نے چونک کر کہا۔

"اب دو تین دن تک شاید میں تمہیں مل نہ سکوں۔"

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔

"کہیں جانا ہے آپ کو.....؟"

"ہاں.....! ایک بہت ضروری کام ہے۔ ممکن ہے، کل ہی ہو جائے اور ممکن ہے، دو تین دن لگ جائیں۔"

"اللہ آپ کے لئے آسان کرے۔ ٹھیک ہے چچا جان.....!"

بارہ بجے کے بعد عبدالحق نے کہا۔

"اب میں چلتا ہوں چچا جان.....!"

"کھانا کھا کر جانا.....!"

"آپ تو جانتے ہیں کہ اب اماں میرے بغیر کھانا نہیں کھاتیں۔"

"ہاں.....! معلوم ہے مجھے.....!" مسعود صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس کے اصرار کے باوجود وہ اسے چھوڑنے پورچ تک آئے۔

گھر واپس جاتے ہوئے عبدالحق نے سوچا کہ جس دن وہ روزہ رکھتا ہے، ویسے بھی مسعود صاحب کی طرف نہیں آتا۔ اس بار تو مسعود صاحب کو ہی کام پڑ گیا تھا۔

"مگر انہیں کیا کام پڑ گیا.....؟" چند لمحے وہ تجسس سے سوچتا رہا۔ پھر اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔

❁❁❁

مسعود صاحب سے ملنے کے بعد عبدالحق کو بہت شدت سے مولوی صاحب یاد آتے تھے۔ وہ ان سے ملنے کو بری طرح تڑپتا تھا۔ کئی بار اس نے حق نگر جانے کی بات کی۔ حق نگر بھی اسے بہت یاد آ رہا تھا۔

لیکن ہر بار زبیر نے اسے ٹال دیا۔

وہ جھنجلا گیا۔

"ایسا کیا ہے زبیر بھائی.....! کہ میں حق نگر نہیں جا سکتا.....؟"

"کوئی خاص بات نہیں.....!"

"کچھ تو ہوگا ہی.....؟"

"ہاں کاکا.....! کچھ تو ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کی خواہش میرے لئے حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔" زبیر نے گہری سانس لی۔

"تو مجھے بتائیں تو.....!"

"کوئی وجہ ہے.....؟ ورنہ میں تو آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔"

"مگر اب میں اصرار کر رہا ہوں۔"

زبیر نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔

"میں اتنا بتا سکتا ہوں کاکا.....! کہ بات آپ کی عزت کی ہے۔ میری التجا ہے کہ اس سے آگے مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ وقت آنے پر میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

عبدالحق خاموش ہو گیا۔ لیکن وہ بہت ناخوش نظر آ رہا تھا۔

"ویسے اب زیادہ وقت نہیں لگے گا انشاء اللہ.....!" زبیر نے اسے دلاسہ دیا۔

"کوئی بہت بری بات ہے زبیر بھائی.....! جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں.....؟"

"ایسی کوئی بات نہیں کاکا.....! بلکہ اچھی بات ہے۔ وہاں ایک سرپرائز ہوگی آپ کے لئے.....!"

"سرپرائز دینے کے تو آپ بادشاہ بن گئے ہیں زبیر بھائی.....!" عبدالحق نے خوش دلی سے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔

"ایک بات بتائیں۔ میں پوری فیملی کی بات نہیں کرتا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں اکیلا حق نگر جاؤں.....؟ اور مولوی صاحب سے مل لوں۔ ان سے ملنے کو ترس رہا ہوں میں۔"

"تھوڑا سا صبر کر لیں کاکا.....! اب انشاء اللہ..... بس چند روز کی بات ہے۔"

عبدالحق خاموش ہو گیا۔ اصرار کرنا تو ویسے بھی اس کی فطرت میں نہیں تھا۔

دوسرے اسے یہ خیال تھا کہ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔ ورنہ زبیر ایسے اس کی بات ٹالنے والا نہیں۔ اور وہ پوری بات نہیں بتا رہا ہے تو یہ بھی ضروری ہی ہوگا۔

''اتنے دن ہوگئے، عارف بھائی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔'' اس نے موضوع بدلا۔

''کیسے ہیں وہ.....؟ آپ نے انہیں بہت مصروف کردیا ہے شاید.....؟''

''میری کیا مجال کاکا.....؟'' زبیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ کام کے معاملے میں وہ جن ثابت ہوں گے۔''

''مطلب.....؟''

''ایسا لگتا ہے کہ وہ کام کو ترسے ہوئے تھے۔ وہ تو کام پر ایسے ٹوٹ پڑے، جیسے وہ کوئی دشمن ہو۔'' زبیر کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''دن رات ایک کردیئے انہوں نے.....!''

''وہ ایسے ہی ہیں۔ الحمدللہ.....!''

''ہمیں تو یہ سمجھیں کاکا.....! کہ بہت بڑی نعمت مل گئی ہے۔ اتنے سے دن میں انہوں نے کام پر ایسا عبور حاصل کرلیا ہے کہ میرے خیال میں ان سے زیادہ کام کو سمجھنے والا ہمارے ہاں کوئی بھی نہیں۔''

''آپ بھی نہیں.....؟''

''ارے..... میں کیا کاکا.....! میں تو.....'' زبیر کھسیا کر ہنسنے لگا۔

''مجھ پر سے تو بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ ایکسپورٹ کے کام کی طرف تو مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ سب کچھ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے.....!'' عبدالحق نے کہا۔ اسے دلی خوشی ہوئی تھی۔

''جی کاکا.....! اللہ ہمیشہ ایسے ایماندار لوگوں سے ملا دیتا ہے۔''

''آپ نے انہیں شراکت کی پیش کش بھی کی.....؟''

''ابھی نہیں کاکا.....! وہ بہت جلدی بھڑک جانے والے آدمی ہیں۔ مناسب وقت پر بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ منافع اس سال بہت بڑھے گا۔ اس کے بعد بات کروں گا۔''

''ٹھیک ہے زبیر بھائی.....!''

''لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی مداخلت کے بغیر وہ میری بات نہیں مانیں گے۔''

''ٹھیک ہے.....! دیکھ لیں گے۔''

عبدالحق بعد میں بھی اس پر سوچتا رہا۔ وہ اس سرپرائز کے بارے میں سوچ رہا تھا، جس کا زبیر نے تذکرہ کیا تھا۔

''کیسی سرپرائز ہے یہ.....؟ کیا ہوسکتا ہے.....؟''

اس نے ذہن سے اس خیال کو جھٹکا۔

''یہ میں کچھ زیادہ ہی تجسس نہیں کرنے لگا ہوں۔ جہاں اللہ نے تجسس کرنے کو کہا ہے، اسے چھوڑ کر..... اور جہاں منع فرمایا ہے، وہاں..... بہت بری بات ہے۔'' اس نے خود کو ڈپٹا۔

مگر پھر دوسرے زاویے سے اسے تشویش ہونے لگی۔ زبیر نے کہا تھا، بات آپ کی عزت کی ہے۔

''ایسی کیا بات ہوسکتی ہے.....؟'' پھر اس نے سوچا۔

''کوئی اس معاملے میں کیا کرسکتا ہے.....؟ عزت ذلت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔''

❁❁❁

وہ کچی نیند میں تھا کہ کسی کی موجودگی کے احساس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے سر گھما کر دیکھا، ارجمند اس کے پاس بیٹھی تھی۔

معمول کے مطابق وہ نیچے سوتا تھا اور ارجمند نورالحق کے ساتھ اوپر بیڈ پر۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ارجمند اس طرح نیچے آئی تھی۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ اس کی آزمائش ہونے والی ہے۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا جسم تن سا گیا۔

''کیا بات ہے ارجمند.....؟''

''مجھے افسوس ہے آغا جی.....! کہ میں نے آپ کی نیند خراب کی۔''

اس کے لہجے میں ایسی شرمندگی تھی کہ عبدالحق کا دل کٹنے لگا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی سویا ہی نہیں تھا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''مگر بات تو بتاؤ ...! ہوا کیا......؟''

''میں بہت خوش نصیب ہوں آغا جی ....! اللہ نے بہت فضل فرمایا مجھ پر۔ بہت عزت عطا فرمائی۔''

''بے شک ہے ...! اللہ بہت نوازنے والا ہے۔''

''میں نے اللہ کا بہت شکر ادا کیا، پھر اللہ سے بہت دُعا کی کہ مجھے آپ کے لئے آزمائش نہ بننے دیں۔ مگر آج مجھ سے رہا نہیں گیا۔''

عبدالحق تو توقع ہی یہی کر رہا تھا، پھر بھی اسے کرنٹ سا لگا۔ اس کا جسم جیسے سمٹ سا گیا۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں آغا جی ....!'' ارجمند نے جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے میں خجالت تھی۔

''میں انشاء اللہ آپ سے وعدہ خلافی کبھی نہیں کروں گی۔ اس کے لئے روز اللہ سے دعا کرتی ہوں۔''

''تو پھر ....؟'' عبدالحق کے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ در آئی۔

''میں ایک سعادت سے محروم ہوں۔ اس کا احساس اب اور بڑھ گیا ہے۔''

''کھل کر بات کرو نا......!''

''میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ہر روز اپنے پاؤں دبانے کی اجازت دے دیں......!'' ارجمند کے لہجے میں التجا تھی۔

عبدالحق بھونچکا رہ گیا۔

''میں نے بہت دعا کی ہے اللہ سے۔ انشاء اللہ...... یہ آپ کے لئے آزمائش نہیں بنے گی۔'' اب ارجمند کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''مگر یہ اچانک ہوا کیا......؟''

''ابا جان کی ڈائری پڑھنے کے بعد مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ اللہ نے کتنی بڑی نعمت، کتنا بڑا اعزاز عطا کیا ہے مجھے۔ سچ یہ ہے کہ وہ ڈائری پڑھے بغیر

میں یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔''

اب عبدالحق کو تجسس ہونے لگا۔

''میرے بارے میں تو یہ سب کچھ تمہیں پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اور اس میں میری تو کوئی خوبی نہیں۔ یہ تو بس اللہ کا فضل اور اس کی نوازش ہے۔'' اس نے کہا۔

''جی.... میں جانتی ہوں۔ لیکن جو نہیں جانتی تھی، وہ اس سے بھی بڑا تھا۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا......!''

''میں ابا جان کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں جانتی تھی نا......؟''

''ہاں ....! لیکن اس میں کیا خاص بات ہے......؟''

''یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابا جان کو ہر طرح سے آپ پر سبقت عطا فرمائی۔''

عبدالحق خوش ہو گیا۔

''اور یہ میرے لئے اللہ کی طرف سے اور بڑا اعزاز ہے۔'' عبدالحق نے پر خیال لہجے میں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا، اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ ارجمند کے ذریعے کوئی بہت اہم بات اس پر کھلنے والی ہے، جو وہ پہلے نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس نے محض سمجھنے کے لئے بات آگے بڑھانے کی غرض سے کہا۔

''ذرا مجھے بھی بتاؤ کہ کیسے......؟''

''دین اسلام کو سمجھنے کا خیال اور اس کی رغبت اللہ نے انہیں آپ سے پہلے عطا فرمائی۔ یہ محض میرا قیاس ہے۔ ورنہ آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔''

عبدالحق نے تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ارجمند کی بات درست ہے۔ اس کے دہلی جاتے ہی پتا جی اس کی کمی پوری کرنے کے لئے مطالعے کی طرف راغب ہوئے تھے۔ ان کی ڈائری یہی بتاتی تھی۔ مگر اس نے کبھی اس بات کو توجہ اور اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ خود تو صرف خدائے واحد کو سمجھنے کی کوشش کے مرحلے میں تھا۔ لیکن اس عرصے میں اللہ نے پتا جی کو اپنا راستہ دکھا دیا تھا، اور پتا جی نے اس پر قدم بھی رکھ دیا تھا۔

''ٹھیک کہا تم نے......!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اور......؟''

''اور ابا جان نے آپ سے پہلے قرآن پڑھنا شروع کیا۔''

یہ بھی درست تھا۔

''شاید پتا جی...... نہیں......! ابا جان......!'' اس کے اندر کسی نے اسے ٹوکا۔

''بھوا نہیں کس محبت سے ابا جان کہہ رہی ہے اور میں وہی پتا جی...... ؟''

ہاں...... امکان یہی تھا کہ جب اس نے پہلی بار نور بانو کی آواز میں قرآن کی تلاوت سنی تھی، ابا جان اس سے پہلے ہی قرآن کی طرف راغب ہو چکے ہوں گے۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو...... اور...... ؟''

''اور ابا جان نے آپ سے پہلے قرآن پڑھ کر اس کے حکم پر عمل کیا۔''

''کون سا حکم...... ؟''

''قرآن کو چھونے سے پہلے پاک ہونے کا حکم۔ انہوں نے ڈائری میں لکھا کہ یہ آیت پڑھنے کے بعد وہ قرآن پڑھنے سے پہلے نہاتے تھے۔''

''بالکل ٹھیک......! اور...... ؟''

''اور جس آیت مبارکہ کو سن کر، سمجھ کر، اس کا مشاہدہ کر کے آپ نے اسلام قبول کیا، ابا جان اس سے پہلے ہی اس کے مشاہدے کے لئے کئی میل پیدل چلے تھے۔ اور انہوں نے سورۂ واقعہ میں، جو اللہ تعالیٰ نے چار چیلنج دیئے ہیں، ان میں سے تین کو سمجھ کر تسلیم کر لیا تھا...... یعنی انسان کی پیدائش، زراعت اور پانی کی نعمت۔ اس کا مطلب ہے کہ زبان سے ایمان لانے اور کلمہ پڑھنے کی سعادت تو انہیں بہت بعد میں حاصل ہوئی۔ لیکن دل اور دماغ سے ایمان وہ پہلے ہی لا چکے تھے۔''

عبدالحق کے لئے سوچوں کے دروازے کھل رہے تھے۔

''ٹھیک کہا تم نے......!'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

''اور وہ ایمان بھی آپ سے پہلے لائے۔'' ارجمند نے جیسے بات مکمل کی۔

یہ آخری بات پوری طرح عبدالحق کے شعور میں موجود تھی۔ اور وہ اس کے لئے بہت بڑی خوشی، بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس کی بنیاد پر تو اس نے اپنی دستاویزات میں والد کا نام تبدیل کرایا تھا۔ یہ وہ کیسے بھول سکتا تھا...... ؟ مگر یہ سمجھنے کے باوجود اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ جب اس کے ابا جان ٹھاکر پرتاب سنگھ سے عبداللہ بننے

کے بعد اس کی بانہوں میں دم توڑتے ہوئے، چتا جلانے کے بجائے دفن کرنے کی وصیت کی تو اس وقت وہ خود عبدالحق نہیں، ٹھاکر اوتار سنگھ تھا۔

اور ڈائری پڑھتے ہوئے ایک بار...... صرف ایک بار اس نے سوچا تھا کہ اللہ نے اسے اور ابا جان دونوں کو ایک ہی آیت، اپنی ایک ہی نشانی کے ذریعے ایمان سے نوازا۔ ابا جان نے اس سے پہلے اس آیت کو تفصیلی مشاہدے کے بعد اس سے پہلے سمجھا۔ مگر بس یہ اس وقت کی بات تھی۔ اس کے بعد وہ اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ حالانکہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی تھی۔

اور سورۂ واقعہ کی آیات کے حوالے سے اب پہلی بار وہ شعوری طور پر ایک بہت اہم بات سمجھ رہا تھا۔ جب اس نے قرآن کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے صرف اور صرف اپنی رہنمائی اور ہدایت سے اس کے ابا جان کو قرآن فہمی کے مرحلے میں داخل فرما دیا تھا۔

کتنا بڑا کرم تھا اللہ کا۔ اللہ نے اسے اور اس کے باپ کو نہ صرف یہ کہ ایمان عطا فرمایا تھا، بلکہ ان کی نسلی ترتیب بھی درست فرما دی تھی۔ یہ وہ کرم تھا، جس پر جتنا شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکا تھا، شکر کیا ادا کرتا...... ؟ اور اب خوش قسمتی سے ارجمند کے ذریعے اللہ نے اسے یہ آگہی عطا فرما دی تھی۔

''جزاک اللہ......! ارجمند......!'' اس نے بے تشکر سے کہا۔

''تم نے بہت بڑی بات مجھ پر کھول دی۔ میں تمہیں اس کا صلہ نہیں دے سکتا۔''

''دے سکتے ہیں......!'' ارجمند نے بے حد یقین سے کہا۔

''بس...... آپ مجھے ہر رات اپنے پاؤں دبانے کی اجازت دے دیں۔ انشاء اللہ...... آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور اگر ہو تو مجھے منع کر دیجئے گا۔ پھر میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔''

''یہ کون سا جذبہ ہے...... ؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''تشکر سمجھ لیجئے......! اللہ نے جن لوگوں کو عزت اور سرفرازی عطا فرمائی ہو،

ان کی عزت اور خدمت کرنا آدمی کے لئے باعث عزت ہوتا ہے۔ اور جب اللہ نے آپ کو ایسے لوگوں سے رشتے میں بھی جوڑ دیا ہو تو یہ اور ضروری ہو جاتا ہے۔ مجھے بہت عزت دی ہے اللہ نے...... الحمدللہ...... ! آپ مجھے محروم نہ رہنے دیں۔''

''چلو ٹھیک ہے...... ! ویسے یہ مجھ پر تمہارا ایک اور احسان......''

ارجمند نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بس...... ایسی باتیں نہ کریں۔''

عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

''جا کہاں رہے ہیں آپ......؟ میرے صلے کی پہلی قسط تو ادا کریں۔''

ارجمند بولی۔

''ابھی نہیں...... ! ابھی تو مجھے ایک اور فرض ادا کرنا ہے۔'' عبدالحق نے کہا اور وضو کے لئے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

❁❁❁

نورالحق کے لئے لاہور ایک ایسا کھلا آسمان تھا، جس کا اُفق لامحدود تھا۔ یہاں اس کی توجہ کے طلب گار اتنے زیادہ تھے کہ ان سب کو خوش کرنا اس کے لئے آسان نہیں تھا۔

رشیدہ اور آبیہ تو ہمیشہ سے اس کے آگے پیچھے گھومتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ اس کا کوئی کام اس کی امی کو بھی نہ کرنے دیتیں۔ اب یہاں وہی حال نسیمہ اور اس کی بیٹیوں کا تھا۔ اس کے نتیجے میں رشیدہ اور آبیہ سے اس کی ٹھنی رہتی۔ جبکہ رشیدہ اور آبیہ انہیں گردانتی ہی نہیں تھیں۔

ایک دن کسی بات پر رشیدہ نے نسیمہ سے کہا۔

''تم چھوٹے صاحب کو ہم پر چھوڑ دو۔ ہمیں ان کی ضرورت کا خیال رکھنا آتا ہے۔''

''کیسے چھوڑ دیں......؟'' نسیمہ نے تنک کر کہا۔

''وہ ہمارے بھی تو چھوٹے صاحب ہیں۔ تم کو اتنا حق کہاں سے مل گیا......؟''

رشیدہ کی آواز بھرا گئی۔

''تم تو شروع ہی سے یہاں ہو۔'' اس نے کہا۔

''پر ہم اپنا گاؤں چھوڑ کر جو یہاں ہیں تو صرف چھوٹے صاحب کی وجہ سے ہیں۔ ہم نے صرف ان کی محبت میں یہ نوکری مانگی تھی بڑے صاحب سے۔''

''رہنے دو یہ باتیں...... ! تنخواہ تم بھی لیتی ہو ہماری طرح۔''

''تمہیں کیا پتا......؟ ہمیں تو بڑے صاحب نے اتنا کچھ دے دیا تھا کہ ہم اپنے گاؤں میں ساری زندگی عیش آرام سے گزارتے۔ پر چھوٹے صاحب کی محبت میں ہم نے اپنا جینا مرنا ان کے ساتھ کرلیا۔ اور میری بیٹی بھی...... ہمیں کیا پڑی تھی کہ اپنا گھربار، رشتے ناطے چھوڑ کر یہاں آتے......؟ تم تو کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔'' رشیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم گھر سے، اپنے بچوں سے دور رہو تو پتا چلے کہ یہ درد کیسا ہوتا ہے......؟ جب وہ سب یاد آئیں تو آٹھ دس دن کے لئے چھٹی لے کر گھر چلے جاتے ہیں۔ پر قسم سے، اگلے ہی دن سے چھوٹے صاحب یاد آنے لگتے ہیں۔''

نسیمہ کا دل پسیج گیا۔ اس نے رشیدہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''اب میں سمجھ گئی۔ سچ تمہارا حق ہم سے بہت زیادہ ہے۔ پر کیا کریں......؟ چھوٹے صاحب سے ہمیں بھی بہت محبت ہے۔ چلو...... اب میں خیال رکھوں گی۔''

نورالحق محبت کو سمجھتا تھا۔ ارجمند نے سب سے زیادہ اسے یہی تو سمجھایا تھا۔ مگر یہ گفتگو سن کر پہلی بار اسے احساس ہوا کہ رشیدہ اور آبیہ اس سے کتنی محبت کرتی ہیں۔

وہ ابتدا ہی سے رشیدہ کو انا اور آبیہ کو آپی کہتا تھا۔ اس روز اس نے رشیدہ سے پوچھا۔

''انا...... ! آپ کا گھر یہاں سے بہت دور ہے......؟''

''ہاں چھوٹے صاحب...... ! بہت دور...... کراچی جتنا دور......!''

''اور آپ کے بچے بھی ہیں......؟ جیسے میں امی اور بابا کا بچہ ہوں......؟''

''ہاں صاحب جی...... ! پر وہ بہت بڑے ہیں۔ آپ کی طرح چھوٹے نہیں

ہیں۔"

"تو بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو کیا امی بابا انہیں بھول جاتے ہیں.....؟ کیا آپ کو وہ یاد نہیں آتے انا.....؟"

رشیدہ رونے لگی۔

"بہت یاد آتے ہیں چھوٹے صاحب.....! پر آپ سے دور جاؤں تو آپ ان سے بھی زیادہ یاد آتے ہیں۔ آپی کا بھی یہی حال ہے۔ پر اس کی شادی ہوگی تو اسے دور جانا پڑے گا۔ مجھے پتا ہے، وہ بہت رویا کرے گی آپ کے لئے.....!"

نورالحق چند لمحے سوچتا رہا۔

"آپ سب کو یہاں بلا لیں نا.....!"

"وہاں ان کے گھر ہیں، زمینیں ہیں، وہ نہیں آسکتے۔ بیٹیوں کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ ہیں۔" رشیدہ نے کہا۔

"پر چھوٹے صاحب.....! ہم یہاں بہت خوش ہیں۔ ہم وہاں اتنے خوش نہیں رہ سکتے۔"

ننھے نورالحق نے بڑی محبت سے رشیدہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں بھی آپ سے اور آپی سے بہت محبت کرتا ہوں انا.....!"

رشیدہ کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔

"مجھے پتا ہے چھوٹے صاحب.....!"

نورالحق کچھ سوچ رہا تھا۔ چند لمحے بعد بولا۔

"آپی کی شادی ہوگی تو وہ دور چلی جائیں گی انا.....؟"

رشیدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

نورالحق پھر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر رشیدہ کو دیکھا۔

"اور اگر آپی کی شادی ماموں سے ہو جائے تو وہ کہیں نہیں جائیں گی۔ یہیں رہیں گی۔" اس نے کہا۔

چند لمحے تو رشیدہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اچانک اس کے دل میں روشنی سی ہوگئی۔

"نورالحق.....! کہاں ہو تم.....؟"

ساجد کی آواز سنائی دی تو نورالحق باہر چلا گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نے رشیدہ کو کیسی راہ سجھا دی ہے۔

اور وہاں تائی تھیں۔ وہ اس سے قریب رہنے کی کوشش کرتی تھیں، مگر کچھ دور رہ کر۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بھی اس سے بہت محبت کرتی ہیں۔ انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اسے یہ بات معلوم تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتیں تو نہ جانے کیسے اسے معلوم ہو جاتا۔ نہ جانے کیوں، وہ ان سے انجانا بنا رہتا۔ لیکن اسے احساس ہوتا کہ ان کی آنکھوں سے بہت نرم سی پھوار اس پر برس رہی ہے، اور وہ بھیگ رہا ہے۔ وہ پھوار اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اور وہ اسے کبھی چھوتیں (لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا) تو ایسے احترام سے چھوتیں، جیسے امی کی ہدایت کے مطابق وہ قرآن پاک کو چھوتا تھا۔ اسے ان کے چھونے پر یہی خیال آتا تھا۔ لیکن اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ایک دن اس نے تائی سے کہا۔

"آپ تو مجھے پیار نہیں کرتیں۔"

اور تائی دہل گئیں۔

"نا پتر.....! میں تو تمہیں ساجد سے بھی زیادہ پیار کرتی ہوں۔"

"تو آپ مجھے پیار کیوں نہیں کرتیں.....؟ امی کی طرح.....!"

تائی کچھ عجیب سی ہو گئیں۔

"ویسے پیار کرنا مجھے آتا نہیں ہے پتر.....! ویسے میں ہر وقت تمہیں چومتی ہوں.....اپنی آنکھوں سے۔"

نورالحق جانتا تھا کہ یہ سچ ہے۔ مگر اس نے کہا۔

"کریں گی تو آجائے گا تائی.....! مجھے اچھا لگے گا۔"

اور تائی نے پہلے ایک ایک کر کے اس کے دونوں ہاتھ چومے، پھر بڑی نزاکت سے اسے لپٹا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ اسے بڑا اچھا لگا۔

مگر تایا کی محبت بڑی بے جھجک تھی۔ وہ اسے پتر نہیں کہتے تھے، مگر اس سے لاڈ بہت کرتے تھے۔ کبھی وہ جلدی آجاتے تو اسے اپنے ساتھ لان میں لے جاتے۔

پہلی بار ایسا ہوا تو سب لوگ لان میں ہی بیٹھے تھے۔

''میرے ساتھ آیئے چھوٹے صاحب .....!'' تایا نے اس سے کہا۔

وہ ان کے ساتھ چلا گیا۔ کچھ دور جا کر وہ اکڑوں بیٹھے اور انہوں نے اس سے کہا۔

''میرے کندھے پر بیٹھ جایئے چھوٹے صاحب.....!'' اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''کیوں تایا جان.....؟''

''آپ بیٹھیں تو سہی.....!''

نورالحق چند لمحے جھجکا، پھر ان کے کندھوں پر بیٹھ گیا۔

''اب میں آپ کا گھوڑا ہوں۔ آپ کو لے کر دوڑوں گا۔''

''گھوڑا نہیں.....! اونٹ.....!'' نورالحق نے کہا۔ اسے کلفٹن کا ساحل یاد آ گیا تھا۔

''چلیں.....اونٹ ہی سمجھ لیں.....!''

''اور میں آپ کی رفتار کم زیادہ کیسے کروں.....؟''

''تیز دوڑنا ہو تو دایاں کان پکڑیں، رفتار کم کرنی ہو تو بایاں کان پکڑیں اور رُکنا ہو تو بال پکڑیں۔'' زبیر نے کہا اور دوڑنا شروع کر دیا۔

چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے لوگ یہ سب دیکھ رہے تھے۔ سب کے تاثرات مختلف تھے۔ رابعہ کے چہرے پر خوشی تھی۔ حمیدہ جیسے کہیں کھو سی گئی تھی اور اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ارجمند گم سم اور بوکھلائی ہوئی تھی۔ جیسے اسے کچھ سوجھ نہیں رہا ہو۔

اِدھر اُدھر موجود ملازمین کے انداز میں حیرت اور دلچسپی تھی۔

بالآخر ارجمند سنبھلی اور اس نے سرگوشی میں حمیدہ سے کہا۔

''چاچا کو روکیں نا دادی اماں.....!''

لیکن حمیدہ نے اس کی آواز سنی ہی نہیں۔

اسی وقت بابا نماز پڑھ کر واپس آئے۔ چائے کی میز پر بیٹھنے کے بعد اس کی

نظر اس منظر پر پڑی اور بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے بوکھلا کر سخت لہجے میں پکارا۔

''نورالحق.....! زبیر بھائی.....!''

نورالحق نے جلدی سے زبیر کے بال پکڑے اور گھبراہٹ میں کچھ زیادہ ہی سختی سے پکڑے۔

''رُکیں تایا.....! رُک جائیں.....!''

''اونٹ کو تایا کہتے ہیں۔'' زبیر نے ہنستے ہوئے کہا اور اسے کندھے سے اُتار دیا۔ دونوں چائے کی میز کی طرف چل دیئے۔ نورالحق سہما ہوا تھا۔ کیونکہ بابا کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر تایا کے پیچھے ہو گیا۔

زبیر عبدالحق کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نورالحق ارجمند کے پاس جا بیٹھا۔

''یہ کیا حرکت تھی نورالحق.....؟'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''اب تم اتنے منے بچے تو نہیں ہو.....!''

''تایا نے کہا تھا بابا جان.....!''

عبدالحق نے زبیر کی طرف دیکھا جو گڑبڑایا ہوا تھا۔ اس کی نظروں میں سوال تھا۔

''دل میں بہت ارمان تھے کاکا.....!'' زبیر نے جھجکتے ہوئے دبے لہجے میں کہا۔

''چھوٹے سے تھے تو دُور چلے گئے، اب ملے ہیں تو وہ سب ارمان پورے کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

''مگر مجھے اچھا نہیں لگا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''بس کر عبدالحق.....!'' دادی نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کی آواز رُندھی ہوئی تھی۔

''تجھے کیا حق ہے ان کے بیچ آنے کا.....؟'' اور وہ رونے لگی۔

بابا بوکھلا گئے۔

''کیا ہوا اماں.....؟ کیا ہو گیا.....؟''

روتی ہوئی دادی نے بس اتنا کہا۔

''اپنا بچپن تجھے یاد نہیں ... پر مجھے تو کیا کیا کچھ یاد آ گیا۔''

اور بابا شرمندہ نظر آنے لگے۔

''مجھے معاف کر دیں زبیر بھائی......!''

''ارے نہیں کاکا......! کیوں شرمندہ کرتے ہیں مجھے... ؟'' تایا نے جلدی سے کہا۔

اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ رات کو اس نے اس سے پوچھا۔

''ابھی تم چھوٹے ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''کچھ بڑے ہو جاؤ تو تمہیں ایک بہت اچھی سچی کہانی سناؤں گی۔ محبتوں کی کہانی......تمہاری امانت ہے وہ۔''

''تو ابھی سنا دیں نا......!''

''نہیں......! ابھی نہیں......! اصل میں دادی کو زیادہ معلوم ہے۔ کہانی تو وہی سنائیں گی۔''

اب بھی تایا جب جلدی آ جاتے تو اس کا اونٹ بنتے اور اسے سواری کراتے۔ اور کبھی اسے گاڑی میں بٹھا کر لے جاتے اور کھلاتے پلاتے۔ انہیں معلوم تھا کہ آئس کریم اسے بہت پسند ہے اور وہ ساجد بھائی کو ساتھ چلنے کا خود سے کبھی نہیں کہتے تھے۔ وہ اصرار کرتا تو وہ اسے ساتھ لے لیتے۔

اور پھر ساجد بھائی تھے۔ وہ اس سے بڑے تھے۔ مگر اس کے دوست تھے۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اسے بھی ان کا ساتھ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ان سے بہت کچھ سیکھتا تھا۔ شروع میں تو ان کی مصروفیت زیادہ تھی مگر پھر وہ اسے بہت وقت دینے لگے۔ وہ ہوم ورک کرتا تو وہ اس کے پاس بیٹھ کر دیکھتے رہتے۔ اسے کوئی مشکل ہوتی تو اسے سمجھاتے۔

اور سچ یہ ہے کہ وہ بھی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔

پھر ساجد بھائی کو ان کا الگ کمرہ ملا تو اسے بہت اچھا لگا۔ اسے ان پر رشک بھی آیا۔

''مجھے ایسا کمرہ کب ملے گا......؟'' اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

''تمہیں الگ کمرہ چاہئے......؟'' انہوں نے اس سے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بالکل اکیلے رہنا تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

یہ سن کر ساجد بھائی مسکرائے۔ وہ بہت خوش نظر آنے لگے۔

''آپ کو اچھا لگتا ہے اکیلے رہنا......؟'' اس نے ان سے پوچھا۔

''ایک بات بتاؤں۔ چاچا نے جب یہ کمرہ مجھے دیا تو مجھے کہا کہ کوئی کمی ہو یہاں تو مجھے بتا دو۔ میں نے وہ کمی بتا دی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ تم کچھ بڑے ہو جاؤ گے تو وہ اس کمی کو دُور کر دیں گے۔''

''اور وہ کمی کیا ہے......؟''

''میں نے ان سے کہا کہ یہاں بس نورالحق کی کمی ہے۔''

وہ خوش ہو گیا۔

''یہ کہا آپ نے......؟ آپ اپنے کمرے میں مجھے شریک کریں گے......؟''

''میں اپنی ہر چیز کے بارے میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہم دونوں کی ہے...... تمہاری اور میری۔'' ساجد بھائی نے بڑے پیار سے کہا۔

''بلکہ میری ہر چیز پہلے تمہاری ہے اور پھر میری۔''

''تو یہ کمرہ میرا بھی ہے......؟''

''مجھ سے زیادہ تمہارا ہے۔''

''تو پھر میں یہاں رہ کیوں نہیں سکتا......؟''

''میں نے اپنے حصے کا کام کر دیا تھا۔ چاچا سے تمہارے لئے اجازت لے لی تھی۔ اب تم اپنے حصے کا کام کرو۔ ان سے اجازت لے لو تو تم آج ہی اس کمرے میں آ سکتے ہو۔''

نورالحق کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

اس نے بابا سے بات کی تو انہوں نے کہا۔

''اب تم تین دن تک اس کمرے میں نہیں جاؤ گے۔ یہ میرا حکم ہے۔''

اس نے سوچا۔ یہ تو اچھا ہونے کے بجائے برا ہو گیا۔

اگلے روز وہ ساجد بھائی سے ملا اور انہیں اپنی اس سزا کے بارے میں بتایا۔

وہ ہنسنے لگے۔

''آپ کو اچھی لگی ہے یہ بات......؟'' اسے سخت صدمہ ہوا۔

''تین دن بعد دیکھنا...... تمہیں بھی اچھی لگے گی۔''

وہ بہت اُداس ہو گیا۔ اسے ساجد بھائی سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ وہ ان سے کچھ کھنچ سا گیا۔

تین دن بعد بابا نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ......!'' اور وہ اسے لے کر ساجد بھائی کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

ساجد بھائی دروازے پر ہی کھڑے تھے۔ بابا نے ان سے کہا۔

''لو بھئی ساجد......! اپنے پارٹنر کو سنبھالو......!''

ساجد بھائی نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے کمرے میں لے گئے۔

پہلے تو اسے حیرت ہوئی اور پھر اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جہاں پہلے ایک چیز تھی، وہاں اب ایک جیسی دو چیزیں تھیں۔ ساجد بھائی جیسا ایک بیڈ، ویسی ہی میزان کی میز کے برابر، ویسی ہی ایک اور الماری، ویسی ہی کرسی۔

''اب یہ تمہارا کمرہ ہے۔'' ساجد بھائی نے کہا۔

''نہیں ساجد بھائی......! ہمارا کمرہ۔'' اس نے کہا اور ان سے لپٹ گیا۔

ان محبتوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس کی زندگی کا اُفق غیر محسوس طور پر پھیلتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ بابا سے اس کا ملنا کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ملتے ہی نہ ہوں۔ رات کو وہ باقاعدگی سے آتے۔ اس کے ساتھ لیٹ کر اسے اللہ میاں کے متعلق بتاتے۔ وہ اللہ کے متعلق بہت باتیں کرتے لیکن ایک بات...... ایک تاکید وہ ہر رات کرتے۔

''تمہیں مجھ سے، امی اور دادی سے، تایا سے...... کسی سے بھی کوئی ضرورت ہو تو ان سے مانگنے سے پہلے سب سے پہلے اللہ سے مانگا کرو میرے پیارے

بیٹے......! اللہ سے مانگنے سے پہلے کسی سے کچھ کہنا بہت بری بات ہے۔ اللہ کو ناراض کرنے والی بات۔''

اور وہ ان سے لپٹ کر سو جاتا۔

مگر جب اسے خیال آتا کہ وہ بابا سے کچھ دُور ہو رہا ہے تو وہ اُداس ہو جاتا۔

لیکن پھر وہی خیال اُلٹ کر آتا اور وہ سوچتا کہ بابا اس سے دُور ہو رہے ہیں اور اسے لگتا کہ بابا اس میں خوش ہیں تو اس کے دل میں شکایت کا ایک کانٹا سا چبھ جاتا۔ اسے بابا پر کچھ غصہ آتا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگتیں۔

دن یوں ہی گزرتے رہے۔

❁❁❁

اس روز زبیر دوپہر سے پہلے ہی گھر آ گیا۔ وہ ایک بالکل معمول کے خلاف بات تھی۔ اس پر سب کو حیرت ہوئی اور وہ خالی ہاتھ نہیں آیا۔ وہ مٹھائی کا ایک بڑا ٹوکرا ساتھ لایا تھا۔ چہرہ اس کا خوشی سے چمک رہا تھا۔

ارجمند نے اس سے پوچھا۔

''کوئی بہت بڑی خوش خبری ہے چاچا......؟''

''اتنی بڑی کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں ارجی بی بی......!''

''تو بتائیں نا......!''

''بتاؤں گا...... پہلے یہ بتائیں کہ کاکا کہاں ہیں......؟''

''آپ اماں کے کمرے میں چلیں۔ میں انہیں لے کر آتا ہوں۔''

ارجمند کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تاہم وہ حمیدہ کے کمرے میں چلی گئی۔

''یہ مٹھائی اماں کے کمرے میں پہنچا دو۔'' زبیر نے نسیمہ سے کہا اور رابعہ سے بولا۔

''اور تم بھی اماں کے کمرے میں چلو......! میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اسٹڈی کی طرف چل دیا۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔

اخبار پڑھتے ہوئے عبدالحق نے سر اُٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس

دستک پر اسے حیرت ہوئی تھی۔ یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ ارجمند کے سوا اور وہ اسے کچھ دیر پہلے ہی چائے دے کر جا چکی تھی اور ویسے بھی وہ دستک نہیں دیتی تھی۔

''کون ہے......؟ اندر آ جائیں......!'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا اور زبیر نے کمرے میں قدم رکھا۔

اسے دیکھتے ہی عبدالحق نے اخبار رکھا اور ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''زبیر بھائی......! آپ......؟ اس وقت......؟'' وہ کچھ پریشان ہو گیا۔

زبیر کی کیفیت بدل گئی تھی۔ عبدالحق کو دیکھتے ہی اسے کچھ ہونے لگا۔ ضبط کی کوشش میں چہرہ چٹخنے لگا۔ اس کے باوجود وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ تاہم خود تنویمی کی اس کیفیت میں وہ عبدالحق کی طرف بڑھتا رہا۔

اس کے آنسو دیکھ کر عبدالحق تڑپ گیا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

''اللہ خیر کرے زبیر بھائی......! کیا بات ہے......؟''

زبیر کے ہونٹ کپکپائے۔ لیکن آواز نہیں نکلی۔ وہ کسی معمول کی طرح عبدالحق کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

عبدالحق نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیسی ہی پریشانی ہو زبیر بھائی......! اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔''

یہ سن کر زبیر کو جھٹکا لگا۔

''ارے نہیں کاکا......!'' وہ رونا بھول گیا۔

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ بہت بڑی خوش خبری لایا ہوں۔ یہ شکر کے آنسو ہیں کاکا......!''

عبدالحق کے دل پر سے جیسے بوجھ ہٹ گیا۔

''مبارک ہو زبیر بھائی......!'' اس نے زبیر کو لپٹا لیا۔

''کچھ بتائیں گے نہیں......!''

''اماں کے کمرے میں چلیں......! سب کے سامنے بتاؤں گا۔''

عبدالحق اس کا ہاتھ تھام کر حمیدہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

کمرے میں ارجمند اور رابعہ پہلے ہی سے موجود تھیں۔ وہاں سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ نوعیت تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھی لیکن یہ احساس سبھی کو تھا کہ کوئی غیر معمولی خوش خبری ہے۔

عبدالحق حمیدہ کے پاس جا بیٹھا۔ زبیر نے مٹھائی کی ٹوکری کھولی۔

''اب بتا بھی دیں...... کیا خوش خبری ہے......؟'' ارجمند نے بے صبرے پن سے کہا۔

''ایسے نہیں......! پہلے منہ میٹھا ہوگا سب کا۔'' زبیر نے کہا۔ پھر عبدالحق سے مخاطب ہوا۔

''اب آپ پہلے اماں کا منہ میٹھا کرائیں کاکا......!''

عبدالحق نے زیرِ لب بسم اللہ پڑھ کر حمیدہ کو مٹھائی کھلائی۔

''اب اماں......! آپ کاکا کا منہ میٹھا کرائیں۔''

حمیدہ نے شفقت سے عبدالحق کا سر تھپتھپایا۔ پھر بڑی محبت سے مٹھائی اسے کھلائی۔

''اب میں خوش خبری سناتا ہوں۔'' زبیر نے کہا۔

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''میرے منہ میں خاک...... کاکا کو بے ایمان اور بدعنوان کہہ کر جس طرح نکالا گیا تھا، جس طرح انہیں بے عزت اور رُسوا کیا گیا تھا......'' یہ کہتے کہتے زبیر کی آواز رُندھ گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''......وہ میرے دل پر زخم کی طرح تھا۔ آج اللہ نے اپنی رحمت سے میرا وہ زخم بھر دیا۔''

عبدالحق سمیت سب سن ہو کر رہ گئے۔ کچھ کچھ تو سبھی سمجھ گئے تھے۔ لیکن بات پوری طرح کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''کیسے چاچا......؟'' ارجمند نے کہا۔

''ہم نے اس فیصلے کے خلاف کیس کیا تھا۔ آج عدالت نے فیصلہ سنا دیا کہ حکومت کا وہ اقدام غلط تھا، غیر منصفانہ اور قطعی طور پر بے بنیاد تھا۔ عدالت نے فیصلے

میں کہا کہ کاکا سے اس پر معذرت کرتے ہوئے انہیں فوری طور پر بحال کیا جائے۔ اور کاکا کو اختیار دیا گیا کہ جس طرح ان کی ساکھ کو نقصان پہنچا کر انہیں رسوا کیا گیا، اس پر وہ عزت ہتک کا دعویٰ کر کے ہرجانہ وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔''

زبیر کو ایک وقت میں اتنا بولتے نہیں سنا گیا تھا۔ سب حیران تھے۔

''هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ... الحمدللہ......!'' عبدالحق اور ارجمند نے بے ساختہ اور بیک وقت کہا۔ پھر حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک ہی لمحے میں ایک جیسے الفاظ......!

''اللہ تیرا شکر ہے......!'' حمیدہ اور رابعہ بھی بولیں۔

''وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ......'' اس بار بھی عبدالحق اور ارجمند کی آوازیں ہم آہنگ تھیں۔

''ادھر تو آ زبیر......!'' حمیدہ نے زبیر کو پکارا۔

زبیر اس کی طرف گیا تو حمیدہ نے مٹھائی اس کی طرف بڑھائی۔

''منہ کھول زبیر......! سب سے پہلا حق تو تیرا تھا۔''

''میرا تو یہ فرض تھا اماں......! کاکا کی بے عزتی کے خیال سے میں تو ہر پل سوچتا تھا کہ میں مر جاؤں گا۔'' اب زبیر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

حمیدہ نے دوسرے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے۔

''منہ تو کھول پگلے......!''

زبیر نے منہ کھولا۔ حمیدہ نے اس کا سر جھکا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

''تو نے ثابت کر دیا زبیر......! کہ تو میرا بڑا بیٹا اور عبدالحق کا بڑا بھائی ہے۔''

''مجھے تو خادم اور غلام ہی رہنے دیں اماں جی......!'' زبیر نے کھسیا کر کہا۔

عبدالحق اور ارجمند کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

حمیدہ نے ارجمند اور رابعہ کو مٹھائی کھلائی۔ پھر آواز دے کر نسیمہ کو بلایا۔

''یہ مٹھائی لے جاؤ۔ تم سب کے لئے ہے۔ اور انعام بھی ملے گا تم لوگوں کو۔''

نسیمہ خوشی خوشی مٹھائی لے گئی۔ حمیدہ نے ایک پلیٹ میں تھوڑی سی مٹھائی نورالحق اور ساجد کے لئے رکھ لی تھی۔

عبدالحق نے اُٹھ کر زبیر کو لپٹا لیا۔

''اللہ کی رحمت سے آپ نے میرے لئے وہ کچھ کیا زبیر بھائی......! جو کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔'' اس نے کہا۔

''بظاہر تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن عزت کی اس بحالی پر جو خوشی ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید میں اپنے دُکھ کو خود سے بھی چھپا رہا تھا۔ آپ نے بڑے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا زبیر بھائی......! اللہ آپ کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے دونوں جہانوں میں۔''

''میرے لئے آپ کی خوشی اور آپ کی دُعاؤں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے کاکا......!'' زبیر نے عبدالحق کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

''آج تو بہت زبردست دعوت ہونی چاہئے۔ کیوں نکی......؟'' حمیدہ نے ارجمند سے کہا۔

''کیوں نہیں دادی اماں......! جو حکم آپ کا۔''

''پہلے غریبوں اور مسکینوں کی دعوت ہونی چاہئے۔'' عبدالحق بولا۔

''اس کی فکر نہ کریں کاکا......!'' زبیر نے کہا۔

''میں بہت اچھے کھانے کا آرڈر دے کر آیا ہوں۔ دو گھنٹے بعد وہ داتا دربار پہنچا دوں گا اور خود بیٹھ کر لوگوں میں تقسیم کروں گا۔''

''الحمدللہ......! آپ ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں زبیر بھائی......!'' عبدالحق کے لہجے میں ستائش تھی۔

''اللہ کی مہربانی ہے سب آپ ہی سے سیکھا ہے کاکا......!'' زبیر نے عاجزی سے کہا۔

ارجمند نے رابعہ کو دیکھا جو دوپٹے میں منہ چھپائے ہوئے سسک رہی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عبدالحق کے ساتھ جو ہوا، وہ اسے سمجھتی بھی تھی اور اس کا دُکھ بھی کرتی تھی اور اب خوش بھی تھی۔

ارجمند نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''چچی......! یہ سب آپ کی دُعاؤں کا صلہ ہے۔''

❁❁❁

عبدالحق کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ذہن میں بہت سے سوالات تھے، جن کے جواب صرف زبیر کے پاس تھے۔

''کھانے کے لئے جائیں تو مجھے بھی ساتھ لے لیجئے گا زبیر بھائی......!''

''بہت بہتر کاکا......!''

ان دو گھنٹوں میں اس نے ظہر کی نماز پڑھی۔ شکر کے نوافل پڑھے۔ وہ اس کے لئے اتنی بڑی خوش خبری تھی کہ وہ جتنا بھی شکر ادا کرتا، کم تھا۔ اللہ نے اس کی عزت بحال فرمادی تھی۔

دو گھنٹے بعد زبیر نے دروازے پر دستک دی۔ پھر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''چلیں کاکا......!''

وہ اُٹھا اور اسٹڈی سے باہر آگیا۔

گاڑی زبیر ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

عبدالحق اپنی سوچوں کو مرتب کرتے ہوئے یہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بات کس طرح شروع کرے......؟ بالآخر اسے سرا مل ہی گیا۔

''بے شک زبیر بھائی......! یہ اللہ نے بہت بڑا کرم فرمایا ہے۔ لیکن یہ کوئی حتمی فتح تو نہیں ہے کہ ہم اس طرح جشن منائیں۔'' اس نے کہا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا کاکا......!''

''میرا مطلب ہے کہ یہ فیصلہ حکومت کے خلاف ہے اور حکومت کے پاس اپیل کا حق بھی ہوگا۔''

''یہ آپ نے ٹھیک کہا کاکا......! لیکن وہ اپیل نہیں کریں گے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں......؟''

''آپ اس لئے نہیں سمجھ پا رہے ہیں کاکا......! کہ آپ نے کیس میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لی۔ آپ کو پتا ہی نہیں کہ یہ کیس کس انداز میں چلا ہے......؟''

''میں نے اس لئے دلچسپی نہیں لی کہ حکومتوں سے لڑنا ممکن نہیں ہوگا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن خیر......! آپ مجھے سمجھائیں......!''

''بات یہ ہے کاکا......! کہ حکومت کے پاس نہ تو اپنے مؤقف کی تائید کے لئے کچھ تھا اور نہ ہی آپ کے خلاف۔''

''لیکن جج بھی تو انسان ہوتے ہیں۔ حکومت کا دباؤ جھیلنا ججوں کے لئے بھی آسان نہیں ہوتا۔''

''حکومت بھی کسی کی ماتحت ہوتی ہے کاکا......!'' زبیر نے بڑی سادگی سے کہا۔

''قادرِ مطلق کے سامنے تو کوئی دم نہیں مار سکتا اور اللہ چاہے تو کمزور سے کمزور انسان کو وہ طاقت عطا فرمادے کہ وہ طاقت ور ترین انسان کو زیر کرلے۔''

عبدالحق کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔

''یہ ہے میرا اللہ پر بھروسہ......!'' اس نے شرمندگی سے سوچا۔

''مگر کاکا......! وہ اپیل تو کر سکتے ہیں۔ اور اپیل کی سماعت کرنے والے ججوں پر دباؤ بھی ڈال سکتے ہیں۔''

''میں آپ کو بتا رہا ہوں کاکا......! کہ وہ اپیل نہیں کریں گے۔ یہ لیں، ہم باورچی تک پہنچ گئے۔ یہاں رُک کر میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔'' زبیر نے کہا اور دُکان کی سائیڈ میں گاڑی روک دی۔

وہ دونوں نیچے اُترے۔ دُکان کا مالک لپکتا ہوا ان کی طرف آیا۔

''پندرہ منٹ اور لگیں گے باؤ جی......! پھر میں دیگیں لدوا دوں گا گاڑی پر۔''

''ٹھیک ہے ہم انتظار کریں گے۔'' زبیر نے کہا۔

''او پولے......!'' دُکاندار نے اپنے ملازم کو للکارا۔

''یہاں کرسیاں لاکر سائے میں لگا صاحب لوگوں کے لئے......!''

پولا لپک کر دو کرسیاں لے آیا۔

"بیٹھیں کا کا.....!" زبیر نے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ عبدالحق زبیر کو استفسار طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بات یہ ہے کا کا.....! کہ ہم نے آپ کے سالانہ گوشواروں کی بنیاد پر کیس کیا تھا۔ وکیل صاحب پُر اعتماد تھے کہ یہ بہت بڑی مضبوطی ہے۔ لیکن آپ کے کردار اور خدمات کو اُجاگر کرنے کے لئے گواہوں کی ضرورت تھی۔ میں نے انہیں تفصیل سے بتایا اور انہیں حق نگر لے گیا۔ وہاں جا کر تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہاں کون ایسا ہے جس پر آپ کا احسان نہ ہو.....؟ اور وہ اس کا اعتراف نہ کرے.....؟ گواہی دینے کے لئے اتنے..... اور بڑے بڑے لوگ سامنے آئے کہ وکیل صاحب حیران ہو گئے۔ وہاں تو آپ کے حق میں جلوس بھی نکلتے رہے تھے اور اخبارات میں ان کی تفصیل تصاویر سمیت شائع ہوتی رہی تھی۔ دوسری طرف سیاسی طور پر وہاں کے ایم پی اے نے آپ کے خلاف بہت کچھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی۔ اس کے متعلق میں آپ کو بعد میں کبھی بتاؤں گا۔

تو وکیل صاحب نے وہاں سے کچھ گواہ منتخب کئے ان گواہوں نے، جو خاصے بڑے زمین دار ہیں، عدالت میں گواہی دے کہ وہ پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے صرف تن کے کپڑوں میں، بے سروسامانی کے عالم میں یہاں آئے تھے۔ آپ نے ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ حق نگر میں تمام زمین آپ کی تھی۔ آپ نے بلا قیمت انہیں زمین دی۔ بلکہ فصل کے اور گزر اوقات کے لئے ان کی مالی مدد بھی کی اور آج تک ان سے کچھ بھی نہیں لیا۔ انہیں بلا قیمت حق ملکیت دیا۔ وہ آج جو کچھ بھی ہیں، اللہ کے بعد صرف آپ کی وجہ سے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی حیثیت تو بادشاہوں کی سی تھی اور جس کے پاس بغیر کسی تعلق اور غرض کے لوگوں کو دینے کے لئے اتنا کچھ ہو، اسے ناجائز طریقوں سے مال حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے.....؟ اس پر سرکاری وکیل نے بڑا واویلا کیا۔ لیکن وہ آپ کے خلاف ایک گواہ بھی نہیں لا سکا۔" زبیر نے توقف کیا اور سر اُٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"آپ رو کیوں رہے ہیں کا کا.....؟"

"یہ تو اور بڑی رُسوائی ہوئی زبیر بھائی.....!"

"کیسے کا کا.....؟"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ جو کچھ تھا، اللہ کا دیا ہوا تھا اور میں نے مستحق لوگوں کی اس سے مدد کی تھی۔ یہ تو شہرت کے نام پر رُسوائی ہوئی۔"

"آپ غلط سوچ رہے ہیں کا کا.....!" زبیر نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"وہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی۔ حق نگر میں کون ہے جو یہ بات نہیں جانتا.....؟ جو الزام آپ پر لگا، اسے حق نگر میں کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔"

بات معقول تھی۔ یہ اللہ کی دی ہوئی عزت تھی۔ جو صرف اللہ ہی واپس لے سکتا ہے۔ اس سے محروم کرنا بندوں کے بس کی بات نہیں۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ.....!" اس نے دھیرے سے کہا۔

"لیکن یہ بتائیں کہ میں تو ہر روز اخبار پڑھتا ہوں۔ یہ تفصیل مجھے کیوں نظر نہیں آئی.....؟"

"حکومت نے عدالت سے استدعا کی تھی کہ فیصلہ آنے تک عدالتی کارروائی کی اشاعت سے اخبارات کو روک دیا جائے۔ کیونکہ یہ حکومت کی عزت اور ساکھ کا معاملہ ہے۔ اس پر ہمارے وکیل نے اعتراض کیا کہ میرے موکل کی تو تصویر بھی چھاپی گئی اور اسے اخبارات ہی کے ذریعے رُسوا کیا گیا۔ حالانکہ یہ کام محکمہ جاتی کارروائی کے ذریعے ہونا چاہئے تھا۔ تشہیر کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہمارا تو موقف ہی یہی ہے کہ بدنیتی سے، صرف بیوروکریسی کو رُسوا کرنے کی غرض سے دانستہ طور پر تشہیر کی گئی۔ اسی لئے ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کی یہ استدعا مسترد کی جائے۔"

عبدالحق کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔

"پھر.....؟"

"عدالت نے ہمارے وکیل کا استدلال تسلیم کیا اور حکومت کی درخواست مسترد کر دی۔"

"مگر اخبارات میں تو کچھ بھی شائع نہیں ہوا۔"

"حکومت نے اخبارات پر دباؤ ڈالا۔ سرکاری اشتہارات روکنے کی دھمکی دی۔ بڑے اخبارات اس دباؤ کے آگے جھک گئے۔ دائیں بازو کے چند اخبار اور رسالے البتہ ڈٹ گئے۔ تو ان کی کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔ ڈیکلیریشن منسوخ کر دیئے گئے۔ پریس سیل کر دیئے گئے۔"

"اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا......؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"کیسے پتا چلتا آپ کو......؟"

"مگر میں اب بھی حیران ہوں کہ فیصلہ ہمارے حق میں کیسے آیا......؟"

"اللہ کی مہربانی اور جج کی جرأت مندی۔" زبیر نے کہا۔

"اور آخر میں چچا جان کی گواہی نے تو شک و شبہے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔"

عبدالحق بری طرح چونکا۔

"کون چچا جان......؟"

"اپنے مسعود احمد صاحب......!"

"انہوں نے گواہی دی میرے حق میں......؟"

"گواہی کیا دی کاکا......! کیس کا فیصلہ ہی کرا دیا۔"

"یہ کب کی بات ہے......؟"

"ابھی صرف دو دن پہلے ہی۔"

عبدالحق کی سمجھ میں آ گیا۔ پچھلی بار مسعود صاحب نے کہا تھا کہ انہیں ایک بہت ضروری کام ہے، جس میں دو تین دن بھی لگ سکتے ہیں۔ انہوں نے اس پر بھی افسوس کیا تھا کہ وہی اسے زبردستی سول سروس میں لے گئے، جہاں اسے عزت کے بجائے رُسوائی ملی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے اللہ سے بہت دُعا کی ہے کہ وہ ان کے ذریعے ہی اس رُسوائی کا ازالہ کرائے۔

اسے افسوس ہونے لگا۔ اب مسعود صاحب دُنیا سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اس کی خاطر انہیں اپنا وہ کمرہ اور اپنی خوب صورت مصروفیات چھوڑ کر عدالت میں جانا پڑا۔

"انہیں زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی زبیر بھائی......؟" اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

"آپ بات سمجھے ہی نہیں کاکا......! مجھے تو شاید کئی دن تک اس بات کا پتا نہ چلتا۔ مگر انہوں نے اس صبح ہی مجھے فون کر کے بلایا اور اس خبر کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے ہی دعویٰ دائر کرنے کی بات کی۔ وکیل البتہ میرا تھا، جو ہمارے تمام قانونی معاملات سنبھالتا ہے۔ میں نے انہیں وکیل سے ملوایا۔ انہوں نے ہی اس کے ساتھ مل کر حکمت عملی طے کی۔ سب کچھ انہوں نے ہی کیا ہے کاکا......!"

عبدالحق کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔ اللہ نے کیسی کیسی سچی اور پیاری محبتیں اسے عطا کی ہیں۔ واقعی...... مسعود صاحب اس سے اپنے بیٹے جیسی محبت کرتے تھے۔ اس نے کہا۔

"آپ پہلے بتا دیتے کاکا......! مجھے سب سے پہلے چچا جان کو فون کرنا چاہئے تھا۔"

"یہ فون کرنے کی بات نہیں کاکا......! ابھی کھانا نمٹا کر، مٹھائی لے کر ان کے گھر چلیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ترتیب اللہ کو خوش کرنے والی ہے۔"

اسی وقت دُکاندار ان کے پاس چلا آیا۔

"دیگیں گاڑی پر رکھوا دی ہیں باؤ جی......!"

زبیر نے کھانے کی ادائیگی کی اور دیگوں والی گاڑی کے ڈرائیور سے کہا۔

"ہمارے پیچھے پیچھے چلنا۔"

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے۔ زبیر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بڑھا دی۔

عبدالحق کا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ سب سے پہلے اسے مسعود صاحب کو مبارک باد دینی چاہئے تھی اور ان کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں، اسے زبیر کی آخری بات اچانک یاد آئی کہ مجھے تو لگتا ہے، یہ ترتیب اللہ کو خوش کرنے والی ہے۔ وہ اس پر غور کرنے لگا۔

"ترتیب......؟"

پھر وہ چونکا۔ ترتیب کی تو بڑی اہمیت ہے۔ اور ترتیبیں سب سے پہلے اللہ کا

شکرادا کرنا چاہئے، پھر اس کا شکریہ، جسے اللہ نے مدد کا وسیلہ بنایا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ میں نے ترتیب کا خیال رکھا۔ الحمدللہ......! میں نے سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا۔''

''تو پھر زبیر بھائی نے ترتیب کی بات کیوں کی......؟''

وہ زبیر کی بات کو ایک سادہ آدمی کی بات قرار دے کر نظرانداز کرنے ہی والا تھا کہ اس کے ذہن میں لفظ ترتیب بجلی کی طرح کوندا۔

''جس ترتیب کی بات زبیر بھائی نے کی، اس پر غور تو کیا جائے۔ عملاً وہ ترتیب ہے کیا......؟''

''ہم نے اللہ کی اس رحمت پر، اس کامیابی پر اللہ کا شکرادا کیا۔ اس خوشی میں گھر والوں اور ملازمین کا منہ میٹھا کیا۔ گھر میں دعوت کا اہتمام کرنے سے پہلے زبیر بھائی نے اللہ کے محروم بندوں کی دعوت کا اہتمام کیا اور اب ہم وہ دعوت کرنے جا رہے ہیں۔

اللہ کے محروم، مسکین بندوں کی دعوت!''

اس کے ذہن میں اپنے ہی الفاظ گونجے اور اس کے ساتھ ہی روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔

''زبان سے شکر ادا کیا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ آدمی کو اپنی حیثیت کے مطابق عملی طور پر بھی تو شکر ادا کرنا ہوتا ہے۔ اللہ کو خوش کرنے کی کوشش بھی تو کرنی ہوتی ہے اور اللہ کو خوش کیسے کیا جائے......؟

اللہ کے بندوں کو خوش کیا جائے۔ اللہ کے دیئے ہوئے مال سے بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، محروموں کی محرومی کو بساط بھر کم کرنے کی کوشش کی جائے، اللہ کے دیئے ہوئے مال سے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جائے تو اللہ بہت خوش ہوتا ہے۔ یہی تو ہے ترتیب۔''

عبدالحق کو زبیر پر رشک آنے لگا۔ کتنی سادگی، بے پرواہی اور بے ساختگی سے اس نے اتنی گہری بات کہہ دی۔ وہ تو زبیر سے یہ اُمید نہیں کرسکتا تھا۔ بے شک، اللہ جسے جتنا چاہے، نواز دے۔ اللہ کے نیک بندوں کی محبت سے بہت کچھ ملتا ہے

آدمی کو۔ جو زبیر نے اتنی آسانی سے کہا، وہ تو اسے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کو تو اس بات کو سمجھنے میں بھی اتنی دیر لگی۔

''واقعی......! یہی تو ہے ترتیب......!''

وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ زبیر نے گاڑی روک دی۔ وہ داتا دربار پہنچ گئے تھے۔

دیگیں اُتاری گئیں۔ کھانے کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ بھی تین افراد آئے تھے۔ ان میں سے ایک دیگ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ کہا۔ ڈرائیور ان دونوں کی طرف چلا آیا۔

''آپ لوگوں کو لا کر دوں باؤ جی......!'' اس نے پوچھا۔

زبیر ہچکچایا۔ مگر عبدالحق کو اس سلسلے میں اپنا ایک بہت پرانا تجربہ یاد آ رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔

''ہاں......! ہمارے لئے بھی لے کر آؤ......!''

اتنی دیر میں دُکان کے دو ملازموں نے آوازیں لگانا شروع کر دیں تھیں۔

''آؤ بھی آؤ......! لنگر آیا ہے......!''

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کھانا لینے والوں کی قطار لگ گئی۔ دیگ والے نے انہیں کھانا دینا شروع کر دیا۔

ڈرائیور گاڑی کی طرف گیا۔ وہاں سے اس نے دو صاف ستھری پلیٹیں لیں اور کھانا تقسیم کرنے والے کی طرف چل دیا۔

''جو کھانا ہم اللہ کو خوش کرنے کے لئے اس کے بندوں کو کھلا رہے ہیں، ہمیں خود بھی تو اس میں سے کھانا چاہئے۔'' عبدالحق نے زبیر سے کہا۔

''پتا تو چلے کہ اچھا بھی ہے یا نہیں......؟ آدمی دوسروں کو وہ کچھ دے جو خود اسے اچھا لگے۔ میں یہاں اس بات کو اُلٹ کر دیکھتا ہوں۔ جو ہم دوسروں کو دے رہے ہیں، وہی خود بھی لینا چاہئے۔''

''میں آپ کے خیال سے ہچکچا گیا تھا کاکا......!'' زبیر نے شرمندگی سے کہا۔

ڈرائیور نے انہیں کھانا لا کر دیا۔ اُدھر لنگر لینے والوں کی قطار اور طویل ہوگئی تھی۔

عبدالحق اور زبیر نے بھی کھانا شروع کیا۔ عبدالحق نے پہلا لقمہ لیتے ہی تعریفی لہجے میں کہا۔

''الحمدللہ......! کھانا بہت اچھا ہے زبیر بھائی......!''

''اللہ کا شکر ہے کاکا......! کاش اللہ کو بھی پسند آئے اور وہ اسے قبول فرمائے......!''

عبدالحق نے دل میں آمین کہا۔

کھانا بہت تھا۔ وہ بارہ دیگیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن لنگر لینے والے بھی نہ جانے کہاں سے اُمنڈ آئے تھے۔ ان کی قطار لمبی ہوتی جا رہی تھی۔

ان دونوں نے کھانا ختم کیا۔ قریب کھڑے ڈرائیور نے پلیٹیں ان سے لیتے ہوئے پوچھا۔

''اور دوں سرکار......؟''

عبدالحق نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''الحمدللہ......!'' پھر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے ڈرائیور سے کہا۔

''تم لوگوں کو بھی تو کھانا ہے۔''

ڈرائیور مسکرایا۔

''آپ ہماری فکر نہ کریں۔''

''نہیں......! یہ بھی ضروری ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے۔''

''تارا ہم لوگوں کے لئے کھانا نکال کر رکھ لے گا باؤ جی......! پر ہم آخر میں کھائیں گے۔''

''چلو......ٹھیک ہے......!''

ڈرائیور گاڑی کی طرف گیا۔ وہاں سے اس نے دو اور پلیٹیں لیں اور کھانا نکالنے والے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس سے کچھ کہا۔ دیگ پر بیٹھے ملازم نے چار پلیٹوں میں کھانا نکال دیا۔ ڈرائیور اور دوسرا آدمی ان پلیٹوں کو گاڑی کی طرف لے

گئے۔

عبدالحق نے اطمینان کی سانس لی۔ سب کام اچھی طرح ہوگئے تھے۔ وہ زبیر کی طرف مڑا۔

''اب چلیں زبیر بھائی......؟''

زبیر نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت تھی۔

''ابھی تو کھانا باقی ہے کاکا......!''

عبدالحق اس وقت مسعود صاحب کے پاس جانے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''الحمدللہ......! سب کچھ تو ہوگیا زبیر بھائی......! کھانا تو یہ لوگ تقسیم کر ہی دیں گے۔''

''آپ کو برا نہ لگے تو ایک بات کہوں کاکا......!''

''آپ بڑے بھائی ہیں میرے۔ یہ مجھ سے اتنا تکلف کرنا کب چھوڑیں گے۔'' عبدالحق جھنجلا گیا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کاکا......! کہ آپ گاڑی لے کر چلے جائیں۔ میں رکشے میں آجاؤں گا۔''

''لیکن کیوں زبیر بھائی......! ساتھ ہی چلیں نا۔ مٹھائی لے کر چچا جان کی طرف چلنا ہے۔''

زبیر چند لمحے ہچکچایا پھر بولا۔

''ابھی میرا یہاں رُکنا ضروری ہے کاکا......!''

''کیوں......؟''

''ذمہ داری کی بات ہے کاکا......!''

''میں سمجھا نہیں......!''

زبیر پھر ہچکچایا۔

''مجھے اتنا کچھ پتا نہیں کاکا......! سچ یہ ہے کہ میں تو کچھ سمجھتا بھی نہیں۔ لیکن مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ کو بندے کے ہر کام کو احسن طریقے سے پوری ذمہ

داری کے ساتھ کرنا بہت پسند ہے۔''

''بالکل ٹھیک زبیر بھائی.... !لیکن میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھا۔''

''بات میری نہیں، مولوی صاحب کی ہے کاکا.....! میں تو بس سمجھنے کی اور سمجھ کر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' زبیر کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی۔

''مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اپنے کام کو پوری ذمہ داری، سچائی اور دیانت داری سے کرنا اللہ کے ہاں عبادت ہے۔ اللہ ایسے لوگوں سے خوش ہوتا ہے۔ جب سے یہ بات مولوی صاحب نے سمجھائی ہے، میں اس پر عمل کرنے کوشش کرتا ہوں۔ اطمینان تو نہیں ہوتا پر مولوی صاحب کہتے ہیں کہ بندے کی کوشش تو خام ہی ہوتی ہے۔ لیکن اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ بندے کی کوشش اور اس کے خلوص کے مطابق اس کی خامی کو بخش دیتا ہے اور اس کے کام کو قبولیت عطا فرماتا ہے۔''

عبدالحق نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''بات تو ٹھیک ہے زبیر بھائی.... !لیکن اس وقت ایسا کیا ہے.....؟''

''یہ تو اپنے کام کی، دنیاوی کام کی بات ہے کاکا.....! اور مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ کے حکم پر عمل کرنا تو جیسے اللہ کا کام ہوا۔ تو اللہ کا کام تو بہت ہی ذمہ داری سے کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ نیکی کرنا اور بات ہے۔ پر نیکی تو بس وہ ہے جو صرف اور صرف اللہ کو خوش کرنے کے لئے کی جائے۔ تو اللہ کو خوش کرنے کے لئے کچھ کرنا تو سب سے بڑا کام ہوا۔ اس میں تو غیر ذمہ داری ہونی ہی نہیں چاہئے۔''

عبدالحق کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جتنا عرصہ اس نے کراچی میں گزارا تھا، اس عرصے میں زبیر تو کچھ کا کچھ ہو گیا تھا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا زبیر بھائی.....!'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''میری اپنی سمجھ میں بھی کچھ کچھ ہی آیا ہے کاکا.....! بس کوشش کرتا رہتا ہوں۔ آپ کو کیا بتا سکتا ہوں.....؟'' زبیر نے عاجزی سے کہا۔

''اس معاملے میں جو آپ نے سمجھا، وہ تو بتا دیں مجھے.....!''

زبیر از حد شرمندہ نظر آنے لگا۔ اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔

''بتائیں نا زبیر بھائی.....! مجھے اُلجھن ہو رہی ہے۔''

''میری سمجھ میں تو یہی آیا ہے کاکا.....! کہ اللہ نے ہم پر بہت بڑا کرم فرمایا۔ بہت بڑی کامیابی اور عزت عطا فرمائی۔'' زبیر نے اٹک اٹک کر کہا جیسے مجبوراً بول رہا ہو..... نہ چاہنے کے باوجود۔ اب ہم نے جو اللہ کے دیئے ہوئے مال کے زور پر اس کے بندوں کو کھانا کھلانے کا یہ اہتمام کیا تو اس کے اس کرم پر شکر ادا کرنے کے لئے کیا، اور اسے خوش کرنے کے لئے کیا۔''

''بے شک زبیر بھائی.....! اللہ اسے قبول فرمائے۔ یہی بات ہے۔''

''تو ہم نے یہ کام اللہ کے لئے ہی کیا ہے نا..... اللہ کا شکر ادا کرنے، اسے خوش کرنے کے لئے۔''

''بے شک.....!''

''اسی لئے مجھے مولوی صاحب کی بات یاد آ گئی۔ اس کام کو پوری ذمہ داری کے ساتھ کرنا ہے۔ غیر ذمہ داری کی گنجائش ہی نہیں۔ ورنہ ہم خدانخواستہ اس کی قبولیت سے محروم ہو جائیں گے۔''

''کھانا لے آئے الحمد للہ.....! تقسیم بھی ہو رہا ہے۔ ذمہ داری پوری نہیں ہوگئی ہماری۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کاکا.....!'' زبیر نے عاجزی سے کہا۔

''لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ آپ چلے جائیں نا.....!''

''آپ کا دل مطمئن کیوں نہیں ہے.....؟''

''دُنیا میں ہزار طرح کی بے ایمانیاں ہوتی ہیں کاکا.....! چیز کو مستحق لوگوں تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اور اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا ان کو بھی آزمائش میں ڈالنا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں زبیر بھائی.....!''

زبیر نے ایک گہری سانس لی۔ پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

''الحمد للہ.....! کاکا.....! ہم بارہ دیگیں لائے ہیں اور کھانا بھی ایسا ہے کہ جو ہم اپنے لئے پسند کریں اور شوق سے کھائیں۔ آپ دیکھیں، ابھی کھانا آدھا بھی تقسیم نہیں ہوا ہے۔ ہماری ذمہ داری بھی پوری نہیں ہوئی۔ ابھی ہم چلے جائیں اور یہ اِدھر

اُدھر بیٹھے دکاندار ان کھانا لانے والوں کو لالچ دلائیں یا ان کے دل میں خود ہی لالچ آجائے ....."

"بس زبیر بھائی.....! میں سمجھ گیا۔" عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سامنے کی بات تھی، مگر میں سمجھ نہیں سکا۔" اب اس کے لہجے میں زبیر کے لئے ستائش تھی۔

"آپ نے مجھے سمجھا دیا پوری طرح۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ دونوں کھانا تقسیم ہوتے دیکھنے لگے۔ حیرت انگیز طور پر قطار سمٹنے کے بجائے اور طویل ہوگئی تھی۔ چھٹی دیگ چل رہی تھی۔

"آپ چلے جائیں ناکاکا.....!" زبیر نے عبدالحق سے کہا۔

"میں چچا جان کے پاس کل چلا جاؤں گا۔"

عبدالحق کہنا چاہتا تھا کہ وہ بھی ذمہ داری نبھانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ کہنا اسے اچھا نہیں لگا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔

"مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ اس وقت چچا جان آرام کر رہے ہوں گے۔ رات کو فون کر کے ان کے پاس چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے کاکا.....!"

❁❁❁

رات کو عبدالحق نے مسعود صاحب کو فون کیا اور آنے کی اجازت چاہی۔

"بیٹے.....! برا نہ مانو تو ایک بات کہوں.....؟" مسعود صاحب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے چچا جان.....! کہ میں آپ کی کسی بات کا برا مانوں.....؟"

"تو اس وقت رہنے دو۔ صبح آجاؤ.....! وہ وقت تمہارے ساتھ گزارنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"جی.....! بہت بہتر چچا جان.....! میں کل حاضر ہو جاؤں گا۔"

اس رات وہ اپنی اسٹڈی میں دیر تک زبیر اور اس کی باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ حیران اس لئے تھا کہ زبیر کے اندر آنے والے انقلاب سے بے خبر رہا

تھا۔ جتنا عرصہ وہ کراچی میں رہا۔ اس دوران اللہ نے زبیر کو بہت نوازا تھا۔ مگر اسے پتا نہیں چل سکا تھا۔

وہ جب جدا ہوئے تو زبیر کے بارے میں وہ بس اتنا جانتا تھا کہ اللہ نے زبیر کو تعلیم سے محرومی کے باوجود زمین جائیداد اور کاروبار کے معاملات میں غیر معمولی فہم و فراست عطا کی ہے اور یہ بھی کہ اسے لوگوں کی بڑی پہچان ہے۔ اور وہ بہت اچھا منتظم بھی ثابت ہوا ہے۔ محنتی، اَن تھک، کام کرنے والا، اس کا وفادار اور اس سے عشق کرنے والا تو وہ پہلے ہی سے تھا۔

مگر جب سے برطرفی کا معاملہ ہوا تھا، زبیر ہر ہر مرحلے پر اسے حیران کر رہا تھا۔

اس کی برطرفی کا علم ہوتے ہی جس تیزی سے وہ حرکت میں آیا، وہ اس کے لئے حیران کن تھی۔ بے شک، چچا جان نے اس کی رہنمائی کی، لیکن مستعدی اور معاملہ فہمی تو اس کی اپنی تھی۔

اور سب سے بڑھ کر اس کی قوتِ فیصلہ.....! وہ تو عبدالحق کے لئے قابلِ رشک تھی۔ وہ لاہور سے کراچی آیا تو اپنے طور پر یہ فیصلہ کر کے آیا کہ شفٹنگ کے تمام معاملات وہ سنبھال لے گا۔ گھر کے تمام لوگوں کو فوری طور پر لاہور چلا جانا ہے تاکہ انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔

پھر لاہور میں اس پر انکشاف ہوا کہ زبیر نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔

اور قوتِ فیصلہ کے ساتھ اس میں خود اعتمادی کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس نے زبیر سے عارف بھائی کے لئے کچھ سوچنے کو کہا۔ وہ کسی کے لئے بھی کچھ کہتا تو زبیر ضرور کرتا۔ وہ تو اس کے لئے فرض تھا۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اس نے عارف بھائی کو تولا بھی۔ اور سمجھ لیا کہ وہ ان کے لئے بہت کارآمد ہو سکتے ہیں اور جب اس نے یہ بات سمجھ لی تو پھر اس نے اپنے طور پر پورے اعتماد کے ساتھ اقدام کیا۔

اس نے زبیر سے عارف بھائی کے لئے رہائش کا بندوبست کرنے کو کہا تھا۔ اس کے اپنے ذہن میں کرائے کے مکان کا خیال تھا۔ لیکن زبیر نے عارف بھائی کے لئے مکان خرید لیا اور جس طرح اس نے ان سے معاملات طے کئے، وہ اس کی غیر

معمولی فراست تھی۔ اس نے ان پر واضح کر دیا کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ ان پر عنایت نہیں، ان کی صلاحیتوں کا بدل ہے۔

اور اب یہ آج کے معاملات......! اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس کی عملی زندگی میں اس کی دینی فراست کارفرما تھی۔ اور ثابت ہو گیا تھا کہ اس کی دینی فراست بھی غیر معمولی ہے۔

اللہ نے اسے کتنا نوازا تھا۔

اس پر اچانک عبدالحق کو نواب صاحب یاد آ گئے۔ نواب اشرف علی خان، جو اپنی تمام دولت، عیاشی کی نذر کرنے کے بعد کوٹھے پر پڑے رہتے تھے، اور اشرف علی خان سے اچھو میاں بن گئے تھے۔ تماش بینوں کے چھوٹے موٹے کام کر دیتے تھے۔ بدلے میں دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی اور وہ کوٹھے پر ہی پڑ کر سو رہتے تھے۔

کہاں تھے اور وہ کہاں آ گئے تھے......؟

پھر ان کے دل میں اللہ نے نادرہ اور ارجمند کی محبت ڈال دی۔ اس شخص کے دل میں جس نے رشتے دیکھے ہی نہیں تھے، جو رشتوں کی اہمیت اور نزاکت سے بے خبر تھا، بے آبروئی کے کوچے میں رہنے والے کو اللہ نے کسی کی آبرو کی فکر کرنا نصیب فرمایا۔

واقعی......اللہ جسے جتنا چاہے، نواز دے۔

اللہ نے ہی وہ محبت ان کے دل میں ڈالی، گویا ان کے لئے بہتری کا راستہ منتخب فرمایا۔ اس کے نتیجے میں ان کے اندر بہتری پیدا ہوتی گئی۔ اللہ نے اس کوٹھے پر رہتے ہوئے انہیں دین کی رغبت عطا فرمائی۔ نماز، روزے، تراویح عطا فرمائی۔ کوٹھے جیسے مقام پر اللہ نے انہیں رزقِ حلال عطا فرمایا۔

واقعی.....اللہ جسے چاہے نواز دے، اور جتنا چاہے نواز دے۔

اور اس کے بعد اللہ نے اصلاح کا عمل مکمل فرما کے انہیں پاکی کے مرحلے میں داخل فرمایا۔ جب نادرہ اللہ کو پیاری ہوئی اور ارجمند کی ذمہ داری اس نے قبول کر لی تو نواب صاحب آزاد ہو گئے۔ وہ حضرت علی ہجویریؒ کے در کے ہو رہے۔ دنیا سے دُور، دُنیا سے بے نیاز، بس اللہ ہی اللہ۔

عبدالحق محسوس کر سکتا تھا کہ نواب صاحب نے کیا سوچا ہوگا......؟ انہوں نے سوچا ہوگا کہ اب وہ زندگی کی آخری سانس تک اسی در پر پڑے رہیں گے۔ اور وہ توبہ استغفار میں گم یہ سوچ سوچ کر لرزتے ہوں گے پتا نہیں، اللہ ان کے گناہ بخشے گا بھی یا نہیں۔ انہیں تو یہی ایک فکر ہوگی کہ مرنے سے پہلے ان کی بخشش ہو جائے۔ انہیں تو دنیا کی کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ غرض تو اس وقت بھی نہیں تھی، جب وہ کوٹھے پر ذِلت کی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر انہوں نے اس ذِلت کو ہنسی خوشی اپنے اعمال کی سزا سمجھ کر قبول کیا تھا۔ ایک نواب، جس کے اُچھالے ہوئے سکوں کی کھنک کے بعد ہی بازار میں گھنگھروؤں کی جھنکار شروع ہوتی تھی۔ اپنے سکے گنوانے کے بعد وہ ایک طوائف ایک نائیکہ کا مصاحب بن گیا تھا۔ یہ کوئی چھوٹی ذِلت نہیں تھی۔ اس ذِلت کے احساس سے تو آدمی مر جائے اور یقیناً نواب اشرف علی خان وہاں پل پل مرتے ہوں گے۔

داتا دربار کی چوکھٹ پر سب کچھ بھول کر، حتیٰ کہ خود کو بھی بھول کر وہ اس خوف میں جیتے ہوں گے کہ کہیں بخشش اور مغفرت کے بغیر ہی انہیں موت نہ آ جائے۔

لیکن اللہ کو صرف ان کی بخشش اور مغفرت ہی منظور نہیں تھی۔ اس نے تو ان کے لئے کوئی اور ہی مقام چن رکھا تھا۔ اس نے ان کے لئے بہت بڑا اعزاز رکھ دیا تھا۔ وہ اعزاز، جس پر عبدالحق کو رشک آتا تھا، جس اعزاز کے بدلے وہ اپنا سب کچھ چھوڑ سکتا تھا۔

اللہ نے کیا سعادت انہیں عطا فرمائی۔ بیت اللہ شریف میں رہنا، اس فرش کو چمکانا، جہاں کا ایک سجدہ دنیا کی تمام نعمتوں سے افضل ہے۔ اللہ نے انہیں وہاں بلا لیا۔

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ......

بے شک......! صرف اور صرف اللہ ہی تو جانتا ہے کہ اس کا کون سا بندہ کس لائق ہے......؟ اور وہی جانتا ہے کہ کس کو کیا عطا کرنا ہے اور کتنا عطا کرنا ہے۔ اس نے نواب اشرف علی خان عرف اچھو میاں کو طوائف کے کوٹھے سے اُٹھا کر روئے زمین پر

سب سے معزز مقام پر پہنچا دیا۔ اپنے گھر کا، اپنا ذاتی ملازم اور خدمت گار بنایا۔ عام انسانوں کے لئے اس سے بڑا کون سا درجہ ہو سکتا ہے......؟

اور وہ، عبدالحق جسے اللہ نے اوتار سنگھ سے عبدالحق بنایا، دُنیا کی ہر نعمت عطا فرمائی۔ لیکن تمام وسائل موجود ہونے کے باوجود وہ اس پاک سرزمین پر بھی قدم نہیں رکھ سکا، جہاں اللہ کا گھر موجود ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے، لیکن ناکام ہے، کیونکہ میزبان کی طرف سے منظور نہیں ہے۔ بے وسیلہ اچھو میاں، جنہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ وہاں جا سکتے ہیں، وہاں مقیم ہیں۔ اور جس نے اللہ کے عطا کئے ہوئے وسائل کے زور پر وہاں سے آئی ہوئی دعوت یہ کہہ کر مسترد کی کہ میں تو الحمدللہ اپنے طور پر بھی وہاں جا سکتا ہوں اس لئے یہ موقع کسی محروم کو دے رہا ہوں، آج تک اللہ کے دیئے ہوئے تمام وسائل کے باوجود اس کے گھر کی دید سے بھی محروم ہے۔

''وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ......''

ایں سعادت بزورِ بازو نیست!

وہ روتا رہا۔ اس رات وہ بہت رویا۔

اور جب وہ سونے کے لئے لیٹا تو اسے پھر زبیر کا خیال آیا۔ زبیر نے خود اپنے انقلاب کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ باقاعدگی سے مولوی مہر علی کے پاس جاتا ہے، ان کی باتیں سنتا اور ان سے سیکھتا ہے۔

اس لمحے عبدالحق مولوی مہر علی کے پاس جانے کو ہڑک گیا۔ اللہ، اس کے رسولؐ، اور اس کے کلام سے محبت کرنے والے، قرآن کو پڑھنے، سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے والے مولوی مہر علی کی صحبت میں یقیناً بڑا فیض تھا اور وہ اتنے عرصے سے ان سے دُور تھا، ان سے مل تک نہیں سکا۔

اس نے سوچا، اب کچھ بھی ہو جائے، وہ ان کے پاس جا کر رہے گا۔

❁❁❁

اگلے روز زبیر نے پھر اسے حیران کر دیا۔

''زبیر بھائی......! آج چچا جان کے ہاں چلنا ہے۔'' اس نے ناشتے پر اسے یاد دلایا۔

''ایک بات کہوں کا کا......! غلط نہ سمجھئے گا۔''

''آپ کہیں تو......''

''مجھے رہنے دیں۔ میں کسی بھی وقت چلا جاؤں گا ان کے پاس......!''

''کیوں زبیر بھائی......؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ آپ سے اکیلے میں ملنا چاہیں گے۔ میرے آپ کے ساتھ ہونے سے بہت فرق پڑے گا۔''

عبدالحق نے کچھ دیر اس پر سوچا۔ رات چچا جان نے کہا تھا۔ اس وقت رہنے دو، صبح آ جاؤ۔ وہ وقت تمہارے ساتھ گزارنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اور پھر عبدالحق کو مسعود صاحب کے اس کمرے کا خیال آیا۔ جہاں آنے اور بیٹھنے کی انہوں نے صرف اسے اجازت دی تھی۔ انہیں اس کے ساتھ وقت گزارنا اس لئے اچھا لگتا تھا کہ وہ اس سے اللہ اور اس کے کلام کی باتیں کرتے تھے۔ وہ ایک طرح سے ان کی خلوت تھی، جس میں ازراہِ شفقت و محبت انہوں نے اسے بھی شامل کر لیا تھا۔ اب اگر وہ زبیر کے ساتھ جاتا تو یا تو وہ انہیں اس کمرے میں لے کر ہی نہ جاتے اور ان کے درمیان محض رسمی بات چیت ہوتی۔ حالانکہ وہ ایسا چاہتے نہیں تھے۔ اور اگر وہ اس کی مروّت میں زبیر کو بھی بلا لیتے تو انہیں اچھا نہ لگتا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں زبیر بھائی......!'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ اسے حیرت تھی کہ زبیر نے یہ بات کیسے سمجھ لی۔ اور وہ کیوں نہ سمجھ سکا......؟ اور اس نے اپنے ہاتھ سے ان کا منہ میٹھا کرایا۔

چچی جان ان کے لئے چائے لے کر آئیں۔ مٹھائی اس نے اندر بھجوا دی۔

''بہت بہت مبارک ہو بیٹے......!'' چچی جان نے کہا۔

''خیر مبارک چچی جان......! یہ سب اللہ کے فضل سے اور چچا جان کی وجہ سے ممکن ہوا۔''

وہ چائے پی چکا تو مسعود صاحب نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''آؤ......! اب اپنے کمرے میں چلیں......!''

جس طرح سے انہوں نے اپنے کمرے میں اسے شریک کیا تھا، اس نے

عبدالحق کے دل کو چھولیا۔ وہ کمرے میں جا کر بیٹھے۔

''میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں چچا جان ......!''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔'' مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اس موقع پر میں یہ فرض نہ نبھاتا تو اللہ کے ہاں جواب دہی ہوتی میری۔ یہ میری ذمہ داری تھی۔''

''ایسی کیا بات ہے چچا جان ......! میں عاقل و بالغ آدمی تھا۔''

''اب تم اور زیادہ عاقل و بالغ ہو۔ لیکن میرے اصرار پر کوئی ناپسندیدہ کام بھی کر سکتے ہو۔ اسے محبت، لحاظ اور مروّت کہتے ہیں۔''

''لیکن آپ نے اصرار تو نہیں کیا تھا۔''

''مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے میاں ......! میں تمہارے پیچھے پڑ گیا تھا۔''

''لیکن اس میں آپ کی اپنی تو کوئی غرض نہیں تھی۔''

''بے شک ......! میری نیت اچھی تھی۔ میں تو ملک اور قوم کے لئے بہت اچھی سرمایہ کاری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' مسعود صاحب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

''ایک بات کروں بیٹے ......! ذرا تفصیلی ......؟''

''فرمائیں نا چچا جان ......!''

''اللہ نے بہت فضل فرمایا۔ ہمیں ایک آزاد ملک عطا فرمایا۔ یہ پاکستان بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن بیشتر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے۔ اب جو کچھ میں کہنے والا ہوں، وہ میرے مشاہدات اور ان سے اخذ کئے ہوئے ممکنہ نتائج پر مبنی ہے۔ بات ذرا طویل ہے۔'' وہ پھر ہچکچائے۔

''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں چچا جان ......!''

''ایک تو وہ بنیادی غلطی ہے، جو ہم انفرادی طور پر کرتے ہیں اور وہ بہت عام ہے۔ ہمیں کچھ ملے تو ہم دینے والے ہاتھ کو دیکھتے ہیں۔ اللہ کو ہم دیکھ نہیں سکتے، اس لئے سوچتے بھی نہیں۔ سوچیں تو تب، جب وہ ہماری روح میں اُترا ہوا ہو۔ تو ہم ظاہری طور پر دینے والے کا احساس مانتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ وہ دینے والا

ہاتھ بھی اللہ کا بنایا ہوا ہے اور جو چیز دی گئی، وہ بھی اللہ کی ہے۔ اور اللہ کا حکم نہ ہوتا تو وہ دینے والا ہاتھ بھی ہماری طرف نہیں بڑھتا، ہم پر مہربان نہ ہوتا۔ یہی غلطی ہم اجتماعی طور پر بھی کرتے ہیں۔ پچیس سال ہو گئے پاکستان بنے ہوئے، میں جس کے منہ سے سنتا ہوں، یہی سنتا ہوں کہ پاکستان قائداعظم نے بنایا۔ کوئی کہتا تو دُور کی بات، یہ سوچتا بھی نہیں کہ یہ اللہ کی عطا کی ہوئی بے مثال نعمت ہے۔ اس کی خوب صورتی دیکھو، اس کے وسائل دیکھو، اور زمین میں چھپے خزانوں کا تو ہمیں علم ہی نہیں۔ یہ روّیہ ایک طرف اللہ سے دُور کرتا ہے اور دوسری طرف اجتماعی ناقدری کو فروغ دیتا ہے۔ اور یاد رکھو، ناقدری بدبختی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔''

آخری بات سن کر عبدالحق کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ اس نے دل میں اللہ سے پناہ مانگی۔ ابھی تو ملک دولخت ہوا ہے۔ کیا خدانخواستہ یہ بدبختی کا آغاز ہے۔

''لوگ تو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔'' مسعود صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں نے سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھا اور اللہ کے فضل سے سب کچھ سمجھا ہے۔ پاکستان کا قیام معجزہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن پاکستان کا قائم رہنا اس سے بھی بڑا معجزہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تقسیم ہند کے دوران صرف پاکستان کی تشکیل کے معاملے میں ہی نہیں، بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان دولت اور وسائل کی تقسیم میں حد درجہ بے انصافی کے ذریعے سازش کی گئی۔ مقصد صرف پاکستان کو ناکام بنانا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان ہندوؤں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے کہ ہمیں دوبارہ ہندوستان میں شامل کر لو اور یقین کرو بیٹے ......! کہ جو ظاہری حالات تھے، ان میں ایسا نہ ہونا بہت بڑا معجزہ ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ معجزے صرف اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور اللہ کا شکر کہ ایسا نہیں ہوا۔ ہو جاتا تو مسلمانوں کے مقدر میں ہندوؤں کی غلامی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ تمہیں تو معلوم ہے، کسی حد تک تم نے بھی دیکھا ہے۔ پاکستان کی معاشی اور اقتصادی صورتِ حال کیسی ابتر تھی۔ ہمیں ہمارے حق سے بہت کم دینے کا وعدہ کیا گیا۔ پھر وہ وعدے بھی پورے نہ ہوئے۔ اس میں بھی ڈنڈی ماری گئی۔ مقصد بس پاکستان کو ناکام بنانا تھا۔ اور یہاں جو سیاسی صورتِ حال

تھی، عدم استحکام تھا، وہ ان کے لئے اور خوش آئند تھا۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ۶۰ء کی دہائی شروع ہوتے ہی پاکستان ہندوستان سے زیادہ خوش حال ہو گیا۔ پاکستانی روپے کی قیمت ہندوستانی روپے سے بڑھ گئی۔ افراط یہاں تھی۔ اشیاء یہاں سستی تھیں۔ روزگار یہاں بہت تھا اور یہ سب کچھ صرف ایک مستحکم حکومت کی وجہ سے تھا، جو قیامِ پاکستان کے بعد پہلی بار پاکستان کو نصیب ہوئی تھی۔

اب ایک بات بتاؤں بیٹے......! اکھنڈ بھارت ہندوؤں کا ایک ایسا خواب ہے، جس سے وہ کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ پاکستان انشاء اللہ......! اللہ کے فضل سے قائم رہے گا، لیکن ہندو اپنے اس خواب کی تعبیر کے لئے سازشیں کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ تعبیر انشاء اللہ......! انہیں اکھنڈ پاکستان کی شکل میں ملے گی۔

پاکستان معاشی طور پر بھارت سے زیادہ مستحکم ہوا تو ان کی نیندیں اُڑ گئیں۔ انہوں نے جنگ چھیڑ کر معیشت کو تباہ کرنا چاہا، لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ پھر انہوں نے ڈپلومیٹک محاذ پر کام شروع کیا۔ ہماری کوتاہیوں اور تقسیم ہند کی پیدا کی ہوئی جغرافیائی کمزوری اور مشرقی پاکستان کے احساسِ محرومی کو ایکسپلائٹ کیا۔ افسوس ناک بات یہ کہ ہمارے بعض سیاست دان بھی ان کے ایجنٹ بن گئے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ حمود الرحمان کمیشن یا تو اپنا کام ہی مکمل نہیں کر سکے گا اور کر لیا تو اس کی رپورٹ کم از کم عوام کے سامنے کبھی نہیں آئے گی۔ لوگ برسوں دھوکا کھاتے رہیں گے۔

پاکستان کو جو خوش حالی نصیب ہوئی، وہ اللہ کا فضل تھا۔ لیکن دُنیاوی اور ظاہری اسباب بھی ہوتے ہیں نا......تو اس خوش حالی میں ایک مستحکم حکومت اور ملک و قوم سے محبت کرنے والی مخلص اور ایماندار بیورو کریسی کا اہم کردار تھا۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ دونوں سے چھٹکارا پایا جا رہا ہے۔''

''لیکن چچا جان......! جمہوریت کی بھی تو اہمیت ہے۔'' عبدالحق نے پہلی بار زبان کھولی۔

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

''یہ لوگوں کو بے وقوف بنانے والی چیز میرے خیال میں مسلمانوں کے لئے

ہے ہی نہیں، نہ عوام الناس کے لئے اور نہ ہی لیڈروں کے لئے۔''

''لیکن کیوں......؟ جمہوریت نہیں ہوگی تو آمریت ہوگی یا بادشاہت۔'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''جس بادشاہ میں خوفِ خدا ہو، اس میں کیا برائی ہے......؟''

''لیکن بادشاہ بننے کے بعد خوفِ خدا کتنے لوگوں میں رہ جاتا ہے۔''

''یہ بات تمہاری ٹھیک ہے۔ لیکن میں مزاج کی بات کر رہا ہوں۔ ان پچیس برسوں میں ہم نے جمہوریت دیکھی تو ہے۔ سیاسی جوڑ توڑ اور حمایت کی خرید و فروخت کے سوا کیا تھا اس میں۔ نتیجہ یہ کہ آئے دن حکومتیں بدلتی تھیں۔ دُنیا بھر میں تمسخر کا نشانہ بن کر رہ گئے تھے ہم۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ ہماری قوم کا مزاج جمہوری ہے ہی نہیں۔''

''ہاں......! اور یہ حقیقت ہے۔ عام لوگوں کو دیکھو، ذرا سے اختلاف پر لڑنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ مناظروں سے بھری پڑی ہے۔ کوئی ایک مثال بتا دو کہ کسی مناظرے کا مثبت نتیجہ نکلا ہو۔ آخر میں دونوں فریق اپنے نکتۂ نظر پر اٹل اور حامیوں کے درمیان مار پیٹ سر پھٹوں۔ بھئی سیاسی لوگوں میں اختلاف تو ہوتا ہے۔ اس پر بات ہوتی ہے اور دلیل سے ہوتی ہے، معقولیت سے سنی جاتی ہے۔ کوئی کسی کی بات تسلیم بھی کرتا ہے۔ کبھی دونوں فریق اپنے اپنے موقف میں لچک پیدا کرتے ہیں، کچھ سمجھوتے کرتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی صرف رفع شر کی خاطر مصلحت سے کام لیتے ہوئے دوسرے کی بات مان لیتا ہے۔ لیکن ایسا صرف اُصولی اختلاف کی صورت میں ہوتا ہے اور ملک و قوم کے مفاد میں ہوتا ہے۔ جہاں دو فریقوں میں اختلاف صرف اقتدار پر ہو، وہاں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ اپنے ہاں کی مثال دیکھ لو۔ جمہوریت کے لئے الیکشن ہوا۔ عوامی لیگ نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی۔ اب دوسری اکثریتی پارٹی کو کیا حق ہے کہ وہ اکثریتی پارٹی کو مجبور کرے کہ وہ اسے اقتدار میں شریک کرے۔ بھئی مرکز میں حکومت بنانا ان کا حق ہے، وہ انہیں ملنا چاہئے......اور وہ بھی غیر مشروط طور پر۔ آپ کی صوبے میں اکثریت ہے تو آپ وہاں حکومت بنا لیں۔ یہی جمہوریت ہے۔ لیکن ہوا کیا......؟ بھٹو صاحب کی باتیں اخبارات کی شہ سرخیوں کی

صورت میں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ جانے والوں کی ٹانگیں توڑ دیں جائیں گی اور آگے فرمایا...... اِدھر ہم اُدھر تم...... یہ پاکستان کی سب سے بڑی جمہوری پارٹی کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ سربراہ کا فرمان ہے، جس کا نعرہ ہے...... جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ کیا آپ کا یہ طرزِ عمل جمہوری ہے......؟ جمہوری کیا......؟ یہ روّیہ تو سیاسی بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے...... اِدھر ہم اُدھر تم...... کا نعرہ لگایا تو گویا ملک توڑنے کی نہ صرف دعوت دی، بلکہ اپنی طرف سے اعلان بھی کر دیا اور یہ ملک سے غداری ہے۔ کوئی سیاست دان اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا۔''

''میرے خیال میں بھٹو صاحب سیاست دان بھی ہیں اور بے وقوف بھی نہیں ہیں۔''

''ہوسکتا ہے، ایسا ہی ہو۔ لیکن اقتدار کی شدید ترین خواہش نے انہیں کچھ بھی نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ مشرقی پاکستان کے پاس اکثریت ہے۔ لہٰذا انہیں کبھی چانس نہیں ملے گا۔ جو بات مجھ جیسا سادہ اور غیر سیاسی آدمی سمجھ سکتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ ان جیسا زیرک سیاست دان نہ سمجھ پائے۔''

''کون سی بات......؟''

''یہی کہ جب کوئی پارٹی حکومت بناتی ہے تو اس کی مقبولیت میں کمی کا آغاز ہوتا ہے۔ عوام کو اس سے شکایات ہوتی ہیں، جو بڑھتی جاتی ہیں۔ ادھر اپوزیشن کی مقبولیت بڑھتی ہے۔ یہ جمہوریت کا اُصول ہے۔ بھٹو صاحب مجیب کو حکومت بنانے دیتے اور مشرقی پاکستان میں اپنی پارٹی کی رُکنیت سازی کرتے، عوام سے رابطہ ہوتا اور پانچ سال میں کم سے کم بھی اتنا ضرور ہوتا کہ عوامی لیگ اکثریت بہرحال حاصل نہ کر پاتی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ اگلے انتخابات میں پیپلز پارٹی اکثریت حاصل کر لیتی۔''

''واقعی......! تو بھٹو صاحب نے ایسا کیوں نہیں کیا......؟''

''وہ اتنا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں فوری اقتدار چاہئے تھا۔''

''یہ تو بہت برا کیا انہوں نے۔''

''مگر اقتدار تو مل گیا نا انہیں...... اور اب جو وہ کر رہے ہیں، وہ اور زیادہ برا

ہے۔''

''آپ کا اشارہ کس طرف ہے......؟''

''اب وہ بس ایک ہی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی، بلکہ دوام بخشنے کی۔ اور اس کوشش میں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان اداروں کو نقصان پہنچا رہے ہیں، جو ملک کے استحکام اور ترقی کے ضامن ہیں۔ فوج کو وہ اپنے اقتدار کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ سب سے پہلے فوج پر حملہ آور ہوئے۔ اخبارات میں یحییٰ خان کے بارے میں جو داستانیں شائع ہوئیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ افسانہ نہیں تھیں۔ کہیں مبالغہ آرائی ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن بہرحال یحییٰ خان فوج کے لئے کوئی قابل فخر جنرل ہرگز نہیں تھے۔ ان کے بارے میں جان کر صرف محمد شاہ رنگیلا کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ لیکن ایک فرد کی ذاتی کمزوریوں سے بہرحال ادارے رُسوا نہیں ہوتے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کی ویڈیو ٹی وی پر دکھا کر فوج کو ذلیل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فوج پر دباؤ بڑھانے کی خواہش میں بھٹو صاحب ضرورت سے زیادہ آگے چلے گئے۔ وہ اچھے سیاست داں ہوتے تو اس کے بجائے فوج کا مورال بلند کرنے کی کوشش کرتے۔ فوج ان کی احسان مند بھی ہوتی اور حکومت کا کام سیاست دانوں پر چھوڑ کر خود عزت سے اپنا وقار بحال کرنے میں لگ جاتی۔ مگر مسلسل تذلیل کے نتیجے میں اب میرے خیال میں فوج میں پیپلز پارٹی کے لئے معاندانہ جذبات اُبھر رہے ہیں اور بھٹو صاحب کے اقدامات کے نتیجے مین یہ جذبات بڑھتے ہی رہیں گے اور یہ ملک و قوم کے مفاد میں نہیں ہے۔''

''آپ نے پاکستان کی خوش حالی کے دو بڑے اسباب کی بات کی تھی۔ تو مستحکم حکومت تو اب موجود ہے۔''

''مجھے تو ایسا نظر نہیں آتا۔'' مسعود صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''بھٹو صاحب کا طرزِ حکم رانی جمہوری ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو شخصی آمریت کا معاملہ لگتا ہے۔ اس کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ پیپلز پارٹی بنانے والے نظریاتی لوگ آہستہ آہستہ پس منظر میں جا رہے ہیں۔ انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے وَن مین شو نہیں چل سکتا۔ یا تو وہ نکال دیئے جائیں گے یا پارٹی چھوڑنے پر

مجبور کر دیئے جائیں گے۔ بھٹو صاحب پاکستان میں اب تک کے مضبوط ترین اور
مقبول ترین سیاست دان کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ وہ مثال ہیں، جو آگے بڑھے گی
اور وہ اچھے سیاست دان نہیں ہیں۔ صرف مقبولیت سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے میرا
خیال ہے کہ آئندہ پچاس سال تک تو پاکستان میں مستحکم جمہوری حکومت قائم نہیں ہو
سکتی۔ ہاں......! فوجی حکومت مستحکم ہو سکتی ہے۔ ایوب خان کی مثال ہمارے سامنے
ہے۔ اور یہ صرف ہماری بات نہیں۔ تم کوئی ایک ایسا اسلامی ملک بتا دو جہاں جمہوریت
ہے۔''

''واقعی......! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' عبدالحق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''جہاں بادشاہت نہیں، وہاں شخصی آمریت قائم ہے۔ خواہ وہ جمہوریت کے
پردے میں ہو۔''

''اب بھٹو صاحب اسی انداز میں اقتدار کو مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے
ہیں۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

''وہ یہ نہیں سوچ رہے کہ یہ ملک اور قوم کے لئے نقصان دہ ہے۔ ملک کا
دفاع کرنے والے ذلیل کئے جائیں گے تو سرحدوں کو خطرہ لاحق ہوگا۔ دوسرا ہدف
انہوں نے بیوروکریسی کو بنایا ہے۔ اب بیوروکریسی میں ایماندار افسروں کی گنجائش نہیں
رہی۔ صرف ان کے خوشامدی ہی عہدوں پر رہ سکیں گے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ اہل
افسر کس کس طرح سے حکومت کی رہنمائی کرتے ہیں، اسے غلط اور نقصان دہ فیصلوں
سے بچاتے ہیں۔ سربراہِ مملکت تو بہت دُور کی بات ہے، وزیر کو ہی اپنے شعبے کے
بارے میں کیا علم ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ تو مشیروں کا محتاج ہوتا ہے اور یاد رکھو،
اوپر سے جو مثال قائم ہوتی ہے، اسی پر نیچے تک عمل کیا جاتا ہے۔ جو اوپر خوشامد کرتے
ہیں، وہ اپنے نیچے والوں سے خوشامد کراتے ہیں۔ خوشامدی مشیر ہوں گے تو ان کے
ماتحت اور ماتحتوں کے ماتحت، سب خوشامدی ہوں گے۔ اور خوشامدی ہوں گے تو یا تو
اہلیت سے محروم ہوں گے یا اپنی اہلیت کو بالائے طاق رکھ کر خوشامد پر گزارا کرنے کی
کوشش کریں گے۔ اب سوچو کہ ایسے میں اُمورِ مملکت کیسے چلیں گے......؟
ایوب خان فوجی آدمی تھے۔ معیشت کے بارے میں کیا جانتے تھے۔ لیکن

انہوں نے لائق اور ایماندار لوگوں کو اکٹھا کیا۔ پھر ان کے مشورے سنے اور ان پر عمل
کیا۔ دو پنج سالہ منصوبے کامیابی سے مکمل کئے گئے۔ اس کے نتیجے میں معیشت متوازن
ہوئی۔ صنعت کا فروغ ہوا۔ برآمدات میں اضافہ ہوا۔ خام مال کے بجائے مصنوعات
برآمد کی گئیں۔ جس سے زرمبادلہ بڑھا۔ ملک وہاں کھڑا تھا، جہاں سے ترقی کی راہ
صاف دکھائی دے رہی تھی۔ خوش حالی آ چکی تھی اور اس میں اضافہ ہوتا تھا۔ مگر بھٹو
صاحب نے صنعتوں کو قومیانا شروع کر دیا۔''

''یہ تو پیپلز پارٹی کا منشور ہے چچا جان......! اور انہیں اس پر عمل کرنا تھا۔''

''تم ان تین جملوں کی بات کر رہے ہو جو بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے
پیپلز پارٹی کے باغیوں نے بڑی ذہانت سے ترتیب دیئے۔ اسلام ہمارا دین ہے،
جمہوریت ہماری سیاست ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں
پچیس برس میں عوامی سطح پر کبھی پذیرائی نہیں ملی۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ اس ملک میں
نمازی چاہے دس فی صد بھی نہ ہوں، لیکن عوام اسلام کے خلاف کوئی معمولی سی بات
بھی برداشت نہیں کریں گے، کوئی نظام تو بہت دُور کی بات ہے۔ اس لئے اسلام ہمارا
دین ہے،، سے اسٹارٹ لیا گیا۔ اور جہاں تک جمہوریت ہماری سیاست ہے، کا تعلق
ہے، تو عملاً ثابت کر دیا گیا کہ یہ محض نعرہ ہے۔ ڈپلومیسی بہت اہم ہوتی ہے۔ سفارتی
آداب کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اقوام متحدہ سب سے بین الاقوامی فورم ہے۔ اگر کوئی
ملک کسی دوسرے ملک کے ساتھ حالت جنگ میں ہے اور کوئی تیسرا ملک جنگ بندی
کے لئے قرارداد پیش کرتا ہے تو اس ملک کے مندوب کی ذمہ داری ہے کہ قرارداد کو
بہت باریک بینی سے پڑھے اور اس پر اپنے اکابرین سے مشاورت کرے۔ اس میں
ترمیم پیش کرنے کا، اس پر اعتراضات کرنے کا، اس کا حق ہے کہ ڈپلومیسی میں افہام و
تفہیم سے کام لیا جاتا ہے۔ اسے مسترد کرنے کا بھی حق بنتا ہے آپ کا۔ لیکن اس کے
پرزے پرزے کر کے پھینکنا اور ہزار سال لڑنے کا اعلان کرتے ہوئے اس فوم سے
واک آؤٹ کرنا ڈپلومیسی کے خلاف ہی نہیں، بدتمیزی بھی ہے۔ یہاں سوال یہ اُٹھتا ہے
کہ اس کے مقاصد کیا تھے۔ اس سے پاکستان کی رسوائی اور جگ ہنسائی کے سوا کیا
حاصل ہوا۔ اگر آپ وہ قرارداد منظور کر لیتے تو آپ کی فوج ریکارڈ تعداد میں ہتھیار

ڈالنے کی ذِلت سے بچ جاتی۔ تو کیا یہ ذِلت دانستہ طور پر کمائی گئی۔ ایسے بہت سے
سوال ہیں۔ لیکن پوچھنے والا کوئی نہیں۔

اور اسمبلی کے منتخب اراکین کے لئے اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں شرکت
کرنا لازم ہے۔ جمہوریت کی روح یہ ہے کہ اگر آپ کو کسی پارٹی سے کوئی اختلاف ہے
تو آپ اسمبلی میں بیٹھ کر اس پر بات کریں۔ اس کے باوجود آپ اس کا بائی کاٹ
کرتے ہیں تو بھی گوارہ۔ لیکن اگر آپ اسمبلی میں جانے والوں کی ٹانگیں توڑنے کا
اعلان کرتے ہیں تو یہ لب ولہجہ، یہ انداز جمہوریت کی صرف نفی نہیں، تذلیل کرتا ہے۔
اس کے بعد آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت آپ کی سیاست ہے۔

اور اگر سوشلزم آپ کی معیشت ہے تو پھر آپ کو اپنے پہلے نعرے سے دست
بردار ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ اسلام میں ریاست کوئی کاروباری ادارہ نہیں۔ ریاست
افراد کے وسائل اور ان کے کاروبار پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ ہر شخص کو کاروبار کا حق ہے،
مالدار بننے کا حق ہے۔ بس اسے اسلامی ٹیکس ادا کرنے ہوں گے۔ غریب، نادار، محروم
اور مسکین لوگوں کے لئے اسے صدقات اور خیرات کی تلقین بھی کی گئی ہے اور ترغیب
بھی دی گئی ہے۔ اللہ نے ان سے بہت بڑھا کر اجر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ چلیں......
آپ ریاستی اخراجات کے لئے ان پر انکم ٹیکس بھی لگا دیجئے۔ لیکن اسلام ریاست کو
افراد کے کاروبار، ان کی ملیں اور کارخانے سرکاری تحویل میں لینے کا حق نہیں دیتا۔ یہ
ہے پیپلز پاٹی کا منشور......!''

''لیکن چچا جان......! بائیں بازو والوں کے پاس اس کے لئے کوئی پلاننگ
تو ہوگی۔ جس سے عام لوگ خوش حال ہوں اور ملک کی معیشت اور مستحکم ہو۔''

''ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن اس پر عمل نہیں ہوگا۔ میرا دعویٰ ہے کہ زیادہ
سے زیادہ دو تین سال میں وہ تمام لوگ یا تو بھٹو صاحب کے خوشامدی بن جائیں گے
یا دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیئے جائیں گے۔ یہ اصل میں دو طرفہ
کھیل تھا۔ بھٹو صاحب بڑے جاگیردار ہیں، بادشاہوں کا سا مزاج رکھتے ہیں۔ بائیں
بازو والے بھٹو صاحب کی کرشماتی شخصیت کو استعمال کرنا چاہتے تھے، اور بھٹو صاحب کو
ان سے آئیڈیاز اور عوامی نعرے درکار تھے۔ لیکن ترپ کے سارے پتے بھٹو صاحب

کے پاس ہیں۔ بھٹو صاحب کو اب ان لوگوں کی ضرورت نہیں۔''

''تو بھٹو صاحب اداروں کو قومیا کیوں رہے ہیں......؟''

''اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے۔ عام لوگوں کو احسان مند بنا کر اپنے
ووٹ بینک کو مستحکم کرنا ہے۔ اس کے لئے انہیں ملازمتیں دینی ہیں۔ صرف سرکاری
ملازمتیں تو ناکافی ہوں گی۔ قومیائے گئے اداروں میں بڑے اور اہم لوگوں کو بڑے
عہدے ملیں گے۔ کارکنوں اور حامیوں کو خوش کرنے کے لئے کھپانا ہوگا۔ اس کے لئے
وہ بااختیار لوگ ضرورت نہ ہونے کے باوجود ملازمتیں فراہم کریں گے۔''

''لیکن اس کے نتیجے میں ان اداروں کا منافع کم ہوگا۔''

''ظاہر ہے......!''

''اور وہ بتدریج کمزور ہوتے جائیں گے۔ اور ملکی معیشت پر اثر پڑے گا۔''

''بالکل پڑے گا۔''

''یہ تو ملک کے لئے نقصان دہ ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے معیشت
پر ویسے ہی برا اثر پڑا ہے۔''

معیشت تو خدانخواستہ اب کمزور تر ہوتی جائے گی۔ لیکن ہمارا صنعتی ڈھانچہ
الحمدللہ اتنا مضبوط ہے کہ پچاس سال میں بھی تباہ ہونے والا نہیں۔ ورنہ تو میرے خیال
میں ملکی معیشت دس سال میں ڈھیر ہو جاتی۔ دیکھو نا...... پٹ سن کی مصنوعات سے
بھاری زرِ مبادلہ حاصل ہوتا تھا، اس سے ہم محروم ہو چکے ہیں۔''

''یہ سلسلہ روکنا تو بہت ضروری ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''کون روکے گا اسے......؟'' مسعود صاحب کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''جمہوریت ہے تو عوام روکیں گے۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔''

''اور یہ ممکن نہیں......!''

''کیوں......؟''

''ہم مسلمان واحد اللہ کے ماننے والے ہیں۔ شخصیت پرستی کی ہمارے ہاں
گنجائش ہی نہیں۔ مگر تحریک پاکستان کے عرصے میں یہ بیماری ہمیں لاحق ہوگئی۔ چلو،
اس وقت تو مسلمانوں کے اتحاد کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ لیکن بیماری، اور خاص

طور پر اجتماعی قومی بیماری پر جلدی قابو نہ پایا جائے تو وہ بڑھتی ہے اور بہت تیزی سے بڑھتی ہے۔ پاکستان بننے کے صرف تیرہ ماہ بعد قائداعظم کا انتقال ہوگیا۔ یہ ہر لحاظ سے ملک کی بدقسمتی تھی۔ وہ زیادہ جیتے تو یہ بیماری بڑھ نہ پاتی۔ بہر حال ان کے بعد صورتِ حال یہ ہوئی کہ قائداعظم پر تنقید قوم سے غداری قرار پائی۔ وجہ یہ تھی کہ لیاقت علی خان کے بعد کے لوگوں کے پاس عوام کو لبھانے کے لئے قائداعظم کے کارڈ کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ جس کسی نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی، اس کے باوجود کہ وہ پاکستان چلا آیا، ملک دشمن قرار دیا گیا۔ صرف اپنی مضبوطی کے لئے نام نہاد سیاست داں یہ کھیل کھیلتے رہے۔ اس کے نتیجے میں جمہوری مزاج ڈیویلپ ہی نہ ہوسکا۔ ملکی اور قومی معاملات میں بھی ذاتی پسند ناپسند غیر ضروری طور پر اہم ہوگئی۔

پھر جب تمام سیاست دانوں نے اپنی نااہلی تسلیم کرتے ہوئے جب محترمہ فاطمہ جناح کو ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی انتخاب لڑایا تو یہ مرض اور تیزی سے بڑھا۔ سب جانتے ہیں کہ الیکشن میں دھاندلی نہ ہوتی تو محترمہ جیت جاتیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا......؟ اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ بہر حال ایسا ہوا نہیں۔ لیکن یہ بہت بری مثال قائم کردی گئی۔ کیونکہ محترمہ نہ تو کوئی سیاسی شخصیت تھیں، اور نہ ہی ملکی اُمور کو سمجھنے اور چلانے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ ان کی بس ایک ہی خوبی تھی کہ وہ قائداعظم کی بہن تھیں اور عوام کے نزدیک انہیں صدرِ پاکستان منتخب کرنے کے لئے ایک یہی بات کافی تھی۔ یہ ہے عوام کا جمہوری شعور......؟

عبدالحق میاں......! ہم اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان رکھنے والے، نبی کریمؐ کے اُمتیوں نے بڑی بھیانک کمزوری پال لی ہے۔ ہم شخصیات کی محبت اور عقیدت میں پرستش کی حد تک آگے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں محبت کا سلیقہ ہی نہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ہر انسان میں کمزوریاں اور خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ نفس بھی لگا ہوتا ہے۔ ان میں اخلاقی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی انسان کامل انسان نہیں ہوسکتا۔

عبدالحق میاں......! نعروں کی بڑی اہمیت ہے۔ سیاسی جماعتیں نعرے بناتی اور عوام کو دیتی ہیں۔ اور جتنی بلند آواز میں اور جتنا بڑا مجمع وہ نعرے لگاتا ہے، وہ اس سیاسی جماعت کی مقبولیت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کے ابتدائی نعرے...... لے کے

رہیں گے پاکستان...... اور پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ...... تھے۔ یہ آئیڈیلز کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پھر ''پاکستان زندہ باد'' آیا۔ یہ پاکستان سے محبت کا اظہار تھا۔ پھر ''قائداعظم زندہ باد'' آیا۔ یہاں سے شخصیت پرستی شروع ہوگئی۔

''نعروں سے بہت کچھ سمجھا جا سکتا ہے بیٹے......! پیپلز پارٹی نے جو نعرہ دیا ہے، وہ ہے...... جیئے بھٹو...... اور اس نعرے کی مقبولیت بتاتی ہے کہ ہماری اجتماعی اور قومی بیماری بڑھ گئی ہے۔ قائداعظم کے لئے جو نعرے لگے، ان کے پیچھے پاکستان کی محبت کارفرما تھی، پاکستان کا حوالہ تھا، ایک نظریہ تھا۔ لیکن جئے بھٹو کے پیچھے کوئی نظریہ نہیں۔ اس کے پیچھے پاکستان کی محبت بھی نہیں۔ حد یہ ہے کہ اس کے پیچھے پیپلز پارٹی بھی نہیں۔ گویا اہمیت نہ سیاسی پارٹی کی ہے، نہ ملک کی۔ صرف ایک شخص اہم ہے۔ شخصیت پرستی اس حد تک بڑھ جائے تو جمہوریت کہاں پنپ سکتی ہے۔ ایسے میں تو شخصی آمریت جنم لیتی ہے۔ اور ہم اس طرف بڑھ رہے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چچا جان......! میں خود انہی خطوط پر سوچتا رہتا ہوں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''لیکن ظاہر ہے۔ آپ کا تجربہ بہت وسیع ہے۔ مشاہدات بہت ہیں۔ ایک عمر گزاری ہے آپ نے۔ میں اتنی گہرائی میں جا کر نہیں سوچ سکتا تھا۔'' وہ خاموش ہوا اور چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''لیکن شخصی آمریت میں بھی سیاسی استحکام تو ہوتا ہے، جو بہر حال ملک کے لئے فائدہ منداور ترقی کا ضامن ثابت ہوسکتا ہے۔''

''ہاں......! ہوسکتا ہے۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ اُمورِ مملکت اہل ترین لوگوں کو سونپے جائیں۔ تا کہ ملک ترقی کرے اور خوش حالی ہو۔ اس کے برعکس ہوگا تو عوام میں بے چینی پیدا ہوگی۔ پھر بات شورش تک پہنچے گی۔ بدامنی ہوگی تو یا تو خونی انقلاب آئے گا یا فوجی انقلاب۔ اسی لئے آمر یہ اہتمام کرتے ہیں۔ اصل میں سسٹم یہ ہے کہ حکومت کے پاس قوتِ عمل اور وسائل ہوتے ہیں۔ لیکن سمت نہیں ہوتی۔ اپنے اپنے شعبے کے ماہر، سوچنے والے دانش ور لوگ سمت فراہم کرتے ہیں۔ وہ حکومت کی کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں اور حکومت وہ کامیاب ہوتی ہے جو عوام کو

خوش اور مطمئن رکھ سکے۔ انہیں روزگار، باعزت زندگی اور ضروریات فراہم کر سکے۔''

''تو یہ کام تو بھٹو صاحب بھی کر سکتے ہیں۔''

''جس طرح سے وہ بیوروکریسی اور فوج پر حملہ آور ہوئے ہیں، اس سے ایسا لگتا نہیں۔ طویل اقتدار کے لئے درست راستے کو چھوڑ کر وہ غلط راستے کی طرف بڑھ گئے ہیں۔ اہلیت رکھنے والوں کو تو بے عزت کر کے فارغ کیا جارہا ہے۔ ایک بات یاد رکھو بیٹے......! جب میرٹ کو خیر باد کہا جاتا ہے تو ایک نہیں، کئی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور وہ بھی دوررس۔ ایسے میں کم اہل یا نااہل لوگوں کے ہاتھ میں فیصلے کا اختیار چلا جاتا ہے، اور وہ غلط فیصلے کرتے ہیں، چاہے خلوص کے ساتھ کریں اور ان فیصلوں کے نتائج پھیلتے ہوئے دُور تک جاتے ہیں۔ پھر وسائل ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اور نااہلی کی وجہ سے ان کا ضیاع ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں معیشت کمزور ہوتی ہے۔ دوسری طرف آپ اہل لوگوں کو سائیڈ لائن کر کے ان کی راہنما صلاحیتوں سے ملک وقوم کو محروم کرتے ہیں تو معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے۔ میرٹ چھوڑتے ہی کرپشن کا آغاز ہوتا ہے اور کرپشن کتنی تیزی سے پھیلنے والی چیز ہے، اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اقربا پروری کا فروغ ہوتا ہے۔ باصلاحیت لوگ اپنی صلاحیتوں کی طرف سے مایوس ہو کر حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔ خوشامد، سفارش اور رشوت کو فروغ ہوتا ہے۔ سچ بولنے اور سننے کی خُو دم توڑنے لگتی ہے۔ یہ سب کچھ قوموں کے لئے زوال کا سفر ہوتا ہے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے۔ میرٹ کو ترک کر دیا گیا ہے۔''

''یعنی کرپشن کا آغاز ہو گیا ہے......؟''

''بالکل......! اور زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ جس انداز میں شروع ہوا ہے، ایک روایت کے طور پر آگے بڑھے گا، اور روایت کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ ابھی زور خوشامد اور سیاسی سفارش پر ہے۔ لیکن آگے جاتے جاتے اس میں رشوت کی مرکزیت قائم ہوگی۔ تب یہ بہت بری طرح پھیلے گا۔''

''یہ تو بہت بھیانک تصویر ہے چچا جان......!'' عبدالحق کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''ایسا ہی ہے بیٹے......! شخصیت پرستی کے بعد رشوت بھی بہت بڑی برائی

ہے۔ اس سے معاشی ناہمواری پھیلتی ہے۔ اس سے مذہبی اور اخلاقی قدریں پیچھے چلی جاتی ہیں، اور مادہ پرستی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ معاشرے سے قانون اور اُصول رُخصت ہونے لگتے ہیں۔ مال کی محبت اور اس کے حصول کی خواہش دیوانگی کی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دینے والا اللہ ہے، جسے چاہے، فراخی عطا فرمائے اور جسے چاہے تنگی۔ لیکن مذہبی قدریں پیچھے چلی جائیں تو آدمی ظاہر میں کرپٹ ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جائز طریقے سے مال ہر آدمی اپنی اہلیت اور محنت کے مطابق حاصل کر پاتا ہے۔ مگر بغیر محنت کے کثیر مال حاصل کرنے کے طریقے بھی موجود ہیں۔ جو لوگ نچلی یا اوپری، کسی بھی سطح پر کسی بھی طرح کا اختیار رکھتے ہیں، وہ اسے حصولِ مال کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور حیثیت نہ ہونے کے باوجود خوش حال ہونے لگتے ہیں۔ اور معاشرے میں مسابقت بھی ہوتی ہے۔ دوسرے لوگ، جن کے پاس کوئی ایسا اختیار نہیں ہوتا، وہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں بغیر محنت کے کثیر مال حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچنے میں لگا دیتے ہیں۔ یوں ذہنی صلاحیتیں بھی ضائع ہوتی ہیں، جو کہ قومی سرمایہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف معاشی ناہمواری اور طبقاتی بُعد میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ محروم لوگوں میں احساسِ محرومی ہونا تو فطری ہے، لیکن دوسروں کی ناجائز خوش حالی ان کے احساسِ محرومی کو زخم بنا دیتی ہے۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں معاشرہ کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اللہ سے تعلق کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اللہ پر بھروسہ کرنے کی، اللہ سے مدد مانگنے کی خو ختم ہونے لگتی ہے۔ ایمان کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔''

''اس قیمت میں تو جمہوریت ناقابل قبول حد تک مہنگی ہے۔''

''قیمت تو واقعی ناقابل قبول ہے۔ مگر جمہوریت تو پھر بھی نہیں ملے گی۔''

''کیا مطلب چچا جان......؟''

''جمہوری ملکوں کو دیکھو تو پتا چلے گا کہ جمہوریت میں وراثت نہیں ہوتی۔ پارٹی افراد سے بڑی ہوتی ہے اور مشاورت سے فیصلے کرتی ہے۔ کسی فرد کو کسی منصب کے لئے منتخب سیاسی جماعت کرتی ہے۔ پاکستان میں سیاست دانوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو سامنے لا کر سیاست میں موروثیت کی ایک بری مثال قائم کر دی۔ اب ہندوستان کو دیکھو۔ وہاں پاکستان کی نسبت بہت توانا جمہوریت ہے۔ لیکن کانگریس کو

نہرو کا متبادل کوئی اور نہیں، نہروں کی بیٹی ہی ملی۔ تو یہ روایت وہاں بھی قائم ہوگئی۔ اور روایت قائم ہوتو آگے بھی ضرور بڑھتی ہے، اور یہ روایت بھی آگے بڑھے گی۔''

''مگر پاکستان میں تو اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔''

''میرا خیال ہے کہ برصغیر کا ایک الگ مزاج ہے۔ اگر پاکستان میں اسلامی اقدار کو مستحکم نہ کیا گیا تو دونوں معاشروں میں بمشکل انیس بیس کا فرق ہوگا۔ اور ویسے بھی شخصی آمریت یا تو اس طرح سے فروغ پاتی ہے، یا پھر اسی طرح کے نتائج سامنے لاتی ہے۔ اللہ پاکستان کو اس سے محفوظ رکھے، لیکن جو کچھ سامنے ہے، اسے دیکھ کر مستقبل کی جو تصویر مجھے نظر آتی ہے، وہ بڑی بھیانک ہے۔''

''کچھ بتائیں مجھے......!'' عبدالحق کے لہجے میں دلچسپی تھی۔

''پاکستان میں جمہوریت کا صرف نام ہوگا، جمہوریت نہیں ہوگی۔ انتخابات میں من مانے نتائج حاصل کئے جائیں گے۔ شخصی آمریت ہوگی۔''

''کیوں چچا جان......؟''

''جمہوری ملکوں پر غور کرو۔ سیاسی جماعتوں کی جمہوریت میں بہت اہمیت ہوتی ہے۔ وہ جمہوریت کی بنیاد ہوتی ہے اور ان کا انحصار شخصیتوں پر ہرگز نہیں ہوتا۔ پارٹی کسی شخص کو ملک کی سربراہی کے لئے منتخب کرتی ہے اور وہ شخص پارٹی کو جواب دہ ہوتا ہے۔ اسے پارٹی کے منشور پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ پارٹی چاہے تو اسے اقتدار سے محروم کردے اور وہ بس دو ٹرم تک سربراہ رہ سکتا ہے۔ ممکن ہے، کہیں تیسری ٹرم کی بھی اجازت ہو۔ اس کے بعد وہ صدر یا وزیر اعظم تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ کچھ خصوصی تقاریب میں اسے مدعو کرنا الگ بات ہے۔ لیکن وہ باقی زندگی ایک عام شہری کی طرح گزارتا ہے۔ جمہوریت میں اقتدار مرتکز نہیں ہوتا۔ اسے بڑی دانش مندی کے ساتھ تقسیم کیا جاتا ہے اور پھر چیک اینڈ بیلنس کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔ یہ کرپشن کی روک تھام کے لئے ہے۔ ہندوستان میں پارلیمانی سربراہ اپنی پارٹی کا سربراہ نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے ہاں معاملہ مختلف ہے۔ سیاسی جماعتیں شخصیتوں کی محتاج ہیں، ان پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ نواب زادہ نصر اللہ خان کی جماعت کو دیکھ لو۔ وہ جماعت ہے ہی نہیں۔ ان کی کبھی ایک سے زیادہ نشست نہیں ہوگی اسمبلی میں۔ اب جمہوری

قاعدہ تو یہ ہے کہ ایسی تمام چھوٹی جماعتوں کا اختتام ہونا چاہئے۔ تاکہ جماعتیں کم سے کم ہوں۔ زیادہ سے زیادہ تین جماعتیں ہوں۔ زیادہ تر تو دنیا میں دو جماعتی نظام قائم ہے۔ لیکن انڈیا میں بھی جماعتیں لاتعداد ہیں۔ بعض اوقات ضرورت پڑنے پر وہ اسمبلی میں ایک ووٹ کی بھی قیمت وصول کرتی ہیں۔ یہ کرپشن کا آغاز ہوتا ہے۔ جمہوری ملک ہر چیز سے بڑھ کر کرپشن کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دو جماعتی نظام کا یہی سبب ہے۔

شخصی آمریت میں ہر فیصلہ فردِ واحد کرتا ہے۔ نہ کوئی اسے پوچھنے والا ہوتا ہے، نہ ہی کوئی روکنے والا۔ ایسے میں کرپشن خوب پھیلتا پھولتا ہے۔ بظاہر اس کے نقصانات نظر نہیں آتے۔ لیکن یہ ملک کی معیشت کو کھا جاتا ہے۔ پھر فردِ واحد کی اولاد اس کی وارث بن جاتی ہے، اور باپ کا سیاسی مرتبہ اور اقتدار اسے مل جاتا ہے۔ انڈیا نے جمہوریت سے اسٹارٹ لیا، لیکن اب وہ موروثی سیاست کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

''مگر پاکستان میں تو ایسی صورتِ حال نہیں ہے چچا جان......!'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''بات اسی شخصیت پرستی کی طرف جاتی ہے۔ جس طرح بھٹو صاحب کو پذیرائی ملی، اس نے انہیں شخصی آمریت کی راہ دکھائی ہے۔ اور یاد رکھو، یہ عوام کی ذمہ داری ہے۔ جذباتیت، محبت، عقیدت، رشتے ناطوں اور برادری کے حوالے سے ووٹ دینا اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔ آپ جمہوریت کو کھیل بنالیں، الیکشن کو تفریحی میلہ سمجھ لیں تو اپنے اور ملک کے ساتھ مذاق کررہے ہیں۔ الیکشن پیسے کا کھیل ہے تو لائق ترین شخص بھی، جو غریب ہے، اسمبلی میں نہیں پہنچ سکتا اور جو اسمبلی میں پیسہ پانی کی طرح بہا کر پہنچے گا، وہ اسے منافع کے ساتھ وصول کرنا چاہے گا۔ نتیجہ کرپشن...... کرپشن اور صرف کرپشن......!''

''لیکن یہاں موروثی سیاست تو مجھے نظر نہیں آتی چچا جان......!''

''شخصی آمریت ہمیشہ اسی طرف لے کر جاتی ہے بیٹے...... ! ایوب خان کی مثال لے لو۔ گوہر ایوب نے خوب پرپرزے نکالے۔ بس زیادہ وقت نہیں مل سکا اسے۔ پیپلز پارٹی صرف بھٹو کی ذات، بھٹو کا نام ہے۔ بڑے سے بڑا لیڈر دو نمبر ہی

رہے گا۔ اس پارٹی کا سربراہ کبھی نہیں بن سکے گا۔ بھٹو صاحب کی اولاد ہے۔ اگرچہ ابھی ایسے آثار نہیں لیکن بھٹو صاحب انہیں سیاست میں ضرور لائیں گے۔ میں موجود نہیں ہوں گا، لیکن دیکھ لینا۔ پاکستان میں جس سیاسی جماعت کو بھی مقبولیت حاصل ہوگی، وہ صرف ایک شخص کی، ایک خاندان کی جماعت ہوگی۔ سو سال تک تو پاکستان موروثی سیاست سے نجات حاصل نہیں کر سکے گا اور اس کے نتیجے میں اقربا پروری، مصاحب نوازی، خوشامد، سفارش، رشوت......یعنی کرپشن اس سطح پر پہنچے گی، جس کا ہم تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''خدانخواستہ ایسا ہوگا تو کوئی روکنے والا بھی تو ہوگا۔''

''صرف فوج روک سکے گی اسے۔'' مسعود صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

''صرف اللہ ہی سب کچھ جانتا ہے۔ اس کے عطا کئے ہوئے شعور کی روشنی میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ فوج کو بار بار مداخلت کرنی پڑے گی۔ ہر نام نہاد جمہوری حکومت کا خاتمہ فوج کے ہاتھوں ہوگا۔''

''تو اس میں بہتری تو ہوگی۔''

''صرف ظاہری طور پر۔ خرابیاں اس سے زیادہ بڑی ہوں گی اور پھیلیں گی۔''

''ایوب خان کی مثال تو بڑی حوصلہ افزاء ہے۔''

''بے شک......! میری رائے میں تو ایوب خان اس قوم کے محسن ہیں۔ انہوں نے ملک کو ہر طرح سے مستحکم کیا۔ خاص طور پر معاشی اعتبار سے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر آنے والا ایوب خان جیسا ہو۔''

''اور جن خرابیوں کی آپ نے بات کی، ان کی وضاحت نہیں کریں گے۔''

''وہ تو بے شمار امکانات ہیں۔ فوج کا اقتدار زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ فوج بھی ہر طرح کی کرپشن میں ملوث ہوگی۔ فوج کا ڈسپلن بھی آزمائش میں پڑے گا۔ قوم فوج سے بہت محبت کرتی ہے۔ خدانخواستہ اس میں بھی فرق پڑ سکتا ہے۔ یہ سب قومی نقصان ہوں گے اور فوج بار بار نام نہاد جمہوری حکومتوں کا تخت اُلٹے گی تو ایک برا تاثر

بہر حال قائم ہوگا کہ افواج کی طاقت اسلحے کے زور پر ہے، جس سے سیاست دان محروم ہے۔ اس سے معاشرے میں طاقت کا قانون فروغ پا سکتا ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ پھر سیاسی قوتیں بھی بالآخر اس حقیقت کو تسلیم کر لیں گی کہ فوج کی حمایت کے بغیر حکومت نہیں کی جا سکتی۔ وہ افواج کی بالادستی تسلیم کریں گی تو ان کے جائز و ناجائز مطالبات بھی اپنے اقتدار کی خاطر پورے کریں گی اور یہ حالت ہوگی تو عوام کے حق میں بہت برا ہوگا۔ پھر انہیں کون پوچھے گا......؟ کون ان کی سنے گا......؟''

''یہ تو بہت خطرناک صورتِ حال ہے چچا جان......!''

''بے شک......! یاد رکھو، سیاسی عدم استحکام معاشی عدم استحکام کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر پاکستان اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے عالمی طاقتوں کی توجہ کا مرکز ہمیشہ رہے گا۔ جو یہاں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کی کوشش کریں گی۔ عدم استحکام کی صورتِ حال ان کے لئے بہت خوش آئند ہوگی۔''

''اللہ پاکستان کی حفاظت فرمائے، اسے اپنی امان میں رکھے۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ یہی تو لیاقت علی خان شہید کے آخری الفاظ تھے۔ انشاء اللہ......! بدترین صورتِ حال میں بھی اللہ پاکستان کی حفاظت فرمائے گا، یہ ملک بنا ہی اللہ کی رحمت سے ہے۔''

''بے شک چچا جان......!''

مسعود صاحب چونکے۔ جیسے کسی تنویمی کیفیت سے باہر آئے ہوں۔

''بات کیا ہو رہی تھی، اور میں کہاں کی باتیں لے بیٹھا......؟'' انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''لیکن یہ سب ضروری ہے۔ میں اپنے بیٹے سے بھی یہ باتیں کرتا ہوں۔ تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور پاکستان بننے کے بعد کے حالات، یہ سب کچھ ورثہ ہے ہمارا۔ اسے نسل در نسل منتقل کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ یہ ہماری تاریخ ہے۔ لیکن مؤرخ دیانتداری اور غیر جانب داری سے تاریخ کم ہی لکھتے ہیں۔ تاریخی سچائیاں تو سینہ بہ سینہ ہی منتقل ہوتی ہیں۔ جو کچھ میں نے دیکھا، سمجھا اور جانا، خاص طور پر جو کچھ میرے بچوں نے نہیں دیکھا، میں وہ سب کچھ انہیں سناتا ہوں، اس تلقین کے

ساتھ کہ وہ یہ سب کچھ اپنے بچوں کو اسی تلقین کے ساتھ منتقل کریں۔ اسلام کی اور پاکستان کی محبت ایک چراغ ہے۔ ہمیں چراغ سے چراغ جلانا ہے۔ تاکہ مستقبل میں چراغاں ہو۔ پاکستان کی اہمیت اور قدر و قیمت وہی لوگ سمجھ سکیں گے، جنہیں علم ہوگا کہ اس ملک کے لئے کتنی قربانیاں دی گئی ہیں۔ کورس میں پڑھائی جانے والی تاریخ تو حکمرانوں کے ساتھ تبدیل ہوتی رہے گی۔ پاکستان کی بقاء اور ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری ہر نسل پاکستان کے نظریے اور تاریخ سے واقف ہو۔ یہ نہ ہوا تو شیرازہ بکھر جائے گا۔ خدانخواستہ میں تم سے بھی یہی کہوں گا کہ تم بھی یہ سب کچھ اپنے بچوں کی طرف اسی تلقین کے ساتھ بڑھا دینا کہ اسے آگے بڑھانا ہر نسل کی ذمہ داری ہے۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب دعا کرتا ہوں کہ میرے بچے بھی اس معاملے میں ذمہ دار ثابت ہوں۔ سب یہ جان لیں کہ پاکستان نہ ہوتا تو ہم ہندوؤں کے غلام ہوتے۔ اور خدانخواستہ یہ ملک نہ رہا تو ہم کافروں کی غلامی کریں گے۔ اور غلامی سے نجات برسوں میں نہیں، صدیوں میں ملتی ہے اور آگے جا کر تو شاید غلامی کے نت نئے روپ سامنے آئیں گے۔ صرف زمین پر قبضہ غلامی کا ثبوت نہیں ہوگا اور بھی بہت کچھ ہوگا، جسے میں محسوس تو کر سکتا ہوں، سمجھ نہیں سکتا، بیان نہیں کر سکتا۔"

"اللہ ہمیں محفوظ رکھے۔ اللہ ہمیں ذمہ دار بنائے۔" عبدالحق نے کہا۔

"اب مجھے یہ بتائیں کہ میرے لئے حکومت کے خلاف کیس کرنے کی کیا ضرورت تھی......؟ آپ جانتے ہیں کہ میری برطرفی میرے لئے تو قید سے رہائی تھی۔ مجھے اس پر کوئی دکھ، کوئی صدمہ نہیں ہوا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن یہ ضروری تھا۔"

"آپ نے اسے خواہ مخواہ اپنے لئے بوجھ بنا لیا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ میرے ضمیر پر بوجھ تھا۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"لیکن بات بس اتنی ہی نہیں تھی۔ اس میں کئی اور پہلو بھی تھے۔ ان نکالے جانے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوں گے، جو تم سے زیادہ قابل ہوں گے اور دیانت دار بھی ہوں گے۔ لیکن رزق اور روزگار کے معاملے میں تمہاری طرح مضبوط نہیں ہوں

گے۔ انہیں تمہاری طرح یہ قید سے رہائی نہیں لگی ہوگی۔ انہیں ایک طرف رسوائی ملی ہوگی تو دوسری طرف بے روزگاری۔ وہ طعنے سن رہے ہوں گے۔ ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہوگا۔ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کی طرف سے فکرمند ہوں گے۔ ایمانداری کی وجہ سے ان کے پاس گزراوقات کے لئے بھی کچھ نہیں ہوگا اور نہ وہ کچھ کر سکیں گے۔

تمہارا یہ کیس اور اس کا فیصلہ ایک پیغام ہے۔ جو دور تک جائے گا۔ عمومی پیغام، جو سب کے لئے ہے، یہ ہے کہ اگر آپ حق پر ہیں اور آپ کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو اس کے خلاف بساط بھر لڑیں۔ خاموشی سے برداشت نہ کریں کہ برداشت کرنا ظالم کا ساتھ دینے اور اس کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کیس ایسے تمام لوگوں کو راستہ دکھاتا ہے، بلکہ اس راستے کو آسان بھی کرتا ہے۔

اور اس کیس نے عدلیہ کو بھی ایک بہت اہم پیغام پہنچایا ہے۔ یہ کہ اس ملک میں اس کی بڑی اہمیت ہے، بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ حکمران یا کوئی بھی شخص، خواہ کتنا ہی مقتدر اور طاقتور ہو، قانون سے بالاتر نہیں ہونا چاہئے۔ حکومتوں کو بھی قانون اور ضابطوں کے دائرے میں رہ کر کام کرنا چاہئے۔ وہ تجاوز کریں تو انہیں روکنا عدلیہ کی ذمہ داری ہے۔ وہ یہ بھاری ذمہ داری نیک نیتی سے اٹھائے گی تو اللہ اسے طاقت بھی دے گا اور عزت بھی۔ وہ سچائی کے حق میں فیصلہ کرے گی تو حکومتوں کو من مانے اور غیر قانونی فیصلوں سے روکنے کے لئے فوج کو نہ مداخلت کی ضرورت پڑے گی، اور نہ ہی وہ مداخلت کا کوئی جواز پیش کر سکے گی۔ لاقانونیت کو لاقانونیت سے روکنے کا رجحان پیدا ہی نہیں ہوگا۔ یہ اسلامی ملک ہے۔ قانون اوپر سے نیچے تک سب کے لئے ایک ہی ہونا چاہئے۔ اور انصاف بھی اوپر سے نیچے تک سب کو ملنا چاہئے۔ میرے نزدیک اس ملک میں عدلیہ ہی سب سے اہم ادارہ ہے۔ تمہارے کیس میں عدالت کا فیصلہ بہت خوش آئند ہے، اور اس میں بھی مقتدر لوگوں کے لئے ایک پیغام ہے۔"

"لیکن عدلیہ کے پاس اپنے فیصلوں پر عملدرآمد کرانے کے لئے کوئی طاقت تو نہیں ہے۔ فوج کی طرح۔" عبدالحق نے اعتراض اٹھایا۔

"طاقت تو ہے۔ عدالت کے فیصلے ماننا اور ان پر عمل کرنا اور کرانا انتظامیہ یعنی حکومت کی ذمہ داری ہے۔"

"فیصلہ حکومت کے خلاف ہو اور وہ اسے نہ مانے تو......؟"

"تو یہ بد قسمتی ہوگی۔ عدلیہ کا احترام حکومت نہیں کرے گی تو عام لوگ بھی اس روش کو اپنائیں گے۔ معاشرے میں بگاڑ، بدامنی اور لاقانونیت ہوگی اور بالآخر بات فوج تک جائے گی۔ مہذب معاشرے اسی لئے عدلیہ کی قوت کو فوج سے بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں کہ غلبہ اسلحے اور ہتھیاروں کو نہیں، علم اور عقل و دانش کو حاصل ہو۔ آخری فیصلہ غلط ہو، تب بھی اسے ماننے کی روایت ہو۔ تاکہ آئین اور قانون کی حکمرانی اور بالادستی ہو۔"

"لیکن جیسے بیوروکریسی پر حملہ ہوا، ویسا ہی عدلیہ پر بھی تو ہو سکتا ہے۔ ججوں کو جبر کا شکار بھی تو بنایا جا سکتا ہے۔"

"بالکل......! اور مجھے ڈر ہے کہ مطلق العنانی کے شوقین یہ کرتے رہیں گے۔ اور یہ ملک، قوم اور معاشرے کے لئے تباہ کن ہوگا۔"

"بہرحال...... میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" عبدالحق نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں......! اس کے پیغام پر سمجھ کر عمل کرو گے تو میں شکر گزار رہوں گا۔ اور اس کے نتیجے میں تم پر سختی بھی آئے گی، اور آزمائش بھی ہوگی۔"

"پیغام کیا ہے......؟"

"اپنے حق کے لئے لڑنے کی تمہیں ضرورت نہ ہو، تب بھی لڑو...... دوسروں کی خاطر...... انہیں یہ راہ دکھانے کے لئے۔"

"اس کا میں وعدہ نہیں کرتا۔ میری راہ، میری منزل اور ہے۔ کام بڑا ہے اور وقت کم۔"

"اللہ وقت میں برکت دے گا انشاءاللہ......!"

"دُعا کرتے رہئے گا میرے لئے......!"

"کرتا ہوں اور انشاءاللہ کرتا رہوں گا۔ مگر اس پر یاد آیا کہ اپنے لئے دُعا کرتے ہوئے کبھی کبھی میں گھبرا جاتا ہوں، ڈر جاتا ہوں۔"

"دُعا سے ڈر جاتے ہیں......؟" عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مگر کیوں......؟"

"یہ خیال آتا ہے کہ وہ اللہ کے لئے ناپسندیدہ نہ ہو اور اس کے نتیجے میں اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ کیوں، رہنمائی کرو۔"

"مجھے شرمندہ کر رہے ہیں آپ......!" عبدالحق نے خجالت سے کہا۔

"میں کیسے آپ کی رہنمائی کر سکتا ہوں......؟ میں تو خود آپ سے سیکھتا ہوں۔"

"نہیں بیٹے......! کچھ معاملات میں تم مجھ سے آگے ہو۔ میری مدد کرو۔"

"میں آپ کی بات سمجھ ہی نہیں پایا۔" عبدالحق نے عاجزی سے کہا۔

"دُعا کی تو اللہ نے تلقین فرمائی ہے۔ دُعا سے تو وہ خوش ہوتا ہے۔"

"کچھ دُعاؤں کو سختی سے منع بھی تو فرمایا ہے۔"

"اوہ......!" عبدالحق نے کہا۔ اب بات اس کی سمجھ میں آئی۔

"میں بہت زیادہ تو نہیں جانتا اس بارے میں۔ لیکن وہ غیر فطری دُعائیں ہوتی ہیں۔ ایسی دُعائیں جن کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ وہ غلط ہیں، اور آپ کو ان کا حق نہیں۔"

"مثلاً......؟"

"مثلاً......! آپ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے اور مشرق میں غروب ہونے کی دُعا مانگیں، جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ نے جو کائنات کا نظام قائم فرمایا ہے، یہ اس کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ کسی حرام چیز یا اللہ کے منع کئے ہوئے کسی کام کے لئے دُعا کرنا۔ کوئی ایسی دُعا کرنا، جو آپ کے لئے یا دوسروں کے لئے دین، دُنیا، آخرت اور معیشت کے لئے نقصان دہ ہو۔"

"مثلاً......؟"

"مثلاً......! کوئی ضرورت مند دُعا کرے کہ اسے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کسی سے روپیہ مل جائے، جبکہ اسے معلوم ہو کہ وہ اسے سود پر ملے گا، اور اس کا ارادہ بھی سود پر قرض لینے کا ہو۔ یا جیسے کسی کا شرابی دوست شراب کی طلب سے بے حال ہو رہا ہو، اور وہ اس کے لئے شراب کے حصول کی دُعا کرے۔"

''دُعا تو عبادت ہے۔ بندگی ہے چچا جان......! دُعا اللہ کے حضور اپنی عاجزی کا اظہار ہے، اللہ کی قدرت کا، اور اس بات کا اعتراف ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مدد کرنے والا نہیں۔ کوئی کچھ دینے والا نہیں۔ دُعا میں سرکشی اور نافرمانی تو بدبختی ہے۔''

''جبھی تو میں دُعا کرتے ہوئے ڈرتا ہوں بیٹے......! کہ کہیں اللہ ناراض نہ ہو جائے۔''

''نہیں چچا جان......! بس نیت اچھی ہونی چاہئے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ نیتیں بھی اور بندوں کے دلوں میں چھپے ہوئے بھید بھی۔ اور وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔''

''پھر بھی میں کوئی ایسی دُعا کر بیٹھوں جو تقدیر سے...... اللہ کی مشیت سے متصادم ہو، تو گرفت تو ہوگی۔''

''تقدیر بندوں سے پوشیدہ ہے چچا جان......! صرف اللہ جانتا ہے اور مشیت کا کسی کو کیا پتا......؟ بندے کو تو جس چیز میں اپنی دُنیا، دین، آخرت اور معیشت کی بہتری نظر آئے، وہ اللہ سے مانگنی ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ نہیں جانتا اور اللہ جانتا ہے کہ اس میں بہتری نہیں۔ اب یہ اللہ کی رحمت اور شانِ عطا ہے کہ وہ اس دُعا کو قبول نہیں فرماتا اور اسے نقصان سے بچا لیتا ہے۔ اور یہی نہیں، وہ اس دُعا کا اس سے بہتر بدل عطا فرماتا ہے، دُنیا میں یا آخرت میں، یا چاہے تو دونوں جگہ۔ دُعا رائیگاں نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں، اللہ چاہے تو دُعا سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ جیسے صدقے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور عمر بڑھتی ہے۔ دیکھیں، دُعا تو بندہ خیر کی ہی مانگتا ہے۔ بے شک وہ نہیں سمجھ سکتا کہ جو کچھ وہ مانگ رہا ہے، اس میں حشر بھی چھپا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دُعا کے ساتھ بالخیر ضرور کہا جائے۔ جیسے آدمی درازیٔ عمر کی دُعا کرے تو اللہ سے درازیٔ عمر بالخیر کی دُعا کرے۔''

''یہ تو تم نے بہت اچھی بات بتائی۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ وہ کچھ دیر سوچتے اور جھجکتے رہے، جیسے اُلجھن میں ہوں کہ جو کہنا ہے، وہ کہیں یا نہ کہیں۔

''کوئی بڑی اُلجھن ستا رہی ہے آپ کو......؟'' عبدالحق نے کہا۔

اور مسعود صاحب جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے۔

''میں اللہ سے جو مانگنا چاہتا ہوں، اس کا نہ مجھے حق ہے اور نہ ہی اس کی میری اوقات ہے۔ اس بات سے ڈرتا ہوں میں۔''

''کچھ مجھے بتائیں تو سہی......!''

''ایسی باتوں میں کسی کو شریک کرنے کے خیال سے بھی شرمندگی ہوتی ہے۔ کیا کروں......؟'' مسعود صاحب کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''تم مجھے یہ بتاؤ کہ کوئی اپنی اوقات سے کتنا بڑھ کر مانگ سکتا ہے......؟'' یہ کہتے ہوئے وہ عبدالحق کو کسی چھوٹے سے بچے کی طرح لگے۔

''اوقات کی تو بات ہی نہ کریں چچا جان......! وہ تو اللہ کی ہی دی ہوئی ہوتی ہے۔ انسان کی اس دُنیا میں حیثیت کیا ہے......؟ اس زمین سے بہت...... بہت بڑے بے کراں صحرا میں ریت کا ایک ذرّہ...... اور اللہ اس میں سے جس بندے کو جو چاہے، مرتبہ عطا فرما دیتا ہے۔ کسی کو بادشاہت دیتا ہے تو کسی کو ولایت۔ غلاموں کو تخت و تاج مل جاتا ہے، اور اس کے حکم سے بادشاہ ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔ اوقات تو کسی کی بھی کچھ نہیں ہے چچا جان......! کیا بادشاہ اور کیا فقیر......؟ جو ہے، اس کا دیا ہوا ہے۔''

مسعود صاحب کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''بے شک بیٹے......! یہ حقیقت ہے۔''

''اللہ سے مانگنے میں اوقات کا کیا دخل چچا جان......!'' عبدالحق نے اپنی بات جاری رکھی۔

''یہ تو بندوں سے مانگتے ہوئے سوچا جائے۔ میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ الحمدللہ......! کوئی سائل مجھ سے دس کروڑ روپے مانگے، اور وہ میرے پاس ہوں بھی تو کیا میں اسے دے دوں گا......؟ ہرگز نہیں......! تکبر کے خوف سے منہ سے نہ کہوں، لیکن دل میں تو سوچوں گا کہ پیروں میں جوتے نہیں، در بدر پھر رہا ہے اور مانگ رہا ہے دس کروڑ......؟ اوقات دس روپے کی بھی نہیں۔ اللہ کا خوف نہ ہو تو اس کا مذاق اُڑاؤں میں۔ اور کوئی رئیس مجھ سے یہی رقم مانگے اور میرے پاس نہ ہو تو میں اس سے یہی کہوں گا نا کہ بھئی میری تو اتنی اوقات نہیں۔ اور دل میں سوچوں گا کہ ہوتے بھی تو نہ دیتا۔ کیا میری ضرورتیں نہیں ہیں......؟

چلیں...... یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ کوئی ایک لاکھ روپیہ قرض مانگے اور ہو وہ تین سو روپے ماہ وار کا ملازم، تو میں منہ سے نہ کہوں، لیکن دل میں اس کی اوقات کے بارے میں سوچوں گا ضرور۔ سوچوں گا کہ یہ اپنی اوقات سے بڑھ کر مانگ رہا ہے۔ عمر گزر جائے گی، اور یہ میرا قرض ادا نہیں کر سکے گا۔ میرے پاس کروڑ بھی ہوں گے تو میں اسے ایک لاکھ نہیں دوں گا۔ تو یہ تو بندوں کے معاملات ہیں۔ مانگنے والا جس سے مانگ رہا ہو، اس کی اوقات دیکھتا ہے۔ جس کے پاس ہزار ہوں، اس سے مانگنے والا لاکھ کبھی نہیں مانگے گا اور دینے والا مانگنے والے کی اوقات دیکھے بغیر نہیں دے گا۔ غور کرے گا کہ یہ لوٹا بھی سکتا ہے یا نہیں۔ یہ ہے انسانوں سے مانگنا، اور اللہ......'' عبدالحق کہتے کہتے رُک گیا۔ اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ مسعود صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں پوری طرح سمجھ رہا ہوں بیٹے......! تم کہتے رہو۔'' انہوں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''اللہ کو یہ پسند نہیں۔ یہ تو حماقت ہے نا کہ آپ اس سے مانگیں جو خود کسی کا محتاج ہے۔ اس سے کیوں نہ مانگیں جس کے سب محتاج ہیں......؟ اقبال کا یہ شعر بہت ہی وسیع مفہوم رکھتا ہے اپنے اندر۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

تو چچا جان......! یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اپنی حاجت روائی کے لئے اس سے رجوع کریں۔''

''میں مجبوراً موضوع سے ہٹ رہا ہوں۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

''بات سے بات نکلی ہے، اس لئے...... اب بیٹے......! اللہ نے اس دُنیا کو اسباب کا کارخانہ بنایا ہے۔ آدمی کا کام آدمی سے ہی نکلتا ہے۔''

''بے شک چچا جان......! اس میں بھی بندوں کی آزمائش ہے۔ مجھے کوئی کام آ پڑا ہے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ میں اس کے لئے اللہ سے دُعا کروں کہ میرا کام ہو جائے۔ اللہ جسے چاہے گا، وسیلہ بنا دے گا اور کام نہ ہو تو صبر کروں۔ یہ سمجھ لوں کہ

اس میں میری بہتری نہیں تھی۔ اللہ نے کسی نامعلوم نقصان سے مجھے بچا لیا۔ یا ضروری ہو تو اس کے لئے مسلسل دُعا کرتا رہوں۔''

''اور اگر تمہارا کام ایسا ہو کہ صرف میرے ہی ذریعے ہو سکتا ہو۔''

''تو بھی مجھے اللہ سے دُعا کرنی ہوگی، آپ سے رجوع کرنے کی اجازت لینی ہوگی۔''

''یہ کیسے پتا چلے گا کہ تمہیں اجازت ملی یا نہیں......؟''

''اجازت نہ ہوئی تو میرا دل اس بات سے ہٹ جائے گا، یا میں کوشش کے باوجود آپ سے رابطہ نہیں کر سکوں گا۔ اپنے معاملات میں، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اللہ سے رجوع کیا جائے تو وہ اس میں اپنا فضل و کرم، رحمت اور خیر رکھ دیتا ہے۔''

''جزاک اللہ بیٹے......! اب اسی معاملے پر بات کرو۔ جو زیر غور تھا۔''

عبدالحق نے ایک گہری سانس لی۔

''بات یہ ہے کہ اللہ وہ واحد اور احد ہستی ہے، جس کے خزانے لامحدود ہیں۔ قدرت کامل ہے۔ جس کے قبضۂ اختیار سے باہر کچھ نہیں۔ لامحدود خزانے ہیں اس کے۔ اس کے کسی ایک خزانے کے کروڑویں حصے کا کروڑواں حصہ بھی ہمارے تصور تک سے باہر ہے۔ وہ کسی کو کچھ بھی دے سکتا ہے...... کچھ بھی۔'' عبدالحق نے زور دے کر کہا۔

''ایک وہی تو ہے...... صرف وہی تو ہے، جس سے بندہ جو چاہے، مانگ لے۔ وہی تو ہے جو مانگنے والے کی اوقات جانتا ہے، اور اس کی اوقات کی پرواہ بھی نہیں کرتا کہ کچھ دیتے ہوئے۔

اور چچا جان......! جسے ہم اوقات کہتے ہیں، وہ اس کے لامحدود خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ اوقات بھی تو وہی دیتا ہے، ورنہ ریت کے ایک بے نشاں ذرّے کی حیثیت ہی کیا ہے......؟ اور وہ بغیر مانگے بھی بہت کچھ دے دیتا ہے...... اوقات بھی، مٹی کے پتلے نے کب اس سے فرمائش کی تھی کہ اسے مسجودِ ملائک بنایا جائے۔ لیکن اس نے فرشتوں سے اسے سجدہ کروا کے بتا دیا، جتا دیا کہ انسان کی اوقات کہاں

تک ہے......؟

تو چچا جان......! اس سے تو بندہ اپنی اوقات کو بھول کر کچھ بھی مانگ سکتا ہے۔ اس کی عطا اور اس کے کرم کے حوالے سے......اور اس کی عطا اور کرم کی بھی کوئی حد نہیں......کوئی حد ہی نہیں۔'

کچھ دیر خاموشی رہی۔ مسعود صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے سر اُٹھایا اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''تم سے ایک ذاتی بات پوچھوں......؟ برا تو نہیں مانو گے......؟''

''ضرور پوچھیں......! میں جواب دینے کی کوشش کروں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تم نے اللہ سے کچھ ایسا مانگا کیا......؟ جسے مانگتے ہوئے تمہیں احساس ہوا ہو کہ وہ تمہاری اوقات سے بڑھ کر ہے۔''

عبدالحق نے بلا تامل اس کا جواب دیا۔

''میں کچھ بھی مانگوں، مجھے یہ خیال رہتا ہے کہ میں اپنی اوقات سے سوا مانگ رہا ہوں۔''

''میں اپنی بات تم پر واضح نہیں کر سکا۔'' مسعود صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''میرا اشارہ اہلیت کی طرف ہے۔ دیکھو نا، اللہ نے اپنے ہر بندے کو ایک فطرت، کچھ صلاحیتیں اور کچھ اہلیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ انہی کے مطابق وہ دُنیا میں آگے بڑھتا ہے۔ تم سرکاری افسر اہلیت کے بغیر تو نہیں بنے تھے نا......؟''

''مگر اب تو اہلیت کے بغیر بھی لوگ افسر بن رہے ہیں۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔''

''لیکن یہ تو دُنیا ہے۔ اللہ کے ہاں تو ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔''

''کبھی نہیں......! اللہ قادرِ مطلق ہے۔ جسے جو چاہے، دے دے......!''

مسعود صاحب لاجواب ہو گئے۔ کچھ کھسیا سے گئے۔

''میں اپنی بات تمہیں سمجھا نہیں پا رہا ہوں۔'' ان کے لہجے میں خفیف سی جھنجلاہٹ تھی۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ کوئی دُعا کرتے ہوئے اللہ سے ڈر لگا تمہیں......؟''

عبدالحق کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اُٹھایا تو اس کی نگاہوں میں تفہیم تھی۔

''اب میں آپ کی بات کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہ مقام تو شاید ہر کسی کی زندگی میں کئی بار آتا ہوگا۔''

''مجھے بتاؤ......! تم سب سے زیادہ خوفزدہ اپنی کس دُعا سے ہوئے......؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے ہی کہا تھا کہ ایسی باتوں میں کسی کو شریک کرنے کے خیال سے بھی شرمندگی ہوتی ہے۔ ہر بندے کے اللہ کے ساتھ، اور اللہ کے ہر بندے کے ساتھ الگ معاملات ہوتے ہیں، اور وہ بہت ذاتی ہوتے ہیں۔''

مسعود صاحب کا چہرہ اُتر سا گیا۔ انہیں شرمندگی ہو رہی تھی۔

''لیکن کبھی کبھی انہیں کسی کے ساتھ شیئر کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے، کبھی اپنے اور کبھی دوسروں کی بہتری کے خیال سے، کبھی اپنی اُلجھن دُور کرنے کے لئے اور کبھی دوسروں کی رہنمائی کے لئے۔ کوئی بہت ذاتی معاملہ ہو تو الگ بات ہے۔ جیسے اپنے ایک خواب کو میں نے کبھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا، اور نہ ہی کبھی کروں گا۔ اور جو کچھ شیئر کیا جاتا ہے، وہ بھی آدمی کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ ہر کسی کو ہر بات تو نہیں بتائی جا سکتی۔'' عبدالحق کہتے کہتے رُکا اور اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔

''آپ میرے لئے بہت محترم ہیں۔ میں آپ کے ساتھ سب کچھ شیئر کر سکتا ہوں۔ اس ایک خواب کے سوا۔''

''یہ تمہاری محبت ہے، اور میں اس پر تمہارا شکر گزار ہوں۔'' مسعود صاحب کے لہجے میں تشکر تھا۔

''مجھے شرمندہ نہ کریں چچا جان......! آپ کو اللہ نے اس کی اہلیت عطا فرمائی ہے۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

’’جب میں چھوٹا تھا تو اللہ کی رحمت سے دُنیا کے نظام پر غور کرتا تھا۔ اللہ کے فضل سے میں نے سمجھ لیا کہ یہ نظام ایک ہی ہستی چلا رہی ہے۔ پھر میری سمجھ میں اس کی نعمتیں اور اس کے احسانات آنا شروع ہوئے۔ میں نے جان لیا کہ مجھے سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرنی چاہئے۔ میں اس وقت اللہ کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔

وہ بہر حال لڑکپن تھا۔ عمر کا وہ حصہ، جب آدمی خوف سے بے نیاز ہوتا ہے اور مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کتنی بڑی خواہش کر رہا ہوں۔ بلکہ میں تو محبت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا تھا۔ محبت ایسی ہی فطری چیز ہے چچا جان......! کہ بعض لوگ عمر بھر محبت کرتے ہیں، لیکن محبت کو سمجھ نہیں پاتے۔ میری طبیعت البتہ ایسی تھی کہ میں محبت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

’’میں بڑا ہوا۔ اللہ نے کرم فرمایا اور مجھے قبولِ اسلام نصیب ہوا۔ اب ہوش کے ساتھ جو میں نے اپنی اللہ سے محبت کی خواہش پر غور کیا تو تھرتھری چڑھ گئی۔ اللہ سے کوئی کیسے محبت کر سکتا ہے......؟ محبت کو جو میں نے سمجھا تھا، اس کے مطابق تو محبت کرنے والا اپنے محبوب کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے، اور وہ بھی بغیر کسی غرض کے۔ اس کا کام محبوب کو خوش کرنا، اسے فائدہ پہنچانا ہے۔ یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ اللہ ہر ضرورت سے پاک ہے۔ اسے کسی سے کچھ نہیں چاہئے۔ وہ تو خود دینے والا ہے اور ہم بے غرض ہو ہی نہیں سکتے۔ ہم تو سراسر محتاج ہیں اللہ کے۔ تو میں بڑا اُلجھا کہ اللہ سے کیسے محبت کروں......؟ میری سمجھ میں یہی آیا کہ محبت تو اللہ کا وصف ہے۔ صرف وہی تو محبت کر سکتا ہے اور وہ کرتا ہے۔ وہ پیدا فرماتا ہے، اور اپنی مخلوقات کی ہر ضرورت پوری فرماتا ہے۔ بغیر مانگے۔ وہ خود فرماتا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ ماں اپنی اولاد سے جتنی محبت کرتی ہے، وہ اس سے 70 گنا سے بھی زیادہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔

’’مگر پھر میں نے قرآن میں پڑھا کہ اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی محبت کی تلقین فرمائی۔ فرمایا کہ بندوں پر سب رشتوں سے، ہر چیز سے کہیں بڑھ کر محبت کرنا صرف اور صرف اسی کا حق ہے۔ اور قرآن میں جو کچھ ہے، حق ہے۔ تو اللہ نے بندوں

کو اپنی محبت کی دعوت دی۔

لیکن اللہ سے محبت کیسے کی جائے......؟ اس کے محتاج اسے کچھ نہیں دے سکتے۔ جبکہ دنیا محبت کا اظہار ہے۔ آدمی کے پاس سب سے قیمتی چیز اس کی جان ہے۔ مگر اس شعر میں اللہ سے محبت کرنے والے کی بے بسی کا کیسا نقشہ ہے ۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

میں تو بے بسی سے سوچتا تھا چچا جان......! مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے میرے دل میں ماں کی محبت کا خیال آیا۔ ماں اولاد کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دیتی ہے۔ روئے زمین پر سب سے عام، سب سے بڑی، ظاہری محبت ماں کی ہے، جو وہ اپنی اولاد سے کرتی ہے۔ کہاں سے آئی یہ محبت......؟ کسی اور کو کیوں نہیں ملی یہ محبت......؟ یہ محبت نہ ہوتی تو کیا ہوتا......؟ بچے کیسے پلتے......؟

میرے اندر جیسے کسی نے سمجھایا، اور ایک پل میں میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ پالنے والے کی محبت ہے۔ اور پالنے والا صرف ایک ہے...... واحد، احد، پروردگارِ عالم، ہمارا ربّ۔ کسی عورت کے پاس وہ محبت پہلے سے نہیں ہوتی۔ لیکن ماں بنتے ہی وہ اللہ کی طرف سے اسے ودیعت ہو جاتی ہے۔ یہ محبت پوری نسل انسانی پر اللہ کا احسان ہے۔ بچوں کی حاجت روائی ہے۔

پھر میری سمجھ میں بات کچھ کچھ آنے لگی۔ محبت آسان جذبہ ہے، بہت بڑی نعمت ہے۔ میں نے اسے ایسے سمجھا کہ جیسے ہر انسان ایک مکان ہے۔ بنانے والے نے اس میں بجلی کے لئے مکمل فٹنگ کر دی ہے۔ جسم مکان ہے اور روح مکین۔ مگر مکمل فٹنگ کے باوجود مکان میں روشنی نہیں۔ اس کے لئے دو کام ضروری ہیں۔ پہلا تو مکین کو بجلی کا کنکشن جوڑنا ہے۔ مگر روشنی پھر بھی نہیں ہوگی۔ بجلی فراہم کرنے والا برقی رو دوڑائے گا تو روشنی ہوگی۔‘‘

’’اور محبت کا کائناتی پاور ہاؤس اللہ ہے۔‘‘ مسعود صاحب نے تڑپ کر کہا۔

’’جی چچا جان......! طاقت، علم، عزت...... سب کچھ صرف اور صرف اللہ کا ہے۔‘‘

"سبحان اللہ بیٹے......! تم نے کتنی خوب صورتی سے اسے واضح کیا ہے۔"

"یہ اللہ کا فضل ہے چچا جان......! بندے کا کام صرف درست سمت میں تجسس کرنا ہے۔ رہنمائی تو اللہ کرتا ہے۔"

"بے شک بیٹے......!" مسعود صاحب نے کہا۔ پھر بولے۔

"میں اپنی مداخلت پر معافی چاہتا ہوں۔ تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"بجلی کا کنکشن جو بندے کو جوڑتا ہے، وہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ جب بندے نے زبان سے کہا اور دل سے تسلیم کیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی عبادت کے لائق نہیں تو کنکشن جڑ گیا۔ اور اس پر عمل کنکشن کو اور مضبوط کرتا ہے۔"

"مگر بیٹے......! محبت تو انہیں بھی مل جاتی ہے، جو اللہ کو نہیں مانتے۔" مسعود صاحب نے اعتراض کیا۔

"فٹنگ تو اللہ نے سب کو عطا کی ہے چچا جان......! اور عام محبت کا کنکشن اللہ خود ہی جوڑ دیتا ہے۔ وہ ودود ہے، محبت کا سرچشمہ ہے۔ جو محبت وہ سب کو بلاتفریق عطا فرماتا ہے، وہ دُنیاوی محبت ہے۔ اس کے بغیر دُنیا کا نظام ہی نہیں چلتا۔ آدمی اپنی غرض کے لئے آدمی کو مار ڈالتا، کھا جاتا، خودغرضی کی حکمرانی ہوتی، اور ایثار کا وجود ہی نہ ہوتا۔ وہ عام دُنیاوی محبت ہے، جو وہ از خود سب کو عطا فرماتا ہے۔ لیکن ہم اس وقت جس محبت کی بات کر رہے ہیں، وہ کائنات کا سب سے اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے، جو انسان کو اللہ کے قریب لے جاتا ہے...... بہت قریب۔ میں بندے کی اپنے خالق، اپنے ربّ سے محبت کی بات کر رہا ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ کے بغیر تو اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اور لا الٰہ الا اللہ سے کنکشن جڑتا ہے۔ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان تعلق قائم ہوتا ہے۔ اور یہ واپڈا کا نظام نہیں۔ یہاں وولٹیج کی سپلائی اللہ کے اختیار میں ہے اور اپنے لئے وولٹیج بندے کو خود کمانا ہوتا ہے۔ جتنا تعلق، اتنا وولٹیج۔ زُبان سے لا الٰہ الا اللہ کہے جاؤ تو وجود کا بس ایک گوشہ روشن ہوتا ہے اور انسانی وجود کی وسعت بڑے سے بڑے عمل سے زیادہ ہوتی ہے۔

میں لڑکپن سے ہی اللہ کی محبت کا خواہاں تھا۔ اُلجھتا تھا کہ محبت کیسے کروں......؟ بندگی فرض ہے، عبادت فرض ہے، اور محبت فرض سے سوا بہت کچھ مانگتی

ہے۔ وہ بہت کچھ ہے کیا......؟"

"مگر بیٹے......! پہلی بات تو یہ ہے کہ محبت ہے کیا......؟" مسعود صاحب کی بےپن اب صاف ظاہر تھی۔

"میں نے بھی پہلے یہی سمجھنے کی کوشش کی تھی چچا جان......! اور اس کے لئے رومانوی شاعری کی طرف گیا۔ وہاں مجھے پتا چلا کہ ہم نے بہت سے سفلہ جذبوں کو محبت کا نام دے رکھا ہے۔ شاید یہ بھی محبت کرنے والوں کی آزمائش ہے۔ میں بہرحال محبت کو سمجھنے کی کوشش میں لگا رہا۔

اس سلسلے میں بالآخر کتے نے میری رہنمائی کی۔"

"کتے نے......؟" مسعود صاحب نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں......! دیکھیں، ہمارے خالق، ہمارے ربّ کی محبت تو اور چیز ہے۔ میں نے سوچا، ہمیں تو مخلوق کی محبت پر غور کرنا ہے۔ اس وقت میرا مطالعہ بالکل نہیں تھا۔ اب بھی بہت محدود ہے۔ مگر مشاہدہ تو سبھی کے لئے آسان ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے اللہ نے دُنیا کو غور سے دیکھنے، اور اس میں تجسس کرنے کی تلقین کی ہے۔

بہرحال کتے سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ کتا جب کسی سے محبت کرتا ہے تو مرتے دم تک اس کی محبت اور قربت سے دستبردار نہیں ہوتا۔ اس کا محبوب اسے روٹی یا ہڈی دے، تب بھی وہ خوش، اور کچھ نہ دے، تب بھی اس سے خوش۔ وہ اسے بری طرح مارے، تب بھی وہ چوں تک نہیں کرتا۔ پٹنے کے بعد بھی وہ اسی کے در پر پڑا رہتا ہے۔ وہ اسے مارنا چاہے، تب بھی نہ وہ اس سے بھاگتا ہے، نہ دفاع کرتا ہے اپنا، کوئی اور ہوتو اسے پھاڑ کھائے۔

میں نے مشاہدہ کیا اور سوچا کہ کتے کو یہ محبت اللہ نے دی ہے، اور شاید ہماری رہنمائی کے لئے دی ہے۔" عبدالحق کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ ظہر کی اذان شروع ہوگئی تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے اذان سنتے اور اس کا جواب دیتے رہے۔ اذان کے بعد کی دُعا کے بعد مسعود صاحب نے کہا۔

"آؤ......! نماز کے لئے چلیں......!"

عبدالحق اُٹھ کھڑا ہوا۔

''جی چچا جان......!''

''نماز پڑھ کر واپس آؤ گے میرے ساتھ......؟'' مسعود صاحب نے پوچھا۔

''دل تو یہی چاہتا تھا چچا جان......!'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

''لیکن مجھے گھر جانا ہے۔ پھر آؤں گا انشاء اللہ......! اور جلد ہی آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے......! یاد رکھنا، یہ گفتگو مکمل کرنی ہے تمہیں۔''

''جی چچا جان......! انشاء اللہ تعالیٰ......!''

اور وہ دونوں کمرے سے نکل آئے۔

❁❁❁

عبدالحق کو حیرت ہوئی کہ کھانے کی میز پر زبیر بھی موجود تھا۔ لیکن اس نے اس سے کچھ پوچھا نہیں۔

کھانے کے بعد زبیر نے اس سے کہا۔

''آپ سے کچھ بات کرنی ہے کا کا......!''

عبدالحق اسے لے کر اپنی اسٹڈی میں چلا آیا۔

''بیٹھیں زبیر بھائی......!'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''کہیں کیا بات ہے......؟''

''آپ سے ایک اجازت لینی ہے۔'' زبیر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''سکریٹری اسٹیبلیشمنٹ ڈویژن آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی آپ کو......؟ آپ خود فیصلہ کر سکتے تھے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''یہ ضروری تھا۔ ان معاملات کے بارے میں میں کچھ جاننا سمجھتا نہیں ہوں کا کا......!''

''تو کیا مجھے ان سے ملنے کے لئے جانا ہوگا......؟'' عبدالحق نے سادگی سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں آمادگی تھی۔

زبیر تڑپ گیا۔

''یہ تو میں کبھی گوارہ نہیں کر سکتا کا کا......! وہ یہی چاہتے تھے، لیکن میں نے منع کر دیا۔ انہوں نے یہاں آنے کی بات کی تو میں نے کہا کہ آپ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''مسئلہ کیا ہے......؟''

''کچھ کیس سے متعلق ہی بات ہوگی۔ مجھے تو کچھ نہیں بتایا انہوں نے۔''

عبدالحق نے پھر چند لمحے سوچا۔ اور فون کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے......! آپ انہیں بلا لیں۔'' اسے زبیر پر پیار آ رہا تھا۔ وہ اس کی عزت کا کتنا خیال کرتا ہے۔

زبیر نے فون ملایا اور کچھ دیر بات کرتا رہا۔ پھر ریسیور رکھنے کے بعد بولا۔

''وہ ابھی آ رہے ہیں۔''

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

اور آدھے گھنٹے بعد سکریٹری آ گیا۔ عبدالحق نے ڈرائنگ روم میں اس سے ملاقات کی۔ زبیر کو وہ اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

سکریٹری اسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑے تپاک سے اس سے مصافحہ کیا۔

''آپ میرے تصور سے بہت مختلف ہیں عبدالحق صاحب......!'' اس نے کہا۔

''تشریف رکھئے......!'' عبدالحق نے کہا۔

''آپ میرے اندازے کے برعکس کا خاصے کم عمر ہیں۔'' سکریٹری نے کہا۔

''آپ مجھے بہت بڑی عمر کا سمجھے تھے...... کیوں......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔ اس نے سکریٹری کو غور سے دیکھا۔ وہ تقریباً اُسی کا ہم عمر تھا۔

''آپ کی ساکھ کی وجہ سے۔ افسروں کے حلقے میں آپ کا نام بے حد عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔''

''نام، ساکھ، عزت...... سبھی کچھ اخبارات کے ذریعے تباہ کیا گیا۔'' عبدالحق

نے سادگی سے کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

"ویسے یہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے، وہ جب چاہے، واپس لے لے.....!"

"کوشش کی گئی، لیکن خراب تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" سکریٹری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور اب تو سب کچھ بحال بھی ہو گیا ہے۔"

"ساکھ اور عزت کی بحالی کے لئے عدالت جانا پڑے تو وہ ساکھ اور عزت کیا ہے۔ ویسے مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ آپ یہ فرمائیں کہ آپ نے کیسے زحمت کی.....؟"

"پہلے میں ایک بات واضح کر دوں۔ میں یہاں سرکاری حیثیت میں، ایک سرکاری کام سے آیا ہوں۔ لیکن آپ کے بارے میں جو کچھ سنتا رہا ہوں، اس کی وجہ سے میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ آپ میرے لئے بہت محترم ہیں۔ میرے نزدیک آپ ایک مثالی آدمی ہیں۔"

"اس محبت کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" عبدالحق نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

"اب پہلے سرکاری بات ہو جائے۔"

"جی بہتر.....!" سکریٹری نے کہا اور بریف کیس کھول کر ایک فائل نکالی۔ فائل میں سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ نکال کر اس نے عبدالحق کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ کی بحالی کا نوٹیفکیشن ہے۔"

عبدالحق نے کاغذ کی تحریر پڑھی اور سر ہلاتے ہوئے، چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ مجھ پر سرکار کی غیر معمولی عنایت ہے۔ لیکن یہ آپ کے ذریعے مجھے بھیجا گیا تو اس میں کوئی رمز بھی ہوگا۔"

سکریٹری شرمندہ نظر آنے لگا۔ اس نے فائل سے ایک اور کاغذ نکال کر عبدالحق کی طرف بڑھا دیا۔

"اس پر آپ کے دستخط درکار ہیں۔" اس کے لہجے میں بھی شرمندگی تھی۔

عبدالحق نے پڑھا اور اس کا استعفیٰ تھا، جس کے تحت وہ ملازمت Resume کرنے کے بجائے بغیر کسی دباؤ، جبر اور اکراہ کے فوری طور پر استعفیٰ دے رہا تھا۔ اس نے سر اُٹھا کر سکریٹری کی آنکھوں میں دیکھا۔

"یہ کام تو میں بغیر کہے کر دیتا۔ یہ ملازمت میرے لئے ایک ناپسندیدہ قید تھی، جس سے مجھے اللہ نے رہائی عطا فرمائی۔ میں دوبارہ قید کیوں ہونا چاہوں گا.....؟"

سکریٹری نے واضح طور پر سکون کی سانس لی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کی نگاہوں میں مایوسی سی جھلکی تھی۔

"لیکن حکومت کے دباؤ کے تحت میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔" عبدالحق کے لہجے میں قطعیت تھی۔

اس بار سکریٹری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میں جو کچھ آپ کے بارے میں جانتا ہوں، اس کے تحت آپ سے اسی ردِعمل کی اُمید تھی۔" اس نے کہا۔

"پھر ظاہری طور پر آپ کی پوزیشن بھی مضبوط ہے۔"

"بات پوزیشن کی نہیں۔" عبدالحق کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

"میں اُصولوں پر سمجھوتے نہیں کرتا۔ اللہ پر یقین رکھتا ہوں۔ اس کے سامنے جواب دہ ہوں اور اپنے ضمیر کے علاوہ کوئی دباؤ قبول نہیں کرتا۔ اور آپ نے ظاہری پوزیشن کی کیا بات کی۔ عدالت نے میرے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ میری پوزیشن ہر طرح سے مضبوط ہے۔ حکومت بارگیننگ پوزیشن میں ہے ہی نہیں۔"

"حکومت کے پاس ریاست کی مکمل طاقت ہوتی ہے عبدالحق صاحب.....! حکومت ہمیشہ بارگیننگ میں ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہیں کہ اسے ہر فرد پر بالا دستی حاصل ہوتی ہے، اور آپ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔" سکریٹری اس انداز میں بات کر رہا تھا جیسے حکومت سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ وہ خود کو علیحدہ کر کے بے حد غیر ذاتی اور غیر جذباتی انداز میں بات کر رہا تھا۔

عبدالحق نے یہ باس محسوس کر لی۔ وہ مسکرایا۔

''میں نے عرض کیا نا کہ میں اُصولوں پر سمجھوتے کبھی نہیں کرتا۔ اس لئے حکومت بارگیننگ پوزیشن میں ہو یا نہ ہو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دباؤ کے تحت میں استعفیٰ نہیں دوں گا۔ البتہ بات کرنے کی حد تک میں یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ حکومت کی طاقت کے بارے میں وضاحت کر دیں۔ نہ کریں تو کوئی بات نہیں۔ کیونکہ آپ حکومت کی نمائندگی کر رہے ہیں، اور ممکن ہے کہ آپ حکومت کے کارڈ ظاہر نہ کرنا چاہیں۔''

سکریٹری بھی مسکرایا۔

''بے شک......! میں حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے کارڈ چھپانے کی نہیں، دکھانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ آپ کو اس پر قائل کرنا ہے کہ معاملے کو یہیں نمٹا لیا جائے۔''

''تو مجھے قائل کریں۔'' عبدالحق کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''میں استعفیٰ نہیں دیتا، تو حکومت کیا کرے گی......؟''

''یہ نوٹیفکیشن آپ کے استعفیٰ سے مشروط ہے۔ آپ استعفیٰ نہیں دیتے تو یہ محض کاغذ کا پرزہ ہے۔''

''میرے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ عدالت کے حکم پر عمل کرتے ہوئے یہ تو حکومت کو جاری کرنا ہی ہوگا۔''

''لیکن سرخ فیتے کے بارے میں بھی آپ جانتے ہی ہوں گے۔ مہینوں لگ جائیں گے اس میں۔''

''مجھے کچھ ایسی جلدی بھی نہیں۔'' عبدالحق نے بے پروائی سے کہا۔

''ویسے آپ حکومت کی بارگیننگ پوزیشن واضح کرنے والے تھے۔''

''جی ہاں......! حکومت کا کارڈ یہ ہے کہ وہ ماتحت عدالت کے فیصلے کو، جو آپ کے حق میں آیا ہے، چیلنج کرے گی۔''

''کس بنیاد پر......؟ حکومت کے پاس میرے خلاف کچھ ہے نہیں۔''

''میں بتاتا ہوں آپ کو...... آپ نے پٹیشن دائر کی۔ اتفاق سے، آپ کی خوش قسمتی سے کیس اس جج کے پاس گیا، جو آپ ہی کی طرح کا انسان ہے...... کوئی

دباؤ قبول نہ کرنے والا...... اور یہ بات......''

عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ اتفاق نہیں تھا۔ اللہ کی رحمت تھی میرے لئے......!''

''جی...... بے شک......!'' سکریٹری نے خلوص بھرے لہجے میں کہا۔

''بہرحال......! میں یہ کہہ رہا تھا کہ وزارتِ قانون نے غفلت برتی کہ اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ بعد میں دباؤ ڈالنے کی کوشش ناکام ہوئی اور معاملات ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس کے نتیجے میں متعلقہ افسر معتوب ہوئے۔ لیکن اب وہ پوری طرح تیار ہیں۔ اپیل میں صورتِ حال مختلف ہوگی۔''

''کچھ کچھ قانون میں بھی سمجھتا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اپیل میں ضروری ہے کہ فیصلے میں کسی قانونی سقم کی نشان دہی کی جائے ورنہ اپیل مسترد ہو جاتی ہے۔''

''دیکھئے...... میں نے کہا نا کہ اب صورتِ حال مختلف ہوگی۔ اپیل کی سماعت کے لئے بہت احتیاط سے بنچ کا انتخاب کیا جائے گا۔ اس میں وہ لوگ بیٹھیں گے، جو حکومت کا دباؤ تسلیم کرتے ہوں گے۔''

''لیکن کسی مضبوط گراؤنڈ کے بغیر وہ بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

''گراؤنڈ تو موجود ہے۔ یا یوں کہیں کہ تیار کر لیا گیا ہے۔''

''اب آپ اس کے بارے میں تو مجھے نہیں بتانا چاہیں گے......؟'' عبدالحق کے لہجے میں اشتباہ تھا۔

''کیوں نہیں......!'' سکریٹری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گراؤنڈ یہ ہوگا کہ کوئی عدالت چیف ایگزیکٹو کے جاری کردہ آرڈیننس کو کالعدم کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ فی الوقت ملک میں کوئی آئین ہے ہی نہیں۔ آگے آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔''

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ حکومت ہمیشہ بارگیننگ پوزیشن میں ہوتی ہے۔'' سکریٹری کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"میں اُصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتا تو سودے بازی کیسے کروں گا......؟"

"اب جو میں آپ سے بات کروں گا، وہ ذاتی ہے۔ اس وقت میں حکومت کا نمائندہ نہیں ہوں۔"

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اسی لمحے نسیمہ چائے کی ٹرالی لے کر چلی آئی۔ اس نے سب کے سامنے چائے رکھی۔ پلیٹ میں بسکٹ بھی تھے۔ پھر وہ واپس چلی گئی۔

"دیکھیں......! ذاتی حیثیت میں میری تواضع بھی ہوگئی۔" سکریٹری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عبدالحق نے کچھ نہیں کہا۔ بس متجسس سی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"اب میں سرکاری حیثیت میں نہیں ہوں تو اپنا تعارف بھی کرا دوں۔ میرا نام راشد مجید ہے، اور میں آپ کے مداحوں میں سے ہوں۔" سکریٹری نے عبدالحق کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

عبدالحق نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ زبیر پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ ابھی تک اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

"ملاقات کے دوران ہی سرکاری حیثیت ترک کرنے میں کیا مصلحت ہے آپ کی......؟" عبدالحق نے راشد مجید سے پوچھا۔

"جو مشورہ میں آپ کو دینا چاہتا ہوں، وہ سرکاری حیثیت میں نہیں دے سکتا۔ اور جو کچھ میں اب کہوں گا، وہ آف دی ریکارڈ ہوگا۔"

"یہ سرکار کے ساتھ خیانت نہیں ہوگی......؟" عبدالحق نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے بھی کچھ اُصول ہیں عبدالحق صاحب......!" راشجد مجید نے برا مانے بغیر کہا۔

"میری وفاداری حکومت پاکستان کے لئے نہیں، پاکستان کے لئے ہے۔ حکومتیں تو آتی جاتی رہتی ہیں اور آتی جاتی رہیں گی۔ پاکستان انشاء اللہ قائم رہے گا۔"

عبدالحق نے پہلی بار اسے احترام کی نظر سے دیکھا۔ اس نے محبت سے اس

کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے راشد صاحب......! اور یہ میں رسماً نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"یہ میرے لئے بڑا اعزاز ہے جناب......!"

"آپ چائے پئیں......! بسکٹ بھی لیں۔ تکلیف نہ کیجئے گا۔ پھر اس کے بعد میں آپ کا مشورہ سننا چاہوں گا۔"

زبیر کے جسم کا تناؤ دُور ہوگیا تھا۔ اب وہ مسکرا رہا تھا۔

چائے خاموشی سے پی گئی۔ راشد مجید نے چائے کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھی اور مسکرایا۔

"اب میں آپ کو مشورہ دینے کی جسارت کر سکتا ہوں......؟"

"میں منتظر ہوں۔"

"میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس پیش کش کو قبول کر لیں۔"

عبدالحق اسی بات کی توقع کر رہا تھا۔ پھر بھی اسے جھٹکا لگا۔

"آپ کہہ رہے ہیں تو اس میں کوئی بھلائی بھی ہوگی۔"

"میں وضاحت کرتا ہوں جناب......!" راشد مجید نے بے حد اعتماد سے کہا۔

"آپ اس پیش کش کو مسترد کریں گے تو حکومت عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کرے گی اور مجھے یقین ہے کہ فیصلے کو کالعدم کرا دے گی۔"

"تو کیا ہوا......؟ میں داغ دار ہی رہوں گا نا......؟ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عبدالحق نے بے پروائی سے کہا۔

"بات صرف آپ کی نہیں...... اس سے دوسروں کو پہنچنے والا فائدہ رُک سکتا ہے...... اور یہ بڑا نقصان ہوگا۔"

"دوسرے کون......؟"

"نکالے جانے والوں میں یقیناً بدعنوان اور رشوت خور بھی ہوں گے۔ لیکن اُن میں آپ جیسے صاف ستھرے لوگ بھی تو ہیں۔ میں ان کی بات کر رہا ہوں۔"

"اور وہ فائدہ کون سا ہے..... جو رُک سکتا ہے.....؟"

"آپ کے حق میں عدالت نے جو فیصلہ دیا، وہ ایک نظیر ہے۔ اس نے ان کے لئے راستہ کھول دیا ہے کہ وہ اپنی دادرسی کے لئے عدالت سے رجوع کر سکتے ہیں اور اس نظیر کی موجودگی میں انہیں انصاف بھی مل سکے گا۔"

"میں اگر یہ سمجھوتہ نہیں کروں گا، تب بھی وہ نظیر تو قائم رہے گی۔" عبدالحق نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں قائم رہے گی عبدالحق صاحب.....! بلکہ اس کے برعکس ایک نظیر قائم ہو جائے گی، جو مدتوں تک لوگوں کے حق انصاف کا راستہ بند رکھے گی۔"

"وہ کیسے.....؟" عبدالحق کے لہجے میں اُلجھن تھی۔

"ایسے کہ گورنمنٹ اپیل کرے گی اور ماتحت عدالت کا فیصلہ اس بنیاد پر کالعدم کرا دے گی کہ ملک کے چیف ایگزیکٹو کے حکم کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اپیل پر کیا جانے والا یہ فیصلہ نظیر بن جائے گا۔ اور انصاف کے راستے کی دیوار ثابت ہوگا۔ اس وقت آپ یہ سمجھوتہ کر لیں تو حکومت اپیل کرے گی ہی نہیں، اور عدالت کا فیصلہ نظیر بن جائے گا اور کسی عدالتی فیصلے کی نظیر کو ردّ کرنا آسان نہیں ہوتا۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ راشجد مجید کی باس میں وزن تھا۔ مگر وہ کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے پوری طرح مطمئن ہونا چاہتا تھا۔

"فرض کر لیں کہ میرے کیس کی نظیر کے تحت عدالت کسی اور کو میری طرح بحال کرتی ہے، تو حکومت اس کے خلاف اپیل کر کے اسے کالعدم کرا سکتی ہے۔"

"جی نہیں.....! یہ بہت مشکل ہوگا۔" راشد مجید نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"یہ قانونی نکتہ ہے۔ اگر حکومت عدالت کے آپ کے حق میں کئے جانے والے فیصلے کے خلاف اپیل نہیں کرتی تو قانونی طور پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور جو فیصلہ تسلیم کر لیا گیا، اسے آگے کبھی کیسے چیلنج کیا جا سکتا ہے.....؟" وہ کہتے کہتے رُکا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام جوڑا۔

"آپ ابھی استعفیٰ پر دستخط کر دیتے ہیں اور یہ نوٹیفکیشن عدالت کے حکم پر

جاری ہو جاتا ہے تو حکومت اپیل نہیں کرے گی۔ یوں یہ نظیر بن جائے گی۔"

عبدالحق کے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ بات اس پر پوری طرح واضح ہوگئی۔ اس نے ستائشی نظروں سے راشد مجید کو دیکھا۔

"بہت دُور کی کوڑی لائے ہیں آپ.....!"

"نہیں جناب.....! سامنے کی بات ہے۔" راشد مجید نے انکسار سے کہا۔

"مجھے تو نظر نہیں آئی۔"

"آپ کی فیلڈ نہیں ہے نا..... اور میں جب سرکاری ملازمت سے نکالا جاؤں گا تو وکالت کروں گا۔" راشد مجید نے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب آپ یہ کہیں گے کہ میں نے یہ نکتہ حکومت پر واضح نہ کر کے بددیانتی کی ہے۔ اور آپ کو یہ مشورہ دے کر خیانت کا رتکاب کیا ہے.....؟"

"نہیں کہوں گا۔" عبدالحق نے محبت سے کہا۔

"میں جان چکا ہوں کہ آپ پاکستان کے وفادار ہیں، حکومتیں تو آتی جاتی رہتی ہیں اور بعض اوقات وہ پاکستان کے مفاد کے خلاف بھی کام کرتی ہیں۔ ایسے میں ان سے وفاداری نبھانا گناہ ہے۔"

"لیکن آپ پوچھتے ہیں، تب بھی میں لاجواب نہ ہوتا۔ میں کہتا کہ یہ وزارتِ قانون کی ذمہ داری تھی، اور میں اسٹیبلشمنٹ ڈویژن میں ہوں۔"

"بات ٹھیک ہے آپ کی۔ لیکن وزارتِ قانون کی نااہلی سامنے آتی ہے۔"

"یہ بات نہیں عبدالحق صاحب.....! آپ کو شاید کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ جب بہت اوپر سے پریشر آتا ہے تو بڑے بڑوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ تجزیہ اور فیصلہ کرنے کی صلاحی گھٹ جاتی ہے۔ اوپر والوں کا پورا زور اس بات پر تھا کہ اس معاملے کو بالکل دبا دیا جائے، کیونکہ یہ ابھر کر سامنے آیا تو حکومت کی رُسوائی ہوگی۔ وزارتِ قانون کا ہدف اس معاملے کو یہیں دفن کرنا تھا۔ اس لئے وہ کسی اور پہلو پر غور کر ہی نہیں سکے۔"

"یہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر اس نے استعفیٰ پر دستخط کر کے راشد مجید کی طرف بڑھا دیا۔ نوٹیفکیشن اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔

"ابھی ایک بات اور ہے۔"

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے راشد مجید کو دیکھا۔

"عدالت نے آپ کو ہرجانے کے لئے کیس دائر کرنے کا حق دیا ہے۔ آپ وہ استعمال نہیں کریں گے۔ اس کے عوض آپ ذاتی طور پر حکومت سے جو رقم چاہیں، ہرجانے کے طور پر طلب کر سکتے ہیں۔"

"یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" عبدالحق نے بے فکری سے کہا۔

"ہمارا منشاء مالی منفعت کے حصول کا نہیں تھا۔ ہمیں تو صرف بدنامی کا داغ دھونا تھا، اور وہ دُھل گیا۔"

"اس زبانی بات سے حکومت کی تسلی نہیں ہوگی۔ کیونکہ آپ کسی بھی وقت دعویٰ کر سکیں گے۔ کون روک سکتا ہے آپ کو......؟ یوں معاملہ پھر عدالت میں جائے گا۔ اخبارات میں خبریں لگیں گی اور حکومت کی رُسوائی ہوگی۔"

"تو پھر......؟"

"آپ کو تحریر دینی ہوگی کہ آپ بغیر کسی جبر و اکراہ کے، اپنی مرضی سے اپنے ہرجانے کے حق سے دستبردار ہو رہے ہیں اور آپ کبھی اس کا دعویٰ نہیں کریں گے۔"

"ایک اور سمجھوتہ......!" عبدالحق نے تاسف سے کہا۔

"خیر......! یہ تو اور اچھی بات ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، جیسے کوئی اچھا زاویہ سجھائی دے گیا ہو۔

"میں ابھی لکھ دیتا ہوں۔"

"ایسے نہیں...... میں اسٹامپ پیپر ساتھ لایا ہوں۔ اس پر لکھ دیں۔" راشد مجید نے فائل سے اسٹامپ پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

عبدالحق نے اسٹامپ پیپر لیا اور اس پر لکھنے لگا۔ لکھ کر اس نے دستخط کئے اور اسٹامپ پیپر راشد مجید کی طرف بڑھا دیا۔

راشد مجید نے وہ عبارت پڑھی اور مسکرایا۔

"بہت خوب......! آپ نے تو اسے حکومت کے خلاف دستاویز بنا دیا۔ اور نہ حکومت اس پر کوئی اعتراض کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتی

ہے۔ نوٹیفکیشن کے اجراء کے بعد اپیل کا حق تو اس کے پاس رہا نہیں۔ اب اس پر میں اور زبیر صاحب بطور گواہ دستخط کر دیں گے اور کارروائی مکمل۔"

اس نے اسٹامپ پیپر پر خود دستخط کئے، پھر زبیر سے دستخط کرائے اور اسٹامپ پیپر کو فائل میں رکھ لیا۔ کاپی اس نے عبدالحق کو دی، اور فائل کو اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔

"آپ مجھے اجازت......؟" وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور عبدالحق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عبدالحق نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کو رخصت کرنے باہر چل رہے ہیں۔"

وہ ڈرائنگ روم سے نکلے۔ باہر نکلتے ہوئے راشد مجید نے کہا۔

"آپ کی طرح میں بھی مسعود احمد صاحب کا شاگرد ہوں۔ جو کچھ میں نے سیکھا، انہی سے سیکھا ہے۔"

"مجھے اس کا اندازہ آپ کے پاکستان سے وفاداری والے جملے سے ہوگیا تھا۔"

"آپ کراچی میں تھے، اور میں ان کے سائے میں تھا۔ ان سے ملاقات ہو تو انہیں میرا اسلام پہنچا دیجئے گا۔"

"ضرور راشد صاحب......!"

راشد مجید کو رُخصت کرنے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوئے تو عبدالحق نے اچانک کہا۔

"زبیر بھائی......! میں حق نگر جانے کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ مولوی صاحب سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔"

"بس......! ایک ہفتہ اور صبر کرلیں کاکا......!" زبیر نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"وہی سرپرائز والا معاملہ ہے زبیر بھائی......!"

"جی ہاں......! بس ایک ہفتہ کاکا......!"

"اور وہاں جو میری عزت کا معاملہ تھا......؟"

"اللہ نے اپنے فضل و کرم سے سب ٹھیک کر دیا کاکا......! اب تو میں اس کے بارے میں بتا بھی سکتا ہوں۔"

اب وہ اسٹڈی میں پہنچ گئے تھے۔ عبدالحق اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا۔

"بیٹھئے زبیر بھائی......! اور مجھے اس کے بارے میں بتائیں۔"

"ہمارے قومی اسمبلی کے حلقے کا منتخب ممبر چوہدری عبدالستار آپ سے شدید بغض رکھتا ہے، نفرت کرتا ہے۔"

عبدالحق کو شاک لگا۔

"لیکن کیوں......؟ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔"

"یہ الیکشن کے دنوں کی بات ہے۔" زبیر نے کہا۔

"یہ حلقہ بہت بڑا ہے۔ حق نگر کے علاوہ اس میں چوہدری عبدالستار کا آبائی علاقہ بھی شامل ہے۔ آبادی کے لحاظ سے حق نگر کے برابر ہی ہوگا۔ حق نگر کے لوگوں نے اپنے نمائندے کھڑے کرنے کا فیصلہ کیا۔ پنچایت میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے لئے اُمیدواروں کے نام کا فیصلہ کیا گیا۔ میں بھی اس میں شریک تھا، اور میں نے ان ناموں کی تائید کی۔ اب مشکل یہ ہے کہ میری کہی ہوئی ہر بات حق نگر میں آپ کے منہ سے نکلی ہوئی بات سمجھی جاتی ہے۔"

"اور یہ درست بھی ہے...... میں بھی آپ کی بات کو یہی حیثیت دیتا ہوں۔" عبدالحق نے کہا۔

"چوہدری صاحب نے حق نگر کے اُمیدواروں کو اپنے حق میں دست بردار کرانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہے۔ وہ بہت بڑے زمیندار ہیں، پیسہ بھی بہت ہے ان کے پاس، اور اثر ورسوخ بھی بہت ہے۔ حق نگر کے کچھ لوگ ان سے مل گئے۔ انہوں نے چوہدری صاحب کو بتایا کہ حق نگر آپ کے نام سے موسوم ہے، اور یہاں آپ کی بات چلتی ہے۔ لوگ جان چھڑکتے ہیں آپ پر۔ اور میں آپ کا نمائندہ ہوں۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں پہلے لوگوں سے ملا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ حق نگر کی رائے عامہ اپنے

اُمیدواروں کے الیکشن لڑنے کے حق میں ہے۔ اس لئے ان پر دباؤ ڈالنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ چوہدری صاحب سے ملا تو میں نے ان پر واضح کر دیا کہ لوگوں کی مرضی ان کے خلاف الیکشن لڑنے کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عبدالحق صاحب اگر حکم کریں گے تو ان کے مخالف اُمیدوار دستبردار ہو جائیں گے۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ لوگوں کی مرضی کے خلاف انہیں مجبور کرنے کے قائل نہیں۔ بس وہاں سے یہ ایک طرح کی دشمنی شروع ہوگئی۔ الیکشن ہوا تو ہمارا قومی اسمبلی کا اُمیدوار صرف ڈیڑھ دو سو ووٹوں سے ہارا، اور صوبائی اسمبلی کا اُمیدوار اس شان سے جیتا کہ اس کے مخالف کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ چوہدری صاحب نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ انہوں نے حق نگر میں زمین خرید کر حویلی بنوائی۔ اب کچھ دن حق نگر میں رہتے ہیں اور کچھ دن سلطان آباد میں۔ اپنے ساتھ مصاحب بھی لا بٹھائے ہیں وہاں حق نگر کے کچھ لالچی لوگ بھی ان سے مل گئے ہیں۔"

"مگر اس میں میری عزت اور بے عزتی کی کیا بات ہے......؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"چوہدری بہت کینہ پرور ہے، اور برسرِ اقتدار پارٹی کا ایم این اے ہے۔ حق نگر میں آپ کی مقبولیت نے اسے حسد میں مبتلا کر دیا۔ وہ آپ کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ بدعنوان افسروں کی فہرست میں آپ کا نام شامل کرانے میں اس کا ہاتھ ہے۔"

"یہ آپ کی بدگمانی بھی تو ہو سکتی ہے زبیر بھائی......!"

"ممکن ہے کاکا......! لیکن اس کے فوراً بعد حق نگر کی دیواروں پر آپ کے خلاف پوسٹر لگا دیئے گئے۔ آپ کے خلاف نعرے لکھے جانے لگے۔ ایک گندی مہم شروع کر دی گئی آپ کے خلاف۔ اس کا خیال تھا کہ یوں حق نگر میں آپ کی مقبولیت کو بہت بڑا دھچکا لگے گا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ لوگ تو مشتعل ہوگئے۔ میں لوگوں کو نہ سمجھاتا تو امن و امان کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ بہرحال پوسٹر لوگوں نے نوچ پھینکے اور نعرے مٹا دیئے۔ ایسے میں آپ کا حق نگر جانا مجھے مناسب نہیں لگا۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات۔"

"چوہدری نے اپنے سلطان آباد کے آدمی اور کرائے کے لوگ جمع کر رکھے ہیں کہ آپ حق نگر آئیں تو آپ کے خلاف مظاہرہ کریں، توہین آمیز نعرے لگائیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں کا کا......!"

"آپ کے خیال میں اس طرح میری عزت جاتی رہے گی، میں بے عزت ہو جاؤں گا۔" عبدالحق نے تلخ لہجے میں کہا۔

"عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے زبیر بھائی......!"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کا کا......! لیکن بات اس سے بڑی ہے۔ حق نگر کے لوگ یہ برداشت نہیں کرتے، اور وہاں خون خرابا ہو جاتا۔ کیونکہ حق نگر کی پولیس تو چوہدری کی غلام بنی ہوئی ہے۔ آپ کے چاہنے والوں کو نقصان ہو جاتا۔"

"یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے زبیر بھائی......!" عبدالحق نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچتا رہا۔

"یہ بتائیں...... آپ اس سے اُلجھے تو نہیں......؟"

بالآخر اس نے پوچھا۔

"میں اسے سمجھانے کے لئے خود چل کر اس کے پاس گیا۔" زبیر نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں نے اسے بتایا کہ آپ کوئی سیاسی آدمی نہیں ہیں، نہ ہی آپ کے سیاسی عزائم ہیں۔ بلکہ آپ تو اسے جانتے تک نہیں۔ اس لئے اسے یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر اس نے بڑی حقارت سے بات کی۔ توہین کرتا رہا۔ اسے اپنے پیسے اور اثر و رسوخ پر بڑا گھمنڈ ہے کا کا......! وہ دھمکیاں دیتا رہا۔ کہنے لگا کہ حق نگر کا نام تبدیل کرائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ کہنے لگا، تمہاری طاقت اور دولت، سب ختم کرا دوں گا۔ یہاں فقیروں کی طرح پھرو گے تم لوگ۔ میں کہاں تک برداشت کرتا کا کا......؟ میں نے بس اتنا کہا کہ تم سے جو بن پڑے کر لو۔"

"تو اب عزت کے ڈر سے میں کبھی حق نگر نہیں جا سکوں گا......؟" عبدالحق نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں کا کا......! اب تو صورتِ حال بدل چکی ہے۔" زبیر نے جلدی

سے کہا۔

"آپ کیس جیت گئے، سچائی ثابت ہوگئی۔ اب تو ہم عدالتی فیصلے کی اور آپ کی بحالی کے نوٹیفکیشن کی کاپیاں تقسیم کریں گے۔ آپ نے جو ہرجانہ معاف کرنے کا اسٹامپ پیپر لکھا ہے، اس کی کاپیاں تقسیم کریں گے۔ وہ اب آپ کے خلاف کچھ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کچھ کرے گا تو اس کی اپنی وہ ذِلت ہوگی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے زبیر بھائی......! آپ نے راشد مجید کی بات سنی تھی نا...... میں نہیں چاہتا کہ ہماری انا کی وجہ سے دوسروں کو نقصان پہنچے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر کا کا......!" زبیر نے بے حد احترام سے کہا۔

"لیکن آپ پر کیچڑ اُچھالی گئی تو میں کسی بات کا لحاظ نہیں کروں گا۔"

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ زبیر اس کی بات ردّ کر رہا تھا۔ زبیر کے چہرے پر جو عزم تھا، اس نے اسے اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"تو پھر میرے حق نگر جانے پر ایک ہفتے کی پابندی کیوں......؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"وہ ایک سرپرائز ہے نا آپ کے لئے......!" زبیر مسکرایا۔

"بس......! ایک ہفتہ صبر کرلیں۔"

"چلیں...... ٹھیک ہے......!" عبدالحق نے کہا۔

"مگر ایک بات کی وضاحت کریں۔ میرے حق نگر جانے کا چوہدری عبدالستار کو کیسے پتا چلے گا......؟ اور پتا نہ چلے تو وہ میرے خلاف مظاہرہ کرائے گا......؟"

"اس کے بہت ذرائع ہیں کا کا......! اس کے آدمی آپ پر نظر رکھتے ہیں۔"

"بڑی عجیب بات ہے......!" عبدالحق نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"بس کا کا......! ایک ہفتے بعد حق نگر چلیں گے انشاءاللہ......!"

"انشاءاللہ......!"

لیکن اس رات ارجمند سے گفتگو ہوئی، اس سے عبدالحق کو اندازہ ہو گیا کہ ابھی کم از کم ایک ماہ وہ حق نگر نہیں جا سکے گا۔

❁❁❁

چوہدری عبدالستار حق نگر میں اپنی حویلی کے ہال ہی میں جسے وہ دیوان خانہ کہتا تھا، کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ سامنے اس کے دونوں بیٹے آصف چوہدری اور کاشف چوہدری بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے امیر علی اور خیر دین ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

''کیا خبریں ہیں......؟'' آصف چوہدری نے خیر دین سے پوچھا۔ آصف سلطان پور سے صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا۔

''حویلی تقریباً مکمل ہو چکی ہے چھوٹے صاحب......! بس دو تین دن کا کام رہ گیا ہے۔'' خیر دین نے کہا۔

''حویلی کو جہنم میں ڈال......!'' آصف نے نفرت سے کہا۔ اس کا بس چلتا تو جس حویلی کی بات ہو رہی تھی، وہ اسے بارہ دسے اُڑا دیتا۔

''میں تجھ سے اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''لاہور سے فون آیا تھا۔ وہ ابھی نہیں آ رہا ہے صاحب جی......!''

''اس کے استقبال کی تیاریاں تو مکمل ہیں......؟'' آصف اس بار امیر علی کی طرف مُڑا۔

''جی چھوٹے سرکار......! آپ کے حکم کے مطابق ہی سب کچھ ہو گا۔'' امیر علی نے جواب دیا۔ لیکن اس کے لہجے میں ناخوشی تھی۔

اس پر چوہدری عبدالستار چونکا۔

''سنو......! اب ایسا کچھ نہیں ہو گا۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''ہمیں کوئی کارروائی نہیں کرنی۔''

''کیا بات کرتے ہیں پاپا جی......؟'' آصف نے احتجاج کیا۔

''وہ ہندو بچہ اتنی آسانی سے یہاں داخل نہیں ہو سکتا۔ حویلی بنوا کر وہ ہمیں چیلنج کر چکا ہے۔ ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔''

''بے کار بات مت کرو۔'' چوہدری نے سخت لہجے میں کہا۔

''اوپر سے سخت احکامات آئے ہیں کہ اس کے خلاف کچھ نہیں کرنا۔''

''پر کیوں پاپا جی......؟''

''کیس جیتنے کے بعد اس کی پوزیشن بھاری ہو گئی ہے۔ ہم کچھ کریں گے تو وہ کمزور وار ہو گا اور اس کے جوابی وار سے پارٹی اور حکومت دونوں کی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''لیکن پاپا......!''

''اگر ہم نے کچھ کہا تو ہمارے سیاسی کیریئر ختم ہو جائیں گے۔'' چوہدری نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تو ہم مونچھیں صاف کرا لیں اپنی......؟'' آصف نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''او نہیں پتر......!'' چوہدری کا لہجہ شفقت سے لبریز تھا۔

''اپنے باپ کی عقل پر بھروسہ نہیں ہے تجھے......؟''

''ہے کیوں نہیں پاپا جی......! پر بتائیں تو...... کیا سوچا ہے آپ نے......؟''

''ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔ مگر کچھ نہ کچھ سوجھ ہی جائے گا۔'' چوہدری نے کہا۔

''چوہدری عبدالستار نہ دشمنی چھوڑتا ہے نہ اپنے دشمن کو کبھی معاف کرتا ہے۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی پاپا جی......!''

''سیاست میں دماغ کو ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے پتر......! میں دشمن کی کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، خاص طور پر وہ کمزوریاں، جو اس کی خوبی ہوں۔ ان سے فائدہ اُٹھا کر کسی کو ذلیل کرنے میں بڑا لطف ہے۔ تم دیکھ لینا، میں اسے صرف ذلیل نہیں کروں گا، میں تو تباہ کر دوں گا اسے۔''

''پر کیسے پاپا جی......؟''

''یہ تو سوچنا ہو گا۔ وقت بہت ہے اپنے پاس۔ جلدی بازی کی ضرورت نہیں۔ میں ایسا کچھ سوچوں گا کہ پارٹی اور حکومت کا واسطہ ہی نہیں ہو گا اس سے۔

دشمن تو میرا ذاتی ہے نا......؟''

''جب تک آپ سوچیں گے... تب تک وہ اپنی اس عظیم الشان حویلی میں بیٹھ کر ہماری چھاتی پر مونگ دلتا رہے گا...... ہمیں ذلیل کرتا رہے گا۔''

''بس......! بہت بول لیا تو نے...... میرا باپ بننے کی ضرورت نہیں...... عزت بے عزتی میری ہے...... تیری نہیں......!''

آصف تو سہم کر خاموش ہو گیا۔ مگر کاشف چوہدری نے اپنے طور پر ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

حق نگر میں عبدالحق کے استقبال کا فیصلہ......!